ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کا جائزہ

تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار
سمیرا نجم
پی ایچ ڈی اُردو سکالر

نگرانِ مقالہ
ڈاکٹر روبینہ ترین
پروفیسر شعبہ اُردو

شعبہ اُردو
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
۲۰۱۷ء

انتساب

اپنی تمام خواتین کے نام جو اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے

ساتھ ساتھ تعلیمی اور پیشہ وارانہ ذمہ داریاں بھی احسن

طریقے سے نبھا رہی ہیں

اقرارنامہ

میں اقرا ر کرتی ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ بعنوان **''ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کا جائزہ''** میری ذاتی کاوش ہے اور اس سے پہلے کسی یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی(اُردو) کی ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

____

سمیرا انجم

تصدیق نامہ

اِس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے پی ایچ ڈی اُردو کی طالبہ سمیرا انجم کے تحقیقی مقالہ بعنوان **''ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات**

کا جائزہ‘‘ کا مطالعہ دِقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالبہ کے تحقیقی و تنقیدی کام سے مطمئن ہوں اور اِس اَمر کی سفارش کے ساتھ اجازت دیتی ہوں کہ ان کا یہ مقالہ پی۔ایچ۔ ڈی (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروا دیا جائے۔

____

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

باب اوّل:

ڈاکٹرجمیل جالبی سوانح ، شخصیت او ر علمی آثار

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان و ادب کے حوالے سے بطور محقق ،مدوّن ،ناقد،لغت نویس ،مؤرخ ،مترجم اور ماہرِ دکنیات کے طور پر منفرد شناخت کے حامل ہیں۔آپ کا مکمل نام محمد جمیل خان بن محمد ابراہیم خان بن محمد اسمٰعیل خاں یوسف زئی ہے۔ (۱) جبکہ قلمی نام جمیل جالبی /ڈاکٹر جمیل جالبی ہے۔

جس زمانے میں جالبی صاحب فرسٹ ایئرکے طالب علم تھے ، تو انہوں نے اپنا نام جمیل جالبی کرلیا ۔ نام کے ساتھ جالبی کا لاحقہ اس لئے لگایا گیاکہ اردو کے صفِ اوّل کے صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی کے دادا ، دونوں ہم زلف بھی تھے اور رشتے کے بھائی بھی تھے ۔ ان کی غیرمعمولی شہرت کی وجہ سے گھر میں ان کا اکثر ذکررہتا ۔محمد جمیل خان نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ان کا آئیڈیل سید جالب دہلوی تھے ۔ اس لئے جالب کی رعایت سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ جالبی لگالیا۔(۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی یوسف زئی پٹھان ہیں۔آپ کے دادا کا نام محمد اسمٰعیل پڑھے لکھے انسان تھے اور ملازمت کے ساتھ ساتھ زمین داری بھی کرتے رہے۔اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔ ’’میرے جدِّامجد برسوں پہلے سوات کے کسی گاوءں یا علاقے سیداں سے ہندوستان آئے تھے اور گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔‘‘(۳) ان کے نانامرزااحمد بیگ انجینئر تھے زمینداری کرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے شاہ ولی اللہ کے فارسی مکاتیب مرتب کرکے سہارن پور سے شائع کرائے‘‘۔(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی کے والد ابراہیم نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔وہ کاشت کاری کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ان کے والد ۱۹۶۵ء میں پاکستان آئے۔آپ کی والدہ کا نام اکبری بیگم تھا جو کہ ایک گھریلو خاتون تھیں۔ڈاکٹر جالبی نے اپنی والدہ کے تحریر کردہ مذہبی نوعیت کے مضامین کو کتابی صورت میں ’’شمع ہدایت‘‘ کے عنوان کے تحت شائع کروایا۔

اگرچہ سرکاری ریکارڈ میں جمیل جالبی کی تاریخ ولادت یکم جولائی ۱۹۲۹ء ہے لیکن ان کی پیدائش کی اصل تاریخ ۱۲۔جون ۱۹۲۹ء ہے ۔ جالبی علی گڑھ میں پیدا ہوئے ۔(۵) ڈاکٹر جمیل جالبی نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔گورنمنٹ ہائی سکول سہارن پور سے ۱۹۴۳ء میں میٹرک کیا۔انہوں نے۱۹۴۵ء میں میرٹھ کالج سے ایف۔اے کیااور۱۹۴۷ء میں یہیں سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد گھر والوں کو بتائے بغیر پاکستان آگئے۔ابتدائی چند ماہ جیکب لائن کراچی میں گزارے۔والدین کو ان کی کراچی میں موجودگی کی اطلاع ریڈیو سے ملی۔آپ کے والد نے آپ کے چھوٹے بھائی کو کچھ رقم دے کر پاکستان روانہ کیا۔اس رقم سے انہوں نے پیر الٰہی بخش کالونی میں گھر لے لیااور تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھایا۔۱۹۴۹ء میں سندھ یونیورسٹی کراچی سے ایم۔اے انگریزی کیا اور ۱۹۵۰ء میں یہیں سے ایم۔اے اردوبھی کیا اور اسی سال ایل ایل بی بھی کیا۔ سندھ یونیورسٹی جامشورو سے۱۹۷۱ء میں ڈاکٹرغلام مصطفی خان کی نگرانی میں پی ایچ ۔ڈی کی۔ آپ کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا عنوان’’قدیم اردو ادب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ‘‘ تھا۔۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے ہی

مثنوی’’کدم راؤ پدم راؤ‘‘کی تدوین پر ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۸۸ء میں اعزازی ڈگری ,ڈی ایس سی (Medicina Alternatua International) ملی۔(۶)

گھریلو تعلیم و تربیت کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تعلیم و تربیت میں جن اساتذہ کرام نے اہم کردار ادا کیا ان میں ولی محمد خان شعلہ،مولوی محمد اسمٰعیل اورمولوی فیض الحسن کے ساتھ ساتھ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر مکرجی،پروفیسر کرار حسین،پروفیسر غیور احمد رزمی صدیقی،پروفیسر مظہری ،پروفیسر محمد حسن عسکری ،پروفیسر بسواس ،ڈاکٹرشوکت سبزواری ،پروفیسر ماتھر ،پروفیسر حبیب اللہ غضنفرخاص طور پر شامل ہیں۔ان اساتذہ نے آپ کے علمی و ادبی ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر جالبی ملازمت کے سلسلے میں درج ذیل اداروں سے وابستہ رہے:۔

۱۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک بہادریارجنگ ہائی سکول کے ہیڈماسٹر رہے ۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کرکے انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے اور انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے ۔

۳۔ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء سے ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء تک جامعہ کراچی میں وائس چانسلر رہے

۴۔ ۱۷ نومبر ۱۹۸۷ء سے نومبر ۱۹۹۴ء تک مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد کے صدر نشین رہے ۔(۷)

۵۔ ۱۹۹۱ء سے۱۹۹۸ء تک اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے اعزازی صدر رہے ۔ (۸)

ڈاکٹر جالبی کی شادی ،یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کی خالہ زاد نسیم شاہین سے شادی ہوئی ۔ آپ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

۱۔ ڈاکٹرخاور جمیل ۲۔ محمد علی خان

۳۔ سمیرا جمیل ۴۔فرح جمیل

ڈاکٹرجالبی کو ان کی درج کردہ کتب اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر درج ذیل اعزازات سے نوازاگیا:۔

پاکستانی کلچر:داؤد ادبی انعام : ۱۹۶۴ء

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ:داؤد ادبی انعام : ۱۹۷۳ء

قدیم اردو لغت :داؤد ادبی انعام : ۱۹۷۴ء

تاریخ ادبِ اردو:داؤد ادبی انعام: ۱۹۷۵ء

یونیورسٹی گولڈ میڈل: ۱۹۸۷ء

محمد طفیل ادبی ایوارڈ: ۱۹۸۹ء

ستارہ ء امتیاز ، حکومت پاکستان: ۱۹۹۰ء

ہلال امتیاز ، حکومت پاکستان   ۱۹۹۴ء

ڈاکٹر جالبی کی سب سے پہلی تخلیقی کاوش ایک ڈرامہ تھا جو انہوں نے اپنے اسکول کے دور میں تحریر کیا۔اس ڈرامے کا نام سکندراور ڈاکو تھا جو۱۹۴۱ء میں سکول کے سٹیج پر کھیلا گیا۔اپنے ایک انٹرویو اپنی اوّلین تخلیقی کاوشوں کے بارے میں بتاتے ہیں:

> ’’میں نے سب سے پہلے نویں جماعت میں ایک چھوٹا سا ڈراما لکھا تھا اس کے بعد میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھتا رہا۔ جب کالج میں پہنچا تو افسانے لکھنے شروع کئے ، کبھی کرشن چندر کے رنگ میں کبھی منٹو کے انداز میں اور کبھی عصمت چغتائی اور حسن عسکری کے رنگ میں ‘‘۔ (۹)

ڈاکٹر جالبی کا سب سے پہلا تنقیدی مضمون ’’نئے شاعر فیض احمد فیض‘‘نیا دور کراچی سے اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ان کے مطابق:

> ’’۱۹۴۷ میں جب سہارن پور میں ہندومسلم فساد ہورہا تھا ۔ کرفیو لگاہوا تھا اور ہم سب گھروں میں قید تھے ۔ تو اس وقت میرے پاس چند کتابیں تھیں ۔ ان میں فیض احمد فیض کی’ نقشِ فریادی ‘بھی تھی ۔ ’نقش فریادی ‘اس زمانے میں میرا پسندیدہ مجموعہ تھا ۔ میں اسے پڑھتارہتااور لطف اندوز ہوتارہتا ۔ اسے پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنا چاہئے ۔ یہ میرا پہلا تنقیدی مضمون تھا جومیں نے لکھا جب میں کراچی آیا تو یہ مسوّدہ میرے ساتھ تھا ۔ محمد شاہین اور ممتاز شیریں کا’ نیا دور‘ نکل رہاتھا ۔ میں نے مضمون شاہین صاحب کو دے دیا جسے انہوں نے نیا دور میں شائع کیا‘‘۔ (۱۰)

ڈاکٹر جالبی نے’ جانورستان ‘ کے عنوان سے سب سے پہلا ترجمہ جارج آرول کے ناول ’دی اینمل فارم‘ کا کیا جو۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ڈاکٹر جالبی نے سب سے پہلی جس کتاب کو مرتب کیا وہ منشی سجاد حسین کی ’حاجی بغلول‘تھی جو کہ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ڈاکٹر جالبی کی سب سے پہلی طبع زاد تصنیف ’’پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ ‘‘ تھی جو کہ ۱۹۶۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ڈاکٹر جالبی نے ادبی رسائل کے مدیر کی ذ مہ داریاں بھی نبھائیں۔نائب مدیر کے طور پر ۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ ’پیامِ مشرق‘ ، کراچی (چھ مہینے کے لئے) سے منسلک رہے۔۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ’ساقی ‘، کراچی کی مجلسِ ادارت میں شامل رہے اور اس میں’ باتیں ‘،کے عنوان سے ادبی کالم نگاری بھی کی ۔ ۱۹۵۵ء میں اپنا رسالہ نیا دور نکالا ۔اس جریدے کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے مختصر قت میں اپنی پہچان بنالی۔بالخصوص ن۔م راشد پر پہلی خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جسے بعد میں جالبی صاحب نے کتابی صورت میں’ ن۔م راشد ایک مطالعہ ‘کے عنوان سے شائع بھی کیا۔

نذرالحسن صدیقی کے مطابق:

''۱۹۵۵ء میں لاہور میں ایک بک اسٹال سے ایک نیا ادبی جریدہ خریدا تھا ۔ جس کے دیدہ زیب ٹائیٹل ، اعلیٰ پائے کے ادبی و شعری معیار اور اچھوتے انداز نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا ۔ یہ ''نیادور'' کا پہلا شمارہ تھا۔ صفحہء ادارت پرتوشمیم احمد اور شاید قمرسلطانہ کا نام چھپا تھا ، مگر جب ۱۹۵۷ء میں مستقل طور پر کراچی آگیا ، تو میاں بھائی کے ذریعے ہی معلوم ہواتھا کہ نیا دور جمیل جالبی کا پرچہ ہے اور اپنے پرچے میں چھپنے والی سطر سطر پہلے ان کی نظر سے گزرتی ہے ۔ ------آنے والے بعد کے سالوں میں خود مجھے بھی ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہوگیااور صدیقی صاحب کی بات کی تصدیق ہوگئی ''۔ (۱۱)

بقول ڈاکٹر مشرف احمد :' 'نیا دور' اردو کا غالباً واحد ادبی رسالہ ہے ۔ جس کے اصل مدیرکانام کبھی اس پرلکھا نظرنہیں آیا، لیکن اس کے باوجود تمام اہل قلم جانتے تھے کہ اس پردۂ نگاری کے پیچھے کون ہے ؟ (۱۲)

ڈاکٹرجالبی ،فن اور شخصیت کے حوالے سے کئی کتب لکھی گئیں لیکن اس سلسلے میں کسی مربوط کاوش کا سراغ نہیں ملتا۔(۱۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتب کی فہرست درج ذیل ہے۔

تنقید:

۱۔ پاکستانی کلچر۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ ۱۹۶۴ء ،پہلا ایڈیشن۔دوسرا ایڈیشن،۱۹۶۶ء۔تیسرا ایڈیشن ،ایلیٹ پبلشرز،۱۹۷۳ء۔نیشنل بک فاؤنڈیشن سے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے،۱۹۸۱ء،۱۹۸۴ء،۱۹۸۵ء،۱۹۸۷ء،۱۹۹۲ء۔جبکہ ڈاکٹر ایاز قادری نے ۱۹۸۷ء میں سندھی زبان میں ترجمہ ،شاہ لطیف بٹھائی چیئر کی جانب سے شائع کروایا۔

۲۔ تنقید اور تجربہ ، پہلا ایڈیشن،مشتاق بک ڈپو،کراچی ۱۹۶۷ء ۔دوسرا ایڈیشن ،یونیورسل بکس لاہور ،۱۹۸۸ء ۔ ہندوستانی ایڈیشن،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۸۹ء

۳۔ محمد تقی میر، انجمن ترقی ء اردو،کراچی،۱۹۸۱ء(اس کتاب میں شامل تمام تر مواد تاریخ ادب اردو (جلد دوم) میں شامل تھا۔دوسرا ایڈیشن،انجمن ترقیء اردو سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا جبکہ دہلی ایجوکیشنل ہاؤس ،ہندوستان سے ۱۹۸۳ ء اور ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا جبکہ کراچی سے ۱۹۹۲ء سے شائع ہوئی۔

۴۔ نئی تنقید (مرتبہ :خاور جمیل) رائل بک کمپنی،کراچی،۱۹۸۵ء

۵۔ ادب ، کلچر اور مسائل (مرتبہ : خاورجمیل) رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء

۶۔ قومی زبان ۔ یک جہتی نفاذ اور مسائل،مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد، ۱۹۸۹ء

۷۔ معاصر ادب ،سنگ میل لاہور،۱۹۹۱ء

۸۔ ادبی تحقیق،مجلس ترقی ء ادب لاہور،جون ۱۹۹۴ء۔

تحقیق و تدوین:

۱۔ حاجی بغلول:(منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول)مشتاق بک ڈپو،کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۔ دیوان حسن شوقی انجمن ترقی اردو،کراچی، ۱۹۷۱ء

۳۔ دیوان نصرتی(مقدمہ و فرہنگ)قوسین لاہور، ۱۹۷۲ء (کتابی صورت میں چھپنے سے قبل یہ دیوان 'صحیفہ' لاہور کے شمارے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اشاعت پذیرہوا۔)

۴۔ مثنوی نظامی دکنی المعروف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ،انجمن ترقی اردو ،کراچی، ۱۹۷۳ء

۵۔ بزمِ خوش نفساں (شاہد احمد دہلوی کے ۲۶ خاکوں کا مجموعہ) مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء

۶۔ ن۔ م۔ راشد۔ایک مطالعہ ،مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۶ء

۷۔ کلیاتِ میراجی ،اردو مرکز لندن، ۱۹۸۸ء ۔سنگ میل پبلشرز،لاہور، ۱۹۹۶ء

۸۔ میراجی ۔ ایک مطالعہ ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء ۔ہندوستانی ایڈیشن،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۱۹۹۲ء

لغات:

۱۔ قدیم اردو کی لغت ،مرکزی اردو بورڈ،لاہور، ۱۹۷۳ء ۔اردو سائنس بورڈ ،لاہور ۱۹۸۸ء۔

۲۔ فرہنگِ اصطلاحات ، جامعہ عثمانیہ (جلد اوّل) مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

۳۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلددوم) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۴۔ قومی انگریزی اردو لغت ،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۲ء۔ ہندوستانی
ایڈیشن، (دو جلدیں)دہلی پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۱۹۹۳ء

تاریخ ادب:

۱۔ تاریخ ادب اردو :قدیم دور ،آغاز سے ۱۷۰۵ء تک(جلد اوّل) پہلا ایڈیشن،مجلس ترقیء ادب لاہور ۱۹۸۴ء، مجلس ترقی ء ادب،لاہور ۱۹۷۵ء ۔دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۶ء۔تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۷ء۔ہندوستانی ایڈیشن،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۷ء۔دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۶ء۔تیسرا ایڈیشن،، ۱۹۸۹ء۔پانچواں ایڈیشن، ۱۹۹۳ء

۲۔ تاریخ ادب اردو (جلددوم ۔حصہ اول)مجلس ترقیء ادب،لاہور ۱۹۸۴ء۔یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی لیکن طباعت کی غلطی سے ۱۹۸۶ء چھپ گیا تھا۔ہندوستانی ایڈیشن،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۳ء۔

۳۔ تاریخ ادب اردو (جلددوم ۔حصہ دوم) ۱۹۸۴ء ،دونوں جلدوں کی یکجااشاعت ۱۹۸۷ء،مجلس ترقی ء ادب
لاہور۔ہندوستانی ایڈیشن،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی،۱۹۸۵ء،۱۹۹۳ء

۴۔ تاریخ ادب اردو (جلدسوم)۲۰۰۶ء

۵۔ تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) ۲۰۱۲ء

تراجم:

۱۔ جانورستان (جارج آرول کے Animal Farm ناول کا اردو ترجمہ) ۱۹۵۸ء

۲۔ ایلیٹ کے مضامین،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی، ۱۹۶۰ء ہندوستانی ایڈیشن،محبوب خان پبلشرز لکھنؤ (س۔ن)،
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی،۱۹۷۸ء۔نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن،رائٹرز بک کلب،۱۹۷۱ء۔دوسرا ایڈیشن،سنگ میل ،لاہور،۱۹۹۱ء

۳۔ ارسطوسے ایلیٹ تک۔پہلا ایڈیشن،نیشنل بک فاؤنڈیشن،کراچی، ۱۹۷۵ء۔دوسرا ایڈیشن۔نیشنل بک فاؤنڈیشن،
اسلام آباد،۱۹۷۶ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۷ء، ۲۰۰۳ء(نظر ثانی اور اضافہ شدہ)۔ہندوستانی ایڈیشن،
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی،۱۹۷۷ء۔۲۰۱۴ء

۴۔ برصغیر میں اسلامی جدید یت (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ Islamic Modernism in India and Pakistan 1857-1964) ادارہء ثقافت اسلامیہ۔لاہور، ۱۹۸۹ء ،ہندوستانی ایڈیشن(ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت)،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۹۰ء۔۲۰۰۶ء،نیا ایڈیشن،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور

۵۔ برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ Islamic Culture in Indian environment) ادارہء ثقافت اسلامیہ،۱۹۹۰ء ۔ہندوستانی ایڈیشن،(ہندو پاک میں اسلامی کلچر)ایجوکیشنل پبلشنگ
ہاؤس،دہلی،۱۹۹۱ء،نیا ایڈیشن،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۲۰۰۵ء

دیگر کتب:

۱۔ حاجی بغلول (منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول)مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۱ء

۲۔ حیرت ناک کہانیاں نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی،۱۹۸۳ء ۔دوسرا ایڈیشن،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۱۹۸۸ء۔ایاز قادری نے نے اس کتاب کا سندھی ترجمہ ’حیرت ناک کھاٹیوں‘ کے نام سے کیا جو کہ مکتبہ اسحاقیہ سے ۱۹۸۵ء سے شائع کروایا۔

۳۔ پاکستان میں ذریعہء تعلیم کامسئلہ (پمفلٹ) ۱۹۹۳ء

۴۔ نہ ہوئی قرولی ،فیروز سنز،لاہور، ۱۹۹۳ء (سرشار کے مزاحیہ کردار خوجی کی سرگزشت پرمبنی کہانی ، جوکامل القادری کے اشتراک سے ماہ نامہ ہونہار ، کراچی میں قسط وار شائع ہوتی رہی)۔

۵۔)Pakistani Culture بہ اشتراک ایم ایچ صدیقی) ۱۹۸۶ء ۔(۱۴)

باقاعدہ ملازمت کے علاوہ ڈاکٹرجمیل جالبی علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے مختلف یونیورسٹیزاور اداروں میں سلیکشن بورڈ اورسینڈیکیٹ کے کے ممبر رہے ۔

ڈاکٹرجمیل جالبی نے عمرِ عزیز کاایک بڑا حصہ اردو زبان وا دب کی خدمت کرتے ہوئے گزاراہے ۔ اپنی بیش بہاعلمی اور ادبی خدمات کے عوض وہ اردو زبان وادب کے بہترین تنقید نگار، محقق ، مترجم ، لغت نگاراور مدوّن کے طور پر اپنی انفرادی پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں ۔ ڈاکٹرجمیل جالبی کی ظاہری اور باطنی شخصیت کے نقوش پر ان کے اقرباء ، احباب اور معاصرین اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

جمیل جالبی کے حلیے کے حوالے سے ان کے قریبی دوست شاہد احمد دہلوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ’’ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے ریشمیں سے نوجوان سامنے آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ انہوں نے سلام کیا۔ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ سرپرسفید کشتی نماٹوپی ؛ گول چہرہ ؛ یاسمینی رنگ ؛کشادہ پیشانی ؛غلافی آنکھیں ؛کتاراسی ناک ؛پتلے پتلے گلابی ہونٹ ؛ ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخدان ؛ ڈاڑھی مونچھ صاف؛ سفید سلک کی شیروانی ؛اکہراپاجامہ اور پاؤں میں سفید سانبھرکی جوتی ‘‘۔(۱۵)

راقمہ کو اس مقالے کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ۔ اوپر بیان کردہ حلیہ اگرچہ ان کی جوانی کے نقوش کی تصویر کشی کرتاہے لیکن ڈاکٹرجالبی بیماری اور ضعیف العمری کے باوجود پرکشش شخصیت کے حامل ہیں ۔ گول مٹول ہنستامسکراتاچہرہ ، چہرے پر پھیلی نرمی اور ملائمت جو آنے والے ملاقاتی کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتی ۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے انتہائی اہم مقام رکھنے کے باوجود اپنی شخصیت کی دلفریبی اور کشش کے باعث پہلی دفعہ ملاقات کرنے والے بھی بہت جلد بے تکلفی سے ان سے ہرموضوع پر گفتگو کرسکتے ہیں ۔ ڈاکٹر جالبی اپنی علمیت اور قابلیت کے رعب سے متاثر کرنے کی بجائے مخاطب کی گفتگو انتہائی دلچسپی اور انہماک سے سنتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کے شخصی اوصاف کے حوالے انور عالم صدیقی اپنے مضمون ’’میرا ہم جماعت‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’جمیل دل کا صاف ، زبان کا کھرااور صاف گو انسان ہے ۔ کسی کو دھوکا نہیں دے گا ، کسی سے دشمنی نہیں نکالے گا ، کسی سے بدلہ یا انتقام نہیں لے گا، معاف کرنا اس کا مسلک ہے ، کوئی اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ بھول جاتاہے ۔ وہ کھلے دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں کرتا،

تعصب اس کے مزاج میں بالکل بھی نہیں ہے ۔ ضرورت مند کوئی ہو، کہیں کاہو ، وہ اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتاہے ۔ بیسیوں طالبعلم ایسے ہیں جنہیں جمیل نے اپنے خرچ سے تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے ۔ (۱۶)

ڈاکٹرجمیل جالبی کے شخصی اوصاف کے حوالے سے ان کے قریبی دوست نذارلحسن صدیقی اپنے مضمون ''روشنی سراپا'' میں لکھتے ہیں:

''جمیل بھائی مجسم خلوص اور پیکرِ محبت ہیں اور زندگی اور اس کے روّیوں کے بارے میں وہ ہمیشہ اسی طور زندگی کو برتتے ہیں ۔ شاید اسی مثبت اندازفکر اور روّیہ کی وجہ ہے کہ میں نے کبھی ان کو غصہ میں نہیں دیکھا ، کبھی کسی کی پیٹھ پیچھے برائی غیبت کرتے نہیں دیکھا''۔ (۱۷)

ڈاکٹرجالبی کے چھوٹے بھائی ، محمد سہیل خان اپنے مضمون 'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ۔۔ّّّّّّّّّمیرابھائی میرا آئیڈیل '' میں لکھتے ہیں:

''جمیل جالبی بہت ہی بے لوث ' سچے اور ایثار کرنے والے تو ہیں ہی ، جب کسی کا کام کرتے ہیں تو بہت دل لگاکر اوراخلاص کے ساتھ دوسروں کے کام میں گہری دلچسپی لیتے ہیں ۔ دوسروں کے کام کو اپنا کام سمجھتے ہیں اور ہمیشہ چیزوں کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ بہت ہی مخلص انسان ہیں اور دوسروں کا اپنے سے زیادہ خیال رکھتے ہیں ۔ دنیاکے کسی کونے میں چلے جائیے، جہاں اردوبولنے والے ہوں گے، وہاں کوئی نہ کوئی ایساآدمی ضرور مل جائے گا جس کی جالبی صاحب نے مدد یاہمت افزائی کی ہوگی''۔(۱۸)

ڈاکٹرجالبی کی عادات اور پسند نا پسند کے حوالے سے انکی بیگم نسیم شاہین اپنے مضمون ''ڈاکٹرجمیل جالبی اپنے گھر میں'' لکھتی ہیں:

''لکھتے ہوئے باربار چائے پیتے ہیں اور یہی حال پان کھانے کاہے ، سگریٹ وغیرہ کے بالکل شوقین نہیں ہیں ۔ کھانے میں تیتر کاگوشت بہت پسند کرتے ہیں اور سویٹ ڈش بہت شوق سے کھاتے ہیں کرتااور شیروانی اور چپل پہننا انہیں اچھالگتاہے۔ ان کی پسند رنگوں کے معاملے میں بدلتی رہتی ہے ، پھولوں اور خوشبو سے بھی بہت پیار ہے اور پھولوں میں گلاب کا پھول بہت پسند ہے ''۔(۱۹)

ڈاکٹرفرمان فتح پوری، جمیل جالبی کے بارے میں اپنی رائے کااظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹرجمیل جالبی ہمارے عہد کی قدرآور شخصیتوں میں سے ہیں ، ان کے مزاج میں سنجیدگی اور شگفتگی کے عناصربرابرہیں۔غالبا سنجیدگی

،علمی کاموں کے حوالے سے اور شگفتگی ادبی کاموں کے حوالے سے ان میں پختہ جگہ پائی گئی ہے‘‘۔(۲۰)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے اپنے بعض انٹرویوز میں اپنی عادات اور دلچسپیوں کے حوالے سے اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹرمشرف احمد کو انٹرویو دیتے ہوئے بچپن میں اپنی عادات اور دلچسپیوں کے حوالے سے سے فرماتے ہیں ۔

’’مجھے یادآیا جب میں پہلی یا دوسری جماعت میں تھا تو اسکول سے آکر کھاناکھانے کے بعد والدہ ہم سب بھائی بہنوں کو اندرکمرے میں لٹادیتیں تاکہ ہم سوجائیں ۔ جب سب سوجاتے اور والدہ کی بھی آنکھ لگ جاتی تو میں چپکے سے اٹھتااور غسل خانے کے چبوترے پربستہ کھول کربیٹھ جاتا۔ اپنی کاپنی سے ورق پھاڑتا، اس سے کتاب بناتااور اسی پر اپنے نصاب کی کتاب سے عبارت نقل کرکے کتاب تیار کررہتااور پہلے صفحے پر اپنا نام لکھ دیتا‘‘۔(۲۱)

نصراللہ خان اپنے مضمون ’’وضع دارآدمی ‘‘ میں ڈاکٹرجمیل جالبی کی تحریروں کی روشنی میں ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں ۔

’’جالبی صاحب کی تحریر میں ان کی شخصیت کے تمام خدوخال نمایاں اور ساراآب و رنگ صاف نظر آتاہے اور جو توازن ہم ان کی شخصیت میں دیکھتے ہیں ، وہی توازن ہم ان کی تحریروں میں بھی دیکھتے ہیں۔بیشتر لکھنے والے ایسے ہیں کہ جن کی تحریروں میں سے ہمیں ان کے مفاہیم نکالنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں تو ہمیں اپنے معنی ڈال کر نکالنے پڑتے ہیں ۔ لیکن جمیل جالبی کو جتنی بات کہنی ہوتی ہے اتنی ہی کہتے ہیں اور وہ اپنی باتوں میں کلی پھندنے نہیں لگاتے ‘‘۔(۲۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی بحیثیت انسان،منتظم،نقاد و محقق اعلیٰ اوصاف کے مالک ہیں ان کے فن و شخصیت کے بارے میں لکھ کر بہت سے لوگوں نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔میرا موضوع ڈاکٹر جمیل جالبی کی علمی و ادبی خدمات کا ان کی تصانیف کی روشنی میں جائزہ لینا ہے۔آئندہ ابواب میں بطور مورخ، محقق،مدوّن اور مترجم ان کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عبدالعزیز ساحر،ڈاکٹر،'جمیل جالبی :شخصیت اور فن ' ،اسلام آباد،اکادمی ادبیات پاکستان ،۲۰۰۷ء ،ص ۱۱

۲۔ 'کچھ جمیل جالبی کے بارے میں 'از ڈاکٹر خلیق انجم ،مشمولہ' ڈاکٹرجمیل جالبی :ایک مطالعہ '،مرتبہ :گوہر نوشاہی ،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، بار اول، ۱۹۹۳ء ،ص۱۹

۳ ۔ (انٹرویو)ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو : ڈاکٹر مشرف احمد مشمولہ سہ ماہی ارمغان (جمیل جالبی نمبر) کراچی : اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء ص۱۵۴

۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے مکالمہ : روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء

۵۔ 'کچھ جمیل جالبی کے بارے میں 'از مشرف احمد ،مشمولہ'ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ' ،ایضاً، ص ۱۸

۶۔ 'ڈاکٹر جمیل جالبی سوانحی کتابیات '،مرتبہ ڈاکٹر نسیم احمدبہ اشتراک سعید احمد،لاہور،الفیصل تاجران و ناشرانِ کتب،۱۹۹۶ء ، ص۳۱

۷۔ سہ ماہی سفیر اردو (جمیل جالبی نمبر) لیوٹن : اکتوبر نومبر دسمبر(یوکے) ۲۰۰۴ء ص ۶

۸۔ عبدالعزیز ساحر،ڈاکٹر 'ڈاکٹر جمیل جالبی : شخصیت اور فن'، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان ،۲۰۰۷، ص۱۳

۹۔ سہ ماہی ارمغان ، ایضاً، ص۔۱۶۸

۱۰۔ ایضاً ، ص۔ ۱۶۸

۱۱۔ نذرالحسن صدیقی ، 'روشنی سراپا'، مشمولہ ، ' ارمغان'،ایضاً،ص ۳۰۔۳۱

۱۲۔ مشرف احمد ،ڈاکٹر، 'جالبی صاحب'، مشمولہ،'ارمغان' ، ایضاً،ص۵۵

۱۳۔ ان کتب کی تفصیل یہ ہے۔ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹرگوہر نوشاہی : ۱۹۹۳ء ۲۔ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ سوانحی کتابیات مرتبہ ڈاکٹر نسیم فاطمہ بہ اشتراک سعید احمد : ۱۹۹۶ء ۳۔سہ ماہی ارمغان ، کراچی (جمیل جالبی نمبر) :اپریل ، مئی ، جون ۱۹۹۶ء ۴۔ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ ایک مطالعہ ، مرتبہ نسیم فاطمہ ، ۱۹۹۸ء ۵۔سہ ماہی سفیر اردو، لیوٹن (جمیل جالبی نمبر) : اکتوبر، نومبر، دسمبر۲۰۰۴ء ۶۔ڈاکٹرجمیل جالبی :شخصیت اور فن ، عبدالعزیز ساحر۲۰۰۷ء

۱۴۔ ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی مرتب کردہ کتاب'' ڈاکٹر جمیل جالبی سوانحی کتابیات'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتب کی تعداد ۳۸ ہے۔اس فہرست میں ان کتب کو بھی شامل کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا محض ایک مضمون شامل تھا۔جیسا کہ کتاب Pakistani Culture میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک مضمون شامل ہے۔اسی طرح'قلندر بخش جرأت؛لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر' کو بطور کتاب شامل کیا گیا ہے

جبکہ یہ مضمون بطور خطبہ پڑھا گیا اور ان کی تاریخ ادب کی جلد دوم کا حصہ ہے۔ The changing world of Islamکے مرتبین میں ڈاکٹر جمیل جالبی شامل نہیں ۔’بوطیقا‘ بھی ان کی کتاب ارسطو سے ایلیٹ تک‘ میں شامل ہے۔

۱۵۔ شاہد احمد دہلوی،’جمیل جالبی‘، مشمولہ، ’ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ ایک مطالعہ‘،ایضاً، ص۷۷۔۷۸

۱۶۔ انور عالم صدیقی، ’میرا ہم جماعت ‘، مشمولہ، ’ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۴۷،۴۶

۱۷۔ نذرالحسن صدیقی، ’روشنی سراپا‘ ، مشمولہ ، ’ارمغان‘ایضاً ،ص۴۱

۱۸۔ محمد سہیل خان، ’ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ میرا بھائی میرا آئیڈیل‘، مشمولہ، ’ارمغان‘ ، ایضاً، ص ۷۱

۱۹۔ بیگم نسیم شاہین، ’ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں‘ ، مشمولہ ، ’ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۱۴۹

۲۰۔ انٹرویو ، محترمہ رضوانہ نسیم صاحبہ ، بمقام ، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۳ اکتوبر۲۰۰۷ء

۲۱۔ انٹرویو مشرف احمد ، مشمولہ ، ’ارمغان ‘ ، ایضاً، ص ۱۵۶

۲۲۔ نصراللہ خان ، ’وضع دار آدمی‘، مشمولہ ، ’ڈاکٹرجمیل جالبی ۔ ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۱۳۳

باب دوّم

ڈاکٹر جمیل جالبی بطور موؤخِ ادب :ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

تاریخ اور ادبی تاریخ میں فرق:

تاریخ ماضی کی بازیافت کا عمل ہےتاریخ کا علم محض واقعات کے بیان تک محدود نہیں بلکہ ایک عہد میں ہونے والے واقعات اور حادثات کے درمیان ربط و تعلق کی کھوج لگانا اور کسی خاص عہد میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے اسباب ونتائج تک پہنچنا تاریخ کے علم کا خاص وصف ہے۔ تاریخ اور ادب کا آپس میں گہر ارشتہ ہے۔ تاریخی رزمیے، تاریخی قصے کہانیاں، افسانے، ناول تاریخ کے اہم مآخذ ہیں۔ انسان اس کائنات میں جو کچھ سیکھتارہا اسے گیتوں اور قصوں کی صورت میں اپنی اگلی نسل تک منتقل کرتارہا۔ یہی قصے کہانیاں آگے چل کر شاعرانہ تخیّل کے ساتھ مل کر رزمیہ نظموں کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس طرح انسان عملی طور پر ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کے عناصر شامل کرتارہا۔ اجتماعی انسانی زندگی کے ترقی کے ساتھ ساتھ واقعات کو تحریر کرنے کا عمل بھی ترقی کرتارہا۔ ابتدائی تاریخ نویسی کے اوّلین نمونے پتھروں پرتحریر کی صورت میں دریافت ہوئے۔ ان ابتدائی تاریخی نقوش کے ذریعے بہت سی تاریخی معلومات محفوظ ہوگئیں۔ مثلاً کسی شہر کو فتح کرنے یا کسی حکمران کے سالِ جلوس اور مرنے کی تاریخ وغیرہ ان کتبوں پر محفوظ کردی گئیں۔ ابتدائی تاریخ نویسی بادشاہوں کے حالات زندگی اورجنگ کے حالات پر مشتمل تھی۔ انسان نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے ان جنگوں کے حالات میں تخیّل کا رنگ بھرنا شروع کیااور مبالغہ آمیزی اور عبارت آرائی کے شوق نے تاریخ نویسی کے طرز کو بدل دیا۔ تاریخ نویسی میں مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت نے اسے ڈرامائی طرز عطاکیا۔

عربی زبان کی مشہور مثل ہے ’’الشعردیوان العرب‘‘ یعنی شاعری عربوں کی تاریخ ہے۔ قدیم عربی شاعری نے اپنے عہد کے مخصوص رحجانات، جنگی واقعات، سورماؤں کی بہادری کے حصوں، قبائل کی باہمی چپقلش، طرزو بودوباش اور انسانی جذبات کو اس طرح محفوظ کیاکہ اسے ایک تاریخی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ یہی بات دیگر زبانوں کے شعروادب پر صادق آتی ہے اس طرح تاریخ اور ادب کے ابتدائی نقوش اجاگر ہونا شروع ہوئے۔ جس طرح ادیب اور شاعر کا کام محض سچائی کو پالینا نہیں بلکہ اسے تخلیقی اندازمیں قاری تک پہنچانا ہے۔ اسی طرح مؤرخ ادب کا کام محض تاریخی حقائق کا بیان نہیں۔

تاریخ ادب کسی عہد کے ادب کے ارتقائی سفر کی دستاویز ہے۔ ادب انسان کی خوشیوں، دکھوں، خواہشات، فکری رویوں اور تخلیقی اپچ کا عکاس ہے جبکہ ادبی تاریخ ان تمام عوامل کو دیگر لوازمات مثلاً سیاسی، معاشرتی، معاشی حالات، جغرافیائی صورتحال اور مذہبی عناصر کے اثرات دیکھنے کا عمل ہے۔ تاریخِ ادب تخلیق اور تخلیق کار کے عہد کے تناظر سے بحث کرتی ہے۔ تاریخ ادب کیا ہے ؟ اس حوالے سے مؤرخین ادب کے نظریات درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''ادب کی تاریخ وہ آ ئینہ ہے جس میں اس زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے۔ اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رحجانات کا آئینہ ہوتی ہے''۔ (۱)

اپنے ایک انٹرویو میں ادبی تاریخ نگاری کے لوازم کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ادبی تاریخ میں ایک اور بات کا ہونا ضروری ہے کہ وہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے ہر سطح پر صحیح اور مستند ہو۔سنین سے لے کر حالات و واقعات تک پوری طرح تحقیق کی کسوٹی پر کسے ہوئے ہوں۔سارا مواد اصل مآخذ سے حاصل کیا گیا ہو۔''(۲)

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق :

'' کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی،روحانی، تہذیبی، تمدنی،سماجی،سیاسی،اقتصادی عوامل اور محرکات کے عمل اور ردّعمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تنا ظر میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی، لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ، تاریخ نگاری اور ان ہی کا مطالعہ تجزیہ و تحلیل اور تشریح ادب مؤرخ کا بنیادی فریضہ ہے !''(۳)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مطابق:

''ادبی تاریخ ماضی کی بازیافت ہے اس کا ایک اہم مقصد گئے گزرے زمانوں کو زندہ کرنا ہے۔ ادبی مؤرخ ماضی کے اندھیروں میں سفر

کرتا ہے۔خوابیدہ داستانوں کو بیدار کرتا ہے۔گرد میں دبی ہوئی دستاویز کو جھاڑتا ہے اور ان دستاویز کے اوراق پر ماضی کے نامور کرداروں سے متعارف ہوتا ہے۔ ان سے مکالمہ کرتا ہے----- تاریخ کے سفر میں ماضی کے تاریک اور نیم تاریک اندھیروں میں انسان، معاشرے اور تہذیب وثقافت کے مظاہر میں ادب کی مختلف صورتوں کا جائزہ لینا بے حد مشکل کام ہے،''(۴)

رضی عابدی رقم طراز ہیں:

''ادب کی تاریخ دراصل اسی ذہنی مزاج کی تاریخ ہوتی ہے جس کا اظہار کسی زبان کے ادب میں ہو تاہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اسی گروہ یا قوم کا فکری ارتقاء جس کا ادب زیرِ مطالعہ ہے اور دوسرے تکنیکی میدان میں اس کی جدت طراز یاں اور کامیابیاں ''۔(۵)

چند انگریز ناقدین کی آراء درج ذیل ہیں

رینے ویلک کے مطابق۔

"History can be written only in reference to variable schemes of values, and these schemes have to be abstracted from history . The establishment of the exact position of each work in a tradition is the first task of literary history..... the history of the term and the critical programmes as well as the actual stylistic changes; the relationship of the period to all the other activation of man; the relationship to the same period in other countries"(6)

بقول ہڈسن:

" It is a chronological account of the men who wrote in these languages and the books they produced, with critical analysis of their merits and defects and some

description of literary schools and traditions and of fluctuation in fashions and taste." (7)

ادبی تاریخ نویسی کے اصول و ضوابط:

ادبی تاریخ کا باقاعدہ تصور مغربی ادب کے ذریعے دنیا کے سامنے آیا اردو ادب نے بھی یہ تصور مغرب ہی سے لیا ہے۔ ادبی تاریخ قارئین کے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے جو فن پارے کی قرأت کے دوران سر اٹھاتے ہیں ادب کی تاریخ چونکہ کسی بھی سماج کے تہذیبی،ثقافتی اور فکری روّیو ں کی آئینہ دار ہوتی ہے لہٰذا فن پارے کی تفہیم میں مدد گار ثابت ہوتی ہے تاریخِ ادب بیک وقت معاشرے اور ادب سے تعلق رکھتی ہے ادیب کی طرح مؤرخ بھی عصری تقاضوں اور فکری روّیوں سے لا تعلق نہیں رہ سکتا۔مؤرخ اِدب کو تاریخ رقم کرتے ہوئے تحقیق،تجزیہ اور تنقید سے کام لینا پڑتاہے۔ تاریخِ ادب کی تالیف مؤرخ سے کچھ ضابطوں اور قوانین کی متقاضی ہوتی ہے ذیل میں تاریخ ادب کے حوالے سے اصول اور ضابطے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ ادب کے حوالے سے سب اہم چیز تنظیم و تسلسل کا ہونا۔ واقعات کے بیان میں تسلسل اور ربط ہی ادبی تاریخ کو با معانی بناتا ہے۔ تواریخ ادب کی سب سے بڑی خامی ہی یہی ہے کہ مؤرخ ادب تاریخ کو مختلف حصوں میں پیش کرتا ہے۔حالات و واقعات کے درمیان ربط و تسلسل قائم رکھنے کی کڑیاں غائب ملتی ہیں مثلاً اردو ادب کی تواریخ میں عموماً اردوزبان و ادب کے ارتقاء میں تسلسل کا عنصر مفقود نظر آتاہے۔ حضرت بابا فرید شکر گنج اور امیر خسروکے درمیان زبان وادب کی کیاصورت حال رہی یا امیر خسرو سے قطب شاہی دور کی درمیانی کڑیاں عموماً غائب ہیں۔ ہرمؤرخ اپنے انداز سے تاریخ نویسی کا فریضہ انجام دیتاہے۔ کہیں تحریکوں کو بنیاد بنادیا جاتاہے، کہیں علاقوں کو اور کہیں اصناف کو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کے بیان میں ایک ربط، تسلسل اور تنظیم ہونی چاہیے تاکہ تاریخ ایک ’’کل‘‘ کی صورت میں ظہور پذیر ہو۔

اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ’’تاریخ کاکام صرف یہ نہیں کہ واقعات و حقائق کا محض اندراج کردے بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کہ ایک ایسی تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہوجائے اور ادب کا حقیقی، تاریخی ارتقاء بھی نظروں کے سامنے آجائے ‘‘۔ (۸)

۲۔ تاریخ ادب اس عصر کی نمائندہ ہوتی ہے جس عصر کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ عصری صورتحال ہمیشہ تغیرپذیر رہتی ہے لہٰذا مؤرخ اد ب کوعصری تبدیلیوں کا شعور ہونا چاہئے۔ عصری تبدیلیاں ادب پر براہ راست اثرات مرتب کرتی ہیں۔ زبان، قواعدِ زبان، محاورہ، اصناف، ہئیتیں، اسالیب، موضوعات، ادبی پیرایۂ اظہار اور فکری روّیوں پر بھی عصری صورتحال اثرانداز ہوتی ہے۔ تاریخ ادب کو اس بدلتے ہوئے منظر نامے کی عکاسی بھرپور طریقے سے کرنی چاہیے۔

۳۔ تاریخ نویسی کے ضمن میں بھی اس اصول کوبھی مدنظررکھنا چاہیے کہ ادبی فن پاروں کے سیاسی، ثقافتی، معاشی اور مذہبی تناظرکی عکاسی کی جائےبقو ل ڈاکٹر تبسم کاشمیری :''ادبی تاریخی جس قدر تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور فکری تاریخ کے قریب ہوگی اسی قدر زیادہ وقیع، زیادہ بصیرت افروز اور زیادہ مفاہیم و مطالب کی حامل ہوسکے گی ''۔ (۹)

ادبی تاریخ کاکسی دورکی تہذیب وثقافت سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔تہذیب وثقافت کے علاوہ سیاسی تاریخ، فلسفہ، نفسیات، معاشیات، دیومالا اور سماجی تاریخ سے بھی اسکا گہرا تعلق ہے ادبی تاریخ محض کسی خاص دور میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خصوصیات گنوانے ہی کا نام نہیں بلکہ ادبی تخلیقات کو پرکھنے کے لیے متذّکرہ بالا علوم کے حوالے سے تنا ظر کا جائزہ لینا بھی بہت ضروری ہے مثلاً اٹھارہویں صدی عیسوی کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے کوئی ادبی مؤرخ شمالی ہند کی سیاسی ابتری، خانہ جنگی اور معاشی بد حالی سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اس دور کے ان سیاسی اور معاشرتی حالات کی عکاسی اس دور کی اہم صنف سخن ''شہر آشوب'' میں نظر آتی ہے جبکہ لکھنؤ سیاسی لحاظ سے مستحکم اور معاشی لحاظ سے مضبوط تھا لہٰذا وہاں شہرِ آشوب نہیں لکھے گئے جبکہ انیسویں صدی کے وسط میں لکھنؤ میں ''اندر سبھا '' لکھی گئی اور دلّی سے ''اندر سبھا'' جیسی کوئی تخلیقی کاوش نظر نہیں آتی۔''اندر سبھا'' لکھنؤ کے نشاطیہ کلچر کی پیداوار تھی جبکہ دلّی کی تہذیب ایسے ادب پاروں کی متحمّل نہیں ہو سکتی تھی۔

۴۔ ادبی تاریخ ایک طرف قدیم ادب کی روایات واقدار کی پاسدار ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ جدید ادب اور عہد کی زندہ روایات اور اقدارّ مدنظر رکھ کر نتائج اخذکرتی ہے ادبی تاریخ عہد گزشتہ اور موجودہ عہد کی اقدار و روایا ت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی عہدِ جدید کو سمجھنے کے لیے قدیم ادب کی تفہیم ضروری سمجھتے ہیں اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طرازہیں۔''جدید ادب کی طرح قدیم ادب بھی مخصوص تہذیبی،معاشرتی،سیاسی ولسانی عوامل کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس لئے اس کا مطالعہ بھی تہذیبی و معاشرتی عوامل کی روشنی میں ویسے ہی کیا جانا چاہئے جیسے آج کا جدید ادب کرتا ہے۔''(۱۰)

عہدِ جدید کی روایات واقدار کو اگر ماضی کے آئینے پر رکھا جائے تو ادبی صورتحال مزید اجاگر ہو جاتی ہے یوں بھی حال اور ماضی ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا تا۔ ہر موجودہ لمحہ ماضی کا حصّہ بن کر تاریخ بن جاتا ہے ادبی تاریخ حال کے ماضی سے تعلق پر روشنی ڈالتی ہے اور اس تعلق کی عکاسی نظامِ اقدار میں سے بھی ہوتی ہے اور ادب سے بھی۔ لہٰذا ہر تاریخ ادب کو نتائج اخذ کرتے ہوئے عہدِ جدید کی روایات اور اقدار کو ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ ساتھ عہدِ قدیم کی روایات واقدار کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

۵۔ تاریخ ادب لکھنے کے لیے بنیادی دستاویزات اور ماخذات کے حصول کی اہمیت سے انکا ر ممکن نہیں۔ بنیادی متون کی فراہمی اور ا ن پرمستند تصانیف کا حصول،ادبی تاریخ نویسی کے عمل کو وقیع بناتا ہے۔ اگر بنیادی ماخذات تک رسائی کٹھن ہو تو دیگر تصانیف تک رسائی کی کوشش کی جانی چاہیے۔ قدیم ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے غیر مطبوعہ تصانیف کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ قدیم ادب کے مخطوطے جن تک عام قارئین کی رسائی ممکن نہیں اگر فراہم ہو بھی جائیں تو ان کی تفہیم ایک مشکل امر ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں : ’’جن مصنفو ں کی تصانیف غیر مطبوعہ ہوں ان کے اقتباسات اپنے نقطہ نظر یا تنقیدی رائے کی وضاحت کے لیے زیادہ دیں کیونکہ وہ مخطوطے قاری کی دسترس سے باہر ہیں۔‘(۱۱)

تاریخ ادب میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اہم معلومات حوالے اور سند کے بغیر درج نہ کئے جائیں گیان چند جین ادبی تاریخ کی خصوصیات گنواتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ’’اس میں صحیح سنین د ینے پر خاص توجہ صرف کرنی چاہیے۔ کسی مصنف کا سنِ ولادت، سنِ وفات اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات مثلاً ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کی تاریخیں دینی چاہیں اس کے علاوہ اس کی مختلف تصانیف اور ان کے ایڈیشنو ں کے سال بھی زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ دئیے جائیں اگر تخلیق کہیں اور سے ماخوذ ہے تو اس کے ماخذ اور مختلف تراجم کی نشاندہی کی جائے۔ قدیم ادب میں اس پہلو پر بطور خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر تبسم کا شمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ایک ادبی محقق کا کام ماضی کے ذخائر کو دریافت کرنا ہے حقائق واقعات اور سوانحات کی صحت کو جانچنا ہے ماضی کے تسامحات کو

دور کرنا ہے اور مختلف افراد سے منسوب غلط روایات کی تردید کرنا
اور تحقیقی کام میں درست حقائق کو سامنے لانا ہے۔''(۱۳)

اس حوالے سے دیکھا جائے تو تاریخ ادب کے مصنف کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے ایک طرف وہ قدیم ادبی متون کی فراہمی کا ذمہ دار ہے اور دوسری طرف صحت اور سند کا بھی ذمہ دار ہے۔اگر تاریخ نویسی کے دوران واقعات کی صحت کا خیال نہ رکھا جائے تو ایسی تاریخ کی کوئی وقعت نہ ہو گی۔

۶۔ تاریخ مرتب کرتے ہوئے ادوار اور اصناف کی تقسیم کس حد تک درست ہے؟ اس کے حوالے سے مؤرخین کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ نویسی میں ادوار بندی سے پیدا ہونے والے تفہیمی مسائل کے باعث بہت سے دانشور اس عمل کو نا پسند کرتے ہیں۔ بقول ظفر الاحسن لاری :

''ہمارے ادبی مؤرخین نے نہ صرف نظم اور نثر کو الگ کرکے ایک دوسرے سے بے تعلق کردیا ہے بلکہ اس کے علاوہ نثر میں ناول اور ڈراما وغیرہ بھی الگ الگ شاخیں کھڑی کر دی ہیں۔ اسی طرح نظم میں غزل،قصیدے،مثنوی اور مر ثیے وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ تقسیم قائم کردی ہے۔ طلباء اور عوام کی نگاہ میں یہ تقسیمیں کسی حدتک آسانی کا موجب بنتی ہیں مگرفنّی نقطہ نظر سے اس تقسیم در تقسیم کا مفہوم یہ ہے کہ حسن کے بھی اتنے ہی ٹکڑے کر دئیے گئے جب تک ہم حسن کے اتحاد وحدت پر ایمان نہ لائیں گے اس وقت تک ہمیں ان تنگ حدود و قیود سے نجات نہیں مل سکتی ''۔ (۱۴)

ڈاکٹرجمیل جالبی اس حوالے سے تاریخ ادب کی ادوار بندی کو درست گردانتے ہیں ان کے خیا ل میں :''ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردّ عمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھاجائے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آجائیں ''۔(۱۵)

اردو ادب میں تاریخ نویسی کے حوالے سے بہت سے رحجانات سامنے آتے ہیں مثلاً ذہنی و فکری حوالے سے تاریخ نویسی، موضوعات کے حوالے سے تاریخ نویسی، اصناف کے حوالے سے تاریخ نویسی، طبقات کے حوالے سے تاریخ نویسی، شخصی ادوار کے لحاظ سے تاریخ نویسی اور زمانی حوالوں سے تاریخ نویسی وغیرہ۔ یہ اور ان جیسے کئی رحجانات ادب کے قاری کو الجھانے کے لئے کافی ہیں۔ ادوار بندی میں بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ادوار بندی کے دوران مؤرخ جس

خاص دور، واقعے یا سن کو تاریخ نویسی بنیاد بناتاہے آیا وہ تاریخ وہ ربط و تسلسل پیداکرنے ضامن ہے یا نہیں۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

''ادوار کوئی مستقل چیز نہیں ہیں، اصل چیز یہ ہے کہ آپ کن رحجانات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں اور انہیں کس طرح دوسرے رحجانات سے الگ کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دنیامیں یہ کہیں بھی نہیں ہوتا کہ ایک رحجان ابھرا وہ ختم ہوگیا تو دوسراآیا، یہ رحجانات ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اور متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹ میں چیزیں بٹی ہوئی ہیں۔ صحیح نہیں ہے ''۔ (۱۶)

ادوار بندی کے تعین کے حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ تاریخی ارتقاء میں تبدیلی کے واضح ترین آثا رموجود ہوں۔ یہ اثرات موضوعات، زبان، اصناف وغیرہ پرواضح طور پر محسوس کئے جاسکیں۔ دومختلف ادوار کے درمیان امتیازات کے ساتھ ساتھ مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں جودومختلف ادوار کے درمیان موجود کشمکش کے عبوری دور میں قائم ہوسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک عہد فکری اقدار ی اور مادّی سطح پر اپنی انفرادیت کو متشکل نہیں کرلیتا۔ اس مرحلے پر مؤرخ کا تاریخی شعور بہت اہمیت کاحامل ہوتاہے ادبی سطح پر ہر دورصنف کی تبدیلی کے ساتھ بھی اپنا اظہار کرتاہے۔ ادب میں ایک دورکا دوسرے دور میں داخل ہونے کے یہ ارتقائی عمل بہت اہمیت کا حامل ہوتاہے۔ ڈاکٹرروش ندیم کے مطابق:

''عہد سازسماجی،سیاسی تغیرات، پرانی ادبی اصناف کو مٹاکر نئی اصناف کی تشکیل کرتی ہیں یا پرانی اصناف نیافکری نظام اور نیا قالب اختیار کرلیتی ہیں۔ ہندوستان میں فارسی حکمرانوں کی آمد سے فارسی ادب کی اصناف اور انگریزوں کی آمد انگریزی ادب کی اصناف اردو میں درآئیں۔۔۔۔۔جدید دور کی آمد کے ساتھ قصیدہ، مثنوی، رزمیہ، ہجو، شہرآشوب، ریختی اور داستان وغیرہ کی جگہ افسانہ، ناول، نثری و آزاد نظم وغیرہ کا ظہور اس کی بہترین مثالیں ہیں ''۔ (۱۷)

تاریخِ ادب میں ادوار بندی مؤرخ کے تاریخی شعور کی مرہون منت ہوئی ہے۔ یہ مؤرخ کی ذہانت ہی ہے جو اسے مختلف ادوار کی تشکیل کے دوران درآنے والے امتیازات کے باوجود ادبی تاریخ کا تسلسل برقرار رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

۷۔ تاریخِ ادب تحریر کرتے ہوئے بعض اوقات مؤرخین اردو کے شعراء کا انگریزی کے شعراء کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔ ایک زبان کے شعراء کا موازنہ ددوسرے شعراء کے ساتھ صرف اس وقت مناسب معلوم ہوتاہے جب ان کے ذاتی اور عہدکے حالات میں مماثلت پائی جاتی ہو وگرنہ بے موقع موازنے تاریخِ ادب کی اہمیت کو کم کرسکتے ہیں۔ موازنے کا یہ رحجان عموماً اردو ادب کی تاریخوں میں پایا جاتاہے جو انگریز ی میں تحریر کی گئی ہے۔ اس حوالے سے رالف رسل نے اپنے مضمون ’’اردوادب کی تاریخ کیسے نہیں لکھنی چاہیے ؟ ‘‘میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح ایک انگریزی دان قاری کو اس قسم کے موازنے کو فت میں مبتلاکرسکتے ہیں۔(۱۸)

۸۔ تاریخ ادب کو وقیع بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ادیب و شعراء کی نگارشات کے منتخب نمونے شامل کئے جائیں تاکہ قاری تحریر کے نمونے سے براہ راست استفادہ کرسکے۔ نگارشات کو شامل کرنے سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ قارئین زبان وادب میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں سے بہترطور پر آگاہ ہوسکے گا۔ متروک الفاظ سے آگہی ہوگی اور مختلف ادوار میں ایک لفظ کن کن صورتوں میں مستعمل رہا اس بات سے بھی واقفیت حاصل ہوگی، سب سے بڑھ کر قارئین ادیبوں اور شعراء کے اسلوب سے واقف ہوں گے۔

۹۔ تاریخ ادب کو جامع و مانع ہونا چاہیے۔ جامع اس صورت میں کہ جس عہد کی تاریخ رقم کی جارہی ہے اس سے متعلق تمام ضروری امور کا اندراج کیاجائے اور مانع، اس طرح کہ کوئی بھی ضروری پہلو شامل ہونے سے رہ نہ جائے۔ اگر کسی امر پہلو کی وضاحت درکار ہو تو تسلسل برقرار رکھتے ہوئے ضروری وضاحت کی جائے اور بے جا اور اضافی مباحث سے تاریخ ادب کو بوجھل کرنے سے گریز کیاجائے۔

۱۰۔ تاریخ ادب کی تالیف ایک سنجید ہ اور فاضلانہ عمل ہے لہٰذا اس کے اسلوب کو بھی باوقار، فاضلانہ اور علمیت سے بھرپور ہوناچاہئے۔ اردو ادب کی تواریخ کا جائزہ لیاجائے تو اندازہ ہوتاہے کہ تقریباً تمام مؤرخین نے اسلوب کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے ہلکا پھلکا اور شگفتہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی عالمانہ شان برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسلوب کے حوالے سے تجویز دیتے ہیں :’’ایسااسلوب جوآئینے کی طرح صاف و شفاف ہو، رواں اور شگفتہ ہو اور عام بول چال سے قریب ہوتے ہوئے بھی ادبی ہو ‘‘۔ (۱۹)

لہٰذامؤرخ ادب کے لئے ضروی ہے کہ ابہام سے پاک اسلوب اختیار کرے ادق اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال علمیت کا اظہار نہیں بلکہ قارئین کے لئے الجھن پیداکرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ مدعانویسی مؤرخ کا مطمع نظر ہوناچاہیے۔

۱۱۔ تاریخ ادب ایک طرف حقائق کی جمع آوری کا ذریعہ انجام دیتی ہے تو دوسری طرف ایک مؤرخ کسی ادیب یا شاعر کا تاریخ میں مقام متعین کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتاہے۔ اس سلسلے میں وہ تنقیدی عمل سے ادبی قدروں کا تعین بھی کرتا ہے اور ان کا محاکمہ بھی کرتاہے۔ بقول جالبی:''ادب کے مؤرخ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بیک وقت تاریخی شعور بھی ہو اور قوت تجزیہ بھی،نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی ہو اور گہری تنقید ی نظر بھی ''۔ (۲۰)

تاریخ ادب کے مآخذات:

تاریخ ایک حد تک گزرے زمانوں کے حالات وواقعات کو محفوظ کرنے کا عمل ہے۔ تاریخ نویسی کی عمارت مآخذات کے بغیر تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ مآخذات تاریخ اسے معتبر اور وقیع بنانے میں اہم کردار ادکرتے ہیں وگرنہ خیالی طوطے مینا اڑانے سے تاریخ نویسی کا عمل وجود میں نہیں آسکتا۔ مؤرخ اپنی بات کو مستند بنانے کے لئے حوالوں اور مآخذات پر انحصار کرتاہے۔ مآخذی مواد دوقسم کا ہوتاہے۔ اولین مآخذ اور ثانوی مآخذ۔اولین مآخذات میں کسی ادیب کی تخلیقات، بیاضیں، مسودے، خطوط، دستاویزات (قانونی و تاریخی) اور تعلیم وغیرہ کا ریکارڈ شامل ہے جبکہ اس ادیب کے بارے میں دی جانے والی آراء اور اس کے حوالے سے لکھی گئی تصانیف ثانوی مآخذ میں شمار ہوتی ہیں۔ داخلی مواد مصنف کی ذاتی تحریروں کو کہاجاتاہے جن سے مصنف سے متعلق بنیادی معلومات کے حصو ل کے لئے مدد لی جاتی ہے۔

بیاضوں کو تاریخ نویسی کے حوالے سے سب سے اہم مآخذ قراردیاجاتاہے۔ کراسہ،مرقع،، چنگ، سفینہ اور کشکول وغیرہ بیاضوں کی ضمنی صورتیں ہیں۔ بیاضیں ذاتی نوعیت کی یاداشتوں پرمشتمل ہوتی ہیں۔ بیاضوں میں پرانے زمانے میں مختلف شعراء کے اشعار درج کئے جاتے تھے۔ یہ اندراج کبھی ذاتی پسند پر منحصر ہوتاتھا تو کبھی موضوع کے اعتبار سے اور کبھی زمانی ترتیب کے حوالے سے یا ذاتی پسند کی بنیاد پر۔ بیاض بطور مآخذ اس حوالے سے بہت اہم ہیں کہ ان کی بدولت گوشۂ گم نامی میں پڑے شعراء کو منظرعام پر لانے میں مدد ملتی ہے۔ بیاض اگرچہ مواد کے حصول کا عمدہ ذریعہ ہیں لیکن بیاضوں کے مواد کو انتہائی جانچ پرکھ اور تحقیق کے بعد تاریخ ادب کا حصہ بناناچاہیے۔

قدیم اردو زبان و ادب کی تاریخ نویسی میں تزکات و ملفوظات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو زبان کی ابتدائی ساخت کو سمجھنے کے لئے صوفیاء کرام کے ملفوظات عمدہ ذریعہ ہیں۔ اسی طرح تزکات کے ذریعے بھی تاریخ ادب کے حوالے سے بہت سا مواد دستیاب ہوسکتاہے۔ تزک بابری

اور تزک جہانگیری تاریخِ ادب کا مواد فراہم کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ملفوظات کے سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاء کی ’’فوائدالفواد‘‘ شاہ نصرچراغ دھلوی کی ’’خیرالمجالس‘‘ اور حضرت گیسوراز بندہ نواز کی ’جوامع الکلام ‘ نہایت اہم ہیں۔

مخطوطات بھی تاریخ نویسی کا معتبر مآخذ ہیں۔ مخطوطات میں قلمی کتب بھی شامل ہیں اور پرانی تحریروں اور مختلف کاغذات کی آرکائیوزبھی شامل ہیں۔ مخطوطات، خود مصنف کی تحریر کردہ بھی ہوتے ہیں اور کاتب کی تحریر کردہ بھی (نقل در نقل کے عمل سے گزری ہوئی) مخطوطات سے استفادہ کرتے ہوئے مؤرخ کو بہت احتیاط سے کام لیناہوتاہے۔ مصنف کے دستخط شدہ یا مصنف کی مہر والے مخطوطات اوّلین مآخذ میں شمار ہوتے ہیں۔
اردوکی ادبی تاریخ میں تذکروں کو تاریخ نویسی کی اوّلین کوششوں میں شمار کیاجاتاہے۔ اس لئے تذکرے ادبی تاریخ نویسی میں انتہائی معتبر مآخذ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ تذکروں کی بدولت نہ صرف شعراء اور ادیبوں کے سوانحی حالات اور ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ متعلقہ عہد کی معاشرت، سیاست، معیشت اور تمدن کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے تذکرے کسی زبان کی ارتقائی تبدیلیوں کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اردو شعراء کے بعض تذکروں کو ان کے مصنفین نے طبقات کانام بھی دیاہے۔ مثلاً طبقات الشعراء از محمد قدرت اللہ شوق (۱۷۷۵ء) طبقاتِ شعرائے ہند از کریم الدین (۱۸۴۷ء) وغیرہ۔ تذکروں کی تاریخ ادب کے مآخذکے حوالے سے اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن بعض ناقدین تذکروں کے کمزور تحقیقی پہلو اور بھرپور تنقیدی پہلو کے باعث تذکروں میں فراہم کردہ معلومات کو اہمیت نہیں دیتےڈاکٹر سلیم اخترتذکروں کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’یہ درست ہے کہ تنقیدکی جدید تعریفوں کی روشنی میں اور اس اصطلاح سے وابستہ آج کے مفاہیم کی روسے انہیں اب تنقید نہیں سمجھا جاسکتا لیکن اردو شعراء کی حیات اور کلام کے بارے میں جوکوائف مدوّن ہوگئے ہیں ان کی ادبی و تاریخی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔علاوہ ازیں ان تذکروں کی صورت میں اردو کے بعض نامور شعراء جیسے میرؔ، مصحفیؔ اور شیفتہؔ کے شعور سے آگہی حاصل ہوتی ہے ‘‘۔ (۲۱)

ادیبوں اور شعراء کے تحریر کردہ خطوط ان کی شخصیت، سوانحی حالات اور ان کے فن کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ بعض اوقات شعراء اور ادیبوں کے نجی خطوط سے وہ معلومات بھی

حاصل ہوتی ہیں جو کسی اور مآخذ سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ خطوطِ غالب، خطوطِ اقبال سے ان کے فن اور سوانح کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات دستیاب ہوئیں ہیں۔ غالب کے خطوط اپنے عہد کی تاریخ، تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔

تاریخ نویسی میں ہم عصر تاریخیں اہم مواد فراہم کرتی ہیں۔ ہم عصر تاریخوں میں نہ صرف ادبی تاریخوں سے بنیادی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں بلکہ دیگر تواریخ مثلاً سیاسی، سماجی، تہذیبی تواریخ بھی بطور اہم ماخذ کے استعمال ہو سکتی ہیں اس حوالے سے ان کتب کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو باقاعدہ تاریخ تو نہیں لیکن ان کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے مثلاً سندھ میں اردو دہلی کا دبستانِ شاعری، دکن میں اردو اور پنجاب میں اردو وغیرہ۔

ادیبو ں اور شعراء کے ذاتی احوال اور فنیّ و ادبی رحجانات کے لئے سوانح عمری اور آپ بیتی بہترین ماخذقراردی جا سکتی ہیں۔ آپ بیتیوں سے ادیبوں اور شعراء کے نفسیاتی مطالعات میں مدد ملتی ہے۔ یاد گارِ غالب، جہانِ دانش،یادوں کی بارات وغیرہ تاریخ ادب کے ماخذ کے حوالے سے نہایت اہم ہیں۔ خاکہ نگاری کے ذریعے بھی موؤخِ ادب قابل قدر معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

سفرنامے عموماً کسی علاقے کی جغرافیائی، ثقافتی اور تہذیبی حالات سے متعلق ہوتے ہیں بعض اوقات ا ن میں سے کسی علاقے کے علمی وادبی رحجانات اور اہم شخصیات اور ان کے فن کے حوالے سے بھی مواد شامل ہوتا ہے۔ ابن بطوطہ اور المسعودی کے سفر نامے ہمیں ابتدائی اردو کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔تنقیدی وتحقیقی مضامین میں کسی خاص موضوع کے حوالے سے معلومات کو انتہائی جانچ پرکھ کے بعد شامل کیا جاتاہے لہذا ایسے مضامین تاریخ نویسی کے لیے بہترین ماخذ ثابت ہو سکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد تک ولیؔ کو اردو کا باوا آدم قرار دیا جاتا رہا لیکن بعد کے محققین نے اپنی محنت سے ایسی چیزیں دریافت کیں کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے متعلق بہت اہم مواد دستیاب ہوا جس سے اردو ادب کی تاریخ کئی صدیو ں تک پیچھے وسعت دینے میں مدد ملی۔ادبی رسائل اور اخبارات ادیبوں اور شعراء کے متعلق مستند معلومات فراہم کرتے ہیں رسائل سے بالخصوص ایسے ادیبوں سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے جن کا تخلیقی سفر مختصر ہوتا ہے یا ایسے ادیب جن کی تخلیقات باقاعدہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوتیں۔ گیان چند جین رسالو ں کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’کتاب کی طرح رسالے بھی تحقیق کا بیش بہا مواد فراہم کرتے ہیں
> بلکہ رسالوں کوا یک لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ کتابو ں کا مواد تو
> سب کے سامنے ہوتا ہے۔ رسالو ں بالخصوص قدیم رسالوں میں نہ

جانے کیا کیا بیش بہا معلومات دفن ہیں،کسے معلوم ؟ان تک رسائی بہت ضروری ہے ‘‘۔ (۲۲)

یونیورسٹیوں سے جاری ہونے والی تحقیقی رسائل بھی تاریخ نویسی کا اہم ماخذ قرار دیئے جاتے ہیں۔ادبی رسائل میں ’نقوش‘،’فنون‘، ’اوراق‘، ’آجکل‘، ’مکالمہ ‘ اور ’ماہ نو‘قابلِ ذکر ہیں اسی طرح یونیورسٹیوں سے جاری ہونے والے تحقیقی رسالے مثلاًتحقیق، دریافت،با زیافت،معیار، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ روزانہ شائع ہونے والے اخبارات بھی تاریخ ادب کے لئے مستند معلومات فراہم کرتے ہیں مثلاً ادیبو ں کی تاریخ وفات ادبی مناقشوں، کسی اعزاز یا خطاب ملنے کی تاریخ وغیرہ۔ ٹی وی، ریڈیو،اخبارات اور رسائل وغیرہ میں ادیبوں اور شعراء کے انٹر ویو ز نشر شائع ہوتے رہتے ہیں یہ انٹر ویوز ادیبوں اور شعراء کی زندگی اور نقطۂنظر معلوم کرنے کا نہایت عمدہ ماخذہیں۔ معاصر ادب کی تاریخ رقم کرتے ہوئے مؤرخ بھی کسی ادیب یا شاعر سے انٹرویوکی نشست کا اہتمام کرکے وسیع معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ مخصوص فکری رحجانات رکھنے والے ادیب اور شاعر کسی نہ کسی ادبی انجمن سے وابستگی اختیار کر لیتے ہیں ان انجمنوں کا ریکارڈمستند معلومات فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ان مآخذات کے علاوہ، سرکاری وقانونی دستاویزات، بصری موا د، درس گاہوں اور ملازمت کا ریکارڈ وصیت نامے، انکم ٹیکس کا ریکارڈ، طبی ریکارڈ، زائچے، پاسپورٹ،کتبے وغیرہ بھی تاریخ نویسی کے لئے مفید مواد فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہیں اسی طرح لوحیں، مقبروں کے گنبد، دروازوں کے نقوش اور سوالنامے بھی تاریخ نویسی کے اہم ماخذات ہیں۔ ادیبوں اور شعراء کی قبر کے کتبوں سے ا ن کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

تاریخ نویسی کے لئے ماخذات کا تعین اور حصول اتنا دشوار نہیں جتنا کہ ان ماخذات کے درست ہونے کا تعین کرتا ہے مؤرخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ جس مآخذ سے استفادہ کرے تمام حقائق حوالے اور سند کے ساتھ پیش کرے اور ان ماخذات کو داخلی اور خارجی تنقیدی اصولو ں کی روشنی میں جانچ پرکھ کے بعد تاریخ ادب کا حصہ بنا ئے۔

تذکرہ نویسی اور تاریخ ادب:

ادبی تاریخ نویسی کی اوّلین نقوش تذکروں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ابتدائی طور پر شعروشاعری کے شوقین حضرات اپنے پسندیدہ اشعار بیاضوں میں تحریر کیاکرتے تھے ان بیاضوں میں بعض اوقات شاعروں کے نام اور تخلص بھی محفوظ کئے جاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کی اہم خوبیوں اور خامیوں کے بیان کی صورت میں یہ بیاضیں تذکروں کی صورت اختیار کر گئیں۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری ؛’’ بیاضوں کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے۔ بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتاتھا۔ جب اس میں انتخاب اشعار کے ساتھ صاحبان اشعار کے نام اور تخلص کا اضافہ کردیاگیا تو اس کا نام تذکرہ ہوگیا‘‘۔ (۲۳)

جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مصحفی کے حوالے سے تذکرہ اور بیاض کی فرق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’مصحفی کے نزدیک بیاض اور تذکرے کا فرق یہ معلوم ہوتاہے کہ بیاض میں ہر قسم اور ہردور کے شاعر کا کلام شامل کیا جا سکتا ہے۔اس شاعر کا بھی جس نے تخلص اختیار نہ کیاہو اور کبھی کبھار تفننِ طبع کے لئے چند اشعار کہے ہوں جبکہ تذکرے میں صرف اس دور یا زمانی دائریے کے باقاعدہ شاعروں کا کلام و حالات شامل کئے جا سکتے ہیں جس کے لئے تذکرہ لکھا جارہاہو ‘‘۔ (۲۴)

تذکرے بیاض کی ترقی یافتہ صورت ہیں اسی طرح ادبی تاریخ، تذکروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت کا آغاز فارسی کے زیر اثر شروع ہو ا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:فارسی کے قدیم ترین دستیاب تذکرے کی حیثیت سے جس تذکرے کا نام لیاجاسکتاہے۔ وہ نورالدین محمد عوفی کا لباب الباب ہے جو ناصرالدین قباچہ والئ اوچ کے عہدمیں لکھا گیا ‘‘۔ (۲۵)

اردو کے اولین تذکرے فارسی زبان میں تحریر کئے گئے بعد میں اردو میں تذکرہ نگاری کا آغاز ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں اردو شعراء کی تذکرہ نگاری کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ بیسویں صدی کی ابتداء تک جاری رہا۔ ابتدائی طور پرتحریر کئے گئے۔تذکرے اگرچہ فارسی زبان میں تھے لیکن شعراء کے کلام کی مثالیں اردو زبان میں درج کی جاتی رہیں۔ تذکروں میں شعراء کے مختصر سوانحی حالات بیان کرنے کے ساتھ ان کے کلام کے حسن وقبح پر روشنی ڈالنے کا اہتمام کیاجاتاتھا۔

تذکرہ نویس کی ذاتی پسند، ناپسند، ان تذکروں میں نمایاں طور پر نظرآتی ہے۔ ہرتذکرہ نویس نے اپنے پسندیدہ شعراء کو تذکروں میں جگہ دی چاہے وہ ادبی لحاظ سے کسی بھی درجے پر فائز ہوں۔ بعض اچھے شعراء کو تذکرہ نگاروں نے محض تعصب کی بنا پر نظرانداز کردیا۔ تذکرہ نویسی کی تاریخ خاصی طویل ہے اس میں ہر قسم کے تذکرے پائے جاتے ہیں مثلاً مختصر تذکرے بھی ہیں اور ضخیم تذکرے بھی۔ کچھ تذکروں میں ادوار بندی بھی کی گئی اور بعض تذکروں میں شعرا ء کو طبقات میں تقسیم کرنے کا رحجان بھی نظر آتا ہے۔

اردو شاعری کا پہلا تذکرہ اردو کے عظیم شاعر میرتقی میر نے ’نکات الشعراء ‘کے نام سے ۱۱۶۵ھ میں تحریر کیا۔ یہ تذکرہ اردو کا اوّلین تذکرہ ہونے کے حوالے اہم ہے بلکہ اس تذکرے کی تنقیدی اور سوانحی اہمیت بھی مسلم ہے۔ نکات الشعراء کے بعد اس کی حمایت اور مخالفت میں تذکرہ نویسی کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا۔ اس حوالے سے ’’ نکات الشعرا‘‘ کو رحجان ساز تذکرہ قراردیا جاتاہے۔ اردو اور فارسی میں تحریر کردہ اہم تذکروں میں نکات الشعراء (فارسی)کے علاوہ تذکرہ ریختہ گویاں(فارسی)از فتح علی حسینی،مخزن نکات(فارسی)ازقیام الدین قائم،طبقات الشعراء(فارسی)ازقدرت اللہ شوق،تذکرہ شعرائے اردو(فارسی)از میر حسن،تذکرہ ہندی گویاں(فارسی)از غلام ہمدانی مصحفی،مجموعہء نغز(فارسی)از قدرت اللہ قاسم،انتخاب دواوین(اردو)از امام بخش صہبائی،طبقات شعرائے ہند(اردو)از کریم الدین فیلن،مخزنِ نکات(اردو)از سید حسن علی،اور انتخاب یادگار(اردو)از امیر احمد مینائی و غیرہ شامل ہیں۔

ادبی تاریخ نویسی کے ابتدائی نقوش جوتذکروں کی صورت میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں نظرآتے ہیں وہ ’’آب حیات‘‘ (۱۸۸۰ء) کی صورت میں یوں جمع ہوئے کہ تذکرہ ہونے کے باوجود ’’آبِ حیات‘‘ ادبی تاریخ نویسی کا اولیّن نمونہ قرارپائی۔ محمد حسین آزادؔ نے سوانح نگاری، تنقید اور لسانیات کی مدد سے ادبی مؤرخین کے لئے ادبی تاریخ نویسی کا ایک ایسا خاکہ پیش کیاجس کی تقلید بعد کے مؤرخین بھی کرتے رہے۔ بقول کلیم الدین احمد :’’بہرکیف ان تاریخوں کاماَخذ ’’آبِ حیات‘‘ ہے فرق صرف یہ ہے کہ ان تاریخوں میں اردو نثرنگاروں کا ذکر ہوتاہے، ادوارکا خیال بھی مستعار ہے۔اسی طرح زیادہ تر واقعات اور تنقیدیں بھی ’’آبِ حیات‘‘ سے ماخوذ ہیں ‘‘۔ (۲۶)

تذکروں میں ادبی تنقید کے ابتدائی نقوش جابجا بکھرے نظرآتے ہیں۔ تذکروں کا تنقیدی معیار اگرچہ بہت بلند نہیں تھا لیکن یہ تذکرے شعراء کے کلام کے ظاہری لفظی خوبیوں پر عمدگی سے بحث کرتے نظرآتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی اس عہد کے اندازِنقد کے حوالے سے لکھتے ہیں :’’لفظوں اور محاوروں کے استعمال میں احتیاط اور اظہار کو بہتر اور مؤثر بنانے کی کوشش ہی اس دور کے تنقیدی معیار تھے۔ کوئی شعر پسند آیا تو اس پر واہ کہہ دی اور اگر اس میں کوئی لفظی سقم یا محاورہ، زبان غلط استعمال نظرآیا تو اس پر اعتراض کردیا‘‘۔ (۲۷)

تذکرے روائتی تنقیدی رحجان کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی اغلاط سے بھی بھرپور ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے اکثر واقعات کی صحت کا خاص اہتمام نہیں کیا۔

تذکرہ نویسی اور تاریخ ادب کے معیار اور حدود میں واضح فرق نظرآتاہے۔ تذکرے عموماً چارچیزوں کے حامل ہوتے ہیں۔ شاعر کے مختصر سوانحی حالات، شخصیت کا مختصر خاکہ، شاعر

کے کلام کی فنی خوبیوں اور خامیوں کا بیان اور منتخب کلام جبکہ تاریخ ادب کے مشمولات تذکروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ تاریخ ادب کسی بھی زبان کے ادب کے ارتقاء کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ کسی بھی مخصوص دور میں چلنے والے فکری اور فنّی رحجانات کاجائزہ لیتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل تذکرے اور تاریخ کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''بنیادی طور پر تذکرہ نویسی اور تاریخ نویسی میں تنقید، تحقیق اور تجزئیے کا فرق بہت واضح ہے اور تاریخ نویسی میں تاریخی و تہذیبی شعور اور معاشرتی احساس وہ بنیادی لوازمات ہیں جو تاریخ نویسی کو تذکرہ سے ممتاز کرتے ہیں''۔(۲۸)

تنقید، تحقیق اور تجزیہ کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب کو جوچیز تذکروں سے ممتاز کرتی ہے وہ مؤرخ کا تاریخی، تہذیبی شعور ہے۔ ایک مؤرخ اپنے تاریخی و تہذیبی شعور ساتھ کام لیتے ہوئے زبان و ادب کی گمشدہ کڑیوں کو دریافت کرکے زبان و ادب کے سفر کو ایک تسلسل کی صورت میں پیش کرتاہے۔ مآخذات اور حوالوں کے بیان ذریعے تحقیق کی سند پیش کی جاتی ہے۔ تذکرہ نگار، تذکروں میں شعراء کی مجلسی زندگی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی شخصیت کے بعض پہلؤوں اور اس دور کی معاشرتی فضا کوسمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ''آبِ حیات'' کو شاعروں کی زندگی کامرقع بھی قرار دیاجاتاہے۔ جبکہ تاریخ ادب میں مؤرخ محض شعراء کی مجلسی زندگی کی جھلکیاں پیش نہیں آتا بلکہ شاعر کے یا مصنف جس سماج کا حصہ ہوتے ہیں اسی سماج کے طرزِ معاشرت، مذہب، سیاست، کاجائزہ لے کہ ادب پران کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کرتاہے۔تذکروں میں صرف شعراء کے حالات پیش کئے جاتے ہیں اور شعراء کے کلام میں بھی زیادہ زور غزل گوئی پر دیا جاتا ہے جبکہ دیگر اصناف سخن نظم، قطعہ، رباعی، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ کے حوالے سے شعراء کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے جبکہ تاریخ نگارشعراء کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں کو بھی موضوع بناتاہے اور ہر دور کی تمام اصناف نظم و نثر کے جائز ہ لے کر ادب کا ایک مربوط تصور پیش کرتاہے۔ مؤرخ، تاریخِ ادب لکھتے ہوئے ایک نظریہ سامنے رکھتاہے اور کسی دور کے زبان و ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے اسی نظر یے کو اہمیت دی جاتی ہے جبکہ تذکرہ نگارمحض اپنے ذاتی شوق، اور یادگار چھوڑ جانے کے جذبے کے تحت تذکرہ نگاری کرتاہے۔ اس لئے تذکرہ نگار کسی خاص علاقے تک محدود ہوتے ہیں جبکہ تاریخِ ادب کی حدود بہت وسیع ہوتی ہیں۔ اس میں کسی خاص علاقے کی بجائے ادب کاجائزہ وسیع تناظر میں لیاجاتاہے۔ تذکرہ نگار عموماً شعراء کے بیان میں تاریخی ترتیب کو ملحوظ خاطررکھتاہے۔ اردو میں تاریخ نویسی کی ابتداء تذکروں ہی کی مرہون منت ہے۔ تذکرے اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تذکروں

پرجس قدر بھی اعتراضات کئے گئے ہیں اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ تمام ادبی مؤرخین نے ابتدائی معلومات کے حصول کے لئے تذکروں کا سہارالیا۔ قدیم شاعری کے نمونے ہوں یا پرانے شعراء کے سوانحی حالات، تذکروں کی مدد لئے بغیر ان کاحصول ممکن نہیں۔ بقول فرمان فتح پوری:

’’۔۔۔۔قدیم شعراء کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے متعلق جتنی کتابیں یامقالات اب تک مرتّب ہوئے ہیں یا ولیؔ کے عہدے سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک شعراء کے متعلق جو واقعات و حالات سامنے آتے ہیں ان سب کا سرچشمہ یہی تذکرے ہیں ‘‘۔ (۲۹)

اس نقطۂ نظر سے دیکھاجائے، اردو کی ابتدائی ادبی تاریخوں پرتذکروں کے اثرات جابجا نظرآتے ہیں۔ مثلاً رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں ۱۹۲۴ء میں اردو زبان کی پہلی تاریخ لکھی وہ تذکرہ نویسی کا سا انداز لئے ہوئے ہے اگرچہ اس کتاب میں شعراء کے علاوہ نثرنگاروں کو بھی شامل کیاگیا ہے،اور اصنافِ نظم ونثر کا جائزہ لیاگیاہے لیکن شعراء و ادیبوں کے سوانحی حالات کے بیان اور کلام کے محاسن بیان کرنے میں تذکروں کا رنگ صاف نظرآتاہے۔ تذکروں کے تحقیقی معیار اور تنقیدی آراء پر اعتراضات کئے جاسکتے ہیں لیکن ادبی تاریخ نگاری میں تذکروں کی اہمیت اور ضرورت سے انکارممکن نہیں۔ یہ تذکرے ماضی میں زبان و ادب کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ تاریخ نگاری میں اگر ان تذکروں سے مدد نہ لی جائے تو تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو ملانے کا تصوّر محال ہے۔ کئی مؤرخین ادب نے تذکرہ میں فراہم کردہ معلومات پرانحصار کرتے ہوئے مروّجہ روایات و نظریات کو تبدیل کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون ’’نکات الشعراء کا تحقیدی مطالعہ ‘‘میں مختلف حوالوں سے ثابت کیاہے کہ میرؔ کے تذکرے کا ایک نقش اولِ بھی تھا جس میں انہوں نے اپنے ہم عصر شعراء اور دیگر شعراء کے بارے میں ایسی باتیں کہی تھیں جن کے نتیجے میں انہیں شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا اور میرنے موجودہ تذکرے سے ان باتوں کو حذف کردیا۔ (۳۰)

تذکروں میں پائے جانے والے غیر معتبراندراجات اگرتحقیق و تفتیش کے بعد تاریخ ادب کا حصہ بنادئیے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان تذکروں میں فراہم کردہ معلومات کو نظرانداز نہیں کیاجاسکتا بلکہ بعض مؤرخین نے انہیں بطور دلیل بھی استعمال کیاہے۔ تذکروں کو ان کے اپنے دور کے ماحول، فکر اور تنقیدی معیارات کی روشنی میں تحریرکیاگیا۔ لہٰذا انہیں آج کے ماحول اور تنقیدی معیارات اور بالخصوص تاریخ نویسی کے جدید نظریات کے تحت پرکھنا درست نہیں ہے۔ تذکرے اور

تاریخ نویسی اپنی حدود طریقۂ کار میں ایک الگ صنف کی حیثیت اختیارکرچکے ہیں لیکن ہماری ادبی تاریخ نویسی، تذکروں کی اہمیت اور ضرورت سے کبھی بھی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

اردو میں باقاعدہ تاریخ نویسی کی ابتداء انیسویں صدی سے قبل ہوچکی تھی۔ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات '' کو تذکرہ اور تاریخ کی درمیانی کڑی قراردیاجاتاہے۔ ''آب حیات'' کی بدولت اردو میں پہلی دفعہ تاریخ نگاری کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے۔ آب حیات میں بیک وقت قدیم تذکرہ نگاری کا رنگ بھی نظرآتاہے اور تاریخ ادب کے ابتدائی نقوش بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ''آب حیات'' کے بعد رام بابوسکینہ کی تاریخ ادب اردو کے بعد بھی بہت سی تاریخیں منظرعام پر آئیں ان میں وہ تاریخیں بھی شامل ہیں جو مختلف اداروں کی معاونت سے وجود میں آئیں مثلاًتاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند جس کی جلد نمبر ۶ تا ۱۰ اردو ادب کے لئے مختص کی گئی۔'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کو پانچ جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن اس کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی لیکن رشید حسن خان نے اس جلد میں اسقدر خامیوں اور اغلاط کی نشاندہی کی کہ بقیہ جلدوں کے شائع ہونی کی نوبت ہی نہیں آئی جبکہ جلد اول کو بھی بازار سے اٹھوالیا گیا۔اردو ادب کی دیگر مبسوط توریخ میں ڈاکٹر محمد حسن ملک کی ''تاریخ ادبِ اردو''(۱۹۷۹ء)،ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کی ''تاریخِ ادبیاتِ اردو''(۱۹۶۹ء)،ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ''تاریخِ زبان و ادبِ اردو''(۱۹۹۸ء)،سیّدہ جعفر اور ڈاکٹر گیان چند جین کی ''تاریخ ادبِ اردو،۱۷۰۰ء تک(۱۹۹۸ء)اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ ادبِ اردو ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک(۲۰۰۹ء) شامل ہیں۔جبکہ انگریزی میں لکھی گئی تواریخ میں رام بابو سکسینہ کی ''اردو ادب کی تاریخ''(۱۹۲۷ء)،گراہم بیلی کی ''اردو ادب کی تاریخ(۱۹۳۲ء) ڈکٹر این میری شمل کی ''کلاسیکی اردو ادب آغاز سے اقبال تک''(۱۹۷۵ء)اور ڈاکٹر محمد صادق کی'اردو ادب کی تاریخ(۱۹۶۴ء) قابلِ ذکر ہیں۔(۳۱)ان تواریخ کے علاوہ بھی اردو ادب کے حوالے سے کئی توریخ لکی گئیں جن میں مختصر تواریخ بھی شامل ہیں لیکن جو قبولِ عام اور استناد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادب کو حاصل ہوا اردو ادب کی کسی تاریخ کو حاصل نہیں ہوا۔

تاریخ ادب اردو(جلد اوّل) کاتحقیقی و تنقیدی جائزہ:

اب تک لکھی گئی تاریخوں میں جو قدرو منزلت ڈاکٹرجمیل جالبی کی تاریخِ ادب کے حصے میں آئی وہ کسی اور تاریخِ ادب کو میسر نہ آسکی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب کی تالیف میں جس عرق ریزی، تفتیش، تحقیق اور جان فشانی سے کام لیاہے وہ کام ایک فرد واحد کے لئے انجام دینا کسی معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی اب تک ’چار‘ جلدیں منظرعام پرآچکی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے؛

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل (۱۹۷۵ء)

۲۔ تاریخ ادب اردو جلد دوّم (حصہ اوّل۔حصّہ دوّم ۱۹۸۲ء یکجا اشاعت ۱۹۹۴ء)

۳۔ تاریخ ادب اردو جلد سوّم (۲۰۰۶ء)

۴۔ تاریخ ادب اردو جلد چہارم (۲۰۱۲ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک ایسے مؤرخ کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جنہوں نے ادب کا مطالعہ اس کے مخصوص عہد اور تہذیب کے حوالے سے کیاہے۔ بقول پروفیسر سید وقار عظیم:

> ’’ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو‘‘(جلد اوّل) اردو ادب کی پہلی تاریخ ہے جس میں ادب کو (خواہ وہ قدیم ہو یا جدید) مخصوص تہذیبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور لسانی عوامل کا منطقی نتیجہ اور ’’اجتماعی تہذیبی روح کا عکس ‘‘ سمجھ کر اس انداز سے زیر بحث لایا گیا ہے کہ وہ ایک ناقابل تقسیم اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ‘‘۔ (۳۲)

ادب اور زبان کسی بھی تہذیب کے فکری سرمائے کے عکاس ہوتے ہیں۔ تہذیب شناسی کا اوّلین زینہ ادب شناسی ہے۔ مؤرخ ادب کے لئے تاریخی اور تہذیبی شعور کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی تہذیب کا ترجمان اس کا ادبی سرمایہ ہوتاہے ادبی سرمائے کے بغیر کوئی بھی قوم یا معاشرہ تہذیب یافتہ معاشرہ نہیں کہلاسکتا۔ حتیٰ کہ دنیا میں ایسی تہذیبیں بھی گزری ہیں جواگرچہ معدوم ہوچکی ہیں لیکن اپنے ادبی سرمائے کی وجہ سے اپنی پہچان رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادب اور تہذیب کی اہمیت کے پیش نظر ہی یہ دعویٰ کیاہے کہ ’’میں نے کوشش کی ہے کہ۔۔۔۔ پوراسماج اور اس کی تہذیب صفحاتِ تاریخ پر چلتی پھرتی نظروں کے سامنے آجائے‘‘ (۳۳)

تہذیبی شعور کی بدولت ہی ڈاکٹر جمیل جالبی نے صرف انہیں واقعات کو تاریخِ ادب کا موضوع بنایاہے جن سے ادبی تخلیق براہ راست متاثر ہوئی۔ تہذیبی شعور کے علاوہ مؤرخ ادب کا تاریخی شعور

ابھی اس کا رہنما ہوتاہے۔ ادبی تاریخ نویسی جیسے پیچیدہ عمل کے لئے مؤرخ کاتاریخی شعور سے بہرہ ور ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو جوبات دیگر مؤرخین سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا تہذیبی اور تاریخی شعور ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخوں سے پہلے جوتاریخیں منظرعام پر آئیں ان سے ظاہرہوتاہے مورخین نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر میں تاریخ ادب تو تحریر کی ہیں لیکن یہ تاریخیں ادب اور زندگی کی کلیّت قائم کرنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخی بصیرت کی بدولت ان معاشرتی، سیاسی، فکری اور تہذیبی روابط کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک ادبی فن پارے کو اس عہد کا نمائندہ بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ ادبی فن پارہ سماج کی بدلتی قدروں کا عکاس ہوتا ہے۔ تہذیبی اقرار بدلتی رہتی ہیں۔ مؤرخ کا تاریخی شعور اسے وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی لسانی، معاشرتی، تہذیبی اورجمالیاتی اقدار میں ہونے والے تضیّرات کا فہم عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی ایسے ہی مؤرخ کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی تاریخی بصیرت ماضی کو حال سے جوڑتی ہے۔ واقعات کے اسباب و نتائج دریافت کرتی ہے، بدلتی ہوئی اقدار اور روایات کے ادب پراثرات کا تجزیہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ نویسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ادبی تاریخ کے ابتدائی دور میں جہاں مختلف ادوار کی لسانی خصوصیات شمار کرانے کو کا فی سمجھا جاتا تھا، بعد میں تحقیقی پہلو کے علاوہ تخلیقات کا تاریخی تہذیبی پس منظر میں بھی مطالعہ کیاگیا۔ اصنافِ ادب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ افکار کی تاریخ بھی بیان کی گئی اور سب سے زیادہ ادب اور کلچر کے باہمی رد عمل پرزور دیاگیا۔ آبِ حیات سے رام بابوسکینہ کی تاریخ تک ارتقاء کی ایک بڑی جیت ہے اور رام بابو سکینہ سے جمیل جالبی تک دوسری جنہوں نے ادوار کی بجائے روایات کا دامن پکڑ کر تاریخ کا بیان کیا‘‘۔(۳۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نظریۂ تاریخ کو ان کے تہذیبی و تاریخی شعور سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ بقول جالبی:

> ’’ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے ہیں اور

> تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رحجانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ میں نے اسی شعور اور نقطۂ نظر سے قدیم ادب کا مطالعہ کیاہے‘‘۔ (۳۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک طرف ادب اور سماج کے رشتے کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور ادب کو سماج اور تہذیب کاآئینہ قرار دیتے ہیں تودوسری طرف تاریخ نویسی میں تحقیق کی اہمیت پربھی زور دیتے ہیں۔ بغیرتحقیق کے تاریخ ادب کی کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی دستیاب مآخذات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ غیرادبی مآخذات سے استفادے کے بھی قائل ہیں اور مؤرخ کے لئے تنقیدی شعور کو بھی ضروری تصور کرتے ہیں جوکسی ادیب کے ادبی مقام کے تعین میں معاون ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل جولائی۱۹۷۵ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی۔ تاریخ ادبِ اردوجلد اوّل اردو زبان و ادب کے آغاز سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کے دور کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ پیش لفظ میں تصورِ تاریخ پروضاحت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس جلد کے خاکے کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان کے مطابق:

> ’’......... اس جلد کا خاکہ اس طرح بنایاگیاہے کہ ساری تصنیف کو ترتیب زمانی سے چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہرفصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں۔ ہرفصل کاپہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتاہے جس میں اس دورکی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی و لسانی خصوصیات کو اجاگر کیاگیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کے سامنے اس دور کی واضح تصویر آجائے‘‘۔(۳۶)

تاریخ ادبِ اردوجلد اوّل چھ فصلوں پرمشتمل ہے۔ ہرفصل میں ابواب کی تعداد میں فرق ہے۔ تاریخ ادب کا باقاعدہ آغاز ’’تمہید‘‘ سے ہوتاہے۔ ’’تمہید‘‘ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کی ابتداء اور اس کے پھیلنے کے اسباب سے بحث کی ہے۔ تمہید میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کی ابتداء اور نشوونما کے حوالے سے مختلف نظریات کا جائزہ لیاہے۔ زبان کی پیدائش اور اس کے پھیلنے کے سماجی اور سیاسی عوامل کو موضوع بحث بنایاہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد بن قاسم کی فتۂ سندھ، ملتان کے تہذیبی و لسانی اثرات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور ملتان کے علاوہ جن عوامل کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کی نشوونما کے حوالے سے اہم قرار دیا ہے ان میں محمود اور آلِ محمود کا دوسو سالہ اقتدار (جوکہ سندھ، ملتان سے لے کر پنجاب، نواح دہلی تک پھیلا ہواتھا)،فتح دکن اور گجرات جس کے نتیجے میں انتظامی

ضرورتوں کے تحت علاء الدین خلجی کے تعینات کردہ امیرہ صدہ ‘ (جوکہ عموماً ایک ترک افسر ہوتاتھا)کا ان علاقوں میں رچ بس جانا، علاء الدین خلجی کا اس انتظام کو برقرار رکھنا، محمد تغلق کی جانب سے دولت آباد کو پایہء تخت کا درجہ دیاجانا، بہمنی سلطنت کی ابتداء (۱۳۵۱ء)،مرکزی حکومت پرمحمد تغلق کی گرفت (۱۳۹۷ء) کمزور ہونے کے سبب خلقِ کثیر کا گجرات کی طرف رخ کرنا(۱۳۹۷ء)ہمایوں ظفر خان (م ۸۱۳/ ۱۴۱۰ء) کی بادشاہت کی ابتداء شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان عوامل کی روشنی میں شمال کو زبان کا مولد قراردیا ہے لیکن اس زبان نے گجرات دکن میں ادبی زبان کا درجہ بہت پہلے حاصل کرلیا تھا۔

تاریخِ ادبِ اردو (جلد اوّل) کی فصل اوّل کا عنوان شمال ہند(۱۰۵۰ء۔۱۷۰۷ء) ہے۔ یہ فصل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک (۱۰۵۰ء۔ ۱۵۲۵ء) اردو زبان کے ابتدائی خدوخال دریافت کئے گئے ہیں۔ یہ وہ درد ہے جب نئے تہذیبی اثرات کے تحت فارسی، ترکی اور عربی کے الفاظ اس زبان میں تیزی سے جگہ بنارہے تھے۔ نہ صرف نئے الفاظ اس زبان میں شامل ہورہے تھے بلکہ الفاظ کی شکلیں بھی تبدیل ہورہی تھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان تاریخی عوامل کا جائزہ پیش کرتے ہیں جن کے باعث یہ زبان پنجابی زبان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ بقول جالبی:

> ’’پنجاب اور اہلِ پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اوّل ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا۔ وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی اسکی ساخت، اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پرپنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا ‘‘۔ (جلد اول،ص۲۲)

اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے دقتِ نظر سے قدیم ادب کا مطالعہ پیش کیاہے اور تاریخی حوالوں سے اس زبان پر پنجابی کے اثرات پیش کئے ہیں اردو زبان کی نشونما کے ابتدائی ادوار میں جن علماء، شعراء اور صوفیوں نے اسے ذریعۂ اظہار بنایا ان میں امیر خسرو(۱۲۵۲۔۱۳۲۵ء)،شیخ فریدالدین مسعود گنجِ شکر(۱۱۷۳ۃ۔۱۲۶۵ء)،شیخ باجن(۱۳۸۸ء۔۱۵۰۶ء)،، شیخ حمیدالدین ناگوری (۱۱۹۳ء۔۱۲۷۴ء)، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی (م ۷۲۴ھ/۱۳۲۳ء) شیخ شرف الدین یحی منیری(م ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء)،شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۸۶۰ھ/۹۴۵ھ/۱۴۵۵ء۔ ۱۵۳۸ء) شامل ہیں۔ ان صوفیا ء کے علاو ہ ان تحریکوں اور ان کے رہنماؤں کی تخلیقات کی زبان کا جائزہ لیاہے جو نئے

تہذیبی و سماجی اثرات کے تحت برصغیر میں برپا ہوئیں مثلاً نا م دیو(۱۲۷۰ء۔۱۳۵۰ء)، کبیر، گرونانک (۱۴۶۹ء۔۱۵۳۸ء)۔

اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے امیر خسرو کی تخلیق ’’خالقِ باری‘‘ کے غلط انتساب کے حوالے سے اپنی تحقیق بھی پیش کی ہے اور اسے امیر خسرو کی تصنیف ثابت کیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم اردو کے مخطوطات اور ملفوظات کا نہایت عمدہ لسانی مطالعہ کرکے اپنے دعوے کو تقویت پہنچائی ہے کہ اردو برصغیر کے مختلف علاقوں میں اپنی ابتدائی شکل میں فارسی، عربی، ترکی کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ مقامی بولیوں کے اثرات بھی قبول کررہی تھی اور ایک وقت میں برصغیر میں مختلف علاقوں میں پھل پھول رہی تھی۔ اس باب میں ایک اہم حصہ وہ ہے جہاں ڈاکٹر جمیل جالبی کبیر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔ کبیر کی شاعری کی زبان کو جالبی پنجاب سے بہار تک کی عام زبان قراردیتے ہیں۔ کبیر کی شاعری میں فارسی، عربی اور ترکی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،کبیر کو ہندومسلم اتحاد کا داعی سمجھتے ہیں۔ اکثر مؤرخینِ ادب کبیر کو اسی روپ میں پیش کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کبیر کے حوالے سے مختلف رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ بقو ل ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

> ’’یہ رائے ایک طرح سے درست بھی ہے مگر کبیر کے امتزاجی مسلک کا ایک اور رخ بھی ہے۔ کبیرکی تمام تر سعی کا جائزہ لیجئے تو انسان اور انسانیت کے اس کی محبت برحق ہے مگر اس کے مجموعی کام کو دیکھئے تو ایک طرح سے اسلام کو انڈین بنانے (Indianization)کی مخلصانہ کوشش ہے ‘‘۔ (۳۷)

دوسرے باب کا عنوان’’ بابرسے شاہجہان تک ‘‘ ہے جوکہ ۱۵۲۵ء سے ۱۶۵۷ء تک کے دور کا احاطہ کرتاہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تقریباً سواسوسال کے ان سیاسی، تہذیبی،سماجی اور لسانی اثرات کاجائزہ پیش کیا ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء پراثرانداز ہوئے۔ ڈاکٹرجالبی نے بابر کی ’’تزکِ بابری‘‘ کے حوالے سے دعویٰ کیا ہے کہ بابر اگرچہ ترک تھا لیکن برصغیر کے انتظامی امور سلجھانے کے لئے اسے برصغیر میں اس وقت رائج زبان کے حوالے سے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بابر کے دور کے ایک فارسی شاعر شیخ جمالی کنبوہ کی شاعری میں اردو الفاظ کا سراغ لگایاہے۔ اسی عہد میں ایسے شعراء کا سراغ بھی ملتا ہے جنہوں نے خالقِ باری کی طرزپر طلبہ کے لئے رسالے تحریر کئے اور جن میں فارسی الفاظ کے اردو مترادفات تحریر کئے ہیں۔ حکیم یوسفی ’’قصیدہ درلغاتِ ہندی‘‘ اچے چند بھٹنا گر کا رسالہ’ مثلِ خالقِ باری ‘(اس رسالے کایہ عنوان مولوی

عبدالحق نے رکھا کیونکہ دستیاب مخطوطے پرکتاب کا نام درج نہیں تھا) قابلِ ذکر ہیں۔ اکبر رواداری کو فروغ دینا چاہتا تھا اس لئے زبان کے حوالے سے بھی اس نے اسی رواداری کو فروغ دیا۔ اکبر کے دور کے ادبی نمونوں کے مطالعے سے ڈاکٹر جمیل جالبی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس دور میں شعوری طور پر اردو کے الفاظ، محاورے، ردیف اور قافیہ وغیرہ استعمال کئے جارہے تھے اور شاعری میں مکالموں کی ادائیگی کے لئے عام روزمرّہ بول چال کی زبان کو اپنایا گیا جس سے ظاہر ہوتاہے کہ اس وقت اردو اتنی صاف ہوچکی تھی کہ عام روزمرّہ گفتگو میں استعمال کی جاسکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بہرام سقّہ بخاری کی شاعری کے حوالے سے اردو،ردیف و قافیہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اردو زبان کے روز مرّہ کی زبان بن جانے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے عشقی خان عشقی اور نورالدین جہانگیر کی ''توزکِ جہانگیری'' کاجائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کی نمائندہ تصنیف' بکٹ کہانی 'کو قراردیا ہے۔ بکٹ کہانی بارہ ماسہ کی روایت میں لکھی گئی۔ بارہ ماسہ کو ڈاکٹر جمیل جالبی ہندوی چیز قراردیتے ہوئے پنجابی، ہریانی، برج، اودھی اور اردو میں اس کی روایت کا سراغ لگاتے ہیں۔ بکٹ کہانی میں استعمال کی گئی زبان کے جائزے سے پتا چلتاہے کہ شمال کی زبان اپ بھرنشی اثرات سے نکل کر جدید ترقی یافتہ صورت اختیار کرچکی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بکٹ کہانی کا تفصیلی، لسانی مطالعہ پیش کیاہے اور یہ نتیجہ اخذ کیاہے کہ بکٹ کہانی میں استعمال کی گئی زبان آگے چل کر ولیؔ کی شاعری میں نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ شاہجہان کے عہد میں جب دلّی کو دارالحکومت بنایا تو اس زبان سے برج بھاشا کے اثرات کم ہوگئے اور اردو (ہندوستانی) اور فارسی ادبی زبان کے طور پر یکساں طور پر مقبول ہوگئی۔

فصلِ اوّل کا تیسراباب ''دورِ اورنگزیب ''ہے جوکہ ۱۶۵۷ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک کے دورکا جائزہ پیش کرتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی تناظر کو بہت خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اکبر کے بنائے ہوئے سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کو شاہجہان نے عروج بخشا اور اب اورنگزیب کے عہد میں یہ تہذیبی ڈھانچہ روبہ زوال تھا۔ اورنگزیب کی شاندار فتوحات کے باوجود نظامِ خیال استقلال سے محروم تھا۔ بقول جالبی:

> ''ہردور کا اظہار اس کے ادب و فن میں ہوتاہے اگر نظامِ خیال صحت مند ہے تو تخلیقی فنکاروں کے پاس زندگی کی یہ سطح پر کہنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتاہے چونکہ اب نظامِ خیال صحت مند نہیں ہے اس لئے اس دور کے ادب و فن میں نہ کہیں صحیح معنوں میں

عظمت نظر آتی ہے (ظاہر ہے کہ تکرار عظمت نہیں) اور نہ وہ کشش جو دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ خطاطی، مصوری، موسیقی، فنِ تعمیر، ادب، تاریخ، سائنس، تعلیم اور دوسرے علوم و فنون ٹھٹھرکر صرف روایت کی لکیر کو پیٹ رہے تھے''۔(جلد اول،ص۷۶)

تہذیبی زوال کے ساتھ اس تہذیب کی زبان یعنی فارسی زبان کی اہمیت بھی کم ہونے لگی اور اردو زبان کاچلن عام ہوگیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق تعلیمی و تدریسی سطح پر سب سے زیادہ اہم نام عبدالواسع ہانسوی کاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی عبدالواسع ہانسوی کو اردو لغت نگاری کا بانی قراردیتے ہیں۔ اردو زبان کے علمی و ادبی زبان بن جانے کی دلیل کے طور پر ڈاکٹر جمیل جالبی لغت نویسی کی ابتدا ء کو قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف اردو لغت نویسی کی ابتداء ہوئی تو دوسری طرف مذہبی تصانیف بھی اردو میں تحریر کی جانے لگیں۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولانا شیخ عبداللہ انصار ی، شیخ محبوب عالم کی مذہبی تصانیف، فقۂ ہندی، محشر نامہ، مسائل ہندی اور دردنامہ کا مختصر جائزہ لیاہے۔ نصف صدی پرمحیط اس باب کے اختتام پر ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو ادبی زبان تو بن چکی تھی لیکن ابھی اظہار و بیان میں اس درجے کو نہیں پہنچ سکی تھی جو فارسی کو حاصل تھا۔

فصل دوّم چار ابواب پرمشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''گجری ادب اور اس کی روایت ''ہے۔ یہ باب ۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۷ء تک کے دور کا مطالعہ پیش کرتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی گجری ادب کی روایت کو دکنی ادب کی روایت سے قدیم ترقراردیتے ہیں۔ گجرات میں اردو زبان ادبی سطح پر اپنی روایت کا آغاز کرتی ہے۔ ''جب گجرات میں اردو روایت کا آغاز ہواتو اس وقت ایک طرف عربی و فارسی اور دوسری طرف سنسکرت ادب و زبان کی روایت تھی لیکن گجری اردو نے ان دونوں روائتوں کو رد کرکے خالص دیسی روایات کو اپنایا''۔(جلد اول،ص۹۲)

گجری اردو پرہندی روایت کا اثر بہت گہرا تھا۔ گجری ادب کو اس لحاظ سے بھی ڈاکٹر جمیل جالبی برتر قراردیتے ہیں کیونکہ اس زبان میں تخلیقی عمل کا جوتسلسل نظرآتاہے وہ دیگر علاقوں کی زبان میں نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''گجری اردو''سے مراد وہ زبان لیتے ہیں جو شمال سے گجرات آئی اور یہاں کی مقامی زبان سے مل کر گجری اردو کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی اس بات سے متفق ہیں کہ گجری ادب قدیم گجراتی اد ب سے ایک الگ اپنا تشخص قائم کر رہا تھا۔

> ’’معلوم ہوتا تھا کہ گجرات کے صوفیا اور ادیبوں کے شعور میں یہ بات پختہ حد تک موجود تھی کہ وہ زبان کے معاملے میں گجراتی زبان کے ادیبوں سے جداگانہ لسانی شناخت رکھتے ہیں--- اس روایت کی تخصیص کے لئے ’گجری‘ یا ’گوجری‘ کی یہ اصطلاح اس خطے کے ادیبوں کی قدیم اردو کو گجراتی سے ممتاز و ممیز کرتی تھی‘‘۔ (۳۸)

دوسرے باب کا عنوان’’نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات اور کتبے‘‘ ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۴۰۰ء سے لے کر ۱۶۰۰ء تک کے دستیاب ملفوظات، لغات اور کتبوں کا جائزہ لیاہے۔ ان ملفوظات اور مخطوطات سے مثالیں پیش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ زبان اس وقت علاقائی اثرات کو تیزی سے قبول کررہی تھی۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی :

> ’’ان ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرائیکی، گجراتی برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں اور ان سب کو ملاجلا کر ایک کرنے کے عمل سے ایک ایسا رنگ ا بھررہاتھا جو بادشاہوں سے لے کر فقیروں تک، صوفیاء سے لے کر عوام تک مقبول ہے۔ ان ملفوظات اور فقروں سے اس بات کا بھی ثبوت ملتاہے کہ مختلف طبقے اور مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کی بات اس زبان کے ذریعے سمجھتے ہیں اور باقی دوسری زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک محد ود ہیں۔ اس معاشرتی ضرورت رواج اور استعمال سے اردو زبان کا رنگ ابھرتااور صاف ہوتاچلاگیا ‘‘۔(جلد اول،ص۹۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب میں جن بزرگان دین کے ملفوظات اور علما ء کی لغات اور قبروں کے کتبوں سے مثالیں پیش کیں ان میں سید برہان الدین، ابومحمد عبداللہ قطبِ عالم، شاہ عالم عرف شاہ منجھن، سلطان محمود بیگرہ، رائے کھیڑ احمد آباد کی مسجد کا کتبہ (۱۵۵۵ء)، شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی، فضل الدین بلخی کی لغت، ’بحرالفضائل ‘رفیع حاجب خیرات کی ’دستور الفضائل ‘، قاضی بدرالدین دہلوی کی تالیف ’’ادات الفضلاء‘‘ شامل ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ’’نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت ‘‘ہے اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء کے دور کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مؤقف کو رد کیا ہے کہ اردو زبان نے محض فارسی زبان و ادب اور اسلامی اثرات قبول کئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے

مطابق:’’ اردو شاعری کی پہلی روایت خالص ہندوی اصناف و اوزان پرقائم ہوتی ہے ‘‘۔(جلد اول،ص۱۰۵)

اردو زبان نے اپنے ابتدائی تشکیلی دور میں ہرلحاظ سے مقامی اثرات قبول کئے چاہے وہ الفاظ کی صورت میں ہو، اصناف کی صورت میں ہو یا موضوعات کے لحاظ سے اردو زبان و ادب کی ابتدائی ۵ صدیاں اپنے اندر مقامی اثرات کو از بس سموئے ہوئے ہیں ’’لیکن جب پانچ صدیاں گزرگئیں اور اس میں نئے ذہنوں کی تخلیقی پیاس بجھانے کی صلاحیت باقی نہ رہی تو آنے والی نسلوں نے رفتہ رفتہ اسے ترک کردیا اور فارسی زبان و ادب سے نئی قوت حاصل کرکے اپنی تخلیق کی آگ کو روشن رکھا‘‘۔(جلد اول،ص۱۰۵)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے اپنے مؤقف کی وضاحت کے لئے نویں اور دسویں صدی ہجری کے ادب کا جائزہ لیا ہے۔ شیخ بہاؤالدین باجن کی تصنیف ’’خزائنِ رحمت اللہ ‘‘ کے خزینۂ ہفتم میں بیان کردہ اقوال و اشعار، جکریوں اور دوہروں کی زبان کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اردو شاعری کی پہلی قدیم ترین روایت قراردیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاعری کی صنف ’’جکری‘‘ کافنّی جائزہ لینے کے ساتھ بہاؤالدین باجن کی تصنیف کردہ جکریوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ بہاؤالدین باجن کے کلام کے لسانی مطالعے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باجن کے کلام میں اوزان سب ہندی ہیں۔ فارسی و عربی الفاظ کو اسی مزاج کے تحت ڈھالاگیا ہے اور اس وقت رائج مقامی زبانوں کے اصول و قواعد ملاجلا کراستعمال کئے گئے ہیں۔

قاضی محمود ریائی گجرات کے صوفیاء میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قاضی محمود ریائی کے دیوان جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام پرہندی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ گجرات ہی کے ایک اور نامور بزرگ شاہ علی محمد جیوگام دھنی کو ہندی اثرات قبول کرنے کی روایت کا نقطۂ عروج قراردیا ہے۔ شاہ علی محمد جیوگام دھنی کے کلام ’جواہر اسراراللہ‘ کا فکری و فنّی جائزہ نہایت عمدگی سے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ:

> ’’ان کی شاعری کا مجموعی مزاج ہندوی ہے جس پر ہندوی اسطور، روایت، صنمیات ورمزیات کا گہرارنگ چڑھا ہے---- باجن اور محمود دریائی کا کلام بھی اسی ہندوی روایت کی کڑیاں ہیں لیکن گام دھنی کے کلام میں ہندوی روایت بہت گہری ہوکر ایک نیا رخ، نیا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ گام دھنی کا کلام ہندوی روایت کا نقطۂکمال ہے لیکن یہاں

اور یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ فارسی روایت کے اثرات ہلکے ہلکے جذب ہوتے دکھائی دیتے ہیں‘‘۔(جلد اول،ص۱۱۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی شیخ خوب محمد چشتی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں فارسی روایت کے علم بردار قراردیتے ہیں۔ گویا جیوگام دھنی کے کلام میں جن فارسی اثرات کی ڈاکٹر جمیل جالبی نے نشاندہی کی ہے وہ اثرات شیخ خوب محمد چشتی کے کلام میں کھل کرسامنے آگئے ہیں۔ یہ وہ دور ہے (۱۵۷۲ء) جب اکبراعظم نے سلطنتِ گجرات کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا اور گجراتی تہذیب روبہ زوال تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سیاسی عوامل کی نشاندہی کی ہے جو معاشرے کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب پربھی اپنے اثرات مرتب کررہے تھے۔ شیخ خوب محمد چشتی کی سب سے اہم تصنیف ’خوب ترنگ‘ ہے۔’ خوب ترنگ ‘ اپنے عہد کی ایک مقبول کتاب تھی۔ اس کتاب کے تتبع میں دیگر کتب بھی لکھی گئیں جن میں محمد عاصم برہان پوری کی ’’نغماتِ حیات‘‘ اور شیخ محمد مخدوم کی ’’مفتاح التوحید ‘‘ قابل ذکرہیں۔ خوب محمد چشتی کی ’خوب ترنگ‘ میں تمثیلوں کو حکایت کی شکل میں بیان کیا گیا۔ ڈاکٹر تبسم کا شمیری کے مطابق ’’قدیم اردومیں شاید ’خوب ترنگ‘ ہی وہ پہلی شعری تصنیف ہے جس میں تمثیل نگاری کا رنگ اختیار کیا گیاہے‘‘۔(۳۹)

خوب محمد چشتی نے ایک تمثیل میں اردو ادب کے مشہور کردار شیخ چلی کی تمثیلی کہانی بیان کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس قصے کو مولانا عبدالرحمن جامی کی مثنوی ’’سلامان و ابسال‘‘ کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ’’خوب ترنگ‘‘ کے موضو ع، رنگِ سخن اور زبان و بیان کی نہایت عمدہ جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے کلام پر ہندوی روایت کے ساتھ ساتھ فارسی کے اثرات کا بھی سراغ لگایاہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خوب محمد چشتی نے ’خوب ترنگ‘ کی شرح،فارسی میں ’امواج خوبی‘ کے نام سے لکھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق خوب محمد چشتی کا یہ عمل اس دور کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی اثرات کے عین مطابق تھا۔ خوب محمد چشتی کی ایک اور اہم تصنیف ’’چھندچھندان‘‘ ہے جوکہ ایک منظوم رسالہ ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے فارسی عروض کو ہندوی عروض کے حوالے سے سمجھانے کی کاوش کی ہے۔ باب کے آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی نہایت عمدگی نے دکنی ادب پر گجری ادب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ’’گجرات اس وقت سارے برعظیم میں اردو زبان کا پہلا اور واحد مرکز تھا اس لئے جب دکن میں اردو کے نئے مراکز ابھرے تو وہاں کے اہل علم و ادب نے قدرتی طور پر گجری ادب کی روایت کو اپنایا‘‘۔(جلد اول،ص۱۲۸)ڈاکٹر تبسم کاشمیر ی بھی ڈاکٹر جمیل جالبی سے اتفاق کرتے ہیں کہ’’

سیاسی مرکز کے تبدیل ہونے سے گجری ادب کی روایت نقل مکانی کرگئی۔ مناسب حالات، ماحول اور فضاکے کشیدہ ہونے کے سبب یہ روایت سفر کرکے دکن میں پہنچ گئی''۔(۴۰)

فصل دوّم کے چوتھے باب کا عنوان ''دسویں، گیارہویں اور بارھویں صدی میں گجری اردو روایت '' ہے۔ یہ باب ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۷ء تک کے دورکاجائزہ لیتاہے۔ یہ باب تیسرے باب کی ہی توسیع شدہ صورت کو پیش کرتاہے۔ اس باب میں ان صوفیا ء، علماء اور شعراء کی تصانیف کا جائزہ لیاگیاہے، جو گجرات سے ہجرت کرکے دکن اور اس کے قرب و جوار مستقل ہوگئے تھے۔ ان صوفیاء میں سید محمد مہدی، میاں مصطفی، سید اسحٰق سرمست شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی گیارہویں صدی ہجری کو اردو ادب کی تاریخ میں دکن کی صدی قراردیتے ہیں۔یہ وہ دور ہے جب اورنگزیب کی فتح دکن کے بعد شمال اور جنوب پھر ایک ہوجاتے ہیں۔ جبکہ بارھویں صدی میں اردو زبان وادب کی علاقائی تخصیص بالکل ختم ہوجاتی ہے اور زبان و ادب کے حوالے سے ایک معیار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے باب کے آخر میں محمد امین گجراتی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس پورے دور کو ڈاکٹر جمیل جالبی فارسی سے (گوجری) اردو ترجموں کا دور قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد امین گجراتی کی دیگر مثنویوں، توّلدنامہ، معراج نامہ، وفات نامہ کاجائزہ لیاہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب تاریخ ادبِ اردو میں محمد امین کی جن تصانیف کا ذکر کیاہے ان میں اوپر بیان کردہ مثنویوں کے علاوہ ایک مثنوی ''معجزہ نامہ بی بی فاطمۂ بھی شامل ہے۔ (۴۱)جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کا ذکر نہیں کیاہے۔

فصل سوّم دوابواب پرمشتمل ہے۔ پہلا باب فصل سوّم کا تمہیدی باب ہے۔ اس باب کا عنوان ''پس منظر، مآخذ اور خصوصیات ''ہے۔ اس باب میں ۱۳۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک کے دورکا جائزہ لیاگیا ہے۔ اس تمہیدی باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت تفصیل سے ان سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل پر روشنی ڈالی ہے جواردو زبان و ادب کے تشکیلی دور میں اسے متاثر کرتارہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق امیر علاء الدین نے ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی اور بہمنی کالقب اختیار کیا۔ بقول جالبی:

> ''اب دکن کی سلطنت ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو شمال کے ترک ہونے کے باوجود خود کو ''دکنی'' کہنے پر فخر کرتے تھے۔ اس نئی سلطنت کی بنیاد میں شمال دشمنی کے جذبات شامل تھے۔ شمال دشمنی کے شوق میں انہوں نے سیاسی لائحہ عمل کے طور پر، ان تمام

عناصر کو ابھارا جو شمال سے مختلف اور خصوصیت کے ساتھ سرزمین دکن سے تعلق رکھتے تھے ''۔ (جلد اول،ص۱۵۰۔۱۵۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس '' شمال دشمنی '' کو ''مرکزگریز'' حکمت عملی کانام دیتے ہیں ''اور اس مرکز گریز حکمت عملی کی وجہ سے دکنی زبان ایک جداگانہ ریاستی تشخص کے اظہار کا ذریعہ ثابت ہوئی اس لئے اسے فروغ ملنے لگا''۔(۴۲)

دکن میں اردو کے پھیلنے، بڑھنے، پروان چڑھنے اور بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کرنے میں جن دیگر اسباب کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیاہے ان میں دکن میں مشترکہ زبان کی ضرورت اور اہمیت، مسلمانوں کا کردار اور بالخصوص بزرگانِ دین کے کردار پرروشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کے ادب کے موضوعات، اصناف، زبان، الفاظ، تلفّظ، املاء کے اصول اور گرائمر وغیرہ پر مثالوں کے ذریعے روشنی ڈالی ہے۔

دوسر ے باب میں کا عنوان ''ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں '' ہے۔ ذیلی عنوان (نظامی سے اشرف) ہے۔ اس باب میں ۱۴۳۰ء سے ۱۵۲۵ء تک کے ادب کا جائزہ لیاگیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، عین الدین گنج العلم سے منسوب کردہ رسائل کو محض افسانہ طرازی قراردیتے ہیں۔ شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں ان سے تین رسالے منسوب کئے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب' معراج العاشقین 'کو ان کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے بلکہ تحقیق سے ثابت کیا کہ' معراج العاشقین 'کااصل مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجا پوری ہیں۔

بہمنی دورکی سب سے قابلِ ذکر دریافت مثنوی' کدم راؤ پدم راؤ 'ہے (جس کے حوالے سے تفصیلی جائزہ تیسرے باب میں لیا جائے گا)بہمنی سلطنت کے زوال پذیر ہونے ساتھ ساتھ بیجا پور میں عادل شاہی سلطنت (۱۴۹۰ء) وجود میں آچکی تھی۔ اس عہد کے اہم شاعر میرانجی شمس العشاق ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میراں جی شمس العشاق کی تصانیف خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق اور مغزمرغوب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اردو کے بدلتے ہوئے خدوخال کی بھی نشاندہی کی ہے۔

میراں جی شمس العشاق کی طویل نظم کا نام ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شہادت الحقیقت تحریر کیاہے جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے داخلی شواہد کی بناپر اس نظم کو شہادت التحقیق قرار دیاہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے ان ادبی نمونوں کو ڈاکٹر جمیل جالبی اس لئے بھی اردو زبان کے ارتقائی دور کے حوالے سے اہم ترین قراردیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک :'' ہندی والے آج اس ادب کو اپنے رسم الخط میں منتقل کرکے اپنی تاریخ کو اردو کی بیساکھیوں پر صدیوں پیچھے تک لے جارہے ہیں ''۔ (جلد اول،ص۱۷۴)

نویں صدی ہجری تک اردو زبان اس قابل ہوجاتی ہے کہ جوکام فارسی سے لیاجارہاتھا اب اردو سے لیاجائے گا اس دور کے اہم بزرگ سید شاہ اشرف بیابانی ہیں۔ ان کی جن تصانیف کاڈاکٹر جمیل جالبی نے جائزہ پیش ہے ان میں لازم المبتدی‘، ’واحد باری‘اور نوسرہار‘ شامل ہیں۔ یہ وہ دورہے جب اس زبان کوہندوی یا دہلوی کے نام سے یاد کیاجاتاہے۔ اس دور کے ادب کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ:

> ’’بہمنی دورمیں، گجرات کی طرح، ہندوی روایت ہی کی توسیع ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و تہذیب کے اثرات بڑھتے چلے جاتے ہیں نظامی خالص ہندوی روایت کا ترجمان ہے۔ میاں جی کے ہاں فارسی طرز احساس اور تہذیب و زبان کے اثرات قدرے بڑھ جاتے ہیں۔ اشرف بیابانی کے ہاں یہ اثرات ذخیرۂالفاظ، آہنگ اور اندازِ بیان کی سطح پر اور زیادہ ہوجاتے ہیں ‘‘۔ (جلد اول،ص۱۷۹)

فصل چہارم اس کتاب کی سب سے بڑی فصل ہے جس میں آٹھ ابواب شامل ہے ہیں۔ اس فصل میں عادل شاہی دور ۱۴۹۰ء سے لے کر ۱۶۸۵ء تک کے دورکو موضوعِ بحث بنایاگیا ہے۔ تمہیدی باب کا عنوان ’’پس منظر، روایت اور ادبی،لسانی خصوصیات ‘‘ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب عادل خان بیجا پور کا حاکم بنا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے محمد قاسم فرشتہ کی ’تاریخِ فرشتہ ‘کے حوالے سے اس کا نام یوسف عادل شاہ بیان کیاہے۔ اس خاندان کے دور کے سیاسی، تہذیبی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس دور کو علم و ادب کے حوالے سے زرّیں دور قراردیتے ہیں۔ شاہی دفاتر میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی استعمال کیاجارہاتھا۔ گجرات، بیجاپور سے بہت قریب تھا لہٰذا ان دونوں ریاستوں کے درمیان تہذیبی ولسانی رشتے بہت گہرے تھے۔ گجرات کی بربادی، بیجارپور کی آبادی کا سبب بنی۔ گجری زبان و ادب پر ہندوی و سنسکرتی روایت اور اسطور کا گہرا اثر تھا حتیٰ کہ عربی و فارسی الفاظ پر اس کا اثر نظر آتاہے۔ اس رشتے کو ڈاکٹر جمیل جالبی اس طرح بیان کرتے ہیں :

> ’’گجری ادب اصل میں ہندوی روایت کی تجدید ہے اور بیجاپوری ادب بھی اسی روایتِ ادب کی مزید تجدید و توسیع ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فارسی طرزجیسے جیسے گہرا ہوتاجاتاہے ‘۔ ہندوی رنگ اسی اعتبار سے ہلکا پڑجاتا ہے‘‘۔(جلداول،ص۱۸۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اس دعوے کو تقویت پہنچانے کے لئے اس عہد کے زبان و ادب کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ بیجاپوری زبان و ادب تجزئیے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بیجاپوری اسلوب اور زبان اس لئے اجنبی محسوس ہوئے کیونکہ یہاں کے لکھنے والوں میں گجری کے زبان و ادب کو بطور معیار قبول کرنے کا رحجان پیدا ہوگیاتھا۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فارسی طرز احساس کو اپنایاگیالیکن فارسی اثرات، ہندوی اثرات کو کم نہ کرسکے کیونکہ بیجاپوری اسلوب میں مقامی زبانوں کے علاوہ سنسکرت وپراکرت کے ذخیرۂالفاظ اور مرکبات وضع کرنے کے طریقوں آوازوں، لہجوں کے آہنگ وغیرہ میں ہندوی پن غالب رہا۔ یہ اثر بیجاپوری ادب کے موضوعات پر بھی واضح ہے۔ اس دورکے ادب میں شاعری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ موضوعات میں تصوف و اخلاق کے ساتھ ساتھ محیّرالعقول واقعات کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا۔ شاعری کا مقبول ترین موضوع عشق تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کے جنگ کے حالات و واقعات، ان کی ذاتی زندگی کے واقعات مثلاً شادی وغیرہ، بزرگانِ دین کے کشف و کرامات اور مذہبی موضوعات اس دور کی شاعری کے اہم موضوعات تھے۔ وقت کے تقاضوں کے تحت دکنی اردو فارسی کے اثرات قبول کرنے لگی۔ بقول جالبی:’’ جب کسی تہذیب اور اس کے ادبی اسالیب تخلیقی ذہنوں کے لئے وجۂ تسّلی نہ ہوں تو ردعمل کی تحریک کا پیداہونا ایک فطری تہذیبی و لسانی عمل ہے ‘‘۔ (جلد اول،ص۱۹۴)

سلطان محمد عادل کے دور میں اسی ردّعمل کی تحریک کے اثرات واضح ہوکر سامنے آئے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ان اثرات کے نتیجے میں فارسی زبان سے ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تراجم کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے خیالات،اصناف،بحریں وغیرہ اس زبان کاحصہ بننے لگیں۔ غزل کا رحجان بھی فروغ پانے لگا۔ فارسی اثرات کے تحت عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کے ہندی طریقے کااظہار کم ہونے لگا۔ مرثیہ اور قصیدہ کی اصناف کو مقبولیت ملنی شروع ہوئی۔ ہجو گوئی کو فروغ ملا مذہبی موضوعات بھی موضوع سخن بنتے رہے۔ اس دور کی زبان مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمورہی تھی۔ ان زبانوں میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت اور گجری کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی زبان کے الفاظ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ قواعد کے بھیکوئی خاص اصول مقرر نہیں تھے۔ مختلف زبانوں کے مختلف اصول و ضوابط استعمال کئے جارہے تھے۔ ان سب اثرات کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے باب کے آخر میں اس دور کی زبان کا لسانی تجزیہ پیش کیا جس سے اس دور کی اردو کے رنگ وآ ہنگ کا اچھی طرح اندازہ ہوتاہے۔

فصل چہارم کے دوسرے باب میں ''گجر ی روایت '' کی توسیع ''ہندی روایت عروج'' کے عنوان سے اہم شعراء اور تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے اردو زبان و ادب کے ارتقاء اور روایت کے فروغ میں ان کے کردار کو واضح کیاہے۔ اس دور کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تین رحجانات کی نشاندہی کی ہے۔ ہندوی روایت کا رحجان جس کے نمائندہ شعراء جانم اور جگت گروہیں۔ ہندی اور فارسی کی مشترکہ روایت کا رحجان جس کے نمائندے عبدل اور شہباز حسین قادری ہیں جبکہ تیسرا رحجان خالص فارسی روایت کاہے جس کے نمائندے خواجہ محمد دیدار فانی ہیں۔ برہان الدین جانم کی ادبی خدمات دوحوالوں سے بہت اہم ہیں ایک یہ کہ انہوں نے تصوف کے فلسفۂ وجود کو مرتب کیا اور دوسرا تصوف و اخلاق اور شریعت و طریقت کو اپنی تصانیف، نظم و نثر کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی برہان الدین جانم کو گجری ادب کی روایت سے متعلق قراردیتے ہیں۔ جانم کے کلام سے اس بات کا ثبوت بھی مہیا کیاہے کہ وہ خود بھی اپنا تعلق گجری زبان کی روایت سے جوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے برہان الدین جانم کی جن شعری و نثری تصانیف کا جائزہ لیاہے ان میں وصیت الہادی، بشارت الذکر، منفعت الایمان، فرمان از دیوان، حجت البقاء، ارشاد نامہ، کلمہ الحقائق اور رسالہ وجودیہ شامل ہیں۔ برہان الدین جانم صوفیا نہ شاعری کی روایت کے مطابق اپنے گیت کے بولوں کو راگ راگنیوں کے مطابق لکھا ہے اور اس راگ کا نام بھی لکھا ہے جس میں اسے گا کر پڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،برہان الدین جانم کی دونثری تصانیف کلمتہ الحقائق اور رسالہ وجودیہ کے علاوہ ان سے منسوب نثری تصانیف کو مشکوک قراردیتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> ''اردو نثری کی تاریخ میں برہان الدین جانم کی اہمیت ان کی اوّلیت ہے ان سے پہلے کی کوئی نثری تصانیف ہم تک نہیں پہنچی۔ اب یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے 'معراج العاشقین 'خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر یابارہویں صدی ہجری کے اوائل کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف مخدوم شاہ حسین بیجاپوری ہیں۔ (جلد اول،ص۲۱۰)

اس دور کا ایک اور اہم شاعر ابراہیم عادل شاہ المعروف جگت گرو ہے اس نام کے مشہور ہونے کی وجہ ان کی موسیقی سے رغبت تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کی سب اہم تصنیف ''کتاب نورس''ہے۔ اس کتاب میں سترہ راگوں کے تحت ۵۹ گیت اور ستر(۷۰) دوہے ہیں۔ 'کتاب نورس' گیت نگاری کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل قراردی جاتی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے ہرراگ راگنی کے کے ساتھ لفظ نورس کا استعمال کیاہے۔ اس کے لئے اس نے اپنے محل، سکے،ہاتھی، شہر، کتاب، شراب، جھنڈے

وغیرہ کہ ساتھ بھی لفظ نورس کا اضافہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے دقتِ نظری سے ’ کتاب نورس ‘ کا فکری و فنّی جائزہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کتاب’ نورس ‘کی زبان کو مشکل قراردیتے ہیں۔ کتاب ’نورس ‘پر ہندودیومالا کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ نورس کے گیتوں کی زبان بیجاپور میں گجری روایت کا نقطۂ عروج ہے۔ گجری روایت کی ایسی پیروی ابراہیم عادل شاہ کے بعد کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعد آنے والوں پرفارسی اسلوب، لغت اور رمزیات کا اثر بڑھتادکھائی دیتاہے گویا ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس روایت کا ردّعمل نظر آتاہے۔ فارسی اثرات قبول کرنے کے باوجود بیجاپوری اسلوب پر گجری روایت کا اثرآخر تک باقی رہتاہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد کے ایک شاعر عبدل نے’ ابراہیم نامہ ‘کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں ہندی و فارسی اسلوب و آہنگ کی ایک کشمکش نظرآتی ہے۔ ڈا کٹر جمیل جالبی نے عبدل کے پورے نام اور حالات زندگی سے ناواقفیت کاا ظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حوالے سے پروفیسر زور اور پروفیسر مسعود حسین خان کی تحقیق کا نچوڑ پیش کیاہے۔ ان محققین کے مطابق اس کے نام عبدل کے نام کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ابراہیم نامہ سے درج ذیل شعر پیش کیاہے ؛

توعبدالکیتی صفت کرشہ بیاں
رہی ہے سو بھر کر زمین آسماں

’عبدل‘ کے آبائی وطن کے حوالے سے بھی معلومات دستیاب نہیں لیکن مثنوی میں موجود مصرعے ’’زبان ہندوی مجہ سوں ہوں دہلوی‘‘ سے ڈاکٹر جمیل جالبی قیاس کرتے ہیں کہ اس کا تعلق دہلی سے تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی عبدل کی نسبت اسی بات سے اتفا ق کرتے ہیں۔ ’’ عبدل اپنی زبان کو ہندوی کہتاہے اور اپنے دہلوی ہونے کا اعلان کرتاہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دلی کی زبان کو ہندوی کا نام دیتا ہے ‘‘۔ (۴۳)

مثنوی’’ گلزارِ ابراہیم ‘‘ کی تالیف کے وقت عبدل کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک ’نوی ‘بات کہنا اور دوسرا بادشاہ کی خوشنودی کاحصول۔’گلزارِ ابراہیم‘ مثنوی کی عام ہئیت میں ہے اور ۷۱۳اشعار پر مشتمل ہے۔’ ابراہیم نامہ‘ کے اسلوب کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتاب’ نورس‘ کا ردّ عمل قراردیا ہے اور’ ابراہیم نامہ‘ کو فارسی روایت کا پہلا ادبی روپ قرار دیا ہے۔

شہبا ز حسین قادری، بیجاپوری کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لئے کیا کہ ان کے کلام کے حوالے سے غلط فہمی دور ہو۔ انہوں نے تحقیق سے یہ ثابت کیاہے کہ قدیم بیاضوں میں پائے جانے

والے کلام جس میں ’’شہباز ‘‘ تخلص اختیار کیاگیاہے، اس کا تعلق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز یاشاہ شہباز (م ۹۳۴ھ) سے نہیں جوکہ شاعر محمود کے مرشد تھے۔خواجہ محمود دیدار فانی کی جن تخلیقات کا فکری و فنّی جائزہ لیاگیاہے اس میں دیوان فارسی، شرح گلشنِ راز، حاشیہ فصل الخطاب، شرح خطبہ البیان وغیرہ شامل ہیں۔ اردو غزل میں فانی کے کلام کی اہمیت سے انکار اس لئے ممکن نہیں کیونکہ اس نے بیجاپوری اسلوب کے مقابلے میں قدیم غزل کی روایت میں نیااسلوب اختیار کیا۔

تیسرے باب کا عنوان ’’ہندی اور فارسی روایت کی کشمکش ‘‘ہے،جو ۱۶۲۷ء سے ۱۶۴۰ء تک کے دور کا احاطہ کرتاہے۔ باب کی تمہید میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سیاسی عوامل کی نشاندہی کی ہے جو بیجاپور اور گولکنڈہ کو علم و ادب کا گہوارہ بنانے میں معاون تھے۔ اس باب میں سب سے پہلے جس شاعر کے کلام کاجائزہ لیا گیا ہے وہ مرزا مقیم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پروفیسر زور اور نصیرالدین ہاشمی کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ مرزا محمد مقیم ہی وہ شخص ہے جس نے’’ چند ر بدن اور مہیار‘‘ مثنوی لکھی اور مقیمی تخلص اختیار کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق کے ذریعے مختلف شہادتوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ میرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔میرزا مقیم فارسی کا شاعر تھا جو سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور اس نے قلعۂ اکبری کی فتح کے موقع پر ’فتح نامہ‘ مرتّب کی اورمقیمی،’چندربدن و مہیار‘کا مصنف ہے جبکہ مقیمی کسی بادشاہ کا متوسل بھی نہیں تھا کیونکہ اسکی مثنوی میں شاہ کی مدح میں اشعار نہیں ملتے جو اس وقت کے عام رواج کے خلاف ہے۔ داخلی شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی استنباط کرتے ہیں کہ مقیمی نے یہ مثنوی غواصی کے تتبع میں لکھی۔ مرزا محمد مقیم کی صرف ایک اردو مثنوی ’’فتح نامہ بکھیری‘‘ دستیاب ہے جو اس نے سلطان محمد عادل شاہ اور راجہ اپربھدراکے درمیان ۱۶۳۷ء میں ہنے والی جنگ کے حوالے سے لکھی۔ مثنوی میں بیان کردہ جنگ کے واقعات اور کتب تاریخ میں بیان کردہ اس جنگ کے واقعات میں کافی اختلاف پایا جاتاہے۔ اس مثنوی میں استعمال کی گئی تراکیب اور بندشوں پر فارسی اثرات بہت گہرے ہیں۔

مقیمی کی ’’چندربدن اور مہیار‘‘ کو ڈاکٹر جمیل جالبی بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے تحقیق اور شواہد کی بنیاد پر اس مثنوی کازمانہ تصنیف ۱۰۳۵ء کے بعد اور ۱۰۵۰ء سے پہلے متعین کیاہے۔ ’’چندربدن مہیار‘‘ داستانی مزاج کی حامل مثنوی ہے۔ مثنوی کے حصے کاجائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی ان مثنویوں کا ذکرکرتے ہیں جن میں اسی قصے کو موضوعِ سخن بنایاگیاہے۔ ’’چندربدن ومہیار‘‘ کے اسلوب کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو اسالیب (بیجاپوری اسلوب اور فارسی اسلوب) کی آمیزش و آویزش کے عبوری دور کی درمیانی کڑی قراردیا

ہے۔ باب کے آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد بن احمد عاجز کی دومثنویوں ’’یوسف زلیخا‘‘ اور ’’لیلیٰ مجنوں‘‘ کا جائزہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد بن احمد عاجز کے کلام کا موازنہ اس کے والد شیخ احمد عاجز سے کیاہے دونوں کے کلام میں تقریباً ۵۰ سال کا عرصہ حائل ہے۔ دونوں کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ’’ ۵۰ سال کے اس عرصے میں اردو زبان تیزی کے ساتھ فارسی زبان کے زیر اثر ڈھل منجھ کر ایک نئے ادبی معیار کی طرف بڑھ رہی ہے‘‘۔(جلد اول،ص۲۴۸)

چوتھے باب کا عنوان ’’فارسی روایت کا رواج ‘‘ ہے اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۶۴۰ء سے لے کر ۱۶۵۷ء تک کے دور کا جائزہ لیاہے۔ ملک خوشنود اس دور کا ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس کا بہت سا کلام ناپید ہے۔ جنت سنگار (امیرخسرو کی مثنوی ھشت بہشت کا آزاد ترجمہ) چند غزلیں، ایک ہجو اور ایک مرثیہ دستیاب ہے۔ باب کے حواشی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے، ڈاکٹر زور کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے ملک خوشنود سے ایک مثنوی ’’بازارِ حسن ‘‘ منسوب کی ہے۔ ہشت بہشت اور جنت سنگار کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے کچھ امور کی نشاندہی کی ہے مثلاً یہ ترجمہ بیت بہ بیت نہیں، کہیں اشعار چھوڑ دئیے گئے ہیں اور کہیں بڑھا دئیے گئے ہیں، کہیں مفہوم کی ادائیگی اپنے الفاظ میں کی گئی ہے، کہیں ردیف قافیہ، معنی اور رمزیات و تلمیحات تبدیل کردئیے گئے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود مثنوی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ ملک خوشنود کی یہ کوشش فارسی زبان اور دکنی اردو کو مزید نکھار نے میں معاون ثابت ہوئی۔ یاد رہے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ’جنت سنگار‘‘کو اپنی کتاب میں ’’جنت سنگات‘‘ لکھاہے۔

اس دور کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو رحجانات کی نشاندہی کی ہے ایک رحجان فارسی اسلوب و آہنگ کے پھیلنے اور جذب ہونے کا رحجان ہے۔ دوسرا رحجان طویل نظموں کا ہے اس دور میں جتنی طویل نظمیں لکھی گئیں دوسرے ادوار میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔اسی دور میں ترجموں کے حوالے سے ایک مثنوی امین نامی شاعر نے’’ بہرام حسن بانو‘‘ کے نام سے لکھی امین اس مثنوی کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔اس دور کے صوفی شاعر دولت شاہ نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا یا۔ تراجم کے حوالے سے اس دور کا ایک اور اہم کارنامہ کمال خان رستمی کا ’خاور نامہ ‘ہے۔ ’خاور نامہ‘ ایک طویل فارسی مثنوی ہے جسے شاہ نامہ فردوسی کی روایت میں ابن حسام نے تحریر کیا۔ ’خاور نامہ‘ کے فارسی مخطوطوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچے ہیں کہ ان دونوں مخطوطوں کی ترتیب و تدوین میں فرق ہے۔ اشعار کی تعداد میں بھی فرق

ہے لہذا ڈاکٹر جمیل جالبی نے قیاس کیاہے کہ ’’خاور نامہ‘‘ کا ترجمہ کرتے ہوئے رستمی کے سامنے کوئی اور نسخہ اور ہوگا ’’خاور نامہ‘‘ کو رستمی کا کارنامہ قراردیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

’’رستمی نے ایک ایسی زبان کی شاعری کا ترجمہ جواپنی پختگی کا اظہار تقریباً چھ سو سال پہلے ’’شاہنامہ فردوسی ‘‘ میں کرچکی تھی،دکنی اردو میں کرکے،جوابھی اپنے تشکیلی دور سے گزررہی تھی، نہ صرف اپنے شاعرانہ کمال کا ثبوت دیا بلکہ خود اس زبان کی غیرمعمولی صلاحیتوں کو بھی سامنے لایا‘‘۔ (جلد اول،ص۲۶۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ’خاور نامہ‘ کے قصّے اور اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اسے فارسی سے قدیم اردو زبان میں ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال قرار دیاہے۔ اس طویل مثنوی کے علاوہ کمال خان رستمی کی غزل کا تنقیدی جائزہ بھی لیاہے۔ اس دور کا ایک اہم شاعر صنعتی ہے۔ صنعتی کے مکمل نام اور سوانحی حالات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے گمان غالب کے ساتھ صنعتی کو ابراہیم خان صبعی قراردیا ہے جس کا ذکر بقول جالبی ۱۶۴۱ء میں ظہور ابن ظہوری نے ’محمدنامہ‘ (۴۴)میں ذکرکیاہے۔ بقول جالبی:’’ اہل تحقیق نے لکھا ہے صبعی ’’کاتب ‘‘ کی غلطی سے بگڑ کر صنعتی ہو گیا۔ وہ خصوصیات جوظہور نے صبعی کے بارے میں ’’محمد نامہ‘‘ میں لکھی ہیں، قصہ بے نظیرمیں واضح طور پر نظرآتی ہیں‘‘۔(جلداول،ص۲۷۵)

صنعتی نے یہ مثنوی ۱۶۴۵ء میں تحریر کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کے قصے اور اسلوب کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے اور اسے سواتین سوسال پہلے کے قدیم اردو ادب میں ’’گوہرِشبِ چراغ‘‘ کا خطاب دیاہے۔

پانچویں باب کا عنوان ’’غزل کی روایت کا سراغ ‘‘ ہے۔ ذیلی عنوان ’حسن شوقی ‘ (م۔۱۶۳۳ء) ہے۔’حسن شوقی ‘ کے دیوان کی تدوین ڈاکٹرجالبی کاایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ حسن شوقی کی مثنویات اور غزلیات کا جائزہ تدوین کے باب میں تفصیلی طور پر لیاجائے گا۔چھٹا باب بعنوان ’’مذہبی تصانیف پرفارسی اثرات‘‘ ۱۶۴۰ء تا ۱۶۷۵ء تک کے دور کااحاطہ کرتاہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حصے میں مذہبی تصانیف کا تجزیہ پیش کیاہے جن پر فارسی زبان کے اثرات تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ جن صوفیا ء کی تصانیف کا جائزہ لیاگیاہے ان میں شیخ داول، شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ شامل ہیں۔ شیخ محمد داول کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے کچھ دستیاب مخطوطوں سے داخلی شواہد کی بنیاد پر ان کا سال وفات ۱۰۶۸ھ متعین کیاہے۔ شیخ داول کے کلام میں چہار شہادت، کشف الانوار، کشف الوجود اور ناری نامہ اور خیال دستیاب ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیخ داؤل کی نظموں اور خیال کا فکری و فنّی تجزیہ نہایت عمدگی سے پیش کیاہے اور نتیجہ اخذ کیاہے کہ ''وہ جانم کی روایت کے مبصّرومفسّرہیں اور جب بھی جانم کانام آئے گا داول کا نام بھی انہی کے ساتھ لیاجائے گا''۔(جلد اول،ص۳۰۵)

شیخ محمود الحق خوش دہاں اس دور کے ایک اور اہم صوفی بزرگ تھے جوجانم ؒکے مرید تھے۔ ان کے اہم تصنیف 'معرفت السلوک' ہے جس میں خوش دہاں نے جانم ؒکے فلسفے کووضاحت اور دلیل کے ساتھ پیش کیاہے۔ 'معرفت السلوک ' کے علاوہ خوش دہاں کا تصوف کے مخصوص مسائل پر ایک فارسی رسالہ، ایک بیاض اور ایک اردو رسالہ تصوف بھی دستیاب ہیں۔ شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ جانم کے فرزند تھے اور خوش دہاں ان کے اتالیق مقرر کئے گئے تھےشاہ امین الدین اعلیٰ کی یادگار تصانیف میں ''عجب نامہ'' رموز السالکین '، 'کلام اعلیٰ ' اور' وجودیہ' شعری تصانیف ہیں جبکہ چندخیال، ریختہ اور غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ نثری تصانیف میں ''گفتارِ حضرت امین ''، ''وجودیہ '' اور ' کلمۃ الاسرار 'شامل ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری 'امین الدین کی تصانیف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''امین الدین اعلیٰ کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ انہوں نے نظم ونثر میں بہ یک وقت بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی جن کتابوں کے حوالے ملے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔گنج مخفی، رسالہ وجودیہ، گفتار امین الدین، عشق نامہ، شرح کلمہ طیبہ، کلمۃ الاسرار، معبود نامہ، چکی نامہ، وصل نامہ، محبت نامہ، نورنامہ اور رموز السالکین وغیرہ ''۔(۴۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے امین الدین اعلیٰ کی شعری و نثری تصانیف کے موضوع اور اسلوب کا عمدہ تجزیہ پیش کیاہے۔ امین الدین اعلیٰ کی نثری و شعری تصانیف کا موضوع اخلاق اور تصوف ہے۔ اعلیٰ نے اپنے پیش روصوفی شعراء کی روایت کے مطابق گیتوں کے بول مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق ترتیب دیے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک بار پھر اپنے اس دعوے کودہرایا ہے کہ معراج العاشقین حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں بلکہ سلسلہ امینیہ کے کسی مرید کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی انداز بیاں کے اعتبار سے اعلیٰ کی نثر کو ان کی شاعری کی نسبت صاف قرار دیتے ہیں۔ اعلیٰ کی نثر میں اپنے پیش رو کی نسبت ربط، ترتیب کے ساتھ ساتھ اور فعل، فاعل اور

مفعول کی ترتیب میں بڑی حد تک باقاعدگی آچکی ہے۔ اعلیٰ کی نثری مذہبی تصانیف اپنے عہد کے اسلوب کی عمدگی سے نمائندگی کرتی ہیں۔ یہی ان کی اہمیت کا سبب ہے۔

چوتھی فصل کا ساتواں باب بعنوان'' دکنی ادب کا عروج '' ہے۔یہ باب۱۶۵۷ء تا ۱۶۷۵ء کے دور کا احاطہ کرتاہے۔ اس عہد کے نمائندہ شعراء میں علی عادل شاہ ثانی تخلص شاہیؔ اور نصرتیؔ کے کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیاہے۔ شاہی نے جن اصناف سخن میں طبع زمائی کی ان میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مرثیے، گیت،کبت اور دوہر ے شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہی کی قصیدہ نگاری پرنصرتی کے قصائد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دووجوہات کا ذکرکیا ہے۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ نصرتی درباری شاعر تھا اور بادشاہ کے کلام پر اصلاح دیتاتھا اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شاہی نے نصرتیؔ کے قصیدوں کو معیار بناکر قصیدہ نگاری شروع کی۔ شاہی کی قصیدہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :''شاہی نے فارسی قصیدے کی روایت کو اردو میں سمونے اور نبھانے کی کوشش کی اور زور بیان سے اپنے اجلے تخیل اور احساس موسیقی سے ایسا رنگ بھر کہ اردو قصیدے کی روایت میں شاہی کو نظرانداز نہیں کیاجاسکتا''۔ (جلد اول،ص۳۲۵)

شاہی کی شاعری کا عام رحجان طربیہ ہے۔ اسی طربیہ اور نشاط انگیز رحجان کے باعث شاہی نے خود اپنی شاعری کو ''طرزشاہی'' کا نام دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہی کی شاعری پر فارسی اثرات کے ساتھ ساتھ بیجاپور کے مخصوص ادبی اسلوب کے رنگ کی نشاندہی کی ہے اور دکن میں فارسی اسلوب و طرز احساس کی پیروری کو شمال کی تہذیبی و سیاسی فتح قرار دیتے ہیں۔ اس دور کا اہم ترین شاعر محمد نصرت نصرتیؔ ہے۔ نصرتیؔ کی سوانح، کلام اور اس کے عہد کی زبان کا لسانیاتی مطالعہ جو کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش کیاہے اس کا جائزہ تدوین کے باب میں لیاجائے گا۔ اردو زبان کے تشکیلی دور میں تاریخ زبان اردو میں نصرتی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس رائے کوبیان کرنا ضروری ہے جوانہوں نے اردو زبان و ادب میں نصرتی کے مقام کے حوالے سے دی:

> ''بحیثیت شاعر نصرتی قدیم اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک ہے جس کی بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی طویل مثنویاں لکھ کر اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا۔ قصیدے میں اس کا نام سودا اور ذوق کے ساتھ لیاجاتاہے۔ وہ ایک باشعور فن کار ہے جسے یہ معلوم ہے کہ وہ کیاتخلیق کررہاہے اور اسکی ہئیت و نوعیت کیا ہونی چاہیے؟یہاں یہ سوال اٹھا یا جاسکتاہے کہ جب فنّی اور شاعرانہ امتیاز سے وہ اتنا

عظیم شاعر ہے تو آخر اب تک اردو ادب کی تاریخ میں نصرتی کو وہ مقام کیوں میسر نہ مل سکا جو اس کے بعد کے شعراء میں سے ولی کو میسر آیا ؟ اس کی وجہ نصرتی کی شاعری نہیں بلکہ اظہار و بیان کی وہ روایت ہے جس میں نصرتی نے اپنے کمال شاعری کو پیش کیا اور جو مغلوں کی فتح دکن کے بعد ادب کے معیار اسلوب کی حیثیت سے متروک ہوگئی ''۔ (جلد اول،ص۳۵۱)

ڈاکٹرتبسم کاشمیری بھی ڈاکٹرجمیل جالبی کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں اور لکھتے ہیں ؛'' بیجاپور کے زوال کے بعد مقیمیؔ، شاہیؔ، رستمیؔ، حسن شوقیؔ اور نصرتیؔ کا بیجاپور تاریخ کے پیش منظر سے ہٹ کر پس منظر میں چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دکنی ادب کی روایت بھی ماضی حصہ بن گئی''۔(۴۶)

آٹھواں باب بعنوان ''نیا عبوری دور '' ۱۶۵۷ء تا ۱۶۸۵ء تک کے دور کا جائزہ لیتاہے۔ اس عہد کے سیاسی منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس دور کی شاعری کے موضوعات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس تہذیب کو نسائیت کی حامل تہذیب قراردیتے ہیں اور اسی وجہ سے اس دور کی شاعری زنانہ پن اور بے عملی کا شکار نظرآتی ہے۔ اس عہد میں جو شعراء سامنے آتے ہیں ان میں سید میراں میاں خاں ہاشمیؔ شامل ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے انہیں پیدائشی اندھا بتایاہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اس رائے سے متفق نہیں ہیں ان کے مطابق ہاشمیؔ کے کلام کی داخلی شہادت سے محسوس ہوتاہے کہ وہ پیدائشی اندھے نہ تھے۔ ڈاکٹرجالبی نے ہاشمیؔ کی جن تصانیف کا جائزہ پیش کیاہے ان میں 'مخمس درنعت و مدح مہدی جونپوری'، 'معراج نامہ'، 'مثنوی عشقیہ'، مثنوی یوسف زلیخا 'اور دیوان ہاشمی شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ہاشمیؔ کی ''عشقیہ مثنوی '' کو دلچسپ ترین قراردیتے ہیں کیونکہ ہاشمی نے اس مثنوی میں دوقصے انتہائی خوبصورتی سے بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ہاشمیؔ کو عبوری دور کی زبان و بیان کا شاعر قرار دیتے ہیں کیونکہ ایک طرف وہ قدیم ادب کے زبان و ادب کا گہرااثر لئے ہوئے ہے وہیں ولی کی زبان و بیان کے امکانات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ 'یوسف زلیخا' جوکہ ہاشمی کی طویل ترین مثنوی ہے ۵۱۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹرجالبی ہاشمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہو ئے لکھتے ہیں:

''ایک اندھے کا اتنی طویل مثنوی لکھنا۔۔نہ صرف یہ مثنوی لکھنا بلکہ غزلیات کے دیوان، قصائد اور عشقیہ مثنوی وغیرہ بھی یادگار چھوڑنا۔۔اردو ادب کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔ ہاشمی کے تخیل نے وہ

کردکھایا جوآنکھ والے بھی نہ کرسکے۔ ہاشمی بیجاپور کاآخری بڑاشاعر ہے جس نے دکھنی زبان کواظہار کی نئی سطح دے کر اپنی شاعری میں محفوظ اور ساتھ ساتھ اسے جدید اسلوب سے قریب تربھی کردیا‘‘۔ (جلد اول،ص۳۶۳)

غزل کے بطور صنف سخن ابھرنے کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کی واضح تبدیلی قراردیا ہے۔ عبوری دورکی غزلوں میں مثنوی اور طویل نظم کا مزاج نظرآتاہے۔ اختصار اور ایجاز جوغزل کی خوبی ہے،اس دور تک کی غزل میں نظرنہیں آتی۔ ہاشمی ؔکی غزل بھی انہی خصوصیات کی حامل ہے اور موضوعات کے لحاظ سے بھی نشاطیہ اور عیش و طرب کا رحجان غالب ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس نشاطیہ رحجان کو دورِ زوال کی علامت قراردیا ہے۔ اس دور کے دیگر اہم شعراء جن کا کلام دستیاب ہے ان میں عبدالمومن مومن کی مثنوی عشق نامہ، محمد امین ایاغی کی مثنوی نجات نامہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مومن ؔ اور ایاغیؔ کی مثنویات کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ بھی نہایت عمدگی سے پیش کیااور اس دور کی زبان اور ادب کے بدلتے ہوئے مزاج کا جائزہ لیاہے۔ عبوری دور کی دو اہم اصناف غزل اور مرثیہ کو قرار دیا گیا ہے۔ مرثیہ نگاری کے حوالے سے عبوری دور کے اہم شاعر مرزابیجاپوری کے مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :’’یہاں پہلی بار مرثیے کا وہ رنگ ابھرتاہے جو آگے چل کرشمالی ہند کے مرثیہ گویوں کے ہاں داستانی شکل میں ظاہرہوتاہے ‘‘۔ (جلد اول،ص۳۷۴)

جلد اوّل کی فصلِ پنجم کا عنوان’’ قطب شاہی دور ‘‘ ہے اس فصل میں ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۶ء تک زبان و ادب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ پہلے باب کا عنوان ’’پس منظر ‘‘ روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات ہے۔ پہلا باب حسبِ روایت تمہیدی باب ہے اور جس میں ایک سو اڑسٹھ سالوں پر محیط عرصے کا تفصیلی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، لسانی و ادبی جائزہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق قطب شاہی سلطنت نے اردو زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون کی ترقی کے حوالے سے قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔فارسی زبان کو بطور دفتری زبان کے استعمال کیااسی وجہ سے فارسی زبان کا اثر و رسوخ بڑھنے کے ساتھ ساتھفارسی اصناف بھی تیزی سے اردوادب کا حصہ بننا شروع ہوئیں۔یہ دور اخذو ترجمے کے حالے سے بھی اہم ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ’’ فارسی روایت کا آغاز‘‘ ہے۔ اس باب میں ۱۵۱۸ء سے لے کر ۱۵۸۰ء تک کے دور کا جائزہ لیاہے۔ اس دور کے شعراء کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب سے پہلے فیروز بیدری کے کلام کا مطالعہ پیش کیاہے۔ فیروز کی’ پرت نامہ‘ جوکہ ۱۲۱، اشعار

پر مشتمل ہے، کاجائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ فیروز نے اس وقت کی زبان کو وہ لہجہ اور طرز دیا جسے نئی نسل کے شعراء نے تصرف میں لاکر نہ صرف عام اور پامال کیابلکہ اس کی ندرت ختم ہوگئی۔ فیروز کی غزلوں پر پنجابی لب ولہجہ کے اثرات بہت واضح ہیں۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک دفعہ پھر اپنے دعوے کا اعادہ کرتے ہیں کہ اردو زبان کی تشکیل و تعمیر میں اہل پنجاب نے ابتداء ہی سے اپنا حصہ ڈالا۔

اس دور کا ایک اور اہم شاعر محمود ؔہے۔ محمود ؔکے دستیاب کلام میں غزلیں،جھولنا، (گجری صنف ادب) مرثیہ، قصہ، گیت اور دوہرے شامل ہیں۔ محمود ؔکے کلام کے مطالعے سے ڈاکٹر جمیل جالبی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ محمود ؔکی غزل میں جوروانی، سلامت اور شیرینی پائی جاتی ہے وہ اس دور کے کسی اور شاعر کے ہاں مفقود ہے۔ محمود ؔکی غزل قافیے اور ردیف کی ہئیت پر قائم کی گئی ہے۔ فارسی تراکیب اور بندشیں جومحمود ؔنے استعمال کیں اس دور کے کسی شاعر کے ہاں نظر نہیں آتیں۔ محمود ؔکی غزل میں موضوعاتی تنوّع بھی موجود ہے۔ حسن و عشق کے بیان کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف تجربات کا بیان بھی ان کی غزل کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انہی خصوصیات کی بنا پرمحمودؔ کو اردو غزل کی روایت کا معمارِ اول قرار دیا ہے جبکہ ڈاکٹر تبسم بھی انہیں بجاطور پر ولی ؔکا پیش رو قرار دیتے ہیں۔ ملا خیالیؔ، فیروز ؔاور محمود ؔہی کا ہم عصر شاعر تھا۔ اس کی صرف ایک غزل دستیاب ہے جوڈاکٹر جمیل جالبی ہی کی دریافت ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق خیالی کی غزل کا مزاج اس کے ہم عصر شعراء فیروز، محمود اور حسن شوقی کی غزلوں سے ملتاہے۔ ڈاکٹر تبسم کا شمیری خیالی کی غزل کے حوالے سے رقم طراز ہیں :’’ یہ غزل قطب شاہی دور کے نشاطیہ طرز احساس کی عکاس ہے۔ اس کی تشبیہوں، استعاروں اور مثالوں میں مقامی وجود کا گہر ا رنگ ملتاہے۔ اس غزل میں گولکنڈہ کی شعری روایت میں سراپا نگاری کاغالب رحجان بھی موجود ہے‘‘۔(۴۷)

تیسرے باب کا عنوان ’’ فارسی روایت کا عروج ‘‘ ہے جو ۱۵۸۰ تا ۱۶۱۰ء کے دور کا جائزہ پیش کرتاہے۔ باب کی ابتدا ء میں اس عہد کے سیاسی منظر نامے کاخلاصہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس عہد کو ایشیاء کی نشاۃِ الثانیہ قرار دیتے ہیں۔ محمد علی قطب شاہ اسی عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ علی قطب شاہ کے دیوان کو اس کے داماد اور بھتیجے (جوتخت کا وارث بھی تھا) نے فارسی طریقے سے بہ اعتبار حروفِ تہجی ترتیب دیا۔ ڈاکٹرجالبی نے کلیاتِ قلی قطب شاہ کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے اور اس کی شاعری کے فکرو فن پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق قطب شاہ نے اپنی کلیات میں سترہ تخلص استعمال کئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نشاۃِ الثانیہ کے حوالے

سے یورپ اور ایشیاء کے مختلف خطوں کے مشترکہ رحجانات کا جائزہ لیاہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کے دیگر خطوں کی طرح نشاۃ الثانیہ کے اس عہد میں عوامی روایت خواص کی روایت سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ عوام، خواص کے رحجانات ان کے نزدیک یہ تھے کہ:

’’یہاں کا درباری شاعر، انور ی و خاقانی کے تتبع میں قصیدے لکھتااور سعدی وحافظ کی پیروی میں غزلیں کہتا۔ دوسری طرف عوام کا طبقہ تھا جو علاقائی زبانوں میں گیت،کبت اور دوہروں کے ذریعے اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کرتا۔۔۔۔چنانچہ محمد قلی قطب شاہ مشترک زبان میں خواص کی روایت کو ایک ایسی عوامی سطح پر لے آتاہے جہاں عوام وخواص دونوں فکرو اظہار میں ہم آہنگ ہوجاتے ہیں ‘‘۔ (جلد اول،ص۴۱۲۔۴۱۳)

قلی قطب شاہ نے جن اصناف میں طبع زمائی کی ان میں قصیدے، مثنویاں، مرثیے، غزلیں، قطعات، نظمیں اور رباعیات شامل ہیں جبکہ اس کے موضوعات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے اسی لئے ڈاکٹر جمیل جالبی اسے اس دور کا تخلیقی معیار قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قلی قطب شاہ کی شاعری کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کہا اس کی دلچسپی کے دو مراکز عشق اور مذہب کا خصوصی جائزہ لیاہے۔ قلی قطب شا ہ کا تصوّر مذہب عام تصوّر مذہب سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ مذہب کو زندگی حکومت، دولت، عروج اور دینوی اعزاز حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتاہے اور عشق،اس کے لئے زندگی کی لذتوں اور رعنائیوں کا ضامن ہے۔ قلی قطب شاہ کی عشقیہ زندگی کی عکاسی اس کی شاعری میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ’تاریخ ادب اردو ‘ میں قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریوں کے نام گنوانے کے ساتھ ساتھ ان تین پیاریوں کے سراپے بھی بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری قلی قطب شاہ کو جبلّتوں کا شاعر قراردیتے ہیں۔ قلی قطب شاہ اور اس کے معاصرین کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’محمد قلی قطب شاہ اور اس کے معاصرین زندگی کو ایک ایسے افق سے دیکھتے ہیں جہاں ان کی نظریں جسم پر مرکوز ہوجاتی ہیں مگر وہ اس جسم کے باطنی مرکز کی طرف سفر نہیں کرتے۔ جسم، جسم ہی رہ جاتاہے کسی دوسرے تجربے کا استعارہ نہیں بن پاتا۔ وہ مابعد الطبعیات کے مسافر نہیں ہیں۔ ان کا سارا کھیل اس طبعی دنیا کا تھا ‘‘۔ (۴۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر ملک حسن اختر نے قلی قطب شاہ کی شاعری پر حافظ شیرازی کے اثرات کا ذکرکیاہےڈاکٹر ملک حسن اختر کے مطابق ''اس نے حافظ کی غزلوں کا ترجمہ اردو میں کردیاہے ''۔ (۴۹)

ڈاکٹرجالبی، حافظ اور محمد قلی کے ذہنی قرب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حافظ سے محمد قلی کے ذہنی قرب کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کے ہاں نشاط اور طرب کیفیت مشترک ہے لیکن دونوں کے ہاں سطح مختلف ہے۔ حافظ کے ہاں عشق آفاقیت لئے ہوئے ہے اور مستی کی سطح رفیع ہے محمد قلی کے ہاں عشق جسمانی ہے اور مستی پست درجے کی ہے ''۔ (جلد اول،ص۴۲۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر ملک حسن اختر نے قلی قطب شاہ کی شاعری پر حافظ شیرازی کے اثرات کا ذکرکیاہےڈاکٹر ملک حسن اختر کے مطابق ''اس نے حافظ کی غزلوں کا ترجمہ اردو میں کردیاہے ''۔ (۴۹)

ڈاکٹرجالبی، حافظ اور محمد قلی کے ذہنی قرب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حافظ سے محمد قلی کے ذہنی قرب کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کے ہاں نشاط اور طرب کیفیت مشترک ہے لیکن دونوں کے ہاں سطح مختلف ہے۔ حافظ کے ہاں عشق آفاقیت لئے ہوئے ہے اور مستی کی سطح رفیع ہے محمد قلی کے ہاں عشق جسمانی ہے اور مستی پست درجے کی ہے ''۔ (جلد اول،ص۴۲۰)

ڈاکٹرجالبی نے قلی قطب شاہ کی شاعری پرجن دیگر فارسی اور مقامی شعراء کے اثرات کاذکر کیاہے ان میں انوری، خاقانی، نظامی، عنصری، ظہیر فاریابی، محمود اور منیر شامل ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس کے برعکس محمد قلی قطب شاہ کو دکنی رو ایت کا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:
''اس پرفارسی اثرات نسبتاً کم دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستانی دیومالا میں گہری دلچسپی اور زمینی رشتوں سے گہرے طور پر منسلک ہونے کے سبب اس کا لسانی شعور بنیادی طور پر مقامی ہی رہتاہے وہ اس لسانی شعور کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے حافظ کی جوغزلیں فارسی سے ترجمہ کی ہیں ان میں فارسی لغت کا اثر زیادہ ملنا چاہیے تھا لیکن ان غزلوں میں بھی اس کی مقامی روح پھڑپھڑانے لگتی ہے، اس کے ہاں فارسی روایت کا تجربہ دبا دبا سالگتاہے ''۔(۵۰)

محمد قلی قطب شاہ اردو زبان و ادب کی روایت کا اہم ترین موڑ ہے اگرچہ اس کے موضوعات میں باطن کاعکس نہیں ملتا لیکن تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ قلی قطب شاہ کی شاعری تاریخی و تہذیبی اعتبار سے اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیخ احمد گجراتی کی دو مثنویوں' لیلیٰ مجنوں '(جوکہ نامکمل دستیاب ہے) اور 'یوسف زلیخا 'جوکہ چار ہزار اشعار پرمشتمل ہے کا جائزہ لیا ہے۔ 'یوسف زلیخا ' کی دریافت کا سہرا بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے سر ہے۔ 'یوسف زلیخا' اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس مثنوی سے شیخ احمد کے حالات، وطن، علمیت، تعلیم، خلافت اور فن شاعری کے حوالے سے اہم معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قرائن سے 'یوسف زلیخا' کو مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے بعد پہلی معلوم مثنوی قرار دیتے ہیں۔ جالبی،شیخ احمد گجراتی کے اسلوب کو بیجاپور کا ادبی اسلوب قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق احمد گجراتی تاریخ کے ستم کا شکار ہوئے کیونکہ اس دور کا جدید اسلوب فارسی رنگ سخن کی پیروی تھا جس سے احمد گجراتی نے شعوری طور پر احتراز کیا اور 'یوسف زلیخا 'اور 'لیلیٰ مجنوں' جیسے کا رنامے انجام دینے کے باوجود اس کا نام وقت کے ساتھ ساتھ اس دور کے قابل ذکر شعرء کی فہرست سے خارج ہوگیا۔ مثنوی کے برخلاف احمد گجراتی کی غزل میں فارسی روایت کی پیروی نظرآتی ہے اس لئے غزل کی سطح پر احمد اور دوسرے دکنی شعراء ہم مرتبہ نظرآتے ہیںڈاکٹر جمیل جالبی احمد گجراتی کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جس زبان میں احمد گجراتی نے شاعری کی ہے وہ محض سو پچاس سال پرانی نہیں بلکہ اس میں صدیوں کے لسانی عمل کی تخلیقی قوتیں شامل ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان ''فارسی روایت کا عروج نظم و نثر میں '' ہے۔ اس باب میں ۱۵۸۰ء سے لے کر ۱۶۴۰ ء تک کے دور کا جائزہ لیاگیاہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ملا امداداللہ وجہی (جوکہ قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا) کی نظم و نثر کا جائزہ پیش کیاہے۔ ملا عبداللہ وجہی کا تخلص مختلف متون میں مختلف املائی صورتوں میں ملتاہے۔ مثلاً وجہی، وجیہی، وجیہہ وغیرہ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اس زمانے کے اہم رحجان کے مطابق وجیہی نے اپنا تخلص مختلف املائی صورتوں میں لکھا ہے۔(۵۱) قطب مشتری ا ور سب رس کے مطالعے سے ثابت ہوتاہے یہ تخلص ایک ہی شخص کے ہیں۔ تحقیق کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے دعویٰ کیا ہے وجیہی ۱۶۵۵ء کے بعد اور ۱۶۷۷ء سے پہلے وفات پاچکا تھا۔ ان کے دعوے کی بنیاد ابن نشاطی کی مثنوی' پھولبن 'ہے جس میں ابن نشاطی نے ان اساتذہ کرام کا ذکر کیاہے جو اس وقت وفات پاچکے

تھے ان میں وجہی کا نام بھی ہے جبکہ طبعی نے ۱۶۷۷ء میں اپنی مثنوی ’’بہرام و گل اندام ‘‘ میں وجہی کا ذکر اس طرح کیاہے گویا وہ وفات پاچکاہو۔

وجہی کی تصانیف کا ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذکر کیاہے ان میں دیوان وجیہ(فارسی)، مثنوی قطب مشتری، نثر کی کتاب سب رس ‘ اور قطب مشتری اور سب رس کی غزلوں کے علاوہ چند غزلیں شامل ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ دیگر مؤرخین مثلاً ڈاکٹرتبسم کاشمیری اور ملک حسن اختر نے وجہی کے دیوان یا غزلیات کا ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس بات کو بھی رد کرتے ہیں کہ تاج الحقائق، وجہی کی تصنیف ہے ‘اورتحقیق سے ثابت کیاہے کہ تاج الحقائق کے مصنف ’’وجیہ الدین محمد ‘‘ ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی ’’کدم راؤ پدم راؤ‘‘ میں، یوسف زلیخا ‘، اور ابراہیم نامہ ‘ کی زبان و بیان کے تجزئیے کے بعد قطب مشتری کا سال تصنیف ۱۶۰۹ء مقرر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے ’’قطب مشتری ‘‘ کے قصے، زبان کا تفصیلی تجزیہ پیش کیاہے۔ قطب مشتری ‘‘ مثنوی کی موجود شکل کو نامکمل قرار دیتے ہیں اور قطب مشتری کے قصے اور زبان کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ’’قطب مشتری نہ صرف نئی روایت، مثنوی کی ہئیت، قرون وسطیٰ کے داستانوی مزاج، نئے رنگ و سخن اور زبان و بیان کے جدید اسلوب بلکہ شاعری کے اعتبار سے بھی قابل قدر تصنیف ہے۔ اس میں جذبات و احساسات کو موزوں الفاظ اور خوبصورت تشبہات کے ذریعے پیش کرنے کا عمل ملتاہے۔ حسب ضرورت منظرکشی بھی کی ہے اور بات کو اثر آفرینی کے ساتھ بیان کرنے کا سلسلہ بھی، جذبات کے رنگا رنگ پہلؤوں کو وہ اپنے بیانیہ انداز میں اس خوبصورتی سے بیان کرتاہے کہ پڑھنے والے میں شاعرانہ مسرت کا جذبہ بیدار ہوجاتاہے ‘‘۔ (جلدا ول،ص۴۴۱)

وجہی کی دوسری اہم تصنیف ’’سب رس‘‘ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سب رس کا سال تصنیف ۱۶۳۵ء متعین کیاہے جوکہ عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پرلکھی گئی۔ ’سب رس‘ وجہی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے تحقیقی انداز میں ان سب قصوں کا مختصر اً ذکر کیاہے جس کی بنیاد اسی قصے پر رکھی گئی ہے۔۔ جس کی بنیاد پر وجہی نے ’سب رس‘ تصنیف کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تمثیل کے فنّی پہلؤوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کرنے کے بعد سب رس کے قصے کا تفصیلی جائزہ لیاہے

اور بہت باریک بینی سے قصے کے نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ قصے کے بیان میں پند و موعظت غالب ہے جب کہ قصہ ذیلی حیثیت اختیار کر گیا۔ قصے اور پندونصائح کے درمیان فنی تواز ن مفقود ہے۔

۲۔ سب رس کا قصہ کسی خاص مر کز کے گرد نہیں گھومتا جو قصے میں اتحاد کا باعث بنتا۔

۳۔ قصہ تمثیلی ہونے کے باوجود قصے کے کردار بعض اوقات تمثیلی حیثیت برقراررکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۴۔ اس تمثیلی قصے کا کوئی کردار مربوط یا مکمل نہیں ہے۔

ان سب خامیوں کی بنیادی وجہ پند ونصائح کا قصے پر غالب ہو جانا ہے گویا سب رس کا قصہ فنّی توازن سے محروم ہے۔ان خامیوں کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تفصیل کے ساتھ ان خوبیوں کا ذکر کیا جس کی بنیاد پر سب رس کو اردو نثر میں پہلا ادبی کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔مثلاً سب رس کا قصہ محض فرضی داستان نہیں بلکہ اس قصے میں اس دور کے تہذیب و تمدن،معاشرتی حالات سے بہت عمدہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ قصے کے حوالے سے اس دور کی جن خصوصیات کا پتہ چلتاہے ان میں تصوف کے کلچر کا فروغ، بادشاہ کا رعایا کے ساتھ عمدہ سلوک، عورتوں کی خصوصیات، مسافر نوازی، سخات، مردوں کی بہادری، جان نثاری، گدائی سے نفرت، نجومیوں پر اعتقاد، عشق مجازی اور عشق حقیقی کی صورتوں کا بیان وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ’سب رس‘ کی اہمیت اس کے خالص اور بے مثل ’’تمثیل‘ ‘ اور اردو نثر کاپہلا ادبی کارنامہ ہونے کے حوالے سے قراردیتے ہیں۔ ’سب رس‘ کا اسلوب نئے لسانی و تہذیبی عناصر کے امتزاج سے بناہے۔ ’سب رس‘کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی،وجہی کی اس کاوش کوسراہتے ہیں جوملاوجہی نے شعوری طور پر کی یعنی نظم ونثر کو ’’ملاکرگلاکر‘‘ کہ نئی طرز میں ’سب رس‘ کولکھا۔ ’سب رس‘ کی نثر مقفیٰ و مسجع ہے۔ جملوں کا ہم آہنگ قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، وجہی کو اردو کی ادبی نثر کا مؤجد قرار دیتے ہیں۔ وجہی نے دکنی اردو کو شمال کی اردو سے ملانے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے اس زبان کو ’زبانِ ہندوستان ‘ کانام دیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری وجہی کے لسانی شعور کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں :’’وہ دکن کا پہلا ادیب جس نے اپنے لسانی شعور کے بل بوتے پر اپنی داستان کے لئے ایک ایسی زبان استعمال کی جسے وہ دکن سے بلند کرکے ’ زبان ہندوستان ‘ کا درجہ دیتاہے‘‘۔ (۵۲)

پانچویں باب کا عنوان ’’فارسی روایت کی توسیع‘‘ ہے۔ جس میں ۱۶۲۵ء سے لے کر ۱۶۷۲ء کے دور کا جائزہ لیاگیاہے۔ اس دور کے سیاسی حالات ابتری کی طرف مائل تھے۔ قطب شاہی سلسلے

کے عبداللہ قطب شاہ جوکہ قلی قطب شاہ کے نواسے تھے، ۱۶۲۵ء کو تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ عبداللہ کے والد سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں غیر مذہبی رسومات اور شراب نوشی پر پابندی لگادی تھی لیکن عبداللہ قطب شاہ مزاجاً اپنے نانا جیسا تھا لہٰذا اس کے عہد حکومت میں وہی ماحول پیدا ہوگیا جوقلی قطب شاہ کے عہد کا خاصا تھا۔ دوسری طرف ملک عنبر اور جگت گرو کی وفات سے دکن کا سیاسی توازن بگڑ گیا تھا اور مغل کی طاقت میں اضافہ ہوتاگیا اور بالآخر ’’صلح نامہ‘‘ کی نوبت آگئی۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی بابر سے منسوب فقرے ’’بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نسبت‘‘ کے حوالے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ غلط طور پر بابر سے منسوب ہے۔ حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے اس مصرعے کو ابوالقاسم مرزا بابر سے منسوب کیاہے۔ جو بابر کا چچا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کی شاعری بھی عیش و نشاط کی شاعری ہے۔ جس میں تہہ داری یا جذبا ت کی گہرائی مفقود ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی خصوصیات گنواتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے نشاندہی کی ہے کہ قلی قطب شاہ کی مانند عبداللہ قطب شاہ بھی ’’نبی صدقے ‘ کے الفاظ مقطعوں میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا مذہب کو اپنے دنیوی لذتوں، عزائم اور مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کاجورحجان قلی قطب شاہ کے ہاں نظرآتاہے وہی عبداللہ قطب شاہ کی شاعری میں نظرآتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کو بحیثیت مجموعی ’’ملمع‘‘ کی شاعری قراردیتے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی اہمیت اس کی علم و ادب کی سرپرستی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسی بناپر اردو زبان کی تشکیل و تاریخ میں اسے اہم قراردیتے ہیں۔

اس دور کا اہم ترین شاعر غواصیؔ ہے۔ وجہیؔ اور غواصیؔ ہم عصر شعراء تھے۔ دونوں شعراء نے اپنی شاعری میں ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے وجہیؔ اور غواصیؔ کے تذکرے میں کیاہے۔ غواصیؔ کے مکمل نام کے حوالے سے تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں البتہ اس کے تخلص اور سوانحی حالات کے اشار ے اس کے کلام میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے غواصیؔ کے جن ادبی کارناموں کاجائزہ لیاہے ان میں کلیات، مثنویاں (مینا ستونتی، سیف الملوک بدیع الجمال، طوطی نامہ) شامل ہیں۔ غواصی کی مثنوی اپنے دور میں ایک مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتی تھیڈاکٹر جمیل جالبی مینا ستونتی ‘ کے قصے کو ہندی الاصل قصہ قرار دیتے ہیں اور ان دیگر مصنفین کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے اس قصے کو مختلف ناموں سے لکھا۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق غواصیؔ نے یہ قصہ فارسی قصے ’عصمت نامہ از حمیدی ‘کو سامنے رکھ کر لکھا لیکن ترجمہ اخذ کرنے کے باوجود اسے دکنی مزاج کا حامل بنا دیا۔ قصہ کا مزاج اور

کردار ہندوہیں لیکن اپنے مزاج اور طرز معاشرت میں یہ کردا ر مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مینا ستونتی میں کرداروں کے لہجوں کے تنوع کو قابلِ توجہ قراردیا ہے۔

غواصی ؒ کی دوسری اہم تصنیف ''سیف الملوک بدیع الجمال '' ہے۔ مثنوی کے اشعار میں بیان کردہ سنِ تالیف کے حوالے تضادات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ غواصی ؒ نے مثنوی میں ۱۰۳۵ھ لکھ دیا ہے۔اس کے علاوہ بعض نسخوں میں ۱۰۲۵ھ اور ۱۰۲۷ھ بھی ملتے ہیں،'سیف الملوک بدیع الجمال'، 'الف لیلیٰ ' کے روائتی قصے سے ماخوذ ہے۔ 'سیف الملوک بدیع الجمال'اور 'الف لیلیٰ ' کے کردار ایک جیسے ہیں البتہ غواصی ؒ نے قصے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرکے اس مزید مؤثر بنادیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''سیف الملوک بدیع الجمال''کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے ان میں ایک سادگی یعنی مبالغے سے پرہیز ہے جو کہ مثنوی کے عام رحجان کے برعکس ہے۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی غواصی اور وجہی کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے عوامی کی اختصارپسندی، منظر، سراپے کے بیان اور جذبات نگاری میں تواز ن، مافوق الفطرت عناصر کے استعمال کو سراہاہے۔ مثنوی کے رزم کے بیان کو ڈاکٹر جمیل جالبی کمزور قراردیتے ہیں جبکہ غواصیؒ خود سپاہی پیشہ تھا۔ غواصی ؒ کی اس مثنوی کی ایک خاصیت جس کی طرف ڈاکٹر جمیل جالبی نے توجہ دلائی ہے وہ غواصی ؒ کے 'سخن ' کے حوالے سے خیالات ہیں۔ غواصیؒ، سخن کی اہمیت اور شاعری کا معیار متعین کرتے ہوئے تخیل، نیا مضمون، نئی تشبیہ، رس بھرے الفاظ، نئی طرز، سلاست، نزاکت، لطافت اور سحرکو شاعری کی جان قرار دیتاہے۔ مثنوی کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''اس مثنوی نے بیجار پوری ادب میں انقلاب پیداکرکے اس کارخ موڑ دیا۔ اس کی زبان مقیمیؒ، امین ؒ اور صنعتی ؒ کی زبان سے قریب ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جس نے بیجاپور ی اسلوب میں فارسی اصناف سخن کے لئے راستہ ہموار کیا''۔ (جلد اول،ص۴۸۱)

غواصی ؒ کی تیسری مثنوی طوطی نامہ کو ڈاکٹر جمیل جالبی ضیاء الدین نخشبی کی نثری تصنیف طوطی نامہ سے ماخوذ قراردیتے ہیں جوکہ سنسکرت زبان کی کتاب 'شکاسب تتی ' سے ماخوذ ہے۔ اصل قصے میں70کہانیاں ہیں جبکہ عوامی نے پینتالیس کہانیوں کو طوطی نامے کا حصہ بنایاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق حیدر بخش حیدر ی نے اسی قصے کو جسے فارسی میں ابوالفضل نے لکھا تھا گلکرسٹ کی فرمائش پر طوطا کہانی کے نام سے اردو میں لکھا۔ مثنوی کے مطالعے سے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عوامی نے جس معیار شاعری کا ذکر

’سیف الملوک ‘ میں کیا تھا اسے بڑی حد تک ’طوطی نامہ‘ میں حاصل کرلیاتھا۔ ’طوطی نامہ‘ پرفارسی اسلوب کے گہرے اثرات نظرآتے ہیں۔ اسی اسلوب کی وجہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی، طوطی نامہ کو سیف الملوک اور مینا ستونتی کی نسبت زیادہ دلچسپ قرار دیتے ہیں۔ ’طوطی نامہ‘ میں غواصی کا سار زور اخلاقی اقدار پرہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق غواصی قدیم مثنوی کی روایت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتاہے۔ ڈاکٹرتبسم کاشمیری غواصی ؔ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اپنے عہد کے لسانی شعور سے آگے کی چیز قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرتبسم کاشمیری غواصی کی چند غز لوں کے مقطعوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مندرجہ بالا غزلوں کی شعری لغت، مزاج اور ادبی روایت اسے ولی سے منسوب کرتی ہے۔ غواصی اگر اسی شعری اسلوب اور روایت کو ایک تسلسل کے ساتھ اختیار کرتا تو اس تجربے میں مسلسل توسیع کرتارہتا تو دکن کی جدید غزل جس کا آغاز ولیؔ کے فنّی شعبدے سے ہوتاہے، اس کی ابتداء عہدِ غواصیؔ ہی سے ممکن ہوسکتی تھی اور اسے غواصی کی ادبی کرشمہ سازی سے تعبیر کیاجاسکتاتھا ‘‘۔(۵۳)

اس باب میں جن دیگر شعراء کی تصانیف کا جائزہ لیاگیا ہے ان میں قطب زاری کی’ تحفۃ ا لنصائح‘ کا دکنی میں منظوم ترجمہ شامل ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیبی نقطۂ نظر سے اہم قرار دیا ہے۔ یہ کتاب اس دور کے معاشرے اور افکار کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے کہ ’’قطبی وزاری‘‘ ایک ہی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی تحقیق کے مطابق : ’’تحفۃالنصائح ‘‘ کے مترجم کانام قطب اور تخلص زاری ہے (رازی نہیں جیساکہ اردوئے قدیم میں مذکور ہے) اور قطبی دوسرا شاعر ہے جس کی دونظمیں ’’مینا نامہ ‘‘ اور چڑیا نامہ ‘ ہماری نظر سے گزری ہیں ‘‘۔(جلد اول،ص۴۸۶)

اسی عہد کے ایک اور اہم شاعر فخرالدین ابن نشاطی ہیں جن کی تصنیف ’’پھولبن‘‘ (۱۶۵۵ء) ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ’’پھولبن ‘‘ کا قصہ فارسی قصے ’’بساتین الانس ‘‘ سے ماخوذ ہے۔ ’پھولبن ‘ داستانی انداز میں قصّہ درقصّہ کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی ’پھولبن‘ کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی قصّہ میں فنّی توازن، عمدہ کردار نگاری، زورِ بیان، موزوں تشبیہات اور ادبی طرزِ اد ا کو اہم قراردیتے ہیں۔ ابن نشاطی بنیادی طور پر انشاء پرداز تھا۔’ پھولبن‘ اس کی واحد شعری تصنیف ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق نشاطیؔ نے شعوری طورپر فارسی فنِ

شاعری کو ملحوظ خاطر رکھا۔ نشاطی نے پہلی بار نظم اور غزل کے حوالے سے بحث کی۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق:

’’اردوزبان و ادب کی تاریخ میں یہ دورہے جب اردو غزل ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی تھی جہاں ولی دکنی ’’اپنے پیش روؤں کی ساری صلاحیتوں، دریافتوں اور امکانات کو سمیٹ کر اپنی ذات میں جمع کرلیتاہے اور اس روایت کو سور ج بناکرچمکادیتاہے ‘‘۔ (جلد اول،ص۴۹۲)

اس عہد کے جن دیگر شعراء کا تذکرہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیاہے ان میں جنیدی، سید بلاقی، عبدالطیف، معظّم شامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کو ترجمے کا دور قراردیا ہے۔ زیادہ تر تصانیف فارسی نظم و نثر سے ترجمہ اوراخذ کی گئیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے میاں جی، یعقوب اور میرانجی خدانما کواہم قراردیا ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں کی بدولت مذہبی نثر منفرد شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ میانجی حسین خدانما کی تصانیف میں مذہبی رسائل، چہار وجود، شرح تمہیدات ہمدانی اور رسالہ قر بیہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے خدانما کی نثر کو ناہموار اور گنجلک قرار دیا ہے لیکن ان کے مطابق اس نثر کا اگر برہان الدین جانم کی نثر سے مقابلہ کیاجائے تو اس کی نثر نہ صرف قوت اظہار میں بہتر ہے بلکہ فاعل،فعل اور مفعول کی ترتیب میں بھی باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ میرانیعقوب کا ترجمہ ’’شمائل الاتقیاء‘‘ اسی روایت کا حصہ ہے۔ یہ کتاب ترجمہ ہونے کے باعث اپنے اسلوب کے حوالے سے زیادہ اہم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

’’یہ ترجمہ لفظی ہے اور ’’شمائل الاتقیاء ‘‘ کی نثراتنی سادہ اور غیر شاعرانہ ہے کہ ’’تمہیدات ہمدانی‘ کے بعدپہلی بار شدت سے نثر کے اپنے الگ وجود کا احساس ہوتاہے ‘‘۔ (جلد اول،ص۵۰۳)

یہ وہ نثر ہے جوانیسویں صدی تک مذہبی موضوعات کے لئے مخصوص ہوجاتی ہے اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا ترجمہ اسی اندازِ بیاں میں کیا ہے۔ اس فصل کے چھٹے باب کا عنوان ’’ فارسی روایت کی تکرار‘‘ ہے۔ اس باب میں بیس سالوں پر محیط عرصے کا تجزیہ کیاگیاہے۔(۱۶۷۶ء سے ۱۶۸۶ء تک) باب کی ابتداء میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے زوال پزیر تہذیبی صورتحال کی نقشہ کشی کی ہے۔ اس تہذیبی زوال کے اثرات ادب پر براہ راست مرتب ہورہے تھے۔۔ یہی وجہ ہے اس دور میں تخلیق کئے جانے والے ادب میں کوئی ایسا فن پارہ وجود میں نہیں آتاجو اس عہد کویادگار بناسکے۔ اگرچہ زبان کے حوالے سے واضح تبدیلی کا احساس ہوتاہے۔زبان میں صفائی، روانی پیدا ہوگئی ہے

اور زبان وبیان کے لئے معیار ظہورپذیر ہورہے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس دورکو پرانی روایت کی تکرار کا دور قراردیتے ہیں۔ اس دور کے جن شعراء کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیاہے ان میں گولکنڈہ کاآخری حکمران ابوالحسن تاناشاہ، طبعی، محب، فتاحی، شغلی، ضعیفی، خواصی،قدرتی، اولیاء اور فائز شامل ہیں۔ اس عہد کے ادب کا جائزہ لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دکنی ادب کی روایت مکمل طور پر ختم ہوچکی تھی۔ زبان اپنے نئے تشکیلی دور سے گزررہی تھی، روایت اور موضوعات میں جدت مفقود تھی اور مذہبی موضوعات دوبارہ مقبول ہورہے تھے۔

ساتویں باب کا عنوان ’’دکنی روایت کا خاتمہ‘‘ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے ان شعراء کا ذکر کیاہے جن کی زبان دکنی سے زیادہ ریختہ کے قریب تھی۔ اس سلسلے میں جس شاعر کا جائزہ سب سے پہلے لیاہے وہ حسن شوقی کے فرزند حسین ذوقی ہیں۔جو ’بحرالعرفان ‘ کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی دو مثنویاں ’’وصال العاشقین ‘‘(۱۶۹۷ء)، ’’نزہت العاشقین‘‘ (۱۶۹۹ء) اور غزلیں دستیاب ہیں۔ ’وصال العاشقین ‘ میں ذوقی نے ملا وجہی کی نثری تصنیف سب رس کے قصے کوموضوع بنایاہے۔ جبکہ نزہت العاشقین میں ذوقی نے منصورحلاّج کے قصے کو پیش کیاہے۔ ان مثنویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی روانی، فارسی تراکیب، لہجہ وآہنگ اور مرہ و محاورہ اور فارسی و عربی الفاظ کے درست املاء کو اس کی شاعری کی خصوصیت قراردیتے ہیں۔

ذوقی کے ہم عصر، قاضی محمود بحری کے دیوان، مثنوی ’من لگن‘ (۱۷۰۰ء) اور ’بنگاب نامہ‘ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بحری اگرچہ فارسی اثرات قبول کرتے نظرآتے ہیں لیکن ان کی زبان میں ایک کشمکش کا احساس ملتاہے۔ ان کی شاعری پر شمال کی زبان اور دکنی محاورہ دونوں کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کوشش کو بجھتی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کرنے کی کوشش قرار دیتے ہیں۔ محمد باقر آگاہ اور شاہ تراب قسم کے متعلق ڈاکٹرجالبی رائے قائم کرتے ہیں کہ ان شعراء نے زبان و ادب کے جدید اسلوب میں لکھنے کی بجائے دکنی میں لکھنے کو ترجیح دی لہذا یہ شعراء ’’جدید اور زندہ روایت کے دھارے سے الگ ہوگئے، اور ان کی آواز تاریخ ادب کے کانوں کو گراں گزرنے لگی ‘‘۔(جلد اول،ص۵۲۴)

فصل ششم ‘ جلد اوّل کی آخری فصل ہے۔ یہ فصل دو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس فصل کا عنوان ’فارسی روایت کا نیاعروج ریختہ ‘‘ ہے۔ اس فصل میں ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۰ء تک کے سیاسی، تہذیبی، سماجی عوامل کاجائزہ لیاگیاہے جو اس عہد میں اردو زبان کی تشکیل و تعمیر میں ممدومعاون ثابت ہوئے۔ پہلے باب کا عنوان ’دلی دکنی ‘ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی دلی ؔدکنی کی اردو زبان

کے حوالے سے خدمت اور اس عہد میں سیاسی عوامل نے جس طرح تہذیبی، لسانی عوامل کو متاثرکیا،کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تاریخ کا مطالعہ بتاتاہے کہ ایک تہذیب یافتہ قوم فاتحین سے شکست کھاکر پسپا ضرور ہوجاتی ہے لیکن اس کی تہذیب دیکھتے ہی دیکھتے خود فاتح کی تہذیب کو فتح کرلیتی ہے۔ تہذیبی فتح زمینی فتح سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بظاہر اورنگزیب عالمگیر نے دکن کو فتح لرلیاتھا لیکن جب ولی ؔکی شخصیت میں شمال اور جنوب کی تہذیبوں کاامتزاج عمل میں آیا تو ولی ؔکی شاعری نے دکن سے اٹھ کر دلی کو فتح کرلیا اور زبان وبیان کے اس نئے معیار کا آغاز ہوا جسے برسوں تک ریختہ کے نام سے موسوم کیاجاتارہا اور جس کی ممتاز ترین نمائندہ صنف ''غزل'' ہے ''۔ (جلد اول،ص۵۲۹۔۵۳۰)

ریختہ، اردوئے معلی اور اردو، ہندی، گجری اور دکنی کی ارتقائی صورتیں تھیں۔ ولی ؔکے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے اس کے سفر دلی ؔکا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں ولی ؔنے بقول محمد حسین آزاد ''ایک زبان کو دوسری سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے کئی پلٹے ' کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی ''۔ (۵۴) ولی کے سفر دلی کے حوالے سے مختلف محققین اور ناقدین نے مختلف آراء کا اظہار کیاہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد صادق اور شمس الرحمن فاروقی اس سفر کو دلی والوں کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ (۵۵)۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی ولیؔ کی دلی کے شاہ گلشن سے ملاقات کو مسترد کرتے ہیں اور محمد اکرام چغتائی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب ولی ؔدہلی آئے تو اس وقت شاہ گلشن دکن کی سیر کررہے تھے۔ (۵۶)ڈاکٹر جمیل جالبی ولی ؔکی ان خدمات کا جائزہ لیتے ہیں جن کی بنیاد پر ولی کو اردو شاعری کا باباآدم قرار دیاجاتاہے۔ ولی ؔکے نام اور وطن کے حوالے سے کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ولیؔ کے محققین اور ناقدین کی آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے ولی ؔکانام ولی محمد تجویز کیاہے۔ ولی ؔکے کلام سے داخلی شواہد کی بنیاد پر جالبی اسے دکنی قرار دیتے ہیں جبکہ ولی ؔکے آباء گجرات سے دکن آباد ہوگئے۔ولیؔ کے سال وفات کے تعین کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیقی انداز سے محققین اور تذکرہ نگاروں کے دئیے گئے تاریخ وفات ۱۷۰۷ء کا تجزیہ کرتے ہیں اور اسے درست تسلیم نہیں کرتے۔ جبکہ ڈاکٹرجالبی نے خود ولی ؔکے ایک اہم عصر شاعر فراخی کے کلام کا تجزیہ پیش کیاہے۔ فراخی نے ''مراۃالحشر'' کے عنوان سے مثنوی ۱۷۶۰ء میں لکھی جس میں مرحوم شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ولی کاذکر نہیں کیا جبکہ ولی اس

عہد میں شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۷۶۱ء میں وجدی کی مثنوی ''مخزنِ عشق'' کاحوالہ دیا ہے جس میں ولی ؔکو مرحوم شعراء میں شامل کیاگیاتھا۔ ان تمام شواہد سے ڈاکٹرجالبی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ولی ۱۷۶۰ء کے بعد اور ۱۷۲۵ء سے پہلے فوت ہوا۔ ولیؔ کے سالِ وفات کے تعین کو مزید معتبر بنانے کے لئے ڈاکٹرجالبی نے ولی ؔکے رشتہ داروں اور دوستوں کی تاریخِ وفاتدرج کی ہے جوسب کے سب ۱۷۰۷ء کے بہت بعد میں فوت ہوئے۔' ' بقول جالبی''جلوس محمد شاہی کے دوسرے سال یعنی ۱۱۳۲ھ 7241 ۱۷۱۹ء میں جب ولی ؔکادیوان دہلی آیا تو اس وقت ولی ؔ یقیناًزندہ تھے ''۔ (جلد اول،ص۵۳۹)

باب کے اگلے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولیؔ کے کلام کا مفصّل فکری و فنّی تجزیہ پیش کیاہے۔ ولیؔ کے دور کے ادبی و لسانی رحجان کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی،ولی ؔکے حوالے سے دو امور کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اوّ ل یہ کہ ولی ؔنے شمال اور جنوب کی زبان کوملاکر ایک ایسا ادبی روپ دیا جوشمال و جنوب دونوں کے لئے قابل قبول تھا۔ دوم یہ کہ ولیؔ نے غزل کے موضوعات کو تنوع اور وسعت دی۔ ولی ؔکی غزل کی خصوصیات کا ذکرکرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اس کے تصورِ عشق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی ؔکے تصور عشق کو اردو شاعری کی تاریخ میں میں اس لحاظ سے منفرد قرارد یا ہے کہ پہلی بار عشق علوی سطح پر سامنے آیا ہے۔ عشق محض جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک سنجیدگی، گہرائی اور ٹھہراؤ ہے اسی طرح ولی اؔ پنے پیش روؤں کی نسبت سراپے کے بیان میں بھی سنجیدگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ولی ؔنے تّصوف کی روایت کو تقریباًساری علامات کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیاہے۔ زندگی کے رنگارنگ تجربات کا عکس ولی ؔکی شاعری میں جابجا نظر آتاہے۔ ولی ؔکی شاعری کے فنّی عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے جن امور کی نشاندہی کی ہے ان میں صنعتوں کا خوبصورت استعمال مثلاً سہل ممتع، تشبیہہ واستعارہ، تجنیس، تلمیح، حسنِ تعلیل، تجاہلِ عارفانہ، صفت عکس، ایرادالمثل، مراۃ النظیر، مستزاد، محاکات اور ایہام وغیرہ کا ذکرکیاہے۔

ڈاکٹرتبسم کاشمیری نے بھی اپنی تاریخِ ادب میں ولی ؔکی شاعری کا تفصیلی فنی و فکری جائزہ لیاہے۔ ڈاکٹر تبسم،ولی ؔکی شاعری کے جن پہلوؤں پرزور دیتے ہیں ان میں بالخصوص شاعری فسانوی و تخیلی فضا اور خودکلامی کے انداز کو اجاگر کیاہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ولی ؔکو بت پرست قراردیتے ہیں جبکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اسے بت پرست کے ساتھ ساتھ بت تراش بھی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیر ی ولی ؔکی شاعری کے صوفیانہ رحجانات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو کے وہ نقاد جو ولیؔ کے کلام کی صوفیانہ تعبیر کرنے پر اصرار کرتے ہیں وہ تصوف کا لباس تیارکرتے ہیں اور صوفیانہ اصطلاحات، خیالات و تصورات کا ایک جامۂ صوف تیار کرکے اسے پہنا دیتے ہیں۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اس جامۂ صوف کے اندر ایک باجمال شاہدِ حسن ہے۔ ولی کی شاعری میں عرفا ن کی تلاش بے سود ہے۔ اس کے تخلص اور صوفیانہ پس منظر سے دھوکہ ہوسکتاہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہاں ذات کا وہ عرفان نہیں جسے اہلِ دل کے عرفان سے تعبیر کیاجاسکے ''۔ (۵۷)

جبکہ ڈاکٹر ملک حسن اختر اپنی تاریخ ادب میں ولی کے کلام میں نشاطیہ رحجان کو غالب قراردیتے ہوئے ولی کی غزل میں موضوعات کے تنوع کے فقدان کا ذکرکرتے ہیں ان کے مطابق :''تصوف سے نگاؤ کے باوجود ولی کی شاعری میں فکری عنصر بہت کمزور ہے وہ حسن کے متعلق سوچتے ہیں صرف حسن کو محسوس کرتے ہیں۔ سوچ کی گہرائیوں میں ہمیشہ غم کے نشانات ہوتے ہیں اور ولیؔ ان گہرائیوں میں اترنا پسند نہیں کرتے ''۔ (۵۸)

ولیؔ کی شاعری کے حوالے سے ناقدین نے بعض امور میں اختلافی آراء کا اظہار کیاہے لیکن ولیؔ کو اردو شاعری کا'' باوا آدم '' قراردینے میں تمام مؤرخین اور ناقدین متفق نظرآتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت میں ولیؔ کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی ولیؔ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''ولیؔ ایک ایساہی شاعر ہے جس نے امکانات کا وسیع راستہ آنے والے شعراء کے سامنے کھول دیا اور جس پر چل کر اردو غزل وہاں پہنچ گئی جہاں وہ آج نظرآتی ہے۔ ولیؔ کے بعد آنے والے شعراء نے غزل کو بنیادی صنفِ سخن کی حیثیت سے قبول کرلیا اور ولیؔ کی غزل کے رحجانات اردو غزل کے بنیادی رحجانات بن گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رحجانات نمایاں ہوئے وہ خوہ عشقیہ شاعری کا رحجان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنؤ ی شاعری کی خارجیت اور مِسّی چوٹی والی شاعری ہو مسائل تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی ایسی شاعر ی جو جس میں داخلیت اور رنگارنگ تجربات کابیان ہو یا اصلاح زبان و بیان کی تحریک ہو، سب کا مبدأولیؔ ہے۔ ولیؔ کا اجتہاد اتنا بڑا ہے کہ اردو غزل نے جورخ بھی بدلا اس میں ولیؔ ہی کو رہبرپایا''۔ (جلد اول،ص۵۵۷)

فصل ششم کے دوسرے باب میں معاصرینِ ولیؔ اور بعد کی نسل کاجائزہ لیاگیاہے۔ ولیؔ کی شاعری اپنے عہد کی شاعری کا معیار بن کر سامنے آئی جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ اس

کے معاصرین اور بعد کی نسل نے ولی ؔکی پیروی دو طرح سے کی۔ پہلاروّیہ ولی ؔکے رنگِ سخن میں شعر کہنا اور دوسرا اس کے رنگِ سخن سے کسی ایک رنگ کا انتخاب کرکے شاعری کرنا۔ ان رحجانات کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی ؔکے معاصرین اور اس کے بعد آنے والے شعراء میں سے جن شعراء کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے ان میں سید محمد فراقی (۱۶۸۵ء۔ ۱۷۳۱ء)، فقیر اللہ آزا د، مرزاداؤداورنگ آبادی (م ۱۵۷۴ھ۱۷۴۴ 7241ء) (مرزادؤدنے خود کواپنے اشعار میں ولی ؔثانی بھی کہا ہے) شامل ہیں۔ ولی ؔکے بعد ڈاکٹرجالبی، سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۵ء تا ۱۷۲۳ء) کو دورِمیر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اردو شاعری کی ایسی ’’آواز ‘‘ قراردیا ہے جو اس سے پہلے نہیں سنی گئی۔سراج کے کلیات میں غزلیں، مثنویات، قصیدے، ترجیح بند، مخمسات اور رباعیات شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبیِ سراج اورنگ آبادی کی شاعری کو’ تہذیبِ جذبات‘ کی شاعری قراردیتے ہیں۔ سراج میں مختلف عشقیہ کیفیات میں تمیزکرنے اور انہیں الفاظ کی گرفت میں لانے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ سراج کی شاعری کوسراہتے ہوئے ڈاکٹرجالبی رقم طراز ہیں :

> ’’اعلیٰ ترین شاعری وہ ہے جس میں دل و دماغ دونوں مل کر ایک ہوجائیں۔ سراج، میر، سودا، درد،غالب اور اقبال سب کے سب بیک وقت دل و دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ ان کا شعوری عنصر لاشعور میں ایسا پیوست ہے کہ وہ الہام کے درجے پر پہنچ گیاہے‘‘۔(جلد اول،ص۵۷۱)

سراج کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے اس کے کلام سے ایسا انتخاب پیش کیاہے جس میں ان کے مطابق آنے والے شعراء کی آوازیں سنی جاسکتی ہیں۔ سراج کے کلام کے عشقیہ پہلو کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے کلام کے متصوّفانہ اور اخلاقی و فلسفیانہ رحجانات کا تجزیہ بھی پیش کیاہے۔ سراج کی شاعری کے موضوعات، تراکیب، محاورات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اردو کے شعراء اور ادیبوں کا مغربی شعراء اور ادیبوں کے ساتھ موازنہ کرنانہیں بھولتے، چاہے یہ موازنہ دوسطروں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو۔ یہاں بھی ڈاکٹرجالبی سراج کوانگریزی شاعر لیسنگ لینڈ کی طرح اردو شاعر ی میں مخصوص عشقیہ روایت کابانی قرار دیتے ہیں۔

شاہ قاسم کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اسے روایت کی تکرار ‘ کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح عارف الدین خان عاجز اور لچھمی نرائن شفیق کو بھی تکرار کا شاعر قراردیتے ہوئے اپنے جلد اوّل کے مخصوص اسلوب میں خود کلامی کا انداز اختیارکرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’تاریخ میں توصرف انہی لوگوں کا ذکر ہوسکتاہے جو روایت کے اصل دھارے پر بہہ رہے ہوں اور وہ لوگ جو اصل دھارے سے دور یاالگ ہیں یا صرف ’’نقل‘‘ اور ’’تکرار‘‘ کے ذریعے ادب و شاعری کا تبرک تقسیم کررہےہیں ان کا ذکر تذکرہ نویسوں پرچھوڑ دو کہ یہ ان کا کام ہے اور تم آگے بڑھو‘‘۔(جلد اول،ص۵۸۵)

جلد کے آخرمیں اختتامیہ کے عنوان سے جلد اوّل کے حاصلِ مطالعہ کے نتائج پیش کئے گئے۔ اردوزبان کو برعظیم کی ساری زبانوں کا’ عاد اعظم مشترک ‘ قرار دیتے ہیں اور تقریباً وہی نتائج مختصراً بیان کردئیے ہیں جو ہرباب میں کسی نہ کسی طور پہلے بیان کئے جاچکے ہیں۔ جلد اوّل کاضمیمہ خاصا طویل ہے اور دلچسپ ہے۔ بعض ناقدین معترض ہیں کہ ضمیمے میں پیش کی گئی معلومات کو جلد اوّل کے لسانی مطالعے میں بھی پیش کیاجاسکتاتھا اسے ضمیمے کے طور پر شامل کرنے کی بجائے جلد اوّل کا حصہ بنانا چاہیے تھا۔ ضمیمے میں ڈاکٹرجالبی نے چاروں صوبوں (پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان) میں اردو زبان وادب کے ابتدائی نقوش اور ان صوبوں کی غالب زبان کے اردو زبان و ادب پراثرات کا جائزہ لیاہے۔ پنجاب اور سرحد کو ڈاکٹرجالبی اردو کی ابتداء کے حوالے سے اس لئے اہم قراردیتے ہیں کیونکہ برعظیم کے فاتحین انہیں علاقوں سے برعظیم میں وارد ہوئے۔ڈاکٹرجالبی برصغیرکے قدیم قبائل دراوڑ،منڈا، آریا وغیرہ کے قدیم الفاظ پیش کئیے ہیں جوآج بھی پنجابی اور اردو میں مستعمل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ان تہذیبی و لسانی عوامل کی تفصیلی نشاندہی کی ہے جوپنجاب میں اردو زبان کی نشونما میں معاون ثابت ہوئے۔ ڈاکٹرجالبی نے جن صوفیاء اور شعراء کے کلام سے اردو اور پنجابی کی مماثلت کے حوالے سے دلائل پیش کئے ان میں قطب (۱۴۵۳ء)، شاہ عالم عرف شاہ منجھن (۱۴۸۳ء)، حضرت شاہ برہان الدین غریب (۱۳۳۷ء)، قاضی محمود دریائی (۱۵۳۴ء)، خوب محمد چشتی (۱۶۱۴ء)، فخرالدین نظامی، میراجی شمس العشاق (۱۴۹۶ء)، مرزامقیم، فیروز، محمود احمد گجراتی اور ولیؔ وغیرہ شامل ہیں جن پنجابی شعراء کے کلام کو بطور حوالہ استعما ل کیاہے ان میں شاہ حسین (۱۵۹۹ء)، گرونانک (۱۵۳۸ء)، بابا فرید شکرگنج (۱۲۶۵ء)، حافظ برخوردار، احمد گوجر وغیرہ شامل ہیں اس حصے میں ڈاکٹرجالبی نے بڑی وضاحت اور دلائل کے ساتھ اردو اور پنجابی زبان کے مماثلات سے بحث کی ہے اور حافظ شیرانی کے اس نظرئیے کی تائید کی ہے جس کے مطابق انہوں نے پنجاب کو اردو کا اصل مولد قراردیا ہے۔ ضمیمے میں شامل دوسراحصہ سندھ میں اردو ہے جوکہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ان تہذیبی، سماجی اور سیاسی عوامل کے تجزیہ کیاہے جو سند ھ میں اردو کی ترویج کا باعث بنے

جبکہ دوسرے حصے میں ان شعراء کے کلام سے حوالے پیش کئے ہیں جن میں قدیم اردو کے خدوخال لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ فرد بھکری، سید محمد میر عدل، شیخ قاسم، شیخ طاہر شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں سندھ کے ان شعراء کا ذکر کیاہے جنہوں نے اردو زبان میں بھی شاعری کی مثلاً ملا عبدالحکیم ٹھٹھوی، شیخ درد، میرحیدرالدین کامل، محمود صابر، میاں محمد سرفراز عباسی،روحیل خان روحل، عبدالوہاب خان سچل سرمست شامل ہیں۔

''لسانی اشتراک'' کے نام سے شامل حصے میں اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبان کے ذخیرۂالفاظ، صرف و نحو اور قواعد کے مشترک اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور مثالیں بھی درج کی ہیں۔ 'سرحد میں اردو روایت' کے عنوان سے شامل حصے میں اردو اور پشتو زبان کے قریبی تعلق کو حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پشتو اور اردو کے مشترک الفاظ کی فہرست پیش کی۔صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے شعراء اور ادباء کا حوالہ دیا جنہوں نے اردو کی تعمیر و تشکیل میں کرداراداکیا۔ بایزیدانصاری، خوشحال خان خٹک، عبدالرحمن بابا، قاسم علی آفریدی، مولوی محمد عثمان قیس، حیدر پشاوری وغیرہ کے کلام کا مختصر جائزہ پیش کیاہے۔

ضمیمے کا آخری حصہ' بلوچستان کی اردو روایت ' کے عنوان سے ہے جس میں براہوی اور اردو زبان کے لسانی اشتراکات کا جائزہ لیاہے۔ جن بلوچی شعراء کا اردو کے حوالے سے تذکرہ کیاہے ان میں نائب، محمد حسن، مولا داد خان، سردار خیربخش مری، سید عابد شاہ عابد، سید غلام علی الماس، عبدالحق زیور، یوسف عزیز مگسی، وغیرہ شامل ہیں۔

جلد کے آخر میں ۷۶ صفحات پر مشتمل طویل اشاریہ ہے جسے مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیاگیاہے۔ یہ اشاریہ کتب،اشخاص، مقامات اور موضوعات کے حوالے سے ابن حسن قیصر کا مرتب کردہ ہے۔جبکہ جلد اوّل کے اختتام پر کتابیات موجود نہیں ہیں۔

جلد اوّل کے تفصیلی مطالعے سے جوبات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی محنت اورریاضت ہے جوانہوں نے تحقیقی مواد کے حصول اور اسے اس مترتب اندازمیں پیش کرنے کے لیے کی۔ تاریخِ ادبِ اردو جلد اوّل کے مشمولات اتناوقیع اور وسیع ہیں کہ مصنف کی محنتِ شاقہ اور عرق ریزی قاری کو مبہوت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی تاریخ نویسی کی اس اوّلین کوشش کو معتبر بنانے کے لئے جن امور نے اہم کردار ادا کیاان میں اس جلد کے مآخذ ات سرفہرست ہیں۔ کسی بھی امر کی تفتیش و تحقیق کے لئے ڈاکٹرجالبی نے جس طرح مختلف مآخذات سے استفادہ کیاہے وہ قابل تعریف ہے۔ تحقیقی حوالے سے اگر کسی مؤرخ کی تاریخ کو اوّل درجے کا استنادحاصل ہے وہ بلاشبہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادب ہی ہے۔ اپنی تحقیقی کاوشوں

کومؤثر بنانے کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہرصفحے کے حاشیے پرمطلوبہ مآخذات کوحواشی کی صورت میں پیش کردیاہے۔ جلد اوّل کے مآخذات کی فہرست اگرچہ الگ سے کتابیات کی صورت میں پیش نہیں کئے گئے لیکن ضرورت کے تحت ہرصفحے پر حواشی کی صورت میں ان کے مآخذات کی تفصیل باآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین ان کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جالبی صاحب نے گجری اور دکنی کے جتنے زیادہ مخطوطات، جتنی زیادہ قدیم بیاضوں اور جتنی تاریخ و سوانح کی کتابوں کو دیکھا ہے وہ بے نظیر و بے ہمتاہے۔ وہ شعری یا نثری نمونے نقل کرتے ہیں تو دوسری تحقیقی یا تنقیدی کتابوں سے نقل نہیں کردیتے بلکہ اصل نثری رسالے یامثنوی و دیوان سے لیتے ہیں اور یاد رہے کہ دکنی ادب کا بیش تر حصہ آج بھی غیر مطبوعہ ہے ''۔ (۵۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس تحقیقی روش کا نتیجہ ہے کہ تاریخِ ادبِ سے متعلق جتنی مستند معلومات ان کی تاریخِ ادب سے ملتی ہے اتنی کسی دوسری تاریخ (فرد واحد کی مرتّب کردہ) سے نہیں ملتی۔

تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل اپنی گوناگوں خوبیو ں کے باعث اشاعتِ اوّل ہی سے ناقدین اور عام قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔جلد اوّل میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک کامیاب مؤرخ کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھر پور طریقے سے اپنے تصوّر تاریخ کی پاسداری کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہر عہد کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مدوجزر اور قدروں کو واقعات کی جانچ پرکھ میں استعمال کرتے ہوئے ادب پر ان کے اثرات کو ایک اکائی کے طور پر پیش کیا ہے بقول ڈاکٹر پروفیسر وقار عظیم:

''ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل) اردو ادب کی پہلی تاریخ ہے جس میں ادب کو (خواہ وہ قدیم ہو یا جدید) ''مخصوص تہذیبی، معاشرتی، معاشی سیاسی اور لسانی عوامل کا منطقی نتیجہ اور اجتماعی تہذیبی روح کا عکس سمجھ کر اسے اس انداز سے زیر بحث لایا گیا ہے کہ وہ ایک ناقابل تقسیم اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے آئے''۔ (۶۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ میں اردو کی ابتدائی ادبی روایت کو ’’ہندی روایت ‘‘ اور ’’فارسی روایت ‘‘ کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پوری جلد میں اردو ادب کی ابتدائی روایت پر مختلف اثرات کی نشاندہی عمدگی اور دلائل کے ساتھ پیش کی ہے۔اردو کی ابتدائی روایت کے بیان کے اس سفر میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک کامیاب اور ذمہ دار مؤرخ اور محقق کے طور پر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ تاریخی حقائق کو دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ علمی دیانتداری اور غیر جانبداری کا اظہار کرتے ہوئے شعراء اور مصنفین کے مقام ومرتبہ کے تعین کی عمدہ کوشش کی گئی ہے اردو زبان کی ابتدائی ادب کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت اور تشکیل معتبر اور مستند حوالوں کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کثیر تعداد میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد سے رہنمائی حاصل کی اور ایمانداری سے اپنے ماخذآت کی نشاندہی فرمائی ہے۔اردو کا ابتدائی ادب غیر مطبوعہ حالت میں ہونے کے با عث عسیر الحصول ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ مطالعہ بھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف نایاب مخطوطات تک رسائی حاصل کی بلکہ ان کے متن کو قابلِ مطالعہ بھی بنایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’جالبی صاحب نے گجری اور دکنی ادب کے جتنے زیادہ مخطوطات، جتنی زیادہ قدیم بیاضوں اور جتنی تاریخ و سوانح کی کتابوں کو دیکھا ہے وہ بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ وہ شعری یا نثری نمونے نقل کرتے ہیں تو دوسری تحقیقی یا نتقیدی کتابو ں سے نقل نہیں کرتے بلکہ اصل نثری رسالے یا مثنوی ودیوان سے لیتے ہیں اور یاد رہے کسی ادب کا بیشتر حصہ آج بھی غیر مطبوعہ ہے‘‘۔(۶۱)

’تاریخ ادب اردو‘جلد اوّل کے مآخذات پر نظر ڈالنے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی محققانہ کاوشوں کا بھر پورانداز ہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی روایت جس منطقی انداز میں اس کے آغاز، ارتقاء،عروج، توسیع اور تکرار کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے اس سے پہلے اردو ادب کی کسی تاریخ میں یہ انداز نظر نہیں آتا۔ اردو ادب کی ابتدائی روایت کو ایک مربوط لڑی میں پرونے کے ساتھ ساتھ ہر روایت کے زوال اور نئی روایت کے ارتقاء کے پس منظر میں کار فرما سیاسی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور معاشی عوامل کو بھی بھر پور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا منطقی اور تجزیاتی اندازِ فکر پوری جلد پر حاوی نظر آتا ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کی نگار شات سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ زبان کے بدلتے روپ کی طرح نشاندہی

کی گئی ہے۔ وہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی زبان کے حوالے سے علمیت اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔’’ تاریخ ادب اردو‘‘ (جلد اوّل) تحقیقی نتائج کے حوالے سے بھی نہایت معتبر ہے۔ تحقیقی نتائج کے حصول کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے پہلے سے موجود حقائق موادسے رجوع کرنے کے علاوہ غیر ادبی مآخذات سے بھی استفادہ کیا ہے بالخصوص تخلیق کاروں کی سوانح مرتب کرنے کے لئے سوانحی ماخذات کے علاوہ تواریخ، سفر ناموں،یادداشتوں، بیاضوں اور دواوین سے بھی بھر پور استفادہ کیا ہے بلکہ بہت سے نئے مآخذا ت کو بھی متعارف کروایا گیا ہے (تفصیلی تجزیے میں نئے مآخذات کی نشاندہی کردی گئی ہے)۔ نئے مآخذات کی دریافت سے کئی نام ور محققین سے اختلاف کرتے ہوئے درست حقائق کی نشاندہی بھی کی گئی ہے یہ اختلافات تاریخ پیدائش،تخلیق کے غلط انتساب، سوانحی امور وغیرہ کے سلسلے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل میں نئے مآخذات تک رسائی کے نتیجے میں بہت سے نئے شعراء کو بھی متعارف کروایا ہے اور بعض شعراء کے غیر دریافت شدہ کلام کو بھی منظر عام پر لائے ہیں۔

تحقیقی انداز اور نتائج کے علاوہ تاریخ اد بِ اردو(جلد اوّل)ڈاکٹر جمیل جالبی کے ناقدانہ شعور کے حوالے سے بھی نہایت اہم ہے۔ تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شعراء کے مطالعے میں تقابلی مطالعے اور تجزیے کا طریقۂکار اختیار کیا ہے زبان کے ابتدائی نقوش کے حوالے سے نہ صرف پنجابی اردو، دکنی اردو اور گجری اردو کا تجزیہ کیا گیا ہے بلکہ ہر دور کے دستیاب مخطوطات اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے دور کے دوسرے تخلیق کاروں سے موازنہ کیا گیا ہے جس سے اردو کی لسانی روایت کو ایک تسلسل کے طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی چونکہ ادب کو زندگی کا آئینہ قرار دیتے ہیں ا س لئے کسی بھی ادبی فن پارے کی تفہیم کے لئے تمام عوامل کے اثرات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں جس سے فن پارے کی تفہیم نہ صرف آسان ہو جاتی ہے بلکہ اس کی معنویت کے مختلف پہلو بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ڈاکٹر غلام مصطفی خان ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہیں۔’’تحقیق کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تنقید بھی بہت سلجھی ہوئی ہے بلکہ دلکش اور دل آویز ہے نہ کہیں سختی اور نہ کہیں جھول ہے ہر بات سے ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتاہے ‘‘۔ (۶۲)

’تاریخ ادب اردو ‘جلد اوّل کے شائع ہونے کے بعد اسے ادبی حلقوں اور عام قارئین میں زبردست پذیرائی ملی۔ اس جلد کے حوالے سے مختلف مضامین بھی لکھے گئے ہیں جن میں اس جلد کی خوبیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اسکی خامیوں کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی گئی۔ اس سلسلے میں جن محققین او ر ناقدین کے مضامین زیادہ اہم ہیں ان میں رشید حسن خان، ڈاکٹر گیان

چند جین اور ڈاکٹر غلام مصطفی خان بالخصوص اہم ہیں سب سے پہلے رشید حسن خان کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیاہے۔

رشید حسن خان نے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ '' میں تاریخ ادب اردو کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادبِ اردو 'جلد اوّل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی تحقیق کے حوالے سے بعض امور کی نشاندہی کی ہے۔رشید حسن خان،نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادبِ اردو' (جلداوّل) کے حوالے سے جو اعترا ضات اٹھائے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ثانوی یا اس سے کم درجہ حوالوں کا استعمال اور بعض مقامات پر حوالہ موجود نہیں۔

۲۔ ہر طرح کے مآخذات تحقیق کے لئے قبول کر نا۔

۳۔ سنین کے ذیل میں عموماً حوالہ نہیں دیا گیا۔

۴۔ بعض مقامات پر کتاب کے ایڈیشن کی نشاندہی نہیں کی گئی۔

۵۔ غیر معتبر راویوں کی روایتوں کو بغیر جانچ پرکھ کے استعمال کیا گیا ہے۔

۶۔ نثر ونظم کے اقتباسات میں صحتِ متن کا خیال نہیں رکھا گیا بالخصوص قدیم مخطوطات میں کس کے متن پر اور' کیوں' بھروسہ کیا گیا؟

۷۔ تنقیدی بیانات میں حاشیہ آرائی کی ہے اور طول بیانی سے کام لیا ہے۔

۸۔ کتاب میں آخر میں دیے گئے ضمیمے، اس کتاب کے تاریخی ربط و تسلسل میں انتشار کا باعث ہیں۔ نیز زبان اور ادب کو آپس میں الجھا دیا گیا ہے اور علم السّان کے اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۹۔ مؤلف نے جگہ جگہ اردو کو مسلمانو ں سے اور اسلام سے اس طرح وابستہ کیا ہے جیسے ان میں لازم وملزم نسبت ہو۔

۱۰۔ ''اردو'' اور '' اردو زبان'' کے الفاظ عام طور پر بے احتیاطی سے استعمال کئے گئے ہیں مؤلف کے اندازِ نگارش سے یہ متبادرہوتاہے۔ کہ ''اردوزبان'' ہر زمانے میں موجودتھی۔(۶۳)

ڈاکٹر رشید حسن خان نے، تاریخ ادب اردو(جلد اوّل) سے مثالوں کے ذریعے اپنے اعتراضات کوواضح کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید حسن خان کے مطابق، ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے بہت سے دعوؤں کی بنیادحافظ محمودد شیرانی مرحوم کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' کے مندرجات پر رکھی ہے۔

> ''شیرانی صاحب نے اس کتاب میں غیر معتبر حوالوں کو بھی بلاتکلف قبول کر لیا ہے بیاضوں اورموؤرتصانیف کی بنیاد پر جس کلام کا انتساب درست سمجھا گیا ہے تحقیق کے نقطۂ نظر سے وہ نا درست ہے۔ شیرانی صاحب نے تو پنجاب کو اردو کا مولد ثابت کرنا چاہا تھا

اور اس کے لئے انہوں نے ہر طرح کا مآخذ سے کام لیا۔ یہ انداز تحقیقی کم اور جذباتی زیادہ تھا۔ مؤلف،ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں جو مہتم بالشّان کام ہے اس لئے ان کی ذمہ داری زیادہ ہے ‘‘۔(۶۴)

رشید حسن خان کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی نے زبان کے آغاز و ارتقاء کی بحث کو غیر ضروری طور پر کتاب میں شامل کیا ہے جبکہ ان کا انداز بھی غیر سائنسی اور لسانیات کے ا اصولوں کے خلاف ہے۔ (۶۵)

رشید حسن خان کے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے تو دو بنیادی اعتراضات ہیں جن کی تفصیل شواہد کے ساتھ انہوں نے اپنے مضمون میں بیان کی ہے۔ پہلا غیر معتبر کتابوں کے حوالے اور نمونے کے اندراج کے وقت مخطوطے یا ایڈیشن کی وضاحت نہیں کی گئی اور نمونے کے اشعار اور متن معتبر نہیں ہیں۔ رشید حسن خان، محمود شیرانی پر بھی بنیادی طور پر انہی دو حوالوں سے معترض ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے رشید حسن خان کے ان دو اعتراضات کا بہت عمدگی سے جواب دیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:

’’یہ مطالبے بے عیب ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہو جائے تو تحقیق مکمل ہو گی لیکن عملی دنیا میں کاملیت ممکن نہیں۔ اگر ہمیشہ اصلی مآخذ کو دیکھ کر حوالے دیے جائیں تو سال بھر میں دس صفحے سے زیادہ لکھنا ممکن نہ ہو گا۔ اگر محض ہم عصر یا قریب العصر راوی کے بیان پر اصرار کیا جائے تو اردو ادب دنیا کے کسی بھی ادب کا معتدبہ ابتدائی حصہ خارج کر دینا ہو گا۔ کیا رامائن، مہابھارت، کالی داس کی تصانیف۔ ہومر کی ایلیڈ، اوڈیسی اور دوسرے یونانی شاہکاروں کے قریب العصر نسخے موجود ہیں۔ ان کے قدیم ترین نسخے مصنف سے کئی صدی بعد کے ہیں کیا انہیں حرف غلط قراردیا جائے۔قدیم اردوادب کے ان قدیم مخطوطات کو لیجئے جن کے مصنف مرتب،کاتب،سنہ تصنیف یا سنہ کتابت میں سے کسی کا علم نہیں،اہل حزم و احتیاط کافرمان ہو گا کہ ان کا ایک حرف بھی قبول نہ کیا جائے۔ لیکن ایسا کیا گیا تو آئندہ کے لئے قدیم اردو ادب میں ایک نظم، ایک شعر،ایک لفظ، ایک سطر کا اضافہ ممکن نہ رہے گا ‘‘۔(۶۶)

اس مضمون میں ڈاکٹر گیان چندجین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ محقق کو سارے قدیم خزانے کا داخلی رنگ و آہنگ دیکھ کر طے کرنا ہوگا کہ یہ کہا ں تک قابلِ اعتماد ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے انداز تحقیق کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے اور جگہ جگہ ان کی تحقیقی کاوشوں کو اس بنیاد پر سراہا گیا ہے اور وہ داخلی شواہد اور معاصرانہ دستاویزات کی روشنی میں کسی بھی ادبی فن پارے کے معتبر ہونے کی سند پیش کرتے ہیں اور بغیر شواہد کے حقائق کو قبول نہیں کرتے۔ یہی رویہ ان کی تاریخ ادبَ اردو (جلداوّل) میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین بھی اسی عمل سے متفق نظر آتے ہیں ورنہ ان کے مطابق نظامی کی مثنوی ''کدم راؤپدم راؤ'' کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیو ں کہ وہ مجہول الاسم ہونے کے علاوہ ناقص الطر فین بھی ہیں۔

حوالے درج کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین، رشید حسن خان کے مؤقف کی تائید کرتے ہیں لیکن ان کے مطابق اگر ہر صورت میں سو فیصدی حوالے درج کئے جائیں گے تو ہر صفحے کے فٹ نوٹ میں حوالوں کا ایک گل دستہ سج جائے گا (ص۶۸۹)۔ ڈاکٹر گیان چند جین، رشید حسن خان کے اس اعتراض کو بے جا سمجھتے ہیں کہ کسی بھی ادیب کی تخلیق کا نمونہ دیتے ہوئے اس کے مختلف نسخوں سے تدوینِ متن کے اصولوں کی پیر وی کرتے ہوئے صحیح متن ترتیب دیا جائے اور اس کے بعد تاریخ ادب کا حصہ بنایا جائے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق اگر ایسا گیا تو پانچ صفحوں کا ایک مضمون لکھنے میں پانچ ماہ درکار ہونگے (ص۶۸۹)۔ڈاکٹر گیان چند جین تجویز دیتے ہیں کہ:

> ''نمونے درج کرتے وقت کسی بہتر نسخے یا ایڈیشن کو استعمال کرے اس کا یہ فرض نہیں کہ وہ ہر شعر کا درج کرنے سے پہلے اس کے خالق کے جملہ مخطوطوں کی چھان بین کرے۔ جو نمونے کسی غیر مطبوعہ متن کے ہیں ان کے مآخذی نسخے کا حوالہ دینا ضروری ہے لیکن مشہو ر متون کے سلسلے میں مآخذ کا حوالہ نظر انداز کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ''۔ (۶۷)

ثانوی حوالو ں پر تکیہ کرنے کے حوالے سے رشید حسن خان کے اعتراض کے جواب میں گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان محققانہ کاوشوں کو سراہتے ہیں جن کے نتیجے میں انہوں نے نمونے درج کرتے ہوئے اصلی مآخذات سے استفادہ کیا ہے۔ جلد اوّل کے فٹ نوٹ میں اصل مآخذ کے صفحے وار حوالے درج کئے ہیں۔ لہذا ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان کا وشوں کو دیکھتے ہوئے رشید حسن خان کا اعتراض بے محل قرار دیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خان ڈاکٹر جمیل جالبی کے طویل تنقید ی

بیانات کو حاشیہ آرائی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند،رشید حسن خان کے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے ان کی تنقیدی آراء کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں رشید حسن خان سے اس حد تک متفق ہوں کہ بحیثیت مؤرخ ادب جالبی صاحب کو اس شرح وبسط سے تنقید نہیں کرنی چاہیے------------لیکن جب انہوں نے لکھنے کی زحمت کرہی ڈالی تو قاری کو اس سے کوئی زیاں نہیں ہوتا، سود ہی سود ہے۔ عام قارئین بالخصوص نصاب کے طالب علموں کو اس تنقیدی تجزئیے سے تفہیم ادب میں مدد ملے گی ''۔ (۶۸)

گیان چند جین، رشید حسن خان کے اس اعتراض کو بھی رد کرتے ہیں کہ مؤرخ ادب کو لسانی پہلو سے صرف نظر کرنا چاہئے (ص۔۶۹۲) گیان چند جین، رشید حسن خان کے ان اعتراضات کو جائز قراردیتے ہیں جن میں اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی سے اختلاف کیاگیاہے۔ گیان چند جین جلد اول کے مضمون میں ہرصوبے کے حوالے سے اردو کے مولد ہونے کے دعوے کا تجزیہ کرتے ہوئے رائے دیتے ہیں:

''لسانیات کے باب میں جالبی صاحب کے ان بیانات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ وہ اس موضوع کے عارف نہیں، انہیں اردو سے پہلے کی لسانی صورت حال، ہندوستان میں زبانوں کے ارتقاء اور اردو کے نظریوں کاکوئی واضح شعور نہیں۔ وہ اردو کی قدامت اور ہر صوبے میں اس کی پیدائش دکھا کر اپنے اور ان صوبوں کے باشندوں کے جذبات کو آسودہ کرتے ہیں لیکن حقیقت کی تلاش نہیں کرتے''۔ (۶۷)

گیان چند جین نے اپنے مضمون '' ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو'' میں رشید حسن خان کے اعتراضات کا جواب دینے کے علاوہ، تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) کے حوالے سے اپنے کچھ تحفظات کابھی اظہار کیاہے جوکہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ادوارکی تقسیم فہرست ابواب میں واضح کردی جاتی۔

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی خود پیش لفظ میں دیگر تواریخ ادب پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان میں مختلف علاقوں کو الگ الگ جزیرے مان کر ان میں ادب کو اس طرح پیش کیاگیاہے کہ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے خود جلد اوّل میں تاریخ ادب کو دور، علاقے اور صنف ادب کے ارتقاء کے حوالے سے پیش کیاہے۔ ضمیموں میں یہ تقسیم مزید نمایاں ہے۔

۳۔ چار علاقوں کے ادب کا ضمیمے میں بیان کرنا خاکہ نگاری کا بہترین طریقہ نہیں۔
۴۔ ضمیمے کا عنوان ’’پاکستان میں اردو ‘‘ قابل اعتراض ہے کیونکہ پاکستان ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء وجود میں آیا۔ اس سے پہلے کہ ادب کو پاکستان کا ادب قرار نہیں دیاجاسکتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو چاہیے تھا کہ وہ ضمیموں میں بیان کردہ علاقوں کے ادب کو کتاب کے اصل متن کے اندر حسبِ موقع درج کر دیتے کیونکہ انہوں نے جلد اوّل کو بنیادی طورپر علاقائی اعتبار سے تقسیم کیاہے۔
۵۔ کتاب کے ذیلی اجزاء کی تقسیم دوہری ہے یعنی فصلوں کو تقسیم کے بعد ابواب کی تقسیم کی گئی ہے۔ ہر فصل کے ذیلی ابواب کی تقسیم نئے نمبر شمار سے کی گئی ہے جس سے حوالہ دینے سے دشوار ی ہوتی ہے۔
۶۔ نظم و نثر کی دوئی کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے نظرانداز کردیا جس سے نثر کا ارتقاء وضاحت سے سامنے نہیں آیا۔
۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب (جلد اوّل) میں روایت کو بہت تنگ زمانی عرصے میں محدود کیاہے۔ روایت کے پھیلاؤ کے لئے زمان کا پھیلاؤ زیادہ ہونا چاہئے۔
۸۔ جالبی جس خصوصیت کے لئے روایت کا لفظ استعما ل کرتے ہیں وہ محض لسانی اور ادبی خصوصیات ہیں جنہیں روایت کے لفظ سے موسوم کرکے ایک نئی فکر کا بھرم پیدا کیاگیاہے۔
۹۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے فٹ نوٹ میں متن کے حوالے سے ضروری مباحث کو بھی حواشی میں درج کیاہے مثلاً کئی مثنویوں کی تاریخ تصنیف کی بحث متن ہے جبکہ اس سے متعلق کوئی جزو، مصرع تاریخ کا کوئی دوسرانسخہ فٹ نوٹ میں درج ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین تجویز دیتے ہیں کہ مختصر حوالے متن میں دیئے جاسکتے ہیں جبکہ طویل حوالے،حواشی میں درج کئے جاسکتے ہیں۔ تبصراتی نوٹ بھی متن میں درج کرنا چاہیے۔ (۷۰)

تاریخ ادبِ اردوجلد اوّل پردرج بالاتحفظات اور تجاویز کے علاوہ جن دیگر امور کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں چند درج ذیل ہیں ؛
۱۔ جالبی نے سنسکرت کی دوتصانیف ’’وکرامورواسیا‘‘، ’’کاوی الارم کارا‘‘ کے نام غلط درج کئے ہیں۔ پہلی کتاب کالی داس کی مشہورتصنیف ’’وکرم اروشی ‘‘ہے۔ دوسری ایک دوسرے ادیب کی ’’کاویاالنکار‘‘ (یعنی کاویہ النکار) ہے۔ (ص۶۹۵)

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لغات کی حد تک محمود شیرانی کی تحقیق سے استفادہ کیاہے جبکہ سفر ناموں اور تاریخ کی طرف توجہ نہیں دی سوائے ’’تحفۃ الاکرام‘‘ اور ’’مراۃ احمد ی ‘‘ کے دیگر کتب سے استفادہ نہیں کیاگیا۔ (ص۔۶۹۶)

۳۔کتاب میں اکثر ہجری سنہ کے متوازی ایک عیسوی سنہ بھی دیا ہے۔ احتیاطا ماہ و یوم معلوم نہ ہوں تو عیسوی سنہ دئیے جائیں۔ (ص۔ ۶۹۶)

۴۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں اردو شعراء کی جن قدیم غزلوں کوپیش کیاگیاہے ان کے انتساب کے بار ے میں اطمینان نہیں ہے لہٰذا انہیں مشکوک کے زمرے میں رکھ دیاجاتا۔ (ص۔ ۶۹۶)

۵۔ گیان چند کی تحقیق کے مطابق ؛ ’’مطبوع الصبیان ‘‘ کی تصنیف سے پہلے ’’خالقِ باری‘‘ کو خسرو سے منسوب کیاجا چکا تھالہٰذا ’’مطبوع الصبیان‘‘ کو ’خالق باری‘ کے خسرو سے انتساب کے حوالے سے دلیل نہیں ٹھہرایاجاسکتا۔ (ص۔۶۹۶۔۶۹۷)

۶۔ ’’واحد بار ی‘‘ کوڈاکٹرجالبی نے ڈاکٹر زور کی تحقیق کے نتیجے میں اشرف بیابانی سے غلط طور پر منسوب کردیا ہے جبکہ نصیرالدین ہاشمی نے سالار جنگ کے مخطوطات کی فہرست سے اس کے مصنف کا پتہ چلایاہے جوکہ آصفی دور میں سکندر جاہ کے عہد میں بریلی یوپی سے یہاں آیا تھا۔ (ص۔۶۹۷)

۷۔ ص۔ ۵۲ پرشیخ جمالی کے حوالے سے دئیے گئے ریختے ’’خوارشدم ‘‘ زار شدم،لٹ گیا ‘‘ کا انتساب مشکوک ہے کیونکہ یہ دوسروں کے نام سے بھی ملتاہے۔ اس حوالے سے گیان چند جین نے اپنی تحقیق کی کتاب ’کھوج ‘ کاحوالہ درج کیاہے۔ (ص۔۶۹۷)

۸۔ گیان چند جین تحقیقی حوالوں سے جالبی کے افضل پانی پتی کے سال وفات ۱۰۳۵ھ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ (ص۶۹۷۔۶۹۸)

۹۔ ص۔ ۹۳ پر سیدنور الدین محمد عرف ست گرو سے منسوب اشعار جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے درج کئے ہیں وہ ایک مجہول الاسم اور مجہول الاحوال مضمون نگار کے حوالے سے درج کئے ہیں جس کی نشاندہی ڈاکٹر رشید حسن خان بھی اپنے مضمون میں کرچکے ہیں۔ گیان چند جین تحقیق کے بعد مضمون نگار کا نام قاصی سید نور الدین شیرازی اور مضمون کا عنوان ’’گجرات، مسلمان اور گجراتی زبان‘‘ قرار دیتے ہیں البتہ ان اشعار کو زبان کی بنیاد پر گیارہویں صدی عیسوی کا ماننے سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ (ص۔۶۹۸)

۱۰۔ گیان چند جین ص ۹۵ پر’’تحفۃ الکرم ‘‘ کے حوالے سے حضرت راجو قتال کے نام قیاساغلط قراردیتے ہیں۔ (ص۔ ۶۹۹)

۱۱۔ ص۔ ۱۴۲ پر جالبی گودھرا کے امین کی مثنوی 'تولدنامہ'، 'معراج نامہ '، 'وفات نامہ' کو ایک ہی مثنوی کے تین حصے قرار دیتے ہیں جبکہ گیان چند جین داخلی شواہد کی بنیاد پر انہیں تین الگ الگ مثنویات قرار دیتے ہیں۔(ص۷۰۰)

۱۲۔ فصل سوم میں ''اردو بہمنی دور میں '' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۵۲۵ء۔ ۱۳۵۰ء) تک اس کی حدود متعین کرتے ہیں جبکہ گیان چند جین، نصیرالدین ہاشمی کی تحقیق کو درست قرار دیتے ہیں جنہوں نے یہ عہد (۱۵۲۷۔ ۱۳۴۷ء) متعین کیاہے۔ (ص۔ ۷۰۰)

۱۳۔ ص۔ ۱۵۱ پر شاہ راجو قتال سنہ وفات ۷۳۶ھ کوگیان چند جین درست تسلیم نہیں کرتے بلکہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق کے مطابق ۷۳۱ھ کو درست قرار دیتے ہیں۔ (ص۔۷۰۰)

۱۴۔ ڈاکٹرجالبی ایک قطعۂ تاریخ کی بنیاد پر شاہ میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات ۹۰۲ ھ یا ۹۰۴ ھ قرار دیتے ہیں جبکہ گیان چند جین اسی قطعہ تاریخ کے حوالے سے ۹۹۴ھ کو سالِ ولادت قرار دیتے ہیں۔ (ص۔۷۰۱)

۱۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ص۔ ۱۷۱ پر میراں جی کی مثنوی کا نام' شہادت التحقیق 'درج کرتے ہیں جبکہ گیان چند جین اسی شعر کے حوالے سے یہ نام' شہادت الحقیق' قرار دیتے ہیں۔ (ص۔ ۷۰۱)

۱۶۔ ص۔ ۱۸۴ پر عادل شاہی دور کی ابتداء ۸۹۷ھ کی بجائے نصیرالدین ہاشمی کی تحقیق ۸۹۵ھ کو درست قرار دیتے ہیں جبکہ ابراہیم عادل شاہ کے سال جلوس ۹۴۵ھ کوبھی درست تسلیم نہیں کرتے بلکہ ڈاکٹر چراغ علی اور نصیرالدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق ۹۴۱ھ کو درست سال جلوس قرار دیتے ہیں۔(ص۷۰۲)

۱۷۔ جالبی نے ص ۱۹۴، ۲۱۹ پر عبدل کے ابراہیم نامہ کا سنہ ۱۰۱۲ھ / ۱۲۰۳ء لکھاہے جبکہ گیان چند جین،مسعود حسین خان کے حوالے سے اسے ۱۶۱۱۔۱۲ء اور ۱۰۲۰۔۲۱ھ قرار دیتے ہیں۔

۱۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ برہان الدین جانم کا سنہ وفات ۹۹۰ھ یا اس کے کچھ بعد متعین کرتے ہیں جبکہ گیان چند جین ڈاکٹر حسینی شاہد کی تصنیف کے مطابق سنہ ۱۰۰۷ھ کو درست قرار دیتے ہیں۔

۱۹۔ تارخ کو علاقے وار بیان کرنے کے سلسلے میں شعراء کے درمیان زمانی تغیرکی مذمت کرتے ہیں اور محمد بن احمد عاجز اور احمد کی مثال دیتے ہیں جس میں بیٹے کا ذکر ص۔ ۲۴۷ پر ہے جبکہ باپ کا ذکر ص ۴۲۳ پرہے۔ (ص ۷۰۳)

۲۰۔ ص۔ ۲۶۷ پر جالبی کے اس دعوے کو رد کرتے ہیں کہ 'خاورنامہ' اردو کی طویل ترین مثنوی ہے۔گیان چند جین کے مطابق 'الف لیلیٰ '، 'نومنظوم' جوکہ ۵۴ ہزار اشعار پرمشتمل ہے اردو کی طوین ترین مثنوی ہے۔ (ص۷۰۴)

۲۱۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب ’نورس ‘کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے دعوے کو درست قرار نہیں دیتے کہ اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے تحت گیت ترتیب دئیے گئے ہیں۔ گیان چند جین کے مطابق اس میں ہرگیت میں وہ راگ لکھ دیا گیاہے جس میں وہ گیت گانا چاہیے گویا گیت کو سبقت حاصل ہے اور راگ اس کے تابع ہے، مزید یہ کہ کتاب ’نورس‘ کو اردو کی کتاب قرار دینے پر بھی معترض ہیں۔ (ص۔ ۷۰۲۔۷۰۳)
۲۲۔ وجہی کے باب میں ’’تاج الحقائق‘‘ کو ملاوجہی سے منسوب کرنا ایک تحقیقی اندھیر ہے ‘، کو رد کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالسعید اختر اور ڈاکٹر شوپرشاد جاوید وشٹ کی تحقیق کو درست مانتے ہوئے اسے ملا وجہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ (ص۷۰۶)
۲۳۔ ص۔ ۴۳۶ پر قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی کے نام مشتری پر شک کا اظہار کرتے ہوئے سیدہ جعفر کی تحقیق کو درست قراردیتے ہیں۔ جس کے مطابق کلیاتِ قلی قطب کے ایک مصرعے سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بھاگ متی کو مشتری کاخطاب دیاگیا۔ (ص۔ ۷۰۷)

ڈاکٹرجالبی کی تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل) مختلف شعراء اور مثنویوں کے ناموں سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب کے آخر میں درج ضمیموں کا جائزہ لیتے ہوئے تجویز دیتے ہیں کہ ان مباحث کو لسانی جائزے کی ذیل میں متن کا حصہ بنانا چاہیے تھا۔ (ص۔۷۰۹) گیان چند جین، رشید حسن خان کے ان اعتراضات کو درست قرار دیتے ہیں جو انہوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے اسلوب کے حوالے ے کیے ہیں۔ رشید حسن خان، ڈاکٹرجالبی پر محمد حسین آزاد کے اسلوب کی نقل پر اعتراض کرتے ہیں۔ (ص۔ ۳۴۵، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ) جبکہ گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی کے حد سے زیادہ شخصی لہجے پر معترض ہیں (ص۔ ۷۱۱) جبکہ جالبی کے حوالے سے لفظ ’ناظرین‘ کے استعمال کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ (ص۔ ۷۱۲) جلداوّل میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے اسلوب کے حوالے سے محمد حسین آزاد کی نقل اور شخصی لہجے کے حوالے سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں،انہیں صرف ایک حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ بحیثیتِ مجموعی یہ اسلوب پوری جلد پر حاوی نہیں بلکہ بعض ابواب کی ابتداء یا اختتام میں کہیں کہیں اس اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے جبکہ تحقیقی اور تنقیدی نتائج کو بیان کرنے کے لئے نہایت شگفتہ علمی اور ادبی انداز اختیار کیا گیاہے جبکہ قارئین کو ناظرین کہہ کر مخاطب کرنے سے قاری اور مصنف کے درمیان ایک بے تکلفی کے رشتے کا احساس ہوتاہے گو یا مؤرخ ادبی تاریخ کے منظر نامے کی سیر کے دوران قاری کواپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات و واقعاتکی طرف بالخصوص متوجہ کرتاہے یوں تاریخ ادب کا مطالعہ ایک سنجید ہ ادبی سرگرمی ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کے لئے ایک دلچسپ قصے کی اہمیت بھی اختیار

کرلیتاہے۔ مشفق خواجہ اپنے مضمون ''اردو ادب کی پہلی تاریخ ' میں جالبی کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہاں ایک آدھ جگہ وہ محمد حسین آزاد کا شگفتہ لہجہ اختیار کرنے کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ ان کا عام انداز نہیں ہے۔ منہ کا مزا بدلنے کے لیئے ایسا کرتے ہیں اور ایسا بھی کیا کہ کوئی تاریخِ ادب لکھنے والاآزاد کے سحر سے اس حد تک آزاد ہوجائے کہ اس پر آزاد کی خوش گفتاری کا بھی اثر نہ ہو''۔ (۷۱)

بہرحال جلد اوّل پر آزاد حسین آزادکے اسلو ب کی نقل کے اعتراضات سامنے آنے کے بعد ان کی تاریخ ادب کی جلد دوّم، سوّم اور چہارم کا اس لحاظ سے جائزہ لیاجائے تو اندازہ ہوتاہے کہ بقیہ جلدوں میں یہ اثرات بتدریج کم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہوگئے ہیں حتی کہ جلد چہارم میں اس اسلوب کا شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹرغلام مصطفی خان نے اپنے مضمون'' تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ ''مشمولہ 'ڈاکٹر جمیل جالبی ؛ایک مطالعہ'میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اوّل اور دوّم کا تجزیہ کرتے ہوئے حواشی میں تحقیقی تسامحات کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ بعض اہم امور کی طرف توجہ بھی مبذول کروائی ہے۔ جلد اوّل کے حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفی خان نے جن تحقیقی اغلاط کی نشاندہی کی ہے وہ درج ذیل ہیں ؛

۱۔ حواشی نمبر1میں تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل کے ابتدائی ۳۷ صفحات میں ڈاکٹرجالبی کے بعض دعوؤں پر اعتراض کرنے کے ساتھ ساتھ بعض امور کے حوالے سے' حوالہ' درج نہ کرنے کی نشاندہی فرمائی ہے۔(ص۔۳۳۶)

۲۔ ص۔ ۲۴ سے لے کر ص ۵۲ تک کچھ تحقیقی امور کی درستگی کی گئی ہے مثلاً لفظ کوتوال کے استعمال کے حوالے سے فردوسی کی اوّلیت اور مطبوع الصبیان کو امیر خسرو سے منسوب کرنے کے علاوہ بابا فریدالدین شکر گنج کے کلام کے حوالے سے تصریحات شامل ہیں۔

۳۔ حواشی نمبر ۹میں ڈاکٹرجالبی کے بیان کردہ وجہی کے فارسی شعر کی تصحیح کی گئی ہے۔

۴۔ حواشی نمبر۱۷، میں بغیرحوالہ رازی کو زاری قراردینے پر اعتراض کیاہے اور اس کے نام قطب کے حوالے سے تخلص 'قطبی' کی ذیل میں حکیم شمس اللہ قادری اور اپنی تحقیق کا حوالہ دیاہے۔

گیان چند جین اور ڈاکٹررشید حسن خان ڈاکٹر جمیل جالبی پرمعترض ہیں کہ انہوں نے پاکستان کے ہر صوبے کو اردو کے مولد ہونے کا اعزاز دیاہے جبکہ ڈاکٹرعظیم الشان صدیقی اس حوالے سے یوں معترض ہیں:

''جمیل جالبی نے ادب کو اس کی زمین سے نہیں بلکہ ایسے خلاء سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جو ان کے مخصوص خطے اور ملک کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کو تقویت پہنچا سکے۔ اس طرح انہوں نے زبان کے آغاز وارتقاء کے بارے میں کمزور شواہد کی مدد سے بعض ایسی مسلّمہ حقیقتوں کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی ملکی تقاضوں کو تقویت ملتی ہے''۔ (۷۲)

یہ اعتراضات اگرچہ کسی حد تک درست ہیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل میں جس نقطۂ نظر کوپیش نظر رکھا ہے۔ وہ بقول مشفق خواجہ:

''جمیل جالبی کا نقطہ نظریہ ہے کہ اردو پاکستان و ہند کی ایک ایسی زبان ہے جو ہرجگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے آغاز کو کسی ایک خطے تک محدود رکھنا درست نہیں۔ یہ بیک وقت بہت سے خطوں میں پروان چڑھی کیونکہ جہاں کہیں مختلف بولیاں بولنے والوں کو ایک دوسرے تک اپنا مفہوم پہنچانے کی ضرورت پیش آئی یہ زبان از خود نمودار ہوگئی۔ اس بناء پر پاکستان و ہند کا ہر وہ علاقہ اس کا مولد قرارپائے گا جہاں یہ زبان اظہار مطالب کا وسیلہ بنی۔ اردو نے ہربولی اور ہرزبان سے فیض اٹھایا اور ایسی خصوصیت اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ جمیل جالبی نے اردو کو پاکستان و ہند میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے 'عاداعظم مشترک '' سے تعبیر کیاہے ''۔ (۷۳)

ڈاکٹرجالبی نے تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل) میں اپنے اس نقطۂ نظر کو دلائل اور حوالوں سے نہ صرف درست ثابت کیاہے، بلکہ زبان کی پیدائش، ارتقاء اور تشکیل کے حوالے سے ایک مربوط منظرنامہ بھی پیش کیاہے۔ جوان کے اس دعوے اور نقطۂ نظر کی تصدیق کرتاہے۔

جلد اوّل میں اردو ادب کے میلانات، متغیر رحجانات اور لسانی تغیرات کو عمدگی سے پیش کرتے ہوئے برصغیر میں اردو زبان کے ارتقاء اور تشکیل کے عمل کو مربوط انداز میں پیش کرنا ڈاکٹرجالبی کا ایک بہت بڑاکارنامہ ہے۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں مختلف ادوار میں اردو زبان

کے ابتدائی رنگ و روپ کی تلاش اور ٹھوس دلائل اور شواہد کے ساتھ انہیں پیش کرکے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب کی مختلف روایتوں کی درمیانی کڑیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کو نہ صرف ٹھوس بنیاد فراہم کی ہے بلکہ زمانی اعتبار سے لسانی تغیرات کو مربوط انداز میں پیش کرکے لسانیات کے حوالے سے بھی اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''غالبا 'آب حیات'کے بعد یہ دوسری تاریخ جس میں بطور خاص ہر ادبی عہد کے مخصوص لسانی تغیرات کا تجزیہ کرنے کی کاوش ملتی ہے۔ واضح رہے کہ میر و سودا کے بعد شمالی ہند میں لسانی تبدیلیوں کا سراغ لگانا اتنا مشکل نہیں کہ اس ضمن میں خاصہ مواد مل جاتاہے لیکن جنوبی ہند کی زبان کے حوالہ سے لکھنا آسان نہ تھا مگر ڈاکٹرصاحب نے اس مشکل کو آسان کر دکھایاہے ''۔ (۷۴)

تاریخ ادب جلد اوّل خاکے کے حوالے سے اعتراضات کا جائزہ لیاجاچکاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو (جلد اول) میں فارسی اقتباسات متن کے اندر ہی درج کئے اور ان اقتباسات کے تراجم نہیں کئے گئے جبکہ ہر صفحے پر فٹ نوٹ میں حواشی اور حوالے دونوں درج کئے گئے ہیں جبکہ بعض ضروری مباحث جنہیں متن میں جگہ دینی چاہیے انہیں بھی حواشی میں درج کیا ہے جبکہ جلد اوّل کے اختتام پر کتابیات بھی نہیں دی گئیں۔ مجموعی طور ڈاکٹرجالبی کی تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل) اپنی پہلی اشاعت ہی سے ناقدین، محققین اور عام قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور اپنی اشاعت کے وقت اور اس کے بعد بھی سب سے معتبر تاریخ ادب پانے کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مختلف محققین اور ناقدین نے ڈاکٹرجالبی کی اسکاوش کو نہ صرف خراج تحسین پیش کیابلکہ سنین کے اسناد کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اکثر بطور حوالہ استعمال ہوتی رہی ہے۔ بقول ڈاکٹرگیان چند جین:

''ان کا یہ کارنامہ خراجِ احترام کا طالب ہے۔ اس تاریخ میں معلومات کے انبار لگے ہیں۔ کو ئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے نئی معلومات نہ ملیں۔ کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری و روشنی نہ ملے۔ کتاب کی خوبیوں کے مقابلے میں خامیاں بہت کم ہیں۔۔کوئی شبہ نہیں کہ یہ تاریخ ادب اردو، اب تک کی بہترین تاریخ ہے۔ کوئی توقع نہیں کہ عرصے تک اس سے بہتر بلکہ اس کی ہم پلہّ تاریخ لکھی جاسکے گی ''۔ (۷۵)

تاریخِ ادبِ اردو(جلد دوّم)تنقیدی و تحقیقی جائزہ:

تاریخِ ادبِ اردو (جلد دوّم) کے جائزے سے پہلے اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ دوسری جلد کو ابتداء میں دوحصوں میں شائع کیاگیا تھا لیکن بعد میں اسے ایک جلد کی صورت میں شائع کیاگیا۔ جائزے کے لئے اسی ۱۹۹۴ء میں شائع شدہ ایڈیشن کو منتخب کیاگیاہے۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل کی بھرپور پذیرائی کے بعد تاریخ ادب اردو جلد دوم دوحصّوں میں پہلی دفعہ جون ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے اب تک چھ ایڈیشن چھپ کر آچکے ہیں۔ تاریخ ادبِ ا ردو جلد دوّم کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے فرزند محمد سہیل خان (سہیل جالبی) کے نام معنون کیاہے۔ جلد کی ابتدا ء میں پیش لفظ اور تمہید کے علاوہ چھ فصلیں شامل ہیں۔ تمہید دو ابواب پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں متعدد ابواب شامل ہیں۔ جلد کے آخرمیں قارئین کی سہولت کے لئے تفصیلی اشاریہ موجود ہیں۔

تاریخِ ادبِ اردو جلددوّم اٹھارہویں صدی عیسوی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ جلد بقول جالبی ۸ سال میں مکمل ہوئی۔ اس جلد کے استناد کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی دعویٰ کرتے ہیں ’’میں نے ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی آراء یا سنی سنائی باتوں پر نہیں رکھی، بلکہ سارے کلیّات، ساری تصانیف، کم و بیش سارے اصل تاریخی ادبی وغیرہ ادبی مآخذ سے براہ استفادہ کرکے روح ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔‘‘ (جلد دوم،ص۱۱)

تاریخِ ادبِ اردو(جلد دوّم)کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے نظریۂ تاریخ نویسی کی وضاحت کرتے ہوئے اسے کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج کا حامل قراردیتے ہیں۔ تحقیق، تنقید اور کلچر کے امتزاج کو تاریخ ادب اردو کی انفرادی خصوصیت قراردیتے ہیں۔ پیش لفظ میں ڈاکٹرجالبی نے جہاں تاریخ ادب اردو کی مختلف سطحوں کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے وہیں پہلی دفعہ تاریخ ادب کے حوالے سے اپنے اسلوب بیان پربالخصوص روشنی ڈالی ہے اور اسے آئینے کی طرح صاف شفاف رواں، شگفتہ، عام بول چال کی زبان سے قریب مگر ادبی قرار دیاہے۔

جلد دوّم کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے نظریۂ تاریخ کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان کے نظریۂتاریخ کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اس لئے ادب کی تاریخ کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہئے جس میں ساری زندگی کی روح منعکس ہو۔

۲۔ ادبی تاریخ نگاری تحقیقی اور تنقیدی شعورکے بغیر نامکمل ہے۔

۳۔ تاریخ میں واقعات کے درمیان تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اور عوامل، واقعات او رحجانات کی نشاندہی ہونا ضروری ہے۔

۴۔ تخلیقات کو اپنے دور کے معیاراور نظامِ اقدار کے ساتھ ساتھ دائمی ادبی معیار سے بھی پرکھنا ضروری ہے۔

۵۔ ادبی تاریخ نگاری کو نہ صرف ماضی سے واقفیت پہنچائے بلکہ حال اور ماضی کے باہمی رشتے کی وضاحت کرے۔

جبکہ مؤرخ ادب کے لئے درج ذیل خصوصیات کو اہم قراردیا گیا ہے:

۱۔ ادبی مؤرخ تاریخی شعور، قوت تجزیہ، نتائج اخذکرنے کی صلاحیت، محققانہ، اور لسانی شعور کا حامل ہو۔

۲۔ واقعات کے منطقی اور تدریجی سفر کو عمدگی سے بیان کرسکے۔

ڈاکٹرجالبی روایت کے حوالے سے اپنے طریقۂتاریخ نویسی کے حوالے سے لکھتے ہیں :’’میں نے ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور رد عمل وتبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آجائے‘‘۔(جلد دوم،ص۱۳۔۱۴)

ڈاکٹرجالبی نے اپنی تاریخ ادب کے حوالے سے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے کم و پیش ہربات کو حوالے اور سند کے ساتھ پیش کیاہے۔ اس کے علاوہ تنقید کی مختلف صورتیں مثلاً نفسیاتی، سماجی، عملی، تشریحی، لسانیاتی وغیرہ استعمال کی ہیں اور شعراء اور مصنفین کے حوالے سے موجود تمام تر مواد اور معلومات سے استفادے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ میں تاریخ نگاری کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیاہے ان کا اطلاق انہوں نے جلد دوّم میں بہت عمدگی سے کیاہے۔ جلد دوم کا تمہیدی باب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان اٹھارہویں صدی، سیاسی منظر، طرزفکر، تہذیبی و معاشرتی روئیے کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں تفصیل کے ساتھ ۱۷۰۰ء سے لر کر ۱۷۹۹ء تک کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی حالات کا جائزہ پیش کیاگیاہے۔ مستند واقعات کے اور حالات کے بیان سے اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصویر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی زوال کو اسباب و علل کی روشنی میں بیان کیاہے۔ دوسری جلد کی تمہید میں اٹھارہویں صدی کے سیاسی منظر و پس منظر، طرز فکر، تہذیبی و معاشرتی روّیوں اور اردو شاعری کے محرکات، میلانات کوواضح کیاگیاہے۔ تمہید کے دوسرے باب کا عنوان ’’اردو شاعری، رواج، کشمکش اثرات، محرکات و میلانات

’‘ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فارسی کے کم ہوتے اثرات اور اردو زبان کے اثرو نفوذ اردو شاعری کی باقاعدہ روایت کا جائزہ لیاہے۔ اٹھارہویں صدی کو ڈاکٹر جمیل جالبی شمال جنوب کے ادبی وتہذیبی اثرات کے ساتھ جذب ہوکر ایک نئی عالمگیر روایت کی تشکیل و ترویج کی صدی قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو شاعری کے حوالے سے اس دعوے کو رد کرتے ہیں کہ اردو شاعری دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ ان کے مطابق:

’’اردو زبان و شاعری تو اس دور میں ان نئی انقلابی، سماجی، معاشی، معاشرتی و لسانی تبدیلیوں کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتی ہے جوتیزی کے ساتھ برعظیم میں پھیلنے والی ہیں۔ اردو زبان و ادب نے ایک طرف مرنے والی تہذیب کے سارے زندہ عناصر اپنے اندر جذب کرکے برعظیم کی تہذیب کا حصہ بنادیا اور اس طرح خود یہ زبان دو عظیم تہذیبوں کا سنگم بن کر، نئی تخلیقی قوتوں کے ساتھ ایک بدیسی زبان پرغالب آگئی اور دوسری دیسی زبانوں کے لئے بھی راستہ صاف کرد یا ‘‘۔ (جلد دوم،ص۲۶۔۲۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو شاعر ی کے حوالے سے اس روّیے کا مدلل تجزیہ پیش کیا ہے جس کے مطابق اس وقت کی نئی نسل نے فارسی زبان کو ترک کرکے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا اور ہندوستانی اثرات قبول کرنے کی بجائے فارسی اثرات قبول کئے ؟ ڈاکٹرجالبی کے تجزئیے کے مطابق فارسی زبان و ادب کے اردو زبان و اسلوب پر اثرات کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ فارسی زبان و ادب اپنی وسعت کے پیش نظر مختلف علاقائی زبانوں حتٰی کہ عثمانی دور کی ترکی شاعری پر بھی بھرپور اثرانداز ہوئی بالکل اسی طرح جس طرح عربی زبان و ادب نے فارسی زبان وادب پر اثرات مرتب کئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تفصیل سے ان اثرات کا تجزیہ پیش کیاہے جو فارسی زبان وادب نے اردو زبان وادب پر مرتب کئے اور بالآخر زبان وادب کا دامن وسیع ترہوا اور ہرقسم کے مضامین عمدگی سے اس زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت پیداہوئی۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں جن سے ظاہر ہوتاہے کہ کس طرح اردو شعراء نے فارسی شعراء کے مضامین کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا، فارسی شاعری کے اسالیب، موضوعات، تلمیحات، محاورات، تراکیب وغیرہ کو اپنے مشاہدات تجربات، احساسات اور جذبات کے ساتھ ملاکر پیش کیااور بالآخر اردو شاعری کی روایت اپنے قدموں پرکھڑی ہوئی اور آگے چل کر اپنی ایک ا لگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئی۔

فصلِ اوّل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس فصل میں شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت کا جائزہ لیاگیاہے۔ پہلے باب میں اٹھارہویں صدی کی مذہبی شاعری، اس دور کی شاعری کی لسانی خصوصیات، شمال دکن کی زبانوں کا فرق اور مرثیے کی روایت کاجائزہ لیاہے۔ اٹھارہویں صدی سیاسی، معاشی، معاشرتی لحاظ سے انتشار کی صدی ہے۔ اپنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل نے فرد کو مذہب سے قریب کردیا۔ مذہب میں ظاہری رسوم کی پیروی کو اوّلیت دی جارہی تھی یہی وجہ ہے اس دور میں مذہبی شاعری کی ایک بڑی روایت آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ لیکن بقول جالبی :'' ان مذہبی نظموں میں عام طور پر کوئی گہرا روحانی تجربہ شامل نہیں ہے۔ ان کا مقصد جذباتی سطح پر سے یاپڑھنے والوں کے عقیدے کو کرامات اور غیرمستند افسانوی روایات کے بیان سے آلودہ کرنا ہے ''۔ (جلد دوم،ص۴۵)

اس باب میں جن شعراء اور ان کی شاعری کا تجزیاتی، لسانی مطالعہ پیش کیاگیاہے ان میں روشن علی روشن کی ''عاشور نامہ'' شامل ہے۔اس حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی،مسعود حسن خان کے اس قیاس کو رد کیا ہے جس کے مطابق ''عاشور نامہ''کے مصنف کا وطن سہارن پور قرار دیا تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے فارسی کی دو قدیم تاریخوں کی روشنی میں یہ بات ثابت کیاہے کہ یہ اصل مالوے کا قصبہ سارنگ پور ہے۔ ''عاشور نامہ '' میں روشن علی نے واقعۂ کربلا کے حوالے سے معتبر وغیرہ معتبر روایات کو یکجا کردیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی''عاشورنامہ'' کو ادبی تصنیف کے طور پر اہم قرار نہیں دیتے بلکہ اسے شمال میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء کے حوالے ساے اہم قرار دیتے ہیں ا ہم قراردیتے ہیں۔ اس باب کا سب سے اہم حصہ و ہ ہے جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''عاشور نامہ'' کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے شمال و دکن کی زبانوں کے فرق کی نشاند ہی کی ہے اس سلسلے میں انہوں نے ''عاشور نامہ'' کے ساتھ ساتھ اسمٰعیل امروہی کی مثنوی '' وفات نامہ '' اور ''معجزۂانار'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیاہے۔

دکن اور شمال میں مرثیہ نگاری روایت کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو بیاضوں ('بیاضِ مراثی ' مرتبہ افسر صدیقی امرو ہی ''بیاض مراثی 'مملوکہ پروفیسر مسعودحسین رضوی ادیب) کومدّنظر رکھا ہے۔ اس جائزے سے ڈاکٹر جمیل جالبی یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شمال کے مرثیوں پر فارسی پن کااثر بہت زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ انہیں بگڑی ہوئی فارسی کے مرثیے قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ دکن کے مرثیے اردو پن لئے ہوئے ہیں۔ شمال کے مرثیے میں اُکھڑاپن ' بے محل بحریں ہیں جبکہ دکن کے مرثیے میں ٹھہراؤ، رواں اور شیریں، بحریں ہیں اور یہ مرثیے اردو زبان کے ارتقاء کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

دوسرے باب میں رزم نامے، اورو قانع نویسی کاجائزہ لیاگیاہے۔ باب کے آغاز میں رزمیہ اور رزم نامے کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’رزم نامہ‘‘ اس طویل بیانیہ نظم کوکہتے ہیں جس میں شاعر نے کسی ایسی جنگ کا حال بیان کیاہو جس کا وہ خود عینی شاہد تھا یااس نے یہ حالات کسی معتبر راوی سے سنے تھے۔ رزم نامے مثنوی کی ہئیت میں یا تو خود فاتح کی فرمائش پر لکھا جا تا یا شاعر فاتح سے انعام واکرام پانے کی امید میں خود لکھ کر پیش کرتا تھا یا پھر اس جنگ کے حالات سے متاثر ہوکر سب کے فائدے کے لئے انہیں از خود موضوعِ سخن بناتاہے۔ برخلاف اس کے رزمیہ اس جامع، طویل بیانیہ نظم کوکہتے ہیں جس میں کسی قوم کی شجاعت و بہادری کے کارناموں کو اس طور پر بیان کیاگیاہو کہ اس قوم کی تہذیب کی روح، شاعرانہ اظہار بیان اور کرداروں کے ذریعے پوری گہرائی کے ساتھ سامنے آئے‘‘۔ (جلد دوم،ص۷۶)

اس باب میں جن دو رزم ناموں کا تفصیلی تنقیدی تجزیہ پیش کیاگیاہے ان میں ’’جنگ نامۂعالم علی خان‘ ‘ از غضنفر حسین اور دوسرا رزم نامہ سید زاہد ثنا کا ’’وقائع ثناء‘‘ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی دونوں شعراء کو مجہول الاحوال قرارد یتے ہیں۔ غضنفر حسین کی مثنوی ’’جنگ نامہ عالم علی خان‘ ‘ اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں تاریخی واقعات کو سند،تاریخ،دن اور فوجی سرداروں کے درست ناموں کے ساتھ بیان کیاگیاہے جبکہ زبان و بیان، ربط و ترتیب اور معاصر انہ تاریخ نگاری کے حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ ’’وقائع ثناء‘‘ از سید زاہد ثنا کی ادبی و تاریخی اہمیت اس لئے مسلم ہے کہ یہ مثنوی اسی سال لکھی گئی جب پانی پت کی لڑائی کی ابتداء ہوئی۔ اس رزم نامے کے واقعات مصنف کے خود دیکھے اور سنے ہوئے تھے لہٰذا یہ ایک معتبر معاصر تاریخی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حاشیے میں ڈاکٹرجالبی نے وقائع ثناء ‘ کے مخطوطے کے حوالے سے معلومات درج کی ہیں جو قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ وقائع ثناء ‘ کو ڈاکٹر جمیل جالبی شمالی ہند کا پہلا معلوم رزم نامہ قراردیتے ہیں جس میں پانی پت کی جنگ کو موضوع سخن بنایاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی وقائع ثناء ‘ میں بیان کردہ واقعے اور زبان و بیان کے تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:’’وقائع ثنا‘‘ اردو زبان کے گنے چنے چند رزم ناموں اپنی ساخت، واقعات کی ترتیب اور انداز بیان کی وجہ سے اس دور کی ایک قابل ذکر تصنیف ہے‘‘۔ (جلد دوم،ص۸۹)

فصل اوّل کا تیسراباب طنزو ہجو کی روایت کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے جعفرز ٹلی کے کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیاہے جوکہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پہلی دفعہ جعفر زٹلی کی شاعری اور اس کے تہذیبی و سیاسی پس منظر کا تفصیلی

جائزہ لیا ہے۔ جبکہ ان سے پہلے تذکرہ نویسوں اور بیسویں صدی کے مؤرخین نے اس ہمیشہ نظر انداز کیا۔(۷۶) ڈاکٹر جمیل جالبی،جعفر زٹلی کو اٹھارہویں صدی کا پہلا ''بھرپورشاعر'' قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبیِ محمود شیرانی سے اختلاف کرتے ہوئے جعفر کو میر''نہیں '' میرزا قراردیتے ہیں اور حوالے کے طور پر جعفر کی مثنوی ''کتخدائی میرزا جعفر '' کا حوالہ پیش کیاہے۔ (اگرچہ اشعار کا حوالہ موجود نہیں)، ڈاکٹر جمیل جالبی محمود شیرانی کے اس دعوے کو بھی ردّ کرتے ہیں کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور جعفر کی ولادت ایک ہی سال نہیں ہوئی۔ 'کلیات جعفرزٹلی ' کے ایک قطعے کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ جعفر نے میاں دانش کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر اس کی ہجو لکھی تھی اور اسے تو شاہ جہاں کے دربار میں ۱۰۶۵ھ میں ایک قصیدہ پیش کرنے پر انعام بھی ملاتھا۔ اس لئے اورنگ زیب کی تخت نشینی ۱۰۶۸ھ کے سال میں جعفر کی ولادت متعین نہیں کی جاسکتی۔ جعفر زٹلی کے دورِ حیات کے تعین کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی داخلی شواہد اور معاصرانہ شہادتوں کی بنیاد پر انحصار کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں ؛''------وہ شاہجہاں کے آخری دور میں جوان تھا۔ شاعری کرتا تھا اور فرح سیرکے دور میں ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں قتل ہوا''۔ (جلد دوم،ص۹۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عمدگی سے ان سیاسی سماجی اور تہذیبی عوامل کا تجزیہ کیا ہے جنہوں نے جعفر زٹلی کی شاعری کو متاثر کیا اور جعفرز ٹلی کی شاعری اپنے دور کا آئینہ بن کر تاریخِ ادب کا حصّہ بنی۔ڈاکٹرجالبی نے جعفرزٹلی کی زبان پرہندی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ جعفر کی شاعری کے فکری و فنی مطالعے کے علاوہ جعفر کی نثرکا بھی تجزیہ پیش کیاہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :''جعفر نے نظم و نثر دونوں میں ہجو،طنز اور ہزل کی روایت قائم کرکے اسے اتنا آگے بڑھایا کہ وہ خود اس دبستان کا نمائندہ بن گیا ''۔ (جلد دوم،ص۱۱۵)

فصلِ دوّم کے پہلے باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فارسی کے ریختہ گوشعراء شاہ وحدت،میرزا معین الدمعین الدین محمد موسوی، خواجہ عبدالاحد، میرزا عبدالقادر بیدل، میرزا عبدالغنی قبول کشمیری، شرف الدین علی خان،پیام اکبر آبادی، شیخ سعداللہ گلشن،مرزا محمد رضا قزلباش خاں، امیر ہمدانی، امیرخان انجام شامل ہیں۔ فصلِ دوّم کے دوسرے باب میں ان قابلِ ذکر فارسی شعراء کا جائزہ لیاہے۔ جوریختہ گوئی کرتے ہوئے اردو شاعری کو بھی متاثر ہ کررہے تھے۔ ان شعراء میں سراج الدین علی خان آرزو، آنند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار دہلوی، خانِ دوراں، نواب ذوالقدر درگاہ، قلی خان درگاہ، میرغلام آزاد بلگرامی قابل ذکرہیں۔ سراج الدین خان آرزوؔ کی ریختہ گوئی کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان اردو لغت نویسی کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے آرزو کی تصحیحبھی

فرمائی ہے۔ آرزو نے اپنے تذکرے میں اپنے والد شیخ مسافرالدین کی مثنوی ’’حسن و عشق‘‘ کا موضوع’’قصہ کا مروپ و کام لتا‘‘ کو قرار دیاہے جب کہ جالبی صاحب نے داخلی شواہد اور تحقیق سے ثابت کیاہے کہ شیخ حسام الدین نے مثنوی ’’حسن و عشق‘‘ میں ’’منوہر و مدمالتی ‘‘ کے قصے کو موضوع بنایاہے۔

فصلِ سوم چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ولی دکنی کے اثرات اور اردو کی پہلی تحریک ’ایہام گوئی ‘ کی تحریک کو موضوع بنا یا ہے۔ ولی دکنی کی شاعری کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شعراء نے ولی کے کلام کے جس عنصر کواپنے سماج اور تہذیب کے تناظر میں سب سے زیادہ قبول کیا وہ ایہام کا عنصر ہے۔ بقول جالبی ’’یہ طرزِ شاعری چونکہ تقاضائے وقت کے مطابق اور اس دور کے مزاج کاحامل تھا،اتنا مقبول ہوا کہ برعظیم کے سب چھوٹے بڑے شاعروں پسندیدہ طرز بن گیا ‘‘۔ (جلد دوم،ص۱۸۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عمدگی سے اس سماج اور تہذیب کے ان عناصر کی نشاندہی کی جس کے باعث ایہام گوئی کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ ایہام گوئی کی وجوہات، محرکات، اردو زبان پر اثرات اور اس کے زوال کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے اس عہد کے ایک اور رحجان ’’عشق‘‘ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس عشق کا تعلق کسی گہری ردحانی کیفیت سے نہیں بلکہ ظاہرپرستی سے تھا۔ اس’ عشق ‘ کا ایک اور مظہر ’امردپرستی ‘ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ امرودپرستی کے رحجان کے محرکات اسی سماج اور تہذیب کے باطن میں پھل پھول رہے تھے اور شاعری میں اسکاظہور نہ صرف فارسی شعراء کی پیروی کا نتیجہ تھا بلکہ اخلاقی اقدار کا زوال بھی کارفرمارہا۔ اس دور کے سماج میں امردپرستی کے رحجان کے محرکات کی نشاندہی ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عمدگی سے کی ہے اور ان سماجی اور اخلاقی تبدیلیوں کو ذمہ دار قراردیا ہے جو سیاسی زوال کے باعث اس تہذیب کا مقدر بن گئی تھیں۔

اس باب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی اوّلیت پربحث کی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے داخلی شواہد معاصرانہ شہادتوں اور دلائل سے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے اس قول کو رد کیاہے کہ اس سلسلے میں اوّلیت کا سرا سہرا فائز کے سر ہے۔ ڈاکٹرجالبی شمالی ہند کے ریختہ گو شعراء میں آبروؔ کو پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیتے ہیں۔ اگلے باب میں ڈاکٹرجالبی نے نجم الدین شاہ مبارک آبرو کے کلام کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ آبرو کے حالات زندگی اور اس دور کے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے آبرو کی شاعری کا مطالعہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق آبرو نے اپنے دور کی تہذیبی فضا کے تقاضوں کے تحت ایہام گوئی

کی تمام صورتوں کو اپنی شاعری میں استعمال کیا اور اسے اپنے دور کا مقبول ترین رحجان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹرجالبی نے آبرو کی شاعری میں ہندوی گیتوں اور دوہروں کے مزاج کی بھی نشاندہی کی اور آبرو کے فن کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ پیش کیاہے۔ باب کے آخر میں آبرو کی شاعری کا لسانی مطالعہ نہایت دقت نظری سے پیش کیاہے اور اردو زبان کے سلسلے میں آبروؔ کے تصرّفات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری آبرو کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:''وہ لفظوں کی دنیامیں صرف ایہام گوئی کا اسیر ہوکر نہیں رہ گیا بلکہ اس کے ہاں لفظ جذبے، احساس اور خیال سے معمور ہیں۔ اسی لئے اس کی شاعری آج بھی اس سطح پر زندہ معلوم ہو تی ہے ''۔ (۷۷)

تیسرے باب میں جن ایہام گو شعراء کے کلام کا مطالعہ پیش کیاگیاہے ان محمد شاکرناجیؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ، مصطفی خان یکرنگؔ، احسن اللہ احسنؔ، شاہ ولی اللہ اشتیاقؔ، سعادت علی امروہی، عبدالوہاب اور میر محمدسجاد شامل ہیں۔ محمد شاکر ناجی کے سالِ وفات کے تعین میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے دقّتِ نظر سے معاصرانہ شہادتوں اور داخلی شواہد کی بنیاد پر ۱۷۴۷ء متعین کیاہے۔ اس باب میں بیان کردہ شعراء کے کلام کا جائزہ ایہام گوئی کی تحریک کے عروج اور زوال کو سمجھنے میں بہت مفید ہے۔ ڈاکٹرجالبی اس عہد کے حوالے سے آبروؔ کے علاوہ دیگر شعراء کو دوسرے درجے کے شعراء قراردیتے ہیں لیکن یہ شعراء اس حوالے سے اہم قراردئیے گئے ہیں کیونکہ یہ شاعر اپنے دور کے بڑے شاعر کو بڑا بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹرتبسم کاشمیری کے مطابق :''ایہام گوشعراء کے اس دور کو لفظ پرست شعراء کا دور قرار دے سکتے ہیں ''۔ (۷۸)

چوتھے باب کا عنوان غیرایہام گو شعراء ہے۔ اس باب میں ان شعراء کا ذکر ہے جنہوں نے ولی دکنی کے اثرات کو قبول کرکے اردو کی روایت کو آگے بڑھایا۔ سراج، قاسم اور داؤد کا ذکر اس باب میں نہیں کیونکہ ان کا ذکر جلد اوّل میں کیاجاچکاہے جبکہ جن شعراء کا اس باب میں جائزہ لیاگیاہے ان میں اشرف گجراتی، محمد رضی رضی، شیخ ثناء اللہ ثنا، نواب صدرالدین، محمد خان فائز، عبیداللہ خان مبتلا، شاہ تراب علی تراب، میر محمود صابر، سید عبدالولی عز لت سورتی شامل ہیں۔ اشرف کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی انکشاف کرتے ہیں کہ:

> ''------ولی کی اور شرف کے دواوین میں کم وبیش ۱۵ غزلیں مشترک ہیں۔ یوں تو اس دور کے دوسرے شعراء مثلاً سراج، قاسم، داؤد، آبرو، ناجی، حاتم، عزلت، تراب وغیرہ نے ولیؔ کے اثرات کو قبول کیاہے لیکن اشرف جیسا ہم رنگ ولی شاعر کوئی دوسرا نہیں ہے ''۔ (جلد دوم،ص۲۹۲۔۲۹۳) ڈاکٹر گیان چند جین اشرف کے حوالے سے ڈاکٹر

جمیل جالبی کی تحقیقی کاوش کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں :''اتنے قدیم صاحب دیوان شاعر کے بارے میں مجھے پہلی بار جالبی کی تاریخ سے علم ہوا''۔ (۷۹)

اس باب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیان کردہ شعراء کے حوالے سے جتنی معلومات بیان کردی ہیں، اس سے پہلے اتنی معلومات کسی نے یکجا نہیں کی تھیں۔ ان شعراء کے کلام کا تجزیہ بھی نہایت عمدگی سے کیاہے۔

فصل چہارم کا عنوان ''ردِعمل کی تحریک '' ہے۔ یہ فصل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل کا تجزیہ پیش کیاہے جو ایہام گوئی کی تحریک کے خلاف ردِ عمل پید ا کرنے میں معاون ثابت ہوئےڈاکٹر جمیل جالبی، مرزا مظہر جانجاناں کو ردّ عمل کی تحریک کا ''نقاش اوّل '' قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ردِ عمل کی تحریک کی بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے ان خاص موضوعات کی نشاندہی کی ہے جنہیں ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل کے طور پر شعراء نے اختیار کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں بقول جالبی :'' اردو شاعر ی نہ صرف فارسی سے آنکھیں ملانے لگی بلکہ اس کی عشقیہ شاعری بڑی زبانوں کی شاعری کی سطح پر اٹھ آئی''۔(جلد دوم،ص۳۵۷)

فصل چہار م کے دوسرے باب کا عنوان ''ردِعمل کے شعراء '' ہے۔ اس باب میں جن شعراء کا جائزہ لیاگیاہے ان میں مرزا مظہر جانجان، انعام اللہ خان یقین، میرعبدالحئی تاباں، محمد فقیہہ دردمند، اشرف علی خاں فغاں، خواجہ احسن الدین خان بیان شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے اس باب میں نہایت عرق ریزی سے نہ صرف ان شعراء کے حالات زندگی بیان کئے ہیں بلکہ ان کے کلام کا فنّی و فکری تجزیہ بھی نہایت عمدگی سے بیان کیاہے۔ جن شعراء کے سالِ وفات یا درست ناموں کے حوالے سے ابہام پایا جاتاہے ان کے سلسلے میں معاصرانہ شہادتوں اور داخلی شواہد کا سہارا لے کر درست سال اور نام کے تعین میں جانفشانی کا ثبوت دیاہے۔بالخصوص تاباں کے سالِ وفات کاتعین ڈاکٹرجالبی کی محققانہ کوششوں کا ایک اور ثبوت فراہم کرتاہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن دیگراہم تحقیقی امور کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ کیاہے ان میں مظہرجانجاں کے قتل کے محرکات بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹرجالبی نے عبدالرزاق قریشی کے جمع کئے گئے 'مظہر کے اردوکلام '' میں شامل کئی اشعار کوالحاقی اور مشکوک قراردیاہے۔

میرعبدالحئی تاباں کے کلام پر عمدہ تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے سالِ وفات کے تعین کے لئے بھی تحقیقی شعور کا استعمال کیاہے۔ خواجہ احسن الدین خان بیان کے نام کے

سلسلے میں تحقیقی بنیادوں پر صراحت کی ہے کہ ان کا احسن اللہ نہیں جیساکہ چند تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں بیان کیاہے(۸۰) بلکہ احسن الدین خاں ہے۔ ڈاکٹرجالبی اس باب میں نہایت دقتِ نظر سے مذکورہ شعراء کے حالات زندگی معاصرانہ شہادتوں کی بنیادوں پر قلم بند کئے ہیں وہیں ان شعراء کے فن کا فکری و فنّی تجزیہ بھی اس خوبصورتی سے کیاہے کہ ان شعراء کے فن کے اہم پہلو اجاگر ہونے کے ساتھ ساتھ ردِ عمل کی تحریک کو فروغ دینے میں ان کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف اردو زبان و ادب کے سفر میں ان شعراء کی لسانی خدمات بھی منظر عام پر آتی ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''بھی ردِعمل کے شعراء'' ہے۔ اس باب میں شاہ حاتم کی ادبی خدمات اور بالخصوص ردِ عمل کی تحریک کے حوالے سے ان کے فن کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ شاہ حاتم نے اگرچہ ابیہام گوئی کی تحریک کے زیرِ اثر بھی دیوان (قدیم) مرتب کیاتھا لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایہام گوئی کے ضمن میں شاہ حاتم کی شاعری کا جائزہ نہیں لیا۔اس کی وجہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:''........لیکن حاتم نے چونکہ اپنے دیوانِ قدیم سے جو اشعار ''دیوان زادہ'' میں شامل کئے ہیں انہیں بھی جدید رنگِ سخن کے مطابق ڈھال لیا ہے اس لئے ان کا مطالعہ تازہ گویوں کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے ''۔ (جلد دوم،ص۴۲۶)

شاہ حاتم کے سوانحی حالات و کوائف اور ان کے فکروفن پر تجزئیے کے حوالے سے یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ ڈاکٹرجالبی نے شاہ حاتم کے درست نام کے حوالے سے بحث کو فٹ نوٹ میں درج کیاہے جبکہ اس بحث کو اصل متن کا حصہ بنانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹرجالبی نے شاہ حاتم کے دور کے حوالے سے ان کی پانچ اوّلیات بیان کی ہیں جن میں اردو کا پہلا شہر آشوب، پہلا واسوخت، دو مربوط نظمیں، ساقی نامہ اور دیوانِ قدیم کا اصناف کے حوالے سے تنوع شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حاتم کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیاہے۔شاہ حاتم کے دیوان قدیم اور دیوان زادہ میں شامل اشعار کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''شاہ حاتم کا المیہ یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنا راستہ دریافت کرلیا۔ اردو شاعری کو ایک صورت دے دی اور ان کی خدمات کے اعتراف کا وقت آیا تو اردو شاعری کو میر، درد اور سودا جیسی شخصیتیں نصیب ہوگئیں لیکن بنیادی بات اپنی جگہ اب بھی اہم ہے کہ اگر شاہ حاتم اپنے دور کے دوسرے شعراء کے ساتھ مل کر یہ کام نہ کرتے تو میر، درد اور سودا بھی وہ نہ ہوتے جو وہ ہیں اور یہی بات دوسری

باتوں کے علاوہ تاریخ ادب میں ان کو ایک اہم مقام دلانے کے لئے کافی ہے ''۔ (جلد دوم،ص۴۶۰)

ڈاکٹرتبسم کاشمیری بھی، شاہ حاتم کی ان لسانی خدمات کو تاریخ ادب میں اسی حوالے سے اہم قرار دیتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

''شاہ حاتم نے اردو شاعری کا سنہری دور یعنی میر، سودا کا دور شروع ہونے سے قبل ہی اردو زبان سے نامانوس اور غریب الفاظ و تراکیب کو متروک قرار دے دیاتھا۔ اس طرح سے شاہ ھاتم نے ایک نئے دور کی تعمیر و تشکیل کے لئے اردو زبان کے اسالیب کونئے تجربات کے لئے تیار کیاتھا ''۔ (۸۱)

فصلِ پنجم میں نوابواب شامل ہیں۔ یہ فصل کتاب کی سب سے طویل فصل ہے۔ پہلے باب کا عنوان'' میر، سودا کا دور ہے۔ ادبی و لسانی خصوصیات ہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے اس دور کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور ان حالات نے کسی طرح شعرو ادب کو متاثر کیا اس کا تفصیلی تجزیہ پیش کیاہے۔ تمہیدی باب ہونے کے باعث اس باب میں ان تمام اصناف اور شعراء کا بھی اجمالی جائزہ لیاگیاہے جن پر اس دور میں طبع آزمائی کی جارہی تھی۔ ان اصناف میں غزل، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب، واسوخت شامل ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے سماجی، تہذیبی،سیاسی عوامل نے ادبی و لسانی سرگرمیوں کو بھی بہت متاثر کیا۔ ان اثرات کو اس دور کی اصنافِ سخن میں بخوبی تلاش کیاجاسکتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اس دور کا مجموعی تجزیہ کرتے ہوئے اصناف سخن اور شعراء کے حوالے سے ان امور کی نہایت عمدگی سے نشاندہی کردی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اردو شاعری کے حوالے سے اس بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق اردو شاعری کے عروج کا تعلق سیاسی زوال سے ہے یا پھرشاعری کا عروج سیاسی زوال کے دور میں ہوتاہے۔ ڈاکٹرجالبی اس حوالے سے مختلف شعراء کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ:

'اردو شاعری کے عام رواج کی وجہ سیاسی زوال نہیں بلکہ قیدِفارسی سے رہائی ہے-------جب سارے معاشرے کے ہر طبقے کا تخلیقی شعور کسی زبان میں اس طور پر شامل ہوجائے تو اس کی ترقی یقینی ہے۔ یہی عمل اس صدی میں ہوا اور اردو شاعری برعظیم کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی ''۔ (جلد دوم،ص۴۹۲)

اس دور کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو شاعری کا عام مزاج مذہبی نہیں بلکہ غیر مذہبی ہے۔ ڈاکٹرگیان چند جین ڈاکٹرجالبی کی اس رائے کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں :''ہندوستانی نقّاد تو یہ کہا ہی کرتے ہیں لیکن ایک پاکستانی نقاد کا یہ فیصلہ بہت اطمینان بخش ہے ''۔ (۸۲)اس دور کو ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان و ادب کے حوالے سے بہت اہم قرار دیتے ہیں اور اس دور میں قائم ہوئی اردو زبان کی روایت کو مستقبل میں فارسی ادب کی روایت سے بہتر قراردیتے ہیں۔ باب کے آخر میں اس عہد کی عمومی لسانی تبدیلیوں کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔

فصل پنجم کا دوسراباب ''محمدتقی میر '' کے عنوان سے ہے جسے ڈاکٹرجالبی نے ''محمد تقی میر'' ہی کے عنوان سے الگ کتاب کے طور پر بھی شائع کروایاہے۔ اس باب میں میر کی حیات، سیرت اور تصانیف کا جائزہ لیاگیاہے۔ اس کتاب کا تجزیہ باب پنجم 'ڈاکٹرجالبی نے بطور نقاد 'کے ضمن میں کیا جائے گا۔

اس فصل کا چوتھا باب ''مرزا محمد رفیع سودا'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں سودا کی حیات اور ادبی خدمات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ سودا کی پیدائش کے سال کے تعین کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے محققانہ شعور کا ثبوت دیتے ہوئے مختلف دلائل اور شواہد کی روشنی میں ڈاکٹرجالبی نے سودا کاسال پیدائش ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء متعین کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے مختلف واقعات اور حوالوں سے سودا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور دلچسپیوں سے بھی پردہ اٹھا یا ہے۔ سود ا کی شعری و نثری تصانیف کا تفصیلی، تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیاہے۔ سودا کی شاعری کے خاص موضوعات اور زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے میر اور سودا کا موازنہ بھی کیاگیاہے۔ میرا ور سودا کے درمیان ہونے والے معرکے، مناقشے کا حال بھی اس باب کا انتہائی دلچسپ حصہ ہے۔میر اور سودا کی شاعری کے فرق کو ڈاکٹرجالبی دونوں شخصیتوں کے مزاجوں کا فرق قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں کے فرق کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

> ''میر کے ہاں اندر کی دنیا آبا دہے لیکن سودا کے ہاں باہر کی دنیا سے رشتہ استوار ہے۔ ہر دور میں دروں بیں شاعرکی طرح میر کے لئے بھی ان کی اپنی ذات اور انا خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کائنات سے ان کا رشتہ اسی سطح پر قائم ہوتاہے لیکن دروں بیں شاعر اپنی ذات و انا کو پیش منظر میں رکھتاہے اور انسان وکائنات سے رشتہ اپنی انا کو الگ کرکے قائم کرتاہے۔ وہ مردم بیزار نہیں ہوتا جس میں دوسروں کے نقطہ نظر کوسمجھنے اور اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنے کی

بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کا حلقہ احباب بھی وسیع ہوتاہے۔ اسی لئے اس کا انداز نظر، طرب انگیز ہوتاہے۔ سودا اسی بیروں بیں مزاج کے حامل تھے اور ان کی شاعری بھی اسی انداز کی حامل ہے۔'' (جلد دوم،ص۶۷۲)

شعراء کی شخصیتوں کے احوال کے باب میں ڈاکٹرجالبی نے جس طرح نفسیاتی نتقید کے اصولوں کو استعمال کیاہے وہ انہیں اور ان کی تاریخ کو دیگرموئرخین سے ممتا ز کرتی ہے۔ شعراء کی مختلف نفسیاتی کیفیات کے حوالے سے ان کے ماحول اور کلام کاجائزہ انفرادیت لیے ہوئے ہے اور یہ طریقہ کسی بھی شاعر اور اس کے کلام کو سمجھنے میں بہت معاون ہے۔ میرا ور سودا کے باب میں بالخصوص یہ طریقہ بہت کارگر رہاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے میر اور سودا کی شاعری سے ان کی شخصیتوں اور نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ میرا ور سودا کے موازنے کے سلسلے میں یہ بہت اہم کے تقریباً تمام ناقدین نے ان دونوں کاموازنہ کیاہے۔ سودا اور میر کے موازنے کو ڈاکٹرسید عبداللہ سودا کی بدنصیبی قرارد یتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مرازا سودا کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ اسے میر تقی میر کی معاصرت نصیب ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل نقد و نظر نے اس کے قد کو میرتقی میرؔ کے حوالے سے ناپنے کی کوشش کی ہے۔ خود سوداؔ کو اس کے اپنے کوائف کی روشنی میں دیکھنے اور دیکھ کر اس کو کوئی درجہ دینے کی کوشش کم کی ہے----اور اگر کی ہے تو اس میں موازنے جھلک ضرور پیداہوئی ہے اور تعجب یہ ہے کہ یہ تکلیف جس کی ابتداء تذکرہ نگاروں کی تنقید سے ہوئی، آزادکے ذریعے آگے بڑھ کر کلیم الدین احمد تک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے۔ شیخ چاند سے سوداؔ پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے اور وہ بھی اس اثر سے خالی نہیں ''۔ (۸۳)

ڈاکٹرجالبی نے جس طرح میرؔ اور سوداؔ کی شاعری بالخصوص غزل کا تنقیدی مطالعہ پیش کیاہے اس کی روشنی میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ اعتراض کمزور پڑتا دکھائی دیتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے سودا کے مقام اور مرتبہ کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ قصائد اور ہجویات کا مطالعہ بھی اس بات کا قابل قدر حصہ ہے۔ سودا کے قصائد کے فنیّ و فکری مطالعے کے بعد ڈاکٹرجالبی غالب اور سودا کے اثرات کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

’’غالب کی غزل کے آہنگ و اسلوب پر جہاں سودا کی غزل کا اثرہے وہاں سودا کے قصیدے کا اثر بھی نمایاں ہے۔ سودا آج بھی ہمارے ایک بڑے شاعر ہیں اور اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ وہ ہمارے سب سے بڑے قصیدہ گو ہیں جن کا اثر اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن پر پڑتی ہے۔ سودا کے قصائد وحدتِ تاثر اور طویل نظم گوئی کے اعتبار سے آج ایک نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں ‘‘۔ (جلد دوم،ص۶۹۹)

باب کے آخرمیں سودا کی شاعری کی زبان کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ اس لسانیاتی مطالعے کے ضمن میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرؔ کو مدنظر رکھاہے۔ دونوں شعراء کے ہاں زبان کے مختلف پہلوؤں کے استعمال کی نشاندہی کی گئی ہے۔

پانچویں باب کا عنوان ’خواجہ میر درد ہے ‘‘ خواجہ میر در دکو ڈاکٹر جمیل جالبی اس عہد کا تیسرا بڑا شاعرقراردیتے ہیں۔ خواجہ میر درد کی پیدائش، خاندان اور وفات کے سلسلے میں تحقیقی بنیادوں پر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ دیگر شعراء کی طرح میر درد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے دور کے حالات اور ذاتی زندگی کو مدّنظر رکھاہے۔ میردردؔ کی جن تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے ان میں اسرارالصلواۃ، واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہِ سرد، شمع محفل، دردِ دل، حرفِ غنا، واقعاتِ درد، سوزِدل، دیوانِ فارسی اور دیوانِ اردو شامل ہیں۔ میر درد کے دیوانِ اردو کے علاوہ تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ میر دردؔ کے کلام فکری و فنّی محاسن کو خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہوئے ان کی شاعری کی زبان کا تجزیاتی مطالعہ بھی عمدگی سے کیاہے اور در د کو میراور سودا کے ہم پلّہ شاعر قرار دیاہے۔

چھٹے بابے میں قائم، میرسوز اور میراثر کے حوالے سے ہے۔ قائم چاند پوری کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے فکری و فنّی تجزیہ کرتے ہوئے انہیں میر اور سودا کے بعد دوسرے درجے کا اہم شاعر قرار دیتے ہیں۔ سودا کے کلام میں قائم کے الحاقی کلام کی نشاندہی بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ قائم پور ی کی تصانیف ’کلیاتِ قائم ‘ اور ’مخزنِ نکات‘ کاتفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو ان کی شاعری پر اثر انداز ہوتے رہے۔ بقول جالبی ؛

’’قائم کے تخلیقی مزاج میں سودا و میر دونوں موجود ہیں لیکن میر و سودا کے مزاج کا تضاد قائم، کی تخلیقی شخصیت کو ایک اکائی نہیں بننے دیتا۔ جیسے ان کی کئی حکایات اور مثنویات سودا کے کلیات میں

شامل ہو کر برسوں سوداکی کہلاتی رہیں۔ اسی طرح ان کی غزل کے بہت اشعار کلیاتِ میر میں ملادئیے جائیں تو ان کو پہچاننا دشوار ہوگا یہی چیز قائم کو اپنے دور میں سودا اور میر سے بلند تر ہونے نہیں دیتی''۔ (جلد دوم،ص۷۷۸)

قائم کی شاعری پر میر اور سودا کے اثرات کے حوالے سے دیگر ناقدین نے بھی روشنی ڈالی ہے بالخصوص محمد حسین آزاد ؔکے بعد مولا حسرت موہانی اور مجنوں گور کھپور ی نے قائم کے حوالے سے تعصبات سے ہٹ کر ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ڈاکٹر تبسم کاشمیر ی اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسئلہ یہ ہے کہ قائمؔ، میر،ؔ سودا ؔ اور درد ؔکی طرح عہد ساز شاعرنہ تھے بلکہ تخلیق شدہ عہد کے ترجمان یااس عہد کی روایت کے نمائندہ شاعر تھے۔ سودا ؔ، میرؔ اور دردؔ کی بنائی ہوئی روایات کے سائے میں کسی آ نے والے شاعرسے توقع رکھنا کہ وہ ان کے دور ہی میں کسی نئی روایت کا اضافہ کرسکے گا، دشوار معلوم ہوتاہے ''۔ (۸۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسی لئے میر اور سودا کے بعد قائم کو اپنے عہد کے دوسرے درجے کے شعراء میں سب سے اہم شاعر قرار دیاہے۔ قائم کی شاعری کے مطالعے کے ضمن میں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ڈاکٹرجالبی نے قائم کی شاعری پر حاتم کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس دور کے حوالے سے قائم کے بعد جس شاعر کو ڈاکٹر جمیل جالبی اہم ترین قراردیتے ہیں وہ محمد میر سوزؔ ہے۔ سوز ؔکے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے کلام کا تجزیہ ان کے عصر اور ذاتی حالات کی روشنی میں پیش کیاہے۔ میرسوز ؔکے دیوان ''دیوانِ سوز'' کے فکری و فنی مطالعے کی روشنی میں ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ :''اظہارِ بیان کی سطح پر سوز نے زبان کو مانجھا اور اسے ایک ایسی صورت دی کہ آئندہ نسلوں نے اسے اپنے تخلیقی جوہر کی کسوٹی بنایا ''۔ (جلد دوم،ص۷۹۹)

اس دور کے اگلے اہم شاعر محمد میر اثرہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ان کی مثنویات،(خواب و خیال اور بیان واقع)ور دیوان اثر کے تجزیاتی مطالعے سے اردو زبان و ادب میں ان کی اہلیت اور مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی ''خواب وخیال'' کے تصنیف کئے جانے کے محرکات کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے ان نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے اس مثنوی کی تفہیم اور اس کے مواد کے حوالے سے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جواب مل جاتے ہیں۔ بقول جالبی:

''ادب و فن کس طرح تزکیہ کرتا ہے اور پھر کس طرح ارتفاع کرتا ہے مثنوی خواب وخیال، اسکی بہترین مثال ہے یہ مثنوی ایک کیس ہسٹری ہے اور اثرؔ اپنے جذبات کا سچا اور مجنونانہ اظہار کر کے بات چیت (talking cure) کرتے ہیں ساتھ ساتھ مثنوی میں درد کی غزلیں ان کے جذبات کے ارتفاع کا کام بھی کرتی ہیں اس مثنوی میں عریانی کی حد تک جو کھلا پن ہے وہ بھی تزکیے کے لئے ضروری تھا ''۔(جلد دوم،ص۸۰۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''خواب و خیال '' کے تجزیاتی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مثنوی ''خواب وخیال '' درد نے دو دفعہ تصنیف کی یعنی ''نیازِ عشق '' کے رنگ کے شدتِ عشق کے اشعار ایک بار کہے گئے اور توبہ استغفار کے اشعار اس کے بعد کہے گئے۔

ساتواں باب 'میر حسن ' کے متعلق ہے۔ اس باب میں میر حسن کے سوانحی حالات، شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے باب کی ابتداء میں حاشیے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ '' سحر البیان''والے میر حسن اور شاگردِ سودا، میر محمد حسن اور خواجہ حسن تینوں علیحدہ شخصیات ہیں۔ میرحسن کے سالِ پیدائش کے تعین کے سلسلے میں ان کے دیگر محققین اور ناقدین کی آراء بیان کرنے کے بعد شواہد اور دلائل کی بنیاد پر ۳۷۔۱۷۳۶ء متعین کیاہے۔ میرحسن کی تصانیف ''کلیاتِ میرحسن '' اور ''تذکرہ شعرائے اردو''شامل ہیں۔' کلیاتِ میر حسن ' کا مخطوطہ (جوکہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے) سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے استفادہ کیاہے۔ ''کلیات میر حسن '' کے مشمولات کا مختصر فنی و فکری مطالعہ پیش کیااور ان کے تذکرے ''تذکرہ شعرائے اردو '' کے حوالے سے بھی مفید معلومات درج کی ہیں۔ یہ دور چونکہ اردو کے تین بڑے شعراء کا دور ہے (میر، سودا، درد) لہٰذا اس دور کے دوسرے درجے کے شعراء کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے ان تینوں شعراء کے دوسرے درجے پر اثرات کو کا تفصیلی مطالعہ بھی پیش کیاہے۔ میرحسن کے سلسلے میں انہوں نے میر، سودا اور درد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی میر حسن کی وجۂ شہرت اور اردو ادب میں ان کی مثنوی ''سحرالبیان '' کو قرارد یتے ہیں۔ میرحسن کی بارہ مثنویوں کا نتقیدی جائزہ پیش کیاہے لیکن مثنوی ''سحرالبیان'' کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ صفحات مختص کئے ہیں جس پر ڈاکٹر گیان چند جین بھی معترض رہے ؛'' جالبی نے 'سحرالبیان' جیسی مشہور مثنوی کا قصہ چار صفحوں میں (۸۵۲۔۵۵) دیاہے جو زیادہ ہے ''۔ (۸۵)

جبکہ مثنوی سحرالبیان کی اردو ادب کے حوالے سے اہمیت کا جائزہ لیاجائے تو ڈاکٹر گیان چند کا یہ اعتراض بے محل نظر آتاہے۔ مثنوی سحرالبیان ' کی اہمیت بیان کرتے ہوئے جالبی لکھتے ہیں :''سحرالبیان میرحسن کے آخر عمرکی تخلیقی اور ایک فن پارہ ہے جو نہ اس سے پہلے اس طور پر لکھا گیا اور نہ اس کے بعد اس طور پر کوئی اور مثنوی لکھی گئی ''۔ (جلد دوم،ص۸۵۰)

''سحرالبیان'' کاتجزیہ کرتے ہوئے اس میں بیان کردہ واقعے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس قصے سے ملتے جلتے دیگر قصوں جوکہ مختلف داستانوں اور مثنویوں میں پائے جاتے ہیں، کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سحرالبیان کی بحر کے حوالے سے وہ انشاء کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیتے ہیں کہ میر حسن نے رزمیہ مثنوی کے لئے مخصوص بحر کو عشقیہ مثنوی کے لئے استعمال کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرحسن کی مثنوی ''سحرالبیان '' سے پہلے تصنیف کردہ مثنویوں کا حوالہ دے کر ثابت کیاہے کہ یہ بحر (متقارب مثمن مقصور یا محذوف : فعولن، فعولن فعولن، فعول یا فعل) عشقیہ مثنویوں کے لئے مقبول و معروف ہوچکی تھی۔

''سحرالبیان '' کے قصے اور اس کی زبان کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ڈاکٹرجالبی نے ان تخلیقات کی معلومات بھی درج کی ہیں جن پر ''سحرالبیان '' کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیاجاسکتاہے۔ اسی طرح مثنوی ''سحرالبیان کے مختلف زبانوں میں تراجم، نثری صورتوں اور اس کی کہانی کی بنیاد پر پیش کئے گئے ڈراموں کے متعلق نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹرجالبی تاریخ نویسی میں تحقیق کو جامع بنانے کس قدر توجہ دی۔ یہ امر ان کی تخلیقی کا وشوں کا مدلل ثبوت بھی ہے۔ اس فصل کے آخری دوابواب '' دوسرے شعراء'' اور ''چند اورشعراء''کے نام سے ہیں۔

ان ابواب میں ان شعراء کی تخلیقات جائزہ لیاگیاہے جنہوں نے ردِ عمل کی تحریک کے فروغ میں اوّل درجے کے شعراء کے ساتھ مل کراپنا کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے جس شاعر کا ذکر ملتاہے دہلی کے رہنے والے لکھنؤی مزاج کے شاعر جعفر علی حسرت ہیں۔ حسرتؔ کو ڈاکٹرجالبی اس لئے اہم قرار دیتے ہیں کہ اس کی شاعری میں سوداؔ اور دردؔ کی روایت سے ہٹنے کے آغاز ہوتا دکھائی دیتاہے۔ ایک رحجان ساز شاعر کے طور پر حسرتؔ اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ حسرتؔ کے سوانحی حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے سوداؔ اور حسرتؔ کے درمیان پائی جانے والی چپقلش کا ذکر بھی کیاہے حسرتؔ کی تصانیف،کلیات حسرت اور مثنوی ''طوطی نامہ'' کاتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔

’’طوطی نامہ ‘‘ کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی ’’سحرالبیان ‘‘ اور ’’طوطی نامہ ‘‘ کہ ان اشعار کو بالمقابل پیش کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ’’ظوطی نامہ‘‘لکھتے ہوئے حسرت کے ذہن پر ’’سحرالبیان ‘‘ چھائی ہوئی تھی۔ مثنوی ’’طوطی نامہ ‘‘ پر ’’سحرالبیان ‘‘ کے اثرات نشاندہی کرتے ہوئے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ حسرت کے غزل کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نتائج مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’یہ سب عناصر مل کرجب حسرت کی غزل میں ابھرتے ہیں تو ان کی شاعری میں لکھنؤکی شاعری کا پہلا واضح نقش ابھرتاہے۔ ان کی غزل میں وہ ساری آوازیں واضح طور پر سنائی دیتی ہیں جو آئندہ دور میں جرأت، انشاء، رنگین، مصحفی اور ناسخ وغیرہ کے ہاں اپنا اپنا مخصوص رنگ بن کر ابھرتی ہیں ‘‘۔ (جلد دوم،ص۸۹۸)

اس دور کے حوالے سے جن دوسرے شعراء کے حالات اور کلام کا جائزہ لیاگیاہے ان میں میرمحمدی بیدار،قدرت اللہ قدرت، ہدایت اللہ ہدایت، ہیبت قلی خان حسرت شامل ہیں۔ میر محمد بیدار کے سوانح اور کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی انہیں ایک ایسا شاعر قراردیتے ہیں جن کے کلام میں اس دور کی تمام آوازوں کو سنا جاسکتاہے۔ گویا ان کے کلام میں انفرادیت کی تلاش مشکل ہے البتہ اپنے دور کے رحجانات کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں جبکہ قدرت اللہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی مقبول آوازوں سے ہٹ کر شاعری کی لہٰذا ان کاکلام بقول جالبی اپنے عہد کے لحاظ سے نامانوس معلوم ہوتا ہےڈاکٹر جمیل جالبی انہیں غالب کا پیش رو قراردیتے ہیں جبکہ ہدایت اللہ ہدایت اور ہیبت قلی خان حسرت کو اپنے عہد کی روایت کے دوسرے درجہ کا شاعر قراردیتے ہیں۔

اس فصل کے آخری باب میں ان شعراء کا تذکرہ ہے صوبہ بہار اور بنگال اور سرزمین دکن میں اردو شاعری روایت کو مقبول بناتے رہے۔ ان شعراء میں شیخ رکن عشقؔ، مرزامحمد علی فدویؔ، شیخ غلام رسول راسخؔ، محمد روشن جوششؔ، محمد عابد دلؔ، شیرمحمدخان ایمانؔ شامل ہیں۔ ان شعراء کے سوانحی حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر تنقیدی فکر کااظہار کیاہے اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جن شعراء نے اردو زبان وادب کے قافلے کا حصہ بن کر اپنے اثرات مرتب کئے،ان کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ یہ وہ شعراء ہیں جو اگرچہ تاریخ میں اپنی الگ انفرادیت تو قائم نہ کرسکے لیکن اپنے دور کی آواز کو بلند تر کرنے میں اپنا حصہ ڈال کر جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

بقول یونس احمد:

''ردّ عمل کی تحریک میر، درد اور سودا، کے لئے بنیادی پس منظر فراہم کرتی ہے۔ یہ تینوں شعراء اس پورے دور پر اس طرح چھاجاتے ہیں کہ یہ دور میرؔ، سوداؔ کا دور بن جاتاہے اور ان کی آوازوں میں اس دور کی ساری دوسری آوازیں جذب ہوجاتی ہیں''۔ (۸۶)

فصل ششم پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں اٹھارہویں صدی میں اردو نثر کے رحجانات، اسالیب اور ادبی خصوصیات کا تجزیہ اس صدی کی نثری تصانیف کے حوالے کیا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں اردو نثر کے ارتقاء اور فروغ کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے اس عہد کی نثری تصانیف کو طرز احساس کے لحاظ سے ڈاکٹر جمیل جالبی دو اقسام میں تقیم کرتے ہیں۔ ایک وہ اسلوب جوفارسی نثر کا مقبول و مروّج اسلوب تھا اور دوسرا عام اور سادہ اسلوب جو تصنع سے پاک تھا۔ موضوع کے اعتبار سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دو ر کو 4حصوں میں تقسیم کیاہے۔ ۱۔ تنقیدی وعلمی نثر۔ ۲۔ مذہبی نثر۔ ۳۔ تاریخی نثر۔ ۴۔ افسانوی نثر آگے چل کر اس دور کی نثر کا مختصر اً جائزہ پیش کیاہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو نثرفورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے اپنا رستہ بناچکی تھی لہذا فورٹ ولیم کالج اردو ادب کا پہلا مرکز کہنا درست نہیں۔

دوسرے باب کا عنوان'' تنقیدی نثر اور اسالیب ' ' ہے۔ اس باب میں جس نثرنگار سے ڈاکٹرجالبی ہمیں سب سے پہلے متعارف کرواتے ہیں وہ سید برکت اللہ عشقی ہیں۔ عشقی کی ''عوارف ہندی '' کو ڈاکٹر جمیل جالبی اس لحاظ سے اہم قرار دیتے ہیں کہ اس میں عشقی نے متعدد اردو امثال اور کہاوتوں کی صوفیانہ تشریح کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے، ادبی لحاظ سے عشقی کی نثر اتنی اہمیت کی حامل نہیں مگر اس دور کی زبان کی عام زبان کے حوالے سے ضرور اہمیت رکھتی ہے۔ 'عوارفِ ہندی 'سے ڈاکٹرجالبی نے 74ضرب الامثال کی فہرست مرتب کی ہے جوکہ اردو میں ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری اہم تصنیف مرزاجان طپش دہلوی کی ''شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان ''ہے۔ اس فرہنگ میں طپش نے سند کے طور پر اردو اشعار رقم کئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے سید عبدالولی عزلت کے اردو دیوان کے دیباچے جوکہ اردو نثرمیں ہیں کا جائزہ لیاہے۔ ان کے مطابق عزلت سے پہلے دیوان کا دیباچہ اردو میں لکھنے کی روایت کا سراغ نہیں ملتا۔ عزلت کے علاوہ جن شعراء نے اردو نثر میں دیباچے اور مقدمے تحریر کئے ان میں مرزا علی نقی خان،انصاف حیدرآبادی، مرزامحمد رفیع سودا، محمد باقر آگاہ ایلوری، غلام علی عشرت شامل ہیں۔محمد باقرآگاہ کے تحریر کردہ دیباچوں اور مقدموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی رقم طراز ہیں:

''اردو کے کسی شاعرنے اپنے اردو دیوان پر اب تک اس قسم کا مقدمہ اردو زبان میں نہیں لکھا تھا جس سے اس کے تنقیدی شعور، اصول اور نقطہ نظر کی وضاحت ہو۔ باقر آگاہ کے سارے دیباچے جدید اردو تنقید کی روایت کے اوّلین نقوش ہیں جن میں تحقیق اور تنقید کے ساتھ نثر کا تنقیدی اسلوب بھی موجود ہے ''۔ (جلد دوم،ص۱۰۱۹)

تیسرا باب کے عنوان مذہبی ''تصانیف اور اسالیب '' ہے۔ اس باب میں جن مذہبی تصانیف کا تجزیہ کیاہے ان میں فضل علی فضلی کی کربل کتھا، شاہ معین الدین حسین علی کے فارسی رسالے 'جام جہاں نما' کا اردو توضیحی ترجمہ'' فتوح المعین'' شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی ''پارہ ء عم '' کی اردو تفسیر جسے ''تفسیر مرادیہ '' کانام دیاگیا، شاہ محمد رفیع الدین کی تفسیر رفیعی، شاہ رفیع الدین ہی کاقرآن پاک کااردو لفظی ترجمہ، شاہ عبدالقادر کا ترجمۂقرآن اور اس کی تفسیر اور حکیم محمد شریف خان کا قرآن پاک کا تشریحی ترجمہ شامل ہے۔ فضلی کی کربل کتھا کے سالِ تصنیف اور سالِ نظر ثانی کی بحث کو حواشی کا حصہ بنایاگیاہے جبکہ اسے اصل متن میں جگہ دینی چاہیے تھی بہرحال جالبی کی تحقیق کے مطابق کربل کتھا کا پہلا نقش ۱۱۴۵ھ میں تیارکیا گیا تھا اور اسے نظرثانی کے بعد ۱۱۶۱ھ میں شائع کیاگیا۔ ڈاکٹرجالبی نے کربل کتھا کے قلمی نسخے اور مطبوعہ نسخے کا تجزیہ کرکے ان امور کی نشاندہی کی ہے جو ان دونوں نسخوں میں فرق کی وجہ ہیں۔ کربل کتھا کے موضوع، زبان اور اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :'' کربل کتھا اردو نثر کے ارتقاء کی ایک بنیادی کڑی اور اپنے دور کی نمائندہ زبان کی ممتاز تصنیف ہے جس نے اردو نثر کو مختصر عرصے میں ایک لمبی مسافت طے کرادی ''۔ (جلد دوم،ص۱۰۴۱)

اس دور کے حوالے سے دیگرمذاہبی تصانیف کا لسانیاتی تجزیہ اس دور کی زبان کو سمجھنے میں بہت مددگار ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی زبان کے استعمال کا تجز یہ اور اردو زبان کے ارتقاء کا جائزہ بھی اس باب کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف مسلمان علماء کی نثری تصانیف کا جائزہ لیاہے بلکہ مستشریقین کی مسیحی کتابوں کا ذکرکیاہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اردو نہ صرف ایک معیاری علمی و ادبی زبان بن چکی تھی بلکہ عیسائی مبلغین بھی اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اس زبان کا سہارا لینے پر مجبور تھے۔ جن عیسائی مبلغین کی کتب کا جائزہ لیاگیاہے ان میں ''بنجمن شلزے، ٹیری ٹام کوربیٹ، فرئیر، ہیڈلے، فرگوسن، رابرٹ، ہنری مارٹن قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ان قواعد اور لغات کی تفصیل بھی بیان کی ہے جو ابتدائی طور پر اردوزبان میں تحریر

کی گئیں۔

چوتھے باب کا عنوان ’’ تاریخی نثر ‘‘ ہے۔ اس باب میں اردو میں تحریر کی گئی جس ابتدائی تاریخی تصنیف کا جائزہ لیاگیاہے وہ سید رستم علی بجنوری کی ’’قصہء و احوالِ روہیلہ‘‘ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کتاب کو اردو کی پہلی تاریخ کی کتاب قراردیتے ہیں۔ ’قصہ احوالِ روہیلہ ‘کے مرکزی قصے اور زبان کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس کی نثر کو نئے اسلوب کی پیش رو قرار دیتے ہیں۔

آخری باب کا عنوان ’’ افسانوی تصانیف اور اسالیب ‘‘ ہے۔ اس باب میں عیسوی خان کا قصہ ’’ مہرافروز ددلبر‘‘، محمد عطا حسین خان تحسین کی ’’نوطرزِ مرصع‘‘، منشی مہر چند کھتری لاہوری کی ’’نوآئینِ ہندی‘‘، شاہِ عالم ثانی آفتاب کی ’’عجائب القصص‘‘ اور سید شاہ حسین حقیقت کی ’’جذبِ عشق‘‘ کا تنقیدی و لسانی تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ نواب عیسوی خان کے حالاتِ زندگی نہایت جامعیت سے پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی، عیسوی خان کو دریافت کرنے کا سہرہ ڈاکٹرپرکا ش مونس (۱۸۰۹ء) کے سر باندھتے ہیں اور ان کی تصانیف کے زمانہء تصنیف کے تعین کے بعد اسے اردو زبان کی قدیم ترین داستان قراردیتے ہیں اور داستان کے قصے کے تجزیے کے ساتھ ساتھ لسانی تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔

اس باب کا ایک اہم حصہ محمد عطا حسین خان تحسین کی ’’انشائے نوطرز مرصع ‘‘کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کا تحقیقی تجزیہ ہے۔’’نوطرزمرضع‘‘ میں شامل چاروں قصے تحسین کے تحریرکردہ ہیں، یا کسی اور نے مکمل کئے اس ضمن میں بحث کرتے ہوئے انہوں نے کئی ایسے نسخوں کی نشاندہی کی ہے جن میں صرف ایک قصہ ملتاہے۔ انہوں نے ’’وقائع عبدالقادرخانی‘‘ کے ایک بیان کو بھی درج کیاہے۔ جس میں دو متضاد بیانات ہیں۔ ایک کے مطابق’’نوطرزِمرضع‘‘ تحسین کی تصنیف ہے۔ دوسرے کے مطابق اس کا نثری حصہ کسی علی الدین خان لکھا ہواہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اگرچہ اس بحث کو منطقی انجام تک نہیں پہنچایا لیکن ڈاکٹر گیان چند کے مطابق:’’حق یہ ہے کہ ’نوطرز مرضع ‘ میں چارنہیں پانچ قصے ہیں اور سب کا اسلوب تحریر یکساں ہے، یعنی یہ ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلے ہیں ‘‘۔ (۸۷)

’’نوطرز مرضع ‘‘کے قصو ں کی بحث کے بعد ڈاکٹرجالبی نے اس داستان کے نام قصے، زبان اور طیش کے اسلوب کے حوالے سے پرمغز بحث کو کتاب کا حصہ بنایاجوکہ یقیناًقابل قدر اقدام ہے۔ مہر چند کھتری کی تصنیف ’’نوآئین ہندی ‘‘ کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے ڈاکٹرگیان چندجین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان فارسی اور اردو حصوں کی نشاندہی کی ہے جن کی بنیاد

’’نوآئین ہندی ‘‘ پرہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مصنف کے حالات تحریر کرنے کے بعد ’’نوآئین ہندی ‘‘ کی زبان کا تجزیہ کیاہے۔

شاہ عالم ثانی کے سوانحی حالات کے بعد ’’عجائب القصص‘‘ کے قصے، زبان اور عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔ باب کے آخر میں سید حسین شاہ حقیقت کی تصنیف ’’جذبِ عشق‘‘ کے قصے اور زبان کی شکل وصورت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہےڈاکٹرجالبی نے مؤرخانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے پورے ادبی منظر نامے کوایک لڑی کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیاہے۔ زبان کے ارتقاء،لفظوں کی بدلتی صورتیں مختلف اصناف کا عروج اور نئی اصناف کاظہور تمام امور مرحلہ وار ہمارے سامنے اس طرح آتے ہیں کہ اردو زبان وادب کی تشکیل پاتی صورت مزید واضح ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔حواشی کے ذیل میں تبصراتی حواشی کے ساتھ ساتھ مآخذات کے حوالے بھی درج کئے گئے ہیں اور آخر میں فارسی اقتباسات درج کئے گئے جن کا اردو ترجمہ متن کے اندر درج کیاگیاہے۔ جلد کے آخر میں ابن حسن قیصر اور لالہ رخ کا ترتیب دیاہوا ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے اشاریہ دیاگیاہےتاریخِ ادبِ اردو جلد دوم میں جلد اوّل کی نسبت فٹ نوٹ میں معلومات درج کرنے کا رحجان نسبتاً کم ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو(جلد دوّم) میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے طریقۂتاریخ نویسی اور تحقیقی کا وشوں کے جائزے کے بعد ضروری ہے، جلد دوّم کے حوالے سے ناقدین کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیاجائے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے مضمون ’’ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخِ ادبِ اردو‘‘ میں مشمولہ’ ادبی تاریخ نویسی ‘ میں جلد اوّل کے حوالے سے اپنے تحفظات اور اعتراضات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جلد دوّم کے حوالے سے بھی چند معروضات پیش کئے تھے جوکہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ چند بنیادی اعتراضات جلد دوّم کی دو حصوں کی تقسیم کے حوالے سے ہیں۔لیکن ہمارے پیشِ نظر چونکہ تاریخ ادب اردو جلد دوّم کانیاایڈیشن ہے جس میں دونوں حصّوں کو یکجا کر دیاگیاہے لہٰذا یہ اعتراضات اب بے معنی ہیں۔

۲۔ گیان چند جین نے تاریخِ ادبِ اردو جلد دوّم کے صفحات نمبر،۱۰۰، ۳۴۷، ۳۵۵، ۶۰۰، ۶۷۷ اور ۷۸۵ پر درج کئے گئے۔ جعفر زٹلیؔ، تاباںؔ، حاتمؔ، میرؔ اور قائمؔ کے ان اشعار کی تصحیح درج کی ہے جو ان کے مطابق بے وزن ہیں یا پھر کتابت سے ان کا متن غلط ہوگیاہے۔ (ص۔ ۴۲)

۳۔ ص۔۱۵۰ پر گلشنِ عشق، کے مصنف کا نام سہوا غواصی لکھ دیا ہے جبکہ یہاں نصرتی ہونا چاہیے۔ (ص۔ ۴۲۱)

۴۔ ص(۵۳۔۱۵۱) پر خانِ آرزو کی فارسی تصانیف کی طویل فہرست ینا تاریخ ادب اردو کے لئے درست نہیں۔ (ص۴۲۱)

۵۔ ص (۱۵۴) پر ڈاکٹرجالبی کا یہ دعویٰ کہ خانِ آرزو نے ’نوادرالالفاظ‘ میں اردو کا لفظ سب سے پہلے استعمال کیاوہ درست نہیں۔ جبکہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق میرمحمد مائل کے دیوان (سنہ ترتیب ۱۱۷۶ھ) کے ایک قطعے میں سب مجرداردو کو زبان کے معنی میں استعمال کیاگیا۔ (ص ۴۴۲)

۶۔ آزاد کے حوالے سے ناجی کے وطن کا نام جاج مؤکبر آباد (ص۲۵۸) دیاہے جبکہ ڈاکٹرگیان چند جین قاضی عبدالودود کے حوالے سے صحیح نام جاجو ضلع کان پور قرار دیتے ہیں۔(ص ۴۲۳)

۷۔(ص۔ ۹۳۔۲۹۲) کے حاشیے میں ولی اور اشرف کی مشترکہ غزلوں کے بارے میں اپنی رائے کومتن میں جگہ دینے کی بجائے حاشیے میں دیا ہے۔ گیان چند جین گمان کرتے ہیں کہ شاید ڈاکٹر جمیل جالبی کے ذہن میں متن اور حاشیے کے مطالب میں فرق واضح نہیں۔(ص۴۲۳)

۸۔ (ص ۷۔۳۰۶) پر میر جملہ عبیداللہ خان کے ہم نام بیٹے کے حوالے سے جالبی ’’سیرالمتاخرین ‘‘ کا حوالہ قبول کرتے ہیں جبکہ گیان چند جین کے مطابق ’’ماثرالامرا‘‘ کاحوالہ زیادہ وزنی ہے کیونکہ دادا اور پوتے کانام تو ایک جیسا ہوسکتاہے باپ اور بیٹے کا نہیں۔ (ص۴۲۴)

۹۔ جلددوّم چونکہ رحجانات اور روایات کے حوالے سے ترتیب دی گئی ہے لہذا اشرف گجراتی اور میرمحمود صابر کا ذکرولی کے سلسلے میں جلد اوّل میں کردیناچاہیے تھا۔ (ص۴۲۴)

۱۰۔ (احسن الدین خان سنہ وفات ص۴۰۷ پر صفر ۱۲۱۳ھ / ۱۷۸۸ء دیا ہےجبکہ ص۔ ۴۱۰ پر صفر ۱۲۲۳ھ / جولائی یا اگست ۱۷۹۸ء لکھتے ہیں۔گیان چند جین جولائی اگست کو مالک رام کے حوالے سے درست قرار دیتے ہیں۔ (ص۴۲۵)

۱۱۔ جلد دوّم میں میرؔ پر سوداؔ سے پہلے لکھا ہے جو تاریخی ترتیب کے خلاف ہے۔ گیان چندجین خودوضاحت کرچکے ہیں یہ جلد تاریخی ترتیب سے نہیں بلکہ رحجانات اور روایات کے تحت لکھی گئی ہے لہذا ان کا یہ اعتراض بے جاہے جبکہ گیان چند جین معترض ہیں کہ میر کے لئے ۱۴۷ صفحات مختص کئے ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔

۱۲۔ جلد دوم میں فارسی اقتباسات کے تراجم کو متن میں دیتے اور اصل عبارت حواشی میں درج کرنے پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح ان کے شمول کی افادیت کم ہوگئی ہے کیونکہ بیان پڑھتے وقت باربار صفحے پلٹنے پڑتے ہیں۔(ص۴۲۶)

۱۳۔ میرحسن کے باب میں بھی میر حسن کے جد میرامامی موسوی کے خاندان کا کچھ ذکرمتن میں دیا ہے اور کچھ ص۔ ۸۱۹ کے حاشیے میں۔گیان چند جین اسے بے اصولی قراردیتے ہیں۔ (ص ۴۲۶)

۱۴۔ فصل پنجم کے آٹھویں باب میں بہار سے تعلق رکھنے والے شعراء کے ذکر کو غیر ضروری قرارد یتے ہیں جبکہ راسخ عظیم آبادی کو ''چند دوسرے شعراء'' میں شامل کرنے پر بھی معترض ہیں۔(ص۴۲۹)

۱۵۔ گیان چند جین،باقرآگاہ ایلوری کے تاریخِ ولادت اور تاریخِ وفات کے حوالے سے جلد اوّل اور جلد دوم میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے تضادات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی متعین کردہ تواریخ کو غلط قراردیتے ہیں اور مالک رام کی متعین کردہ تاریخوں کو درست قرار دیتے ہیں۔(ص۳۱۔۴۳۰)

۱۶۔ گیان چند جین جلد دوّم کے آخرمیں کتابیات کی فہرست درج نہ کرنے پر بھی معترض ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفی خان نے اپنے مضمو ن ''تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ ''(مشمولہ : جمیل جالبی ایک مطالعہ از گوہر نوشاہی) کے حواشی میں جلد دوّم کے حوالے سے جو معروضات پیش کیں ہیں وہ درج ذیل ہیں ؛

۱۔ لفظ اٹھارہویں کے بجائے 'اٹھارہویں ' درست املاہے۔(حاشیہ نمبر۲۳)

۲۔ ڈاکٹر صاحب برِّصغیر کو ہرجگہ برّعظیم میں لکھتے ہیں۔ (حاشیہ نمبر(۲۵)

۳۔ ڈاکٹر صاحب جعفر زٹلی کو مرزاقراردیتے ہیں جبکہ خود انہوں نے بھی صفحہ ۱۱۲، اور صفحہ ۱۱۵، پرمیر جعفرہی لکھا ہے (حاشیہ نمبر۲۸، ص۔ ۳۳۹)

۴۔ کریم الدین کا تذکرہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا اس میں ۱۸۵۰ء میں چھپنے والی 'دہ مجلس 'کے اقتباسات نہیں ہوسکتے۔ (حاشیہ نمبر۵۱) جبکہ ڈاکٹرجالبی کے مطابق گارسان و تاسی نے کریم الدین کے تذکرے سے کربل کتھا سے طویل اقتباسات دئیے۔ (ص۔۳۳۳)

۵۔ صفحہ (۱۰۴) پرکتاب کا نام' فتوح المعین' ہے لیکن صفحہ ۱۰۴۲، اور حاشیہ نمبر ۱۸ میں ''فتح المعین ''لکھا ہے۔ (حاشیہ۵۳ ص۔۳۴۲)

ڈاکٹر غلام مصطفٰی کے ان معمولی اعتراضات کے علاوہ جلد دوّم کا تجزیہ کیاجائے تو یہ جلد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی جلدوں میں سب سے عمدہ جلد قرارد ی جاسکتی ہے۔ اس بات کو ان کے ناقدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام اپنے مضمون ''اردو اب کی تاریخیں '' میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی جلد اوّل کو '' بے مقصداور بے ارادہ '' لکھی ہوئی تاریخ ادب قراردیتے ہیں وہیں جلد دوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دوسری جلد ادبی تاریخ نویسی کا ایک نہایت اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ اس کی بنیاد اردو زبان و ادب

سے متعلق مضبوط تحقیقات پررکھی گئی ہے اور بہ کثرت مستند حوالوں سے مزین ہے۔یہ دوسری جلد نہایت تحسین کے قابل ہے ''۔ (۸۸)

جلد دوّم کا تجزیہ کیاجائے تو یہ جلد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی جلدوں میں سب سے عمدہ جلد قرارد ی جاسکتی ہے۔ اس بات کو ان کے ناقدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جلد اوّل کو جہاں اپنی پہلی اشاعت کے بعد بہت پذیرائی ملی وہیں اس جلد پر چند بنیادی قسم کے اعتراضات بھی کئے گئے بالخصوص طریقۂکار اور اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے جلد دوم میں نہ صرف تاریخ نویسی کے طریقۂکار میں تبدیلی کی بلکہ اسلوب کے حوالے سے ''محمدحسین آزاد'' کے اثرات سے بھی نکلنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹرجالبی نے پیش لفظ میں اپنے اسلوب اور تنقیدی طریقۂ کار پر بالخصوص روشنی ڈالی ہے۔ جلد دوّم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے دعوے کے مطابق امتزاجی تنقید سے کام لیاہے۔ تنقیدی آراء دیتے ہوئے جہاں بے جا تعلیم سے گریز کیاہے وہیں توازن اور اعتدال سے ہر تخلیق کارکے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ جلد دوّم میں ڈاکٹرجالبی نے روایتی تنقیدی آراء دینے سے گریز کرتے ہوئے تنقید میں تخلیق کے امتزاج سے نئے تنقیدی اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے۔اس جلد میں ڈاکٹرجالبی نے امتزاجی تنقید کے طریقہء کار کو نہایت عمدگی سے برتا ہے۔ یہاں ڈاکٹرجالبی کے تنقید کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں مثلاً ایہام گوئی کی تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''آبر نے جس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی حسن پرستی، عشق بازی، بزم آرائی اور مجلسیت، خوش وقتی، امرّدپرستی اور میرزائیت، زندگی سے وقتی لذّت، جسمانی لطف اور نشاط حاصل کرنے کی خواہش، زندگی اور کیف و سرور سے سرمست ہوجانے کی آرزو،حقیقت سے آنکھیں چرانے اور زندگی کے مسائل سے آنکھیں بچانے کا عمل، اس دور کے تہذیبی روّیوں میں رچا ہوا تھا۔ اس تہذیب نے حقائق سے بھاگ کر نشاط، اور مجاز کے دامن میں پناہ لی اور اسی نفسیات نے اس دور کے انسان کو اپنے سانچے میں ڈھالاتھا۔ اس دور میں فارسی روایت دم توڑ رہی تھی اور دیسی روایت سارے فنونِ لطیفہ میں تیزی کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ اردو زبان و ادب کی ترقی، رواج و مقبولیت بھی اسی روایت کا حصہ تھی۔'' (۸۹)

اٹھارہویں صدی کی نثر پر سیاسی تبدیلیوں کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’اٹھارہویں صدی کا آخری حصّہ غیرمعمولی سیاسی تبدیلیوں کا دور تھا۔ نئے انگریز حکمرانوں کا تصورِ حقیقت ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا جو اب تک اد ب کی سرپرستی کرتے آئے تھے۔ اب ضرورت نے ایسی نثر کو رواج دیا جو آسان زبان میں لکھی او’ر صاحبان نو آموز ‘بھی پسند کریں ‘‘۔ (۹۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے تحقیقی نتائج اور تنقیدی آراء کو جس تخلیقی اسلوب میں تاریخ ادب اردومیں پیش کیاہے اس نے اس جلد کی وقعت بڑھانے اور پسندیدگی میں اضافہ کرنے میں اہم کردار اداکیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیقی نتائج کے بیان اور تنقیدی آراء کے اظہار میں بہت واضح اسلوب اختیار کرتے ہیں جس میں پیچیدگی، خشکی اور غیرضروری سنجیدگی سے گریز کیاگیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جلد دوم میں اپنے اسلوب کو عام بول چال کی زبان سے قریب رکھتے ہوئے بھی اس کی علمیت اور ادبی شان میں کمی نہیں آنے دی۔ فارسی و عربی تراکیب کے استعمال سے شعوری طور پر احتراز کرتے ہوئے رنگین بیانی سے گریز کیاہے۔ (جیسا کہ جلد اوّل کے حوالے سے ان کے اسلوب پر اعتراضات کئے گئے تھے) ڈاکٹرعبدالعزیز ساحر اپنی کتاب ڈاکٹرجمیل جالبی ’’شخصیت اور فن ‘‘ میں ان کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’علمی تحریر کی زبان اگر کتابی او رتحریری زبان کے اثر سے ہٹ کر،گفتگواور بول چال کی زبان کے آہنگ سے مملوہوجائے تو پھر اس کی تازگی اور شادابی کے اتنے رنگ بکھرتے ہیں کہ جن سے نثر :جمالیاتی اور تہذیبی احساسِ جمال سے مل کر ایک نئے اور اچھوتے رنگ ڈھنگ کو جنم دیتی ہے۔ اس میں اظہار کی سادگی، رعنائی خیال سے بھی وابستہ رہتی ہے اور شاعرانہ آہنگ سے بھی، اور یہ کرشمہ لفظ سے متشکّل ہوتا ہے۔ جوخیال کو ایک پیٹرن اور رنگ عطاکرتاہے ‘‘۔ (۹۱)

ڈاکٹرجالبی کے ’رواں ا ور شگفتہ اور عام بول چال کی زبان سے قریب ہوتے ہوئے بھی ادبی اسلوب ‘کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

’’جعفرکے کلام سے معلوم ہوتاہے کہ تہذیب کا وہ عمل جو امیر خسروکے دور میں زندہ نامیاتی اور ترقی پسند تھا اب مردہ ہوکر بکھرا چاہتاہے۔ اب وہ تہذٰیب ایک دوسری تہذیب میں جذب ہورہی ہے۔ غالب

تہذیب مغلوب ہو کر دیسی تہذیب میں اپنا سر چھپا رہی ہے اور چاروں طرف چھائے ہوئے گردو غبار میں ایک نیا چہرہ دھندلا دھندلا لیکن صاف نظر آرہا ہے۔ ایک نئی زبان اپنا راستہ بنا رہی ہے ‘‘۔ (۹۲)

’’فن کے نئے جذبے کے اظہار کے لئے ایک ایسے توزن کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اوپر اٹھا سکے یہی عملِ ارتفاع (Sublimation) ہے۔ اگرمیرؔ کی شاعری یہ عمل نہ کرتی تو ان کے نالے، ان کی شدتِ غم، ان کے جلانے والا سوز وگداز، ان کی خستگی اور قنوطیت ایک مریضانہ ذہنیت اختیار کرلیتی جس میں مثبت کے بجائے منفی طرز فکر کااظہار ہوتا‘‘۔(۹۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا اسلوب بیان اپنے اندر فکری تہہ داری اور معنویت رکھنے کے ساتھ ساتھ ادبی شان کا بھی حامل ہے۔ تاریخ ادب جیسی عظیم الشان صنف کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کے اسلوب بیان کو مثالی قراردیاجاسکتاہے۔ ایسا اسلوب جو نہ صرف تحقیقی نتائج کے بیان میں شگفتگی اور دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا بلکہ تنقیدی نتائج کے اظہار کے لئے بھی سادگی، ادبیت، ابلاغ، استدلال اور فکری و معنوی حیثیت سے محروم نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تنقیدی فکر کے اظہارکے لئے انگریزی تراکیب بھی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا اردو متبادل دینے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ کو صرف انتہائی ضروری مواقع پر استعمال کرتے ہیں جن سے ان کی زبان میں غرابت کا احساس بہت کم ہوتاہے۔ زبان ہی کے حوالے سے ان کی ایک اور خوبی ان کی زبان کا اردو پن ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شعوری طور پر فارسی و عربی تراکیب کے استعمال سے گریز کیاہے جس کا اظہار وہ پیش لفظ (جلد دوّم) میں بھی کرچکے ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر قاضی عبدالغفار :’’ان کی تحریر شگفتہ، رجائیت آمیزاور جامع ہے۔ اس میں روانی اورسلاست ہے اور یہ ایک سلجھے ہوئے انسان کی انفرادیت کی مظہرہے ‘‘۔ (۹۴)

انہی خصوصیات کی بنا پرتاریخِ ادبِ اردو جلد دوّم،متوازن تنقید،تحقیقی شعوراور اسلوب کی دلکشی کے باعث اردو ادب کے قارئین اور طالبِعلموں میں انتہائی مقبول ہے۔ اردو تاریخ نگاری میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو (جلد سوّم)کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ:

ڈاکٹرجمیل جالبی کی تاریخ ادب جلد سوم، جو ۲۰۰۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ تاریخ ادب کی دوسری جلد اور تیسری جلد کے درمیان تقریباً ۲۴ سال کا عرصہ حائل ہے لیکن یہ جلد دیگر دو جلدوں سے مربوط ہے اور انیسویں صدی کے نصف اوّل پرمحیط ہے۔ صفحہ نمبر۵ پرW.B Yeats کا یہ مقولہ درج ہے۔

All Changed, chaged utterly: a terrible beauty is born.

کتاب میں پیش لفظ اور تمہید کے علاوہ پانچ فصلیں ہیں۔ ہر فصل متعدد ابواب پر مشمل ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹرجالبی تیسری جلد کے حوالے سے ان امور کا ذکرکیا ہے جو تیسری جلد، تصنیف کرتے ہوئے پیش آئےڈاکٹر جمیل جالبی، تیسری جلد کو بیشتر لکھنؤ کی صدی قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اس جلد میں بعض باتوں کو دہرانے کی ضرورت محسوس ہوئی لہذا ناسخ کے گہرے اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے بعض امور کو دوبارہ دہرایا گیاہے۔ تاریخ ادب کی دیگر جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے شعراء اور نثرنگاروں کے سوانحی حالات مرتب کرنے کے لئے دقتِ نظری کا ثبوت دیاہے۔ شعراء کے مزاج اور ماحول کی بہترعکاسی کے لئے اس عہد کی تصویر کشی کے ساتھ شعراء اور مصنفین کے درمیان برپا ہونے والے ادبی مباحث اور معرکوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے حوالے سے اردو ادب کے بہت سے گوشے جو نظروں سے اوجھل تھے انہیں بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیگرجلدوں کی طرح اس جلد میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے دعویٰ کیاہے کہ انہوں نے ادب کی تفہیم اور اس کا مطالعہ سماج، تہذیب، کلچر اور لسانی پہلوؤں کے ساتھ ایک اکائی کے طور پر کیاہے۔ ان محرکات کی نشاندہی کرنے کی کوشش ہے جوکسی فن پارے کو آفاقیت عطاکرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ میں اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ:

> ’’ہمیں اپنے شاعروں، ادیبوں اور فکشن نگاروں کا اپنے ادب اور روایت کے حوالے سے ہی مطالعہ کرنا چاہئے ناکہ چوسر شیکسپئیر، کالرج اور گوئٹے وغیرہ سے----- ہماری تہذیبی روح ’’مغرب‘‘ کی تہذیبی روح سے مختلف ہے اس لئے ایک کے معیار سے دوسرے کو نہیں جانچا جاسکتا ‘‘۔ (جلد سوم،ص۱۶)

اس جلد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نثر ونظم کا زمانی اعتبار سے ایک ساتھ مطالعہ پیش کیاہے جبکہ جلد دوّم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اٹھارہویں صدی کی نثر کا تجزیہ جلدکی آخری فصل میں پیش کیاتھا۔ جلد سوّم کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ دعویٰ کیاہے کہ کئی ایسے ادیب اور شاعر متعارف کروائے گئے ہیں جوگم نام تھے۔ جلد سوّم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کم یاب کتب کے حوالے زیادہ سے زیادہ فراہم کئے ہیں تاکہ عام قاری بھی کم یاب کتب سے استفادہ کرسکے۔ دیگر جلدوں کی مانند اس جلد کے مواد کے حصول کے لئے بھی اولین ماخذات پر زیادہ سے زیادہ انحصار کیاگیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ میں اپنے اسلوب کے حوالے سے بھی اہم امور کی نشاندہی کی ہے۔ پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت جامعیت سے اس جلد کے مشمولات بیان کئے ہیں۔ بقول جالبی:

''اس تاریخ میں پانچ دھارے مل کربیان کی وحدت کا سنگم بنتے ہیں۔ ایک دھارا واقعات و حالات اور ولادت و وفات کی دھاراہے۔ دوسرا زمانی ترتیب اور ادب کے حوالے سے، ہر دور کے تاریخی مطالعے کا دھاراہے۔ تیسرا تہذیبی و تاریخی شعور کے ساتھ، اد ب و شعر کے تعلق سے کسی شاعر یانثر نگار کاتنقیدی مطالعہ اور تاریخ میں اس کے مقام کا تعین ہے۔ چوتھا روایتِ شعرادب کی پیدائش، تکرار و توسیع، تبدیلی اور پھر نحراف کا دھارا ہے۔ پانچواں ہر دور اور ہر قابل ذکر شاعر یا ادیب کے زبان و بیان کا لسانی مطالعہ ہے۔ یہ سب دھاراہے۔ یہ سب دھارے مل کرتاریخ ادب میں اس '' پنج ند'' اور وحدت و اکائی کو جنم دیتے ہیں، جومیرا مقصود ہے ''۔ (جلد سوم،ص۱۸)

دوسری جلد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فارسی اقتباسات کے تراجم متن کے اندر اور اصل متن حواشی میں درج کیا تھا جبکہ اس جلد میں حسب ضرورت اقتباسات فارسی زبان ہی دئیے گئے ہیں اور اقتباسات کے تراجم ''حواشی ب '' کے عنوان کے تحت دئیے گئے ہیں۔ '' تمہید'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انیسویں صدی کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی رویوں اور تبدیلی کے عمل کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ اٹھارہویں صدی مغلیہ سلطنت کے زوال کی صدی تھی تو انیسویں صدی انگریزی سلطنت کی توسیع اور استحکام کی صدی قرار دی جاتی ہے۔ ڈ اکٹر جالبی نے ان سیاسی واقعات کی نشاندہی کی ہے جو مغلیہ سلطنت کے مکمل زوال کا سبب بنے اور انگریزوں کو سیاسی استحکام بخشنے کا باعث بنے۔ سیاسی سطح پر یہ تبدیلی، تہذیبی اور معاشرتی سطح پر بھی بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیاں افراد کے افکار اور واعمال پر براہ راست

اثرانداز ہوئیں۔ بقول جالبی :’’ ایک طرف پدرم سلطان بود کاگھمنڈ دوسرے طرف خود کو طرّم خان سمجھ کرکسی نئی چیز، کسی نئی بات کو قبول نہ کرنے اور اپنی بات پراڑ جانے کا مزاج اور بغیر حکمت عملی کے میدان جنگ میں اترنے کے عمل نے سارے معاشرے کو بیرونی طاقتوں کی زد پر لاکھڑا گیا تھا‘‘۔ (جلد سوم،ص۲۲)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں مسلمانوں کے اقتدار کا باقاعدہ خاتمہ ہوااور انگریزوں کا اقتدار برصغیر پر مزید مستحکم ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بدلے ہوئے منظرنامے کے حوالے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے رد عمل اور روئیے کا نہایت عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے اور اس عہد کی معاشرتی، معاشی اور تہذیبی اقدار کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ انگریزوں کے اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد مغربی نظریات کے فروغ کے جس طرح برصغیر کی زبان و ادب میں تغیر پیدا کیا اورجو تحریکیں اس تغیر کے نتیجے میں برپا ہوئیں ان سب کے عوامل اور اثرات پر عمدگی سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس عہد کے معاشرے کی تصویرہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مغربی نظریات کے فروغ کے علاوہ طباعت کی سہولتوں اور ذرائع رسل و سائل میں بہتری آنے سے جس طرح اور دو زبان و ادب کو فروغ ملا وہ اس صدی کا اہم ترین واقعات میں سے ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے اہم بحث ’’اردو ‘‘ اور ’’ہندی‘‘ کے حوالے سے ہے۔ آیا ’اردو ‘ اور ’ہندی‘ الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک ہی زبان ہیں،لیکن رسم الخط مختلف ہے۔ ڈاکٹرجالبی اس حوالے سے مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں اردو اور ہندی کے لسانی اختلا فات کو انگریزوں کی چال قرار دیتے ہوئے، ہندی کو اردو کادیوناگری روپ قراردیتے ہیں جس میں سنسکرت الفاظ شامل کرکے اسے ہندی کا نام دیاگیا۔ ’’ انگریزی اقتدار نے اس لسانی اختلاف کو ہوادی تاکہ ہندو، مسلمان ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں۔ اور ’’لڑاؤ اور حکومت کرو‘‘ کے قدیم رومن اصول کے عین مطابق ان کی حکومت مستحکم و دائم رہے‘‘۔ (جلد سوم،ص۳۰)

انیسویں صدی میں انگریزوں کے اقتدار نے جہاں نئی نئی ایجادات متعارف کروائیں وہیں نئے نظریات بھی برصغیر میں وارد ہوئے اور زبان و ادب پر اثرات مرتب کرنے لگے۔ انگریزوں کے لائے ہوئے پیداواری نظام کے نتیجے میں برصغیر کے لوگوں کی زندگیوں کو جس طرح متاثرہوئیں ان سب کی تصویر کشی کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی تمہید کا اختتام کرتے ہیں۔

فصل اوّل، چودہ ابواب پرمشتمل ہے۔ فصل کی تقسیم ڈاکٹرجالبی نے اس طرح کی ہے پہلے چھ ابواب کے بعد، ’’چند دوسرے شعراء‘‘، ’’روایت کی تکرار ‘‘، کے تحت مزید چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر ’’چند اور شعراء؛ روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز‘‘ کے عنوان کے تحت چار ابواب

میں تقسیم کیا گیاہے۔ فصل کی یہ تقسیم ابہام کا باعث ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو شاعری کے محرکات، رحجانات، روایت کے سفر تبدیلی، معیار سخن وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے ہندوستان کے ان تہذیبی، لسانی اور ادبی روایات کا جائزہ لیاہے جوزبان و ادب پر اثرانداز ہوتی رہیں جیساکہ ڈاکٹرجالبی پیش لفظ میں وضاحت فرماچکے ہیں کہ انہوں نے اس جلد میں تہذیب، کلچر، سماج اور لسانی پہلوؤں کو ایک اکائی کے طور پر دیکھا ہے۔لہذا ہر عہد کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی اور ان کے ادب پر اثرات کا جائزہ اس باب میں بھی نہایت عمدگی سے لیاہے۔ اٹھارہویں صدی میں جہاں دلیّ اردو زبان وا دب کا مرکز تھی، بیسویں صدی میں لکھنؤ ہنداسلامی تہذیب اور علم وادب کا نیا مرکز قرار پایا۔ طبقہ امراء کی عیش کوشی، توہم پرستی، مذہبی اقدار میں غلو اور حالات سے فرار کے رویّے کے اثرات ایک مخصوص رحجان لے کر ظاہر ہوئے۔ اس دور میں ابھرنے والے شعراء میں، مصحفی سوز، جرأت انشاء شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد کے تخلیقی مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے، اس عہد میں ابھرنے والی اہم اصناف میں غزل، قصیدہ، قطعہ نگاری، تاریخ گوئی، مرثیہ، واسوخت، ریختی کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد میں ہونے والی مجموعی لسانی تبدیلیوں کاتجزیہ بھی عمدگی سے پیش کیاہے۔ یہ ہی وہ دور ہے جب انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب کے غالب آجانے سے شعراء کے کلام میں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال شروع ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختلف شعراء کے کلام سے اس رحجان کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ’’قلندر بخش جرأت ‘‘ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جرأت کے نام کے حوالے سے تذکرہ نگاروں (تذکرہ نگاروں یاتذکروں کی نشاندہی نہیں کی گئی) کے درج کئے گئے ’نام قلندربخش کو ردّ کرتے ہوئے ان کے کلام سے داخلی شواہد کاحوالہ دیتے ہوئے یحییٰ امان کو درست نام قرار دیاہیں۔ جرأت کے سالِ پیدائش اور سالِ وفات کا تعین بھی مدلل انداز میں کیاہے اور واقعات و شواہد کی جانچ پرکھ کرکے بعد سال ولادت ۱۱۶۲ھ اور سال وفات ۱۲۲۴ھ متعین کیاہے۔ جرأت کے حالات زندگی بھی تحقیقی دقت نظری سے بیان کئے گئے ہیں۔ جرأت کے عہدکے حالات اور ذاتی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے کلام کاتجزیہ کیاگیاہے۔ جرأت کے نابینا ہونے کے متعلق بھی مختلف تذکروں اور شواہد کاتجزیہ کرتے ہوئے ۱۱۹۸ھ کو جرأت کے نابینا ہونے کا سال قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جرأت کی تخلیقات کی فہرست مرتب کی ہے اور جرأت کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جرأت کی شاعری کے موضوعات کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''جرأت کی شاعری ایک مخصوص دور کے مخصوص مزاج کی شاعری ہے جووجود (Particular) سے آفاق (Universal) کی طرف نہیں جاتی اور اسی لئے اس میں علویت نہیں ہے۔ جرأت کے زیر اثر شاعری کا یہ رحجان اور شاعروں کا ایک طبقہ ضرور پیدا ہوگیا۔ جس نے خارجیت کو اختیار کیا اور شاعری کو ایک دوسری انتہا کی طرف لے گیا جس میں خارجیت اور معنی آفرینی معیارِ سخن ٹھہرے جرأت کی شاعری ہمیں بڑے ہونے کا فریب سا دیتی ہے۔ ادب زندگی کاآئینہ ہے اور جرأت کی شاعری اس دور کو اپنے اظہار کے آئینے میں اجاگرکرتی ہے ''۔ (جلد سوم،ص۸۶)

باب کے آخری حصے میں جرأت کی شاعری کے حوالے سے اس دورکی زبان کا تجزیہ نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں جس شاعر کا جائزہ لیاگیاہے وہ انشاء اللہ خان انشاء ہے۔ اس باب میں انشاء اللہ انشاء کے حالات زندگی، سیرت و شخصیت ادبی معرکوں، تصانیف کے تجزئیے کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی مقام کے تعین کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ انشاء اور مصحفی کے درمیان برپا ہونے والے معرکے کا بیان بھی انتہائی دلچسپی کا حامل ہے اور انشاء کی شخصیت کے بہت سے گوشوں کو آشکار کرتا ہے۔ غزل کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی انشاء کی غزل میں جن نئے رحجانات کی نشاندہی کرتے ہیں ان میں غزل سے احساس و جذبے کا اخراج، غزل کو مردانہ، پرقوت اور بلند آہنگ لہجہ دینا، قدرتی مناظر کا بیان، ہندوستانی اسطور اور کنایات کو کثرت سے اپنی غزل میں سمونا، غزل کے لہجہ کو مخصوص مزاج سے شگفتہ بنانا شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے انشاء کی غزل سے مندرجہ بالا نئے رحجانات کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ڈاکٹرتبسم کاشمیری انشاء کے اس رویے کو ''اینٹی غزل روّیہ'' قراردیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''لکھنؤ میں انشاء نے غزل کے روایتی وجود کو ایک نئی صورتحال سے دو چار کر دیا تھا۔ وہ غزل کے روایتی تکلفا ت،آدب اور روایات سے باغی معلوم ہوتے ہیں۔ شمالی ہند میں غزل کے معروف ڈھانچے کو انشاء نے شعوری طور پر توڑ پھوڑ دیا۔ انشاء نے غزل کی معنوی توڑ پھوڑ(Deconstruction) کر دی۔وہ تغزل کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہ غزل کی عشقیہ تہذیب پر چلتے تھے ''۔ (۹۵)

انشاء کی جن نثری تصانیف کا ڈاکٹر جمیل جالبی نے تجزیہ کیاہے ان میں دریائے لطافت، لطائف السعادت، روزنامچہ، مطرالمرام، کہانی رانی کیتکی اور اودھے بھان کی، سلکِ گوہر شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی انشاء کی تخلیقات کے تجزیے کے بعد ہندو ستانیت اور اردو پن کو ان کی نمایاں پہچان قرار دیتے ہیں۔

چوتھے باب میں غلام ہمداانی مصحفی ؔکی حیات، شخصیت اور ادبی معرکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دستیاب شواہد کی بنا پر بلم گڑھ کو مولد اور اکبر پور کو ان کا آبائی وطن قراردیتے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کے سالِ پیدائش کے تعین کے لئے بھی موجود مواد کا تحقیقی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے ۱۷۷۴ء بمطابق ۱۱۶۰ھ اور سال وفات ۱۲۴۰ھ متعین کیاہے۔ مصحفی کی زندگی کے ذاتی حالات اور شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان معاشرتی اور معاشی محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر اثرانداز ہوتے رہے۔ مصحفی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان نفسیاتی عوامل کی توجیہہ بھی پیش کی گئی ہے جو ان کے فن پر اثرانداز ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے غلام ہمدانی مصحفی کی تصانیف اور لسانی تجزئیے کے لئے ایک الگ باب، باب پنجم مختص کیاہے جبکہ اس سے پہلے تصنیف کی گئی تواریخ میں یہ رحجان نظرنہیں آتا۔ ہر شاعر کے متعلق ضروری معلومات اور ادبی کارناموں کو ایک ہی باب میں جگہ دی گئی ہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے مصحفی ؔکے تذکروں، دواوین اور ان کی غیرمطبوعہ تصنیف 'مجمع الفوائد' کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔

چھٹا باب سعادت ر یارخان رنگین کے حالات، سیرت و شخصیت کے بیان اور تصانیف کے لئے مختص ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اپنی روائتی تحقیقی طریقہء کارکے مطابق دستیاب شواہد اور واقعات کے تجزئیے سے رنگین کا سال پیدائش ۱۷۵۷/۱۱۷۰ء متعین کیاہے جبکہ سال وفات ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ ء قرار دیا ہے۔رنگین کی شخصیت کے بیان مین بھی حسبِ سابق ان کے ذاتی حالات و واقعات کے ساتھ ان کے عہد کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے اور ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رنگین کی تصانیف مرتب کرتے ہوئے انہیں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رنگین کی فہرست تصانیف مرتب کرنا قدرے دشوار کام اس لئے ہے کہ وہ قوت ایجا دواختراع سے نئے نئے کام کرتے رہتے ہیں مثلاً جب رنگین کے چار دیوان تیار ہوگئے تو ان کا مجموعی نام''چہاررنگین''رکھ دیا۔ جب پانچواں دیوان، حدیقۂ رنگین (فارسی)

تیار ہواتوان پانچوں کانام ’’خمسۂ رنگین‘‘ رکھ دیا۔ جب تین اور تصانیف تیارہوئیں تو اس مجموعے کا نام ’’ہشت بہشت رنگین ‘‘ رکھ دیا۔ کچھ عرصے بعد جب ایک اور کتاب تیار ہوئی تو اس مجموعے کانام ’’نورتن رنگین ‘‘ رکھ دیا۔ پھران تصانیف کے سنین اور ’’نورتن رنگین ‘‘ میں شامل تصانیف میں ردّو بدل کرکے مزید الجھن پیداکردی‘‘۔ (جلد سوم،ص۲۸۹)

رنگین کے کلام کے فکری و فنی عناصر کے تجزیاتی مطالیعے کے بعد ان کی ایجادکردہ صنف ریختی کے حوالے سے رنگین کی قوتِ اختراع اور صنف ریختی کے حوالے سے رنگین کے عہد کی تہذیبی صورتحال کا جائزہ پیش کیاگیاہے۔ رنگین کے با ب میں ڈاکٹرجالبی نے تاریخ دھند لکوں سے رنگین کے حوالے سے ان غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش بھی کی ہے جن کی بنیاد پر اردو ادب کے ناقدین بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری’’مردود‘‘ قراردیاگیا۔ رنگین کی تصانیفِ نظم و نثر، کے تفصیلی تجزیاتی مطالعے کے بعد ڈاکٹرجالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ’’شاعری میں جتنے تجزئیے، جتنی طرزیں، جتنے اصناف سخن اور ہئیت کے جتنے تجزئیے رنگین نے کئے ہیں شایدہی کوئی دوسراان کی ہم سری کرسکے ‘‘۔ (جلد سوم،ص۳۲۲)

دیگر مؤرخین جہاں یہ کہہ کر ’’اس دیوان میں اکثر اشعارفحش ہیں۔ رنگین کو اشعار کہنے کا بڑا شوق تھا اور جنسیات سے بڑی دلچسپی تھی‘‘۔(۹۶) بری الذّمہ ہوجاتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی،رنگین کے مزاج، عہد اور تہذیبی صورتحال کے حوالے سے ان عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جن کی بنیاد رنگین کی اس قسم کی شاعری کو معاشرے میں پذیرائی ملی۔

فصلِ اوّل میں ’’چند دوسرے شعراء ‘‘، ’’روایت کی تکرار‘‘ کے عنوان کے تحت جوچار ابواب شامل کئے گئے ہیں ان میں پہلا باب ثناء اللہ فراق کے متعلق ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے مختلف تذکروں اور تاریخی حوالوں سے ان کا سالِ ولادت ۱۱۶۷ھ متعین کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے فراق کے عہد اور ذاتی حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے دیگر شعراء کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ روایت کی تکرار کے حوالے سے دوسرا اہم شاعر ’’شیخ ولی اللہ محب‘‘ کو قرار دیاگیاہے۔ شیخ ولی اللہ محب کے تاریخ ولادت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے کوئی رائے نہیں دی البتہ ان کی تاریخ وفات مصحفی اور کریم الدین کے حوالے سے (۹۳۔۱۷۹۲ء) درج کی ہے۔ محب اللہ کے حوالے سے اہم واقعات کے بیان کے بعد ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے انہیں روایت کی تکرار کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ روایت کی تکرار کے تسلسل کے حوالے سے تیسرے باب

میں ’’شہزادہ‘‘ سلیمان شکوہ ’’حالات اور شاعری‘‘ کی تجزیہ کیاگیاہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی تاریخ ادب میں کوئی انفرادی حیثیت تو متعین نہیں کی جاسکتی البتہ ڈاکٹرجالبی انہیں ان کی ادب پروری اور شعرگوئی کی صلاحیت کی بنیاد پر تاریخِ ادب میں جگہ دی ہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی شاعری اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم اس عہد کے ادبی احجانات اور معرکوں سے بھی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔ روایت کی تکرار کے ضمن میں چوتھے باب میں ’’میرزامحمد تقی ہوس :حالات و مطالعۂ شاعری ‘‘ کے عنوان کے تحت تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ معاصرانہ شہادتوں اور تذکروں کی مدد سے ان کا سال پیدائش ۱۱۸۰ھ جبکہ سال وفات ۱۲۵۱ھ متعین کیاگیاہے۔ ہوس ؔکے دیوانِ اردو اور مثنویوں کا فکری اور فنی مطالعہ کے بعد انہیں بھی اپنے بھی عہد کی روایت کی تکرار کے شاعر قرار دیا گیا ہے۔

فصلِ اوّل کے تیسرے حصے میں ’’روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز ‘‘ کے عنوان کے تحت بھی چارابواب شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں طالب علی خان عیشی ’’حالات ورنگ شاعری‘‘ کے عنوان سے ہے۔ عیشی کی تاریخ ادب میں اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی جالبی رقم طراز ہیں:

> ’’عیشی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ مصحفی نے انہیں ’’استادِ دقت ‘‘ لکھا ہے۔ عیشی کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے ناسخ کے رنگِ سخن و زبان کو قبول کرکے نہ صرف خود اس رنگ میں شاعری کی بلکہ اس رنگ کو مقبول بنانے میں پیش پیش رہے۔ اب تک جرأت وانشاء کے رنگ شاعری مقبول تھے لیکن ناسخ، آتش اور عیشی کے زیر اثر ’’معنی بندی‘‘ کا رحجان مقبول ہونے لگا‘‘۔(جلد سوم،ص۳۷۱)

تبدیلی کے آغاز کے حوالے سے دوسرے اہم شاعر ’’رائے جسونت سنگھ پروانہ‘‘ ہیں۔ دوسرے باب میں پروانہ کے حالات زندگی، تصانیف کا جائزہ لیاگیاہے۔ تیسرے باب میں قاضی محمد صادق خان اختر کے حالات زندگی، تصانیف اور شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیاہے اور ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو اردو زبان و ادب میں موضوعات اور اندازِ بیان کے لحاظ سے تبدیلی کے آغاز کا باعث بنے۔ تبدیلی کے آغاز کے حوالے سے چوتھے شاعر ’’مہدی علی خان زکی مراد آبادی ‘‘ کے حالات و شاعری کا تجزیہ چوتھے باب میں کیاگیاہے۔ زکی کے کلام میں مصحفی اور ناسخ کے اثرات کی نشاندہی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ زکی کی شاعری کو اپنے دور کے حالات و واقعات اور سانحات کی آئینہ دارقراردیتے ہیں لیکن ان کے کلام میں آفاقیت کے وہ عناصر موجود نہیں جو انہیں

انفرادی شاعر کے طور پر تاریخ ادب میں جگہ دلوائے۔ پہلی فصل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے روایت کی تکرار اور نئی روایت کے آغاز کے سلسلے میں دوسرے درجے کے جن شعراء کے کلام اور حالات زندگی کو محفوظ کیاہے وہ اس حوالے سے ایک اہم کاوش ہے کہ ان سے پہلے عموماً تاریخوں میں دوسرے درجے کے شعراء کے کلام پر اس طرح تنقیدی نظرنہیں ڈالی گئی۔

فصل دوّم پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ 150صفحات پر مشتمل اس فصل میں ڈاکٹرجالبی نے فورٹ ولیم کی ابتداء، اغراض و مقاصد اور اس سے وابستہ اہل قلم کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے باب ’’فورٹ ولیم کالج‘‘، ’’مقاصدتعارف‘‘ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے فورٹ ولیم کالج کی ابتداء اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کرنے کے بعد فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ڈاکٹرجالبی اس غلط فہمی کو بھی ردّکرتے ہیں جس کے مطابق اردو نثر کو سادہ طرز ادادینے میں فورٹ ولیم کالج کو اوّلیت حاصل ہے۔ اٹھارہویں صدی سے اس قسم کی مثالیں پیش کی گئیں ہیں جن سے پتہ چلتاہے کہ اردو نثر میں سادہ نویسی کاآغاز فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے ہوچکاتھا۔ دوسرے باب کا عنوان ’’جون گل کرسٹ تعارف، علمی و تاریخی خدمات ‘‘ ہے۔ گل کرسٹ کی برصغیر میں آمد اور کالج کے قیام کے حوالے سے اس کی کوششوں کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی تصنیفات کا جائزہ لیاہے۔ گل کرسٹ کی اردو زبان و ادب کے حوالے سے کوششوں کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :’’تصنیف، تالیف، ترجمہ، طباعت، املا ء وغیرہ میں جدید تقاضوں کو شامل کرکے اس نے اردو زبان کو دورِ جدید کے دائرے میں لاکھڑاکیا۔ یہ وہ خدمات ہیں جن کے لئے ہماری تاریخ ہمیشہ اسے یاد رکھے گی ‘‘۔ (جلد سوم،ص۴۲۱)

تیسرے باب میں میر امن کے حالات اور تصانیف کاجائزہ لیاگیاہے۔ میرامن کے حالاتِ زندگی باغ وبہار اور گنجِ خوبی کے حوالے سے بیان کےئے گئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے باغ، بہار کے قصے، نثر اور زبان کا تجزیاتی مطالعہ بھی نہایت عمدگی سے پیش کیاہے۔ چوتھے باب میں شیر علی افسوس کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف ’باغ اردو‘ اور ’آرائش محفل‘ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔ پانچویں باب میں حیدر بخش حیدری کے حالات زندگی کے جائزے کے بعد ان تصانیف، آرائشِ محفل، توتا کہانی، گلزار دانش، گل مغفرت، قصہ لیلیٰ مجنوں، قصہ مہروماہ، گل دستۂحیدری، جامع القوانین، ہفت پیکر،تاریخِ نادری اور ’دیوان حیدری ‘کاجائز ہ لیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے شعبۂہندوستانی میں جتنا تالیفی کام حیدری نے کیا ہے کسی دوسرے منشی نے نہیں کیا۔ ڈاکٹرجالبی نے حیدری کی مطبوعہ اور غیرمطبوعہ کتب کی تفصیل فراہم کی ہے اور اپنے مآخذات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اردو زبان میں پہلی دفعہ لفظ’ طوطا‘ کو ’ت‘ سے لکھنے کی روایت کاآغاز بھی حیدری نے

کیاجس کی وجہ بقول جالبی حیدری نے یہ بتائی ہے کہ ’’ہندی میں حرف طوئے نہیں ہے اور اس س احقرنے ’’طوطی نامہ‘‘ فارسی کوزبانِ ریختہ میں لکھا اس واسطے طوطی کو ’’طوئے ‘‘ کی بجائے ’’ت‘‘ سے بدل کیا‘‘۔(جلد سوم،ص۴۶۷)

حیدر ی کی ’’توتاکہانی ‘‘ کی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی حیدری کی نثر کو میرامن اور افسوس کی نثر سے سادہ اور آج کی نثر کے قریب قرار دیتے ہیں اور اپنے دعوے کو تقویت پہنچانے کے لئے تینوں مصنفین کی نثر سے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

چھٹے باب میں نہال چند لاہور ی کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف ’’مذہبِ عشق‘‘ کے قصے اور زبان کا تجزیہ پیش کیاہے۔ ساتویں باب میں ’’مہربہادرعلی حسینی کے حالات زندگی اور تصنیفات کا جائزہ لیاگیاہے۔ مہربہادر علی حسینی کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے نے ان کی ولدیت کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی اور سید محمد کی غلط معلومات کی درستگی فرماتے ہوئے سید عبداللہ کو میربہادر علی حسین کا بیٹا قراردیتے ہیں اور یہ کہ سید عبداللہ نے ہی شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کے ناشر ہیں اور یہ ترجمہ کلکتہ سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا۔ میربہادر علی حسینی کی پہلی تصنیف’ نثربے نظیر ‘ہے جسے انہیں دوطرح سے لکھا۔ پہلا روپ مخطوطے کی صورت میں ہے۔،جسے’ عام کی بولی میں‘ اور دوسرے روپ کو ’موافق محاورۂ خاص‘‘میں لکھا گیا۔ نثرِ بے نظیر کے علاوہ حسینی کی جن دیگر تصانیف کی نثر کا ڈاکٹر جمیل جالبی نے تجزیہ کیاہے ان میں اخلاقِ ہندی، نقلیات اور تاریخ آسام شامل ہیں۔ نثر بے نظیرروپ اول کی مانند تاریخ آشام بھی مسودے کی شکل میں محفوظ ہے اور آج تک شائع نہیں ہوسکی۔

آٹھویں باب میں مظہر علی ولاکے حالات زندگی کے بیان کے ساتھ ان کی تصانیف مادھونل اور کام کنڈلا، بتیال پچیسی، ہفت گلشن، لطائف و ظرائف،تاریخِ شیرشاہی، تاریخِ جہانگیر شاہی، پند نامہ اور دیوانِ ولاؔ شامل ہیں۔ ان تمام تصانیف کے مشمولاتِ متن کے علاوہ ولاؔ کی شاعری اور نثر کی زبان کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیاگیاہے۔ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام کتب چونکہ زیادہ تر تراجم کی صورت میں سامنے آئیں لہذا ان تصانیف کا ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمہ نویسی کے اصول و ضوابط اور طریقۂ کار سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی ساتھ ساتھ کیا ہے۔ نویں باب میں کاظم علی جواں کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی کتب شکنتلا، سنگھا سن بتیسی، ترجمۂ قرآن مجید (اس کام میں معاونت کے لئے دیگرمترجمین بھی شامل تھے) تاریخ بہمنی شامل ہیں۔ شکنتلا اور سنگھاسن بتیسی میں ہندوی الفاظ کے کثیرکا استعمال کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کی رائے ہے کہ :’’ان دونوں قصوں پر ہندوکلچر و تہذیب کی گہری چھاپ ہے۔ اس کے سب کردار پنڈت اور ہندو راجا

مہاراجا ہیں اس لئے یہ سب الفاظ فطری انداز سے موقع محل کے مطابق عبارت میں آتے ہیں اور اچھے لگتے ہیں ‘‘۔(جلد سوم،ص۵۲۸)

دسویں باب میں حفیظ الدین احمد کے حالات اور تصانیف کامطالعہ شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حفیظ الدین احمد کی’ خردافروز ‘(جوکہ فارسی کی کتاب عیارِ دانش کا ترجمہ ہے) کو باغ و بہار اور آرائش محفل کی مانند اردو ادب کی اہم کتاب قرار دیا ہے۔ گیارہویں باب میں خلیل علی خاں اشک کے حالات زندگی اور تصانیف کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کے دور میں اشک نے چھ کتابیں ترجمہ و تصنیف کیں جن میں دوکتب نگار خانہء چین ‘‘ اور ’’کائنات جو‘‘ کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دریافت کرکے مرتب و شائع کیا۔ ’’داستان امیر حمزہ‘‘ اشک کی پہلی تالیف ہے جسے اردو کی پہلی داستان ہونے کا اعزاز حاصل ہے اس سے پہلے قصہ چہا درویش، آرائش محفل، مذہب عشق وغیرہ کو قصہ گوئی کی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اسے بول چال کی سادہ و سہل زبان قرار دیتے ہیں۔اشک کی تصنیف رسالہ ’’کائنات جو‘‘کو ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان کی پہلی سائنسی تصنیف قرار دیتے ہیں اس کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے جالبی لکھتے ہیں:

> ’’اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر میں اتنی قوت وصلاحیت ہے کہ وہ قصہ کہانیوں کے علاوہ سائنسی، تاریخی موضوعات کے لئے بھی آسانی سے استعمال ہو سکتی ہے۔ اصطلاحات کے علاوہ اسکی عبارت بھی بول چال کی کی زبا ن سے زیادہ قریب ہے‘‘۔(جلد سوم،ص۵۴۴)

’نگار خانۂ چین ‘اشک کی طبع زاد تصنیف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے قصے اور زبان کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد زبا ن کے بدلتے املا ء قواعد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خلیل علی خان اشک کی جن دیگر تصانیف کا تعارف پیش کیاگیاہے ان میں ’’انتخاب سلطانیہ، کتاب واقعاتِ اکبر، اور منتخب الفوائد ‘‘ شامل ہیں۔

بارھویں باب میں مولوی اکرام علی کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے رسالے’’ اخوان الصفا ‘‘ (جوکہ عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیاگیاہے) کا تجزیہ شامل ہے۔ تیرھویں باب میں بینی نراین جہاں کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد ان کی تصانیف چار گلشن، دیوانِ جہاں، نوبہار، تفریح طبع، باغِ عشق اور تنبیہتہ الغافلین کاتعارف اور مشمولاتِ متن کا تجزیہ شامل ہے۔ چودھویں باب میں مرزا علی لطف کے حالات زندگی کے بعد ان کی تصانیف، دیوان لطف، گلشن ہند

(تذکرہ)شامل ہیں۔ دیوانِ لطف (جوکہ شائع نہ ہوسکا) کے مختلف نسخوں کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اہم معلومات درج کی ہیں۔ گلشنِ ہند کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیقی بنیاد پر دعویٰ کرتے ہیں کہ مرزا علی لطف نے اس کی دو جلدیں تیارکرنے کا دعویٰ کیاہے لیکن اس کی دوسری جلد تیار کرنے کی نوبت ہی نہیں ہے۔

''گلشن ہند'' گلزارِ ابراہیم ہی کی بنیاد پر تحریر کیاگیا لیکن لطف نے اس میں بعض نئی باتیں شامل کرکے اسے نئی صورت دے دی ہے۔ لہٰذا یہ تذکرہ اپنا الگ وجودرکھتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اس معلومات کااندراج بھی کیاہے جوکہ ''گلشن ہند'' میں ملتی ہے لیکن ''گلزار ابراہیم '' میں نہیں ملتی۔ پندرھویں باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فورٹ ولیم کالج کی چند غیر مطبوعہ تالیفات و تراجم کا جائزہ پیش کیاہے اور ۱۳، ایسی تصانیف کا تعارف پیش کیاجو اب تک مسوّدوں کی صورت میں موجود ہیں۔فصلِ دوم میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عرق ریزی فورٹ ولیم کالج کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر فورات ولیم کالج کے تحت ہونے والے تراجم اور دیگر تخلیقات کے اثرات کا تجزیہ بھی پیش کیاہے۔ بہت سی ایسی کتب کے بارے میں بارے میں معلومات فراہم کی گئیں ہیں جو عام قارئین کے پہلے دستیاب نہیں تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کی غیر مطبوعہ تصانیف کا اشاریہ مرتب کرکے ڈاکٹر جمیل جالبی نے نئے محققین کے لئے راہیں بھی کھولیں ہیں کہ اصولِ تدوین کی روشنی میں ان قدیم نسخوں کو شائع کر کے اردو کے قدیم ادبی سرمائے کو محفوظ بھی بنایا جاسکتاہے۔ اردو ادب میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو پروفیسر وقارعظیم ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

> ''اردو میں پہلی مرتبہ ایک وسیع پیمانے پر ایک منظم اور باضابطہ انداز میں تصنیف و تالیف کے مقابلے میں ترجمے کی اہمیت واضح ہوئی اور ترجموں کی اس منظم مساعی نے اردو نثر میں ترجمے کی ایسی روایت کا آغاز کیا، جس سے آگے آنے والوں نے اپنی شمعیں روشن کیں۔ اردو نثر کی تاریخ میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی جتنی تحریکیں انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں شروع کی گئیں ان سب کی زندگی میں فورٹ ولیم کالج کی اس روایت کی دھڑکن سنائی دیتی ہیں '۔ (۹۷)

فورٹ ولیم کالج کی انہی خدمات اور تاریخِ ادبِ اردو میں اہمیت کے باعث ڈاکٹر جمیل جالبی نے پوری ایک فصل اس کے لئے مختص کی اور فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا کماحقہ تذکرہ رقم کیا۔

تاریخِ ادبِ اردو کی فصل سوّم کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں نوطرزِ مرصع اور'' فسانۂ عجائب کی درمیانی کڑیاں '' کے عنوان سے تین ابواب شامل ہے جبکہ دوسرے حصے میں ''نثرِ رنگین کا نقطہ عروج'' کے عنوان کے تحت تین ابواب شامل ہیں۔ فصل کی تمہید میں' نوطرزِ مرصّع اور فسانۂ عجائب کی درمیانی کڑیاں 'کے عنوان کے تحت' گلشن نوبہار کی' اردو ادب میں شاعر انہ نثر کے حوالے سے اہمیت اجاگر کرتے ہوئے اسے نو طرزِ مرّ مع اور فسانہ عجائب کی درمیانی کڑی قرار دیاہے۔ پہلے باب میں محمد بخش مہجور کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف 'گلشن نوبہار' اور 'نور تن 'کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔ گلشنِ نوبہار کے قصے کا تجزیہ کرتے ہوئے فسانہ عجائب اور گلشن نوبہار کے قصے کے درمیان مماثلت کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''فسانہ عجائب تحریرکرتے ہوئے سرور کے سامنے گلشن نوبہار موجود تھی اور وہ نہ صرف اس سے بڑھ کر قصہ بیان کرناچاہتے تھے بلکہ نو طرزِ مرصع سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔۔۔۔یہ مماثلت اتنی گہری ہے کہ صرف ڈھانچا اور ہتیت ہی میں نظر نہیں بلکہ کہانی کا رنگ ڈھنگ بھی' گلشن نوبہا'ر جیساہے ''۔ (جلد سوم،ص۵۸۹)

دوسرے باب میں عظمت اللہ نیاز دہلوی کے مختصر حالاتِ زندگی رقم کئے ہیں۔ عظمت اللہ نیاز دہلوی کی داستان ''قصۂ رنگین '' گفتار (جوکہ اب تک غیرمطبوعہ ہے) کے مختلف قلمی نسخوں کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ڈاکٹرجالبی اردو نثر کے ارتقاء میں 'قصۂ رنگین گفتار کو' تاریخی اہمیت کی حامل داستان قرار دیتے ہیں۔ داستان کے قصے اور زبان کا تجزیہ نہایت عمدگی سے پیش کیاگیاہے۔ تیسرے باب میں غلام علی عشرت کی داستان'سحرالبیان'کا تجزیہ کیاگیاہے۔ باب کے شروع میں ڈاکٹرجالبی نے وضاحت فرمائی ہے کہ اگرچہ جلد دوّم میں عشرت کا ذکر آچکاہے لیکن چونکہ داستان' سحرالبیان' کے کسی نسخے تک ان کی رسائی نہیں تھی لہذا اس کا ذکر پہلے نہیں جاسکا لہذا اپنے دورمیں اردو نثر کے ارتقاء میں اس داستان کو نظر انداز نہیں کیاجاسکتا لہذا اپنے دور میں اردو نثر کے ارتقاء میں اس داستان کو نظرانداز نہیں کیاجاسکتا لہذا اسے جلد سوّم کا حصہ بنایا گیاہے۔ عشرت کی سوانح اور تصانیف کے ذکرکے بعد داستان سحرالبیان کے قصے اور زبان کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ فصل کے دوسرے حصے میں ''نثرِرنگین کانقطۂعروج'' کے تحت پہلے مرزارجب علی بیگ سرور کے حالات زندگی، شخصیت اور تصانیف کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ سرور ؔ سفرِ کان پور کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی اسے فکرِ معاش کے سلسلے کی ہجرت قراردیتے ہیں جبکہ ڈاکٹرتبسم

کے مطابق؛ ’’کانپور جانے کی وجہ ایک قتل کا مقدمہ تھا جس میں وہ ملوث تھے۔ ممکن ہے سرور نے اس مقدمے کے خوف اور سزاکی دہشت سے ڈرکر کانپور میں پناہ لے لی ہو‘‘۔ (۹۸) کانپور میں قیام کے دوران ان پر طاری ہونے والی ’’ماضی پرستی‘‘ اور جنون کی کیفیت سے فرار کے لئے ’’فسانۂعجائب‘‘ کی تخلیق کی طرف بھی ڈاکٹرتبسم کاشمیری نے توجہ دلائی ہے جبکہ ڈاکٹرجالبی ’’فسانہ عجائب‘‘ کی تخلیق کے محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسے کسی امر کی طرف توجہ مبذول نہیں کرواتے۔ ’’فسانہ عجائب‘‘ کے سنِ تصنیف کے تعین لئے ڈاکٹرجالبی نے حسب معمول داخلی شواہد سے مدد ملی ہے اور ۱۲۴۰ھ کو سال تصنیف قراردیتے ہیں۔ تصنیف کے انیس سال بعد جولائی 1843ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ ڈاکٹرجالبی نے ’ فسانۂعجائب‘ کے مختلف نسخوں کے حوالے سے بھی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ان تہذیبی اور معاشرتی عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کا عکس اس داستان میں جابجا نظر آتاہے۔ اس داستان کے تخلیقی محرکات میں بھی ڈاکٹرجالبی اس عہد کے عا م رویوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فسانہ عجائب پر دیگر قصوں کے اثرات کی نشاندہی کے باوجود ڈاکٹرجالبی اسے طبع زاد داستان قراردیتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> ’’اصل بات یہ ہے کہ مصنف نے ان قصوں کو کس طرح ایک دوسرے سے مربوط کرکے کہانی کو فطری تسلسل دیا ہے اوردلچسپی و حسن میں اضافہ کیاہے۔ ان سارے اثرات کے باوجود سرور نے جس طرح اس قصے کو بیان کیااور مختلف نقطۂ عروج(climax) سے پڑھنے یا سننے والے کی دلچسپی کو شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے، یہ سب کچھ سرورکا اپنا ہے ‘‘۔ (جلدسوم،ص۶۲۷) جبکہ ڈاکٹر سہیل بخاری کی رائے میں :’’فسانہ عجائب‘‘ طبع زاد افسانہ نہیں ہے بلکہ ’’بہارِدانش‘‘ کا مکمل چربہ ہے۔ اس کا صرف ایک واقعہ ’’پدماوت‘‘ سے لیاگیاہے ورنہ مکمل پلاٹ ’’بہادردانش‘‘ کاہے‘‘۔(۹۹)

فسانہ عجائب کے کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ بہت عمدگی سے کیاہے۔ فسانہ عجائب کے دوپہلووؤں تہذیب و معاشرت اور اسلوب بیان کاتجزیہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے سرور کی نثر کی خصوصیات پربھی روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ’’فخرالدین حسین سخن دہلوی:سروشِ سخن‘‘ ہے۔ سخن کے سالِ ولادت کے سلسلے میں ایک واقعے کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے ۱۸۳۷ء کو سالِ ولادت متعین کیا گیا ہےڈاکٹر جمیل جالبی نے سخن کے حالاتِ زندگی ترتیب دیتے ہوئے سخن اور صغیر بلگرامی کے

درمیان تعلقات کے اتارچڑھاؤ پربھی روشنی ڈالی ہے۔ تاریخی شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹرجالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ سروش نے ’’سروشِ سخن‘‘ ’’فسانہ عجائب‘‘ کے جواب میں لکھی لیکن دونوں قصوں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ سروشِ سخن، کو بھی ڈاکٹرجالبی نے اپنی تہذیب کی نمائندہ قراردیا ہے اور ’’سروشِ سخن‘‘ میں دہلوی اور لکھنوی رنگوں کے امتزاج کی بھی نشاندہی کی ہے جس کے نتیجے میں اسلوب بیان کا ایک نیا روپ ہمارے سامنے آیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ’سروشِ سخن‘ میں ان صنعتوں کی بھی نشاندہی فرمائی ہے جوعموماً شاعری میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً نثرِعاطلہ (مہملہ اور غیرمنقوطہ) ’’صفتِ منقطع الحروف‘‘ اور نثرِمنقوطہ وغیرہ۔ تیسرے باب میں ’’جعفرعلی شیون‘‘ کے حالات زندگی اور ’’طلسمِ حیرت‘‘ کاتجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے اور طلسمِ حیرت کو بے اسلوب اور غیر فطری خصوصیت (ضلع جگت) کی حامل ہونے کے باوجود داستانوں کے سلسلے سے آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔

فصلِ سوّم کل اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ فصل سوّم کو ڈاکٹرجالبی نے مختلف عنوانات کے تحت چار حصوں میں تقسیم کیاہے۔ ہرحصہ متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلاحصہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس حصے کا عنوان ’’ناسخ و آتش کا دور:سادہ گوئی کے خلاف رد عمل طرز جدید وتازہ گوئی کا رواج ‘‘ہے۔ پہلا باب تمہیدی باب ہے جس میں ناسخ وآتش کے دور کے تہذیبی، سیاسی، معاشی حالات کاتجزیہ کرتے ہوئے ان محرکات کی نشاندہی کی ہے جوادبی افق پر تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس دور کے اہم شعراء ان کے ادبی رحجانات، اختراعات اور اصنافِ سخن پرجامع تبصرہ پیش کیاہے۔ ان شعراء اور ادبی رحجانات کاتجزیہ ہرشاعر کے حوالے سے الگ الگ باب میں تفصیلی طور پر آنے والے ابواب میں کیاگیاہے۔ طرز جدید اور تازہ گوئی کی روایت کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی شیخ امام بخش ناسخ کو سب سے اہم شاعر اور ماہرِلسان قراردیتے ہیں۔

دوسرا باب ناسخ کے سوانحی حالات، اہم تصانیف اور ان تصانیف کے لسانی مطالعے کے لئے مختص ہے۔ ناسخ کی پیدائش کے سال کے تعین کے لئے مختلف تاریخی شواہد کے تجزئیے کے بعد ۱۱۸۵ھ کا سال اور ۱۲۵۴ھ کو سالِ وفات متعین کیاہے۔ ناسخ کے کلیات کی روشنی میں ڈاکٹرجالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے تقریباً تمام ذاتی و سیاسی واقعے پر قطعات تحریر کئے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ناسخ کی ایک مستند سوانح مرتب کی جاسکتی ہے۔ ناسخ کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے ان کی ذاتی زندگی اور ادبی معرکوں کے واقعات بھی رقم کئے ہیں جن سے ناسخ کی زندگی کا احوال مزید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ناسخ کی مطبوعہ اور غیرمطبوعہ تخلیقات کے متعلق اہم معلوما ت فراہم کی ہیں۔ ناسخ کے تینوں دواوین کے حوالے سے ان کی غزل

کامطالعہ کرتے ہوئے ’’طرزجدید اور طرزنو(غالب نے ناسخ کو اسی طرز کا موجد قراردیابقول جالبی) کی خصوصیات کا تعین کیاہے مثلاً جذبہ و احساس کے تجربے سے عاری شاعری، صنعتوں کے استعمال سے قیاس اور فرضی معنی کی حصول، معنی میں ابہام کا فروغ، لفظی مناسبات کا استعمال، بلند آہنگی، غزل میں ہر قسم کے الفاظ کا استعمال، صحتِ زبان کے حوالے سے سخت اصولی کی پابندی وغیرہ۔ ناسخ کی ان اختراعات کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

> ’’ناسخ نے جو طرزِ نو ایجاد کی اس نے لکھنو کی تہذیب و شاعری کو ایک انفرادیت اور امتیاز عطاکیا۔ ناسخ لکھنؤ کے پہلے شاعر تھے جس کا اثر دہلی تک پہنچا اور سارے ہندوستان میں مقبول و معروف ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کی جوخصوصیات اور مزاج ورنگ پیداہوئے اس کے خالق و بانی امام بخش ناسخ ہیں۔ ناسخ ؔکے رنگ سخن نے اردو غزل کو اظہار و اسالیب کی سطح پرایک ایسالسانی ڈھانچہ اور مضمون آفرینی کا وہ رحجان دیا کہ اس کے اثرات کا طوطی انیسویں صدی تک بولتارہا۔ ناسخ ؔ نے اردو غزل کے موضوعات کووسعت دی اور ان موضوعات میں دنیا جہاں کو شامل کرکے اردو غزل کو نیااعتماد دیا‘‘۔
> (جلد سوم،ص۷۰۸)

ناسخ ؔکی شاعری کے تجزئیے کے بعد ڈاکٹرجالبی نے ناسخ ؔکی اصلاح زبان کے حوالے سے کوششوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کیاہے۔ ناسخ ؔکی اصلاح زبان کی تحریک کے حوالے سے ان کے ترک و اختیار الفاظ کے سلسلے میں متعدد مثالیں بھی درج کی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ناسخ ؔکی اردو زبان و ادب کے حوالے سے ’’اوّلیات کا ذکرکرتے ہیں ان میں سے ایک طرزِ جدید کی ابتداء اور دوم پرانی ناہموار روش کے ناسخ کے طور پرـناسخؔ کی اصلاحِ زبان کے حوالے سے کوششوں کو تقریباً تمام محققین اور ناقدین سراہتے رہے ہیں لیکن ڈاکٹرتبسم کاشمیری اپنی تاریخ ادب میں رشید حسن خان کے اعتراضات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ’’رشید حسن خان نے ناسخ ؔکی اصلاح زبان کے ادبی کردار کو چیلنج کیاہے۔ ان کے دعویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ ناسخ نے سادہ گوئی کے مقابلے میں ایک نیا شعری اسلوب رائج ضرور کیاتھا جیسا کہ مصحفی ؔ کے حوالے ظاہر ہوتاہے مگر یہ بات ثبوت طلب ہے کہ ناسخ نے اسلوبیاتی تبدیلی کے علاوہ شعری زبان میں بھی تبدیلیاں کی تھیں اور

زبان کی تراش خراش کی تھی۔ تاریخ میں کسی بھی حوالے سے ناسخ کا اگرکوئی مقام متعین ہوسکتاہے تو اصلاحِ زبان کی خدمت ہی کا کردار ہے۔۔۔۔اصلاحِ زبان کا نظریہ ختم ہونے کے بعد تاریخ ادب میں غریب ناسخ کے ادبی کردار کی بالکل تنسیخ ہوجاتی ہے ''۔ (۱۰۰)

تیسرے باب میں خواجہ حیدر علی آتش کے حالات زندگی، تصانیف اور لسانی خصوصیات کا تجزیہ شامل ہے۔ آتش کے سال پیدائش کے تعین کے سلسلے میں تاریخی شواہد کے تجزئیے اور قیاس کا سہارا لیتے ہوئے ۱۷۷۸ء کو سالِ ولادت قراردیا گیا ہے۔ آتش کی شخصیت کی تصویر کشی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے آتش کے دیوان اور کلیات کے حوالے سے بھی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس تصوّر (جوکہ بقول جالبی، مولانا آزاد حسین کی اختراع تھا) کی بھی نفی کرتے ہیں کہ ناسخ و آتش کے درمیان معرکہ آرائی زوروں پررہی تھی۔ شواہد سے اپنے دعوے کے ثبوت بھی فراہم کئے ہیں۔ آتش کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے ہیں اور ان کی شاعری کے اہم موضوعات اور فنی خوبیوں کی نشاندہی اور مثالیں پیش کرکے کی ہے۔ آتش اگرچہ ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک میں شامل تھے لیکن اپنے کلام میں انہوں نے ضرورت کے مطابق ہندی الاصل استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی تراکیب کو بھی عمدگی سے استعمال کیا۔ آتش کے کلام کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ :''آتش اردو زبان کے وجود کو دوسری زبانوں سے الگ تسلیم کرتے تھے اور اس کے مزاج اور لفظوں کے چلن کے مطابق لفظ،روزمرہ اور محاورہ استعمال کرتے تھے''۔(جلد سوم،ص۷۴۴)

فصلِ چہارم کے اگلے حصّے میں طرزِ جدید کی تکرار و توسیع کے حوالے سے دس ابواب شامل ہیں۔ سب سے پہلے جس شاعرکی سوانح اور کلام کاتجزیاتی مطالعہ شامل ہے وہ علی اوسط رشک ہے۔ باب کی ابتداء میں ڈاکٹرجالبی نے حسب معمول داخلی شواہد اور تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر رشک کے سال پیدائش اور سال وفات کا تعین کیاہے۔ رشکؔ کی شخصیت اور حالات زندگی کے بیان کے بعد ان کی تصانیف کا تجزیہ کیاگیاہے۔ رشکؔ نے وہ الفاظ درج کئے ہیں جو ان کی شاعری میں ملتے ہیں یا جنہیں شاعری میں استعمال کیا جاناچاہئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے رشکؔ کی شاعری کے مطالعے میں رشکؔ پر ناسخ کے اثرات کے ساتھ ساتھ ان انفرادی رنگوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو رشکؔ کو اپنے عہد کا اہم شاعر بناتے ہیں۔ دوسرے باب میں فتح الدّولہ مرزا محمد رضابرق کے حالاتِ زندگی اور شاعری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ برق کے سال ولادت کے سلسلے دستیاب

شہادتوں کی بنیاد پر قیاس کا سہارا لیتے ہوئے ۱۲۰۰ھ کوسالِ ولادت قرار دیاہے۔ تذکروں اورواجدعلی شاہ کے قطعے کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کو سالِ وفات قراردیا گیا ہے اور آغاحجو شرف، مولوی عبدالحئی کے حوالے سے درج کئے گئے سالِ وفات کو غلط قراردیتے ہیں۔ برق کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی تصانیف کے متعلق اہم معلومات فراہم کرتے ہوئے ''غزل'' کو برق کے فن کے حوالے سے سب سے اہم صنف قرار دیتے ہیں۔ برق کی شاعری پربھی ناسخ کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسراباب امداد علی بحر کے حالات زندگی اور مطالعۂ شاعری پر مشتمل ہے۔ مختلف حوالوں کے ذریعے بحر کے کلام کے حوالے سے معلومات درج کی ہیں۔ بحر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی بحر کو اس لحاظ سے اہم شاعر قراردیا ہے کہ ان کی شاعری سے نیارحجان سامنے آیا۔ جس کے تحت بول چال کی زبان اور ہندی الاصل اردو الفاظ کو استعمال کیا جارہا تھا۔ ''بحرالبیان'' بحرکی اردو زبان و قواعد کے موضوع پر لکھی گئی اہم تصنیف ہے۔ ناسخ کی تحریک کوسمجھنے کے لئے بھی ''بحرالبیان'' ایک اہم تصنیف ہے۔

چوتھے باب میں خواجہ محمد وزیر، وزیرلکھنؤی کے حالات زندگی اور مطالعہ شاعری کو پیش کیاگیاہے۔ خواجہ وزیر کے دیوان کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں کہ کس طرح ان کاکلام ضائع ہوگیاتھا اور ان کے شاگردوں نے دوبارہ ان کے کلام کویکجاکیا۔ وزیر لکھنؤی نے بھی ناسخ کے رنگ کی پیروی کی وزیرلکھنؤی کی اہمیت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ترجمان تھے۔ پانچویں باب میں فقیرمحمد خان گویاؔ کے حالات اور نظم و نثر کے تجزئیے کو شامل کیاگیاہے۔ گویاؔ اپنے عہد کی ایک معروف سیاسی شخصیت تھے لہٰذا ان کے حالات کے بیان میں اسی تناظر کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو آشکار کرنے کے لئے ان کی زندگی کے اہم واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتاہے کہ وہ ایک ذہین، شجاع اور دلیر انسان تھے۔ گویاؔ بھی ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے بھی انہی امور کی نشاندہی کی گئی ہے جو شاگرد انِ ناسخ سے منسوب ہیں۔ بطور نثرنگار گویاؔ کی ایک اہم تصنیف ''بستانِ حکمت'' ہے جوفارسی کی مشہور تصنیف ''انورسہیلی'' کا اردو روپ ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اس ضمن میں ''انورسہیلی '' کے حوالے سے بھی مفید معلومات بہم پہنچائیں ہیں۔ 'انوارسہیلی' کا ترجمہ کرتے ہیں گویاؔ نے جواختراعات کیں ہیں، ڈاکٹرجالبی نے ان کی بھی نشاندہی فرمائی ہے۔ گویا نے 'انورسہیلی ' کے قصے میں تو کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن اندازِ بیان سے اس طرح اسے روا ں اور مؤثر بنایاہے کہ اردو نثر کے حوالے سے ''بستانِ حکمت'' تاریخی اہمیت حاصل کرلیتی ہے۔ روایتِ ناسخ کے ایک اور اہم شاعر کلب حسین خان نادرؔ کے لئے چھٹا باب مختص کیاگیاہے۔ نادرؔ کے حالات زندگی اور

شخصیت کے حوالے سے مختلف امور کی نشاندہی کرنے کے بعد گویا کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔

ڈاکٹرجالبی نے تاریخِ ادب میں شاگردان ناسخؔ میں سب سے زیاد ہ جگہ نادؔ ر کو دی ہے۔'تلخیصِ معلی' کو نادر کی اہم تصنیف قرار دیتے ہوئے اس کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ اصلاحِ زبان کی تحریک کا حصہ ہونے کے باعث نادر کی ''تلخیصِ معلی' اردو قواعد اور اپنے عہد کے لسانی مزاج کے حوالے سے اہم تصنیف ہے۔ ساتواں باب مرزاحاتم علی بیگ مہرؔ کے حالات زندگی، تصانیف اور مطالعۂشاعری کے لئے مختص ہے۔ مرزاحاتم کے حالات زندگی اور شخصیت کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ان کی دستیاب تصانیف جوکہ ۷ ہیں کا تعارف پیش کیاگیاہے۔ مہرؔ کے ضائع شدہ دیوان کے حوالے سے قرآئن کی روشنی میں اور مطبوعہ دیوان کے جائزے سے ناسخ کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں میرؔ کلوعرش کے حالات اور مطالعۂ شاعری کو پیش کیاگیاہے۔ ان کے تعارف میں لکھتے ہیں :''شاعر بے بدل محمد تقی میر نے دو شادیاں کیں ' پہلی بیوی سے میرفیض علی اور دوسری سے حسن عسکری عرف میر کلوعرش پیداہوئے میرکلوبڑے باپ کے چھوٹے بیٹے اور اپنے دور کے معروف شاعر تھے ''۔ (جلد سوم،ص۸۱۸) ڈاکٹر جمیل جالبی نے میرکلوعرش کی شخصیت کے حوالے سے دلچسپ انکشافات کئے ہیں اور ان کے کلام کو رنگِ ناسخ کا ترجمان قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :''میرکارنگ اس میں اصل یا نقل صورت میں بھی نظرنہیں آتا''۔(جلد سوم،ص۸۱۹) نویں باب میں عبدالغفور نساخ کے حالات زندگی اور نظم و نثر کا تجزیہ شامل ہے۔ نساخؔ کے سوانحی کوائف، تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی تصانیف کا تعارف و تجزیہ شامل ہے۔ نساخ کی نظم و نثر کی ۲۱تصانیف میں سے زبانِ ریختہ، سوانح عمری نساخ، سخنِ شعراء، تذکرۃ المعاصرین، انتخاب نقص پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ناسخ کی تصانیف کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

> ''بحیثیت مجموعی نساخ اس دور کی اہم شخصیت تھے۔ بنگال میں وہ آج بھی اردو شاعری کے'' بابا ''جانے جاتے ہیں۔ ان کے تذکروں سے بہت سے شعراء بنگال کے نام و نمونہ محفوظ ہوگئے------ان کی سوانح عمری نساخ (خودنوشت) اردو کی پہلی باقاعدہ خودنوشت ہے۔ پہلے دودواوین میں نساخ نے ناسخ کے ''طرزِ جدید'' کی پیروی ضرور کی ہے لیکن وہ ناسخ کے متروکات کے پوری طرح پیروی نہیں کر سکے،

اس لئے آخری دواوین میں شعرائے دہلی کے زیر اثر رہتے ہیں ''۔(جلد سوم،ص۸۴۸)

دسویں باب میں امانت لکھنؤی کے حالات زندگی اور تصانیف کو موضوع بنایاگیاہے۔ جالبی نے امانت کا سنہ ولادت ان کے بیٹے میرحسن لطافت کے بیان کی روشنی میں ۱۸۱۶ء متعین کیاہے۔ اس باب میں ڈاکٹرجالبی نے انتہائی دقت نظری سے اندر سبھا کے عہد، اس کی تکنیک، کہانی، کرداروں، اندرسبھا کی ڈرامے کے حوالے سے اولیّت کے متعلق دیگر محققین کے دعوؤں کا تفصیلی تجزیہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق'' اندر سبھا''سے پہلے لکھنؤ رہس اور جلسے کی روایت موجود تھی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی تہذیبی فضا''اندرسبھا'' جیسی تخلیق کے لئے انتہائی موزوں ماحول فراہم کرنے کی ذمہ دارتھی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی اندرسبھا کی تخلیق کے حوالے سے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اندرسبھا' کی تخلیق ہوامیں نہیں ہوئی۔ 'اندرسبھا' کے زمانۂ تخلیق کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زمانہ' اندرسبھا 'جیسی تخلیق کے لئے انتہائی سازگار تھا۔' اندرسبھا ' کی تخلیق کے لئے جس تہذیبی ماحول اور ادبی فضاکی ضرورت تھی وہ امانت کے دورمیں بہ درجۂ کمال موجود تھی۔ امانت کا کارنامہ اس تہذیبی ماحول سے حاصل ہونے والی تحریک اور اس دور کے عشقیہ سائیکی سے ایک نیا نقش تخلیق کرنا تھا ''۔(۱۰۱)

ڈاکٹرجالبی نے تحقیقی کاوش سے انتہائی دلچسپ انداز میں ان دعوؤں کا جواب دیاہے جن کی بنیاد پر ''اندرسبھا'' کو زمانی طور پر پہلا ناٹک قرار دینے کے حوالے سے مختلف ادوار میں مختلف محققین نے چیلنج کیا اور تحقیقی شواہد سے ثابت کیاہے کے واجد علی شاہ کے رہسوں کے بعد اردو کی پہلی تصنیف ہے،جسے عہدِ حاضر کے تعلق سے ڈراما کہاجاسکتاہے وہ ''اندرسبھا'' ہی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اردو ادب میں 'ڈرامے 'کی روایت کے حوالے سے بھی اندر سبھا کے اثرات کا جائزہ لیاہے۔ پروفیسر وقار عظیم اس بحث کے حوالے سے رقم طراز ہیں :''ہمارے ڈرامے کا سارا ادبی اور فنی تخیل اندر سبھا سے ماخوذ ہے 'اور اپنے ابتدائی دور میں ہمارے ڈرامے کی ساری روایت اندرسبھا کی دی ہوئی روایتوں پرقائم ہے ''۔ (۱۰۲)

ڈاکٹرجالبی نے امانت کے لکھے ہوئے تین واسوخت کا تعارف بھی پیش کیاہے۔ امانت کے ۳۰۷ بندوں پر مشتمل و اسوخت کو بہترین قرار دیتے ہوئے امانت کے عہد ان تہذیبی رحجانات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی بنیاد پرواسوخت جیسی صنفِ سخن اس عہد میں مقبول ہوئی۔ امانت کی شاعری کا

تجزیہ کرتے ہوئے رعایتِ لفظی کو امانت کی شاعری کی اوّلین صفت قراردیتے ہیں اور امانت کو لکھنؤی مزاج کا بہترین عکاس قراردیتے ہیں۔

فصل چہارم کے تیسرے حصے کاعنوان ''روایتِ آتش کی توسیع، تکرار اور امتزاج ''ہے۔ اس حصے میں تین ابواب شامل ہیں۔ اس عنوان کے تحت جس شاعر کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے ان میں سید محمد رند کو پہلے باب کاموضوع بنایا گیاہے۔ رندؔ کے سوانحی حالات درج کرتے ہوئے ان کی سالِ وفات کے تعین کے سلسلے میں روایتی طور پر داخلی شواہد اور تاریخی واقعات کے تجزئیے سے ۱۲۶۸ھ کو سالِ وفات قراردیا گیا ہے۔ رندکے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اسے ناسخ کی روایت سے متاثر قرار دیتے ہیں لیکن رند کو جوچیز اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے کلام میں جذبہ و احساس کے عناصر ہیں اور یہ عناصر ان کے استاد آتش اور ان کے پسندیدہ شاعر میرتقی میر کے تتبع کے باعث ان کی شاعری جزوبنے۔ لسانی سطح پر ڈاکٹرجالبی، رند کو آتش اور مصحفی کا پیروکار قراردیتے ہیں۔

روایت آتش کی توسیع کے حوالے سے میروزیر علی لکھنؤ ی کو دوسرے باب کا موضوع بنایاہے۔ ڈاکٹرجالبی تحقیقی نقطۂ نظر سے ان کے معاصرین کے بیان کردہ واقعات اور تذکروں میں موجود معلومات کی روشنی میں ۱۸۰۵ ء کو سال ولادت اور ۱۸۵۵ء کوسال وفات قرار دیتے ہیں۔ میر وزیر علی لکھنؤی کی شخصیت کی عکاسی کے بعد ان کے کلام کے متعلق مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وزیر لکھنؤی بھی اپنے عہد کے اعتبار سے ''طرزِ جدید'' میں شعرگوئی کو ترجیح دیتے لیکن شاعری میں جذبہ و احساس کو شامل کرنے اور روزمرّہ استعمال میں آنے والے ہندی الاصل الفاظ و محاورات کو برتنے کے ضمن میں آتش کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ مضمون تازہ کی تلاش نے ان کے کلام میں ابتذال کو راہ دی۔ ڈاکٹرجالبی نے شاعرکے کلام کے تجزئیے کے ساتھ اس کے عہد کے مروّجہ رحجانات کی عکاسی بھی کی ہے اور اس عہد کے حوالے سے مجموعی طور پر زبان کے اندر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے صباؔ کے کلام سے ناسخؔ کے مترو ک کردہ الفاظ کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ صباؔ بھی ''طرز جدید'' کے دلدادہ ہونے کے باوجود زبان کے استعمال کے حوالے سے ناسخؔ سے زیادہ آتشؔ کے قریب تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے ان انگریزی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو اس عہد میں شعراء بالعموم اپنی شاعری میں استعمال کرنے لگے تھے جوکہ ناسخ کے صحتِ زبان کے اصولوں کی سخت خلاف ورزی تھی۔

آتش کے اثرات کے حوالے سے تیسرے باب میں آغا حجّوشرف کے حالاتِ زندگی، شخصیت اور ادبی کا رناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے آغا حجّوشرف کے سالِ ولادت اور وفات کے سلسلے میں کچھ دستیاب شہادتوں اور کچھ قیاس کا سہارا لیتے ہوئے ۱۲۲۷ء کو سالِ ولادت متعین کیا ہے اور سال وفات ۱۳۰۵ھ سے قبل قیاس کیا ہے۔ آغا حجو شرف واجد علی شاہ کے سمدھی تھے لہٰذا ان کی تصانیف ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے بہت اہم ہے بالخصوص ان کی مثنوی ''شکوہِ فرنگ'' جس میں انگریزی حکام کی بہادری اور مسلمان امراء کی ان سے وفاداری کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ مثنوی کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں لیکن واجد علی شاہ کے حالات، رحجانات امراء کے روّیوں اور انگریزوں کے حوالے سے شاہی خاندان کے روّیے کو جاننے کے لئے یہ مثنوی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ آغاحجو شرف کی دوسری مثنوی افسانہ لکھنؤ کو ڈاکٹر جمیل جالبی 'شکوہ فرہنگ'کی ترقی یافتہ صورت قراردیتے ہیں۔ افسانہ لکھنؤ میں' شکوہ فرہنگ' سے متعدد اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں بلکہ ان میں کمی بیشی بھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق 'شکوہ فرہنگ' کی مانند یہ مثنوی بھی فنِ شاعری کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اس مثنوی میں متعدد امراء، شہزادگان، شہزادیوں، اطباء و شعراء، علماء وغیرہ کاذکر موجود ہے جوکسی نہ کسی حوالے سے اپنے عہد میں معروف تھے۔ واقعاتِ غدر کے بیان کے سلسلے میں بھی یہ مثنوی اہم ہے۔ بقول ڈاکٹرجالبی:

> ''اس میں گاہ گاہ تہذیب و معاشرت کے ایسے پہلو اور ایسے واقعات بھی بیان میں آئے ہیں جن کا ذکرکہیں اور نہیں ملتا مثلاً اسعدالدّولہ حسن یارخان افضل، شاگردِ آتش کا ذکرآیاہے جن کے توجہ دلانے سے واجد علی شاہ نے شاعری شروع کی اور مثنوی، افسانہ عشق' ان کی فرمائش پرلکھی تھی۔ اس میں ایسی باتیں مثلاً مرزا غالب کی پنشن کی بحالی، مٹیابرج میں آگ لگنا، واجد علی شاہ کے پچیس ہزار کبوتر، نئی کوٹھیوں کی تعمیر و آرائش وغیرہ بھی بیان میں آگئی ہے۔ اس مثنوی میں حامیانِ واجد شاہ کا زاویۂنظر پیش کیا گیاہے۔ تاریخی لحاظ سے اپنے سارے نقص و سقم کے باوجود یہ اس دور کی ایک اہم تصنیف ہے''۔ (جلد سوم،ص۸۹۶)

''دیوانِ شرف'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی حجوشرف کی شاعری کے موضوعات اور زبان کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان امور کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے باعث حجوشرف نے اپنے عہد کی مقبول تحریک ''طرزِجدید'' کی پیروی کے باوجود آتش کے رنگِ سخن کی پیروی کی۔فصل

چہارم کے آخری حصے جس کا عنوان ’’شاگردانِ آتش میں مثنوی کی منفرد روایت ‘‘ ہے،دوابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب کا عنوان ’’پنڈت، دیا شنکر نسیم، مثنوی گلزارِ نسیم، حالات، مطالعۂ گلزار نسیم، معرکۂ چکبست وشرر‘‘ہے۔ ڈاکٹرجالبی پنڈت دیاشنکرنسیم کے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ان کی تاریخ پیدائش جوکہ برج نرائن چکبست کے حوالے سے بیان کی ہے، درج کی گئی ہے لیکن ڈاکٹر رشیدحسن خان کے حوالے سے اسے مشکوک قراردیا گیا ہے۔ اسی طرح سالِ وفات کے سلسلے میں چکبست کے دئیے گئے سال (۱۸۴۳ء) کو بھی ردّ کیا گیا ہے اس سلسلے میں مزید تحقیقی نتائج پیش نہیں کئے گئے جوکہ ڈاکٹرجالبی کے روایتی طریقۂ تحقیق کے خلاف ہے۔ ڈاکٹرجالبی کی تاریخ ادب کی تینوں جلدوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتاہے کہ وہ جب بھی کسی امر پر دیگر محققین، ناقدین سے اختلاف کرتے ہیں اپنا نقطہ نظر تحقیقی حوالوں سے ضرورپیش کرتے ہیں۔ یہاں پنڈت دیاشنکر نسیم کے سالِ ولادت اور سال وِفات کے سلسلے میں اس رحجان کی پیروی نظرنہیں آتی۔

ڈاکٹرجالبی نے نسیم لکھنؤی کی دوتصانیف (۱) دیوان نسیم اور (۲) مثنوی گلزارِ نسیم کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے موضوعات فنی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے تحقیقی انداز میں بہت خوبصورتی سے گلزارِ نسیم کے مآخذات کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں خیابانِ ریحان جوکہ نسیم ریحان الدّین ریحان کی مثنوی ہے،سے اشعار لے کر گلزارِنسیم سے تقابلی مطالعہ بھی پیش کیاہے اور اپنے اس دعوے کو تقویت پہنچائی ہے کہ ’’گلزار نسیم لکھتے ہوئے‘ مذہبِ عشق‘ او‘ر خیابانِ ریحا نِ نسیم کے پیشِ نظر تھی۔ ’’گلزار نسیم‘‘ کے قصے کے مآخذات کے حوالے سے گیان چند جین، رشید حسن خان اور افسر صدیق امروہی کی تحقیقات کا بھی تجزیہ کیا گیاہے۔ ’’گلزارنسیم ‘‘ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے قصے، زبان کے مختلف پہلوؤں اور انداز بیان پرتفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ گلزارِنسیم میں ضائع و بدائع، رمزو کنایہ، تشبیہہ و استعارہ، مجازِ مرسل، اختصار، رعایتِ لفظی، منظر کشی کی خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مثنوی سے مثالیں بھی پیش کی ہیں اور لکھتے ہیں :’’نسیم نے اپنے طرزِ ادا سے اس مثنوی میں جس طرح زبان و بیان کے گل بوٹے بنائے ہیں،وہی ان کا کارنامہ ہے جس تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا‘‘۔ (جلد سوم،ص۹۱۵)

ڈاکٹرتبسم کاشمیری نے بھی اپنی تاریخِ ادب میں گلزارِ نسیم کے قصے اور زبان و بیان کا انتہائی دلچسپ مطالعہ پیش کیاہے اور نفسیاتی تنقید کے اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے اس کے قصے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیاہے۔ ’’گلزارِنسیم‘ کے حوالے سے لکھتے ہیں ؛’’گلزارنسیم اپنے عہدکے ایک نئے شعری باطن کی شاعری ہے، یہ ایک ایسے نقطے کی دریافت ہے جہاں اس عہد کی اعلیٰ ترین شعری روایات مجتمع ہوگئی ہیں ‘‘۔ (۱۰۳)

اس باب کاانتہائی دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں نسیم کی وفات کے تقریباً سات سال بعد ہونے والے ادبی معرکے کا جائزہ لیاگیاہے۔ یہ معرکہ چکبست و شرر کے درمیان برپا ہوا۔ اس معرکے کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس معرکے میں حصہ لینے والے ادباء، شعراء اور رسائل کے حوالے سے مکمل تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ فصلِ چہارم کا آخری باب ’’نواب مرزا شوق‘‘ کے لئے مختص ہے۔ شاگردانِ آتش میں نواب مرزا شوقؔ اپنی مثنوی نگاری کے لئے تاریخ ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ نواب مرزا شوقؔ کے سوانحی حالات اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی تصانیف کاجائزہ لیاہے۔ شوقؔ کے حوالے سے اس غلط فہمی کا تحقیقی بنیاد پر ازالہ کرتے ہیں جس کے مطابق ’’لذتِ عشق‘‘ کو متعدد محققین اور ناقدین نے شوقؔ سے منسوب کیاتھا۔ شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی ثابت کرتے ہیں کہ یہ مثنوی شوق نہیں بلکہ ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی تصنیف ہے۔ شوقی کی مثنویوں فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کی ترتیب کے حوالے سے پائے جانے والے ابہام کو بھی تاریخی شواہد سے دورے کرتے ہوئے ان کی ترتیب وتصنیف کا تعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کی یہی محققانہ کوششیں ہیں جو انہیں دیگر محققین سے ممتاز کرتی ہیں۔ وہ کسی بھی تحقیق طلب مسئلے کو حل کئے بغیر آگے نہیں بڑھتے اور شعراء اور ادباء سے متعلق کسی بھی تحقیق طلب امر کی تفتیش نہایت جانفشانی سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی تحقیق کے مطابق شوق کی مثنویوں کی ترتیب ہے۔

۱۔ فریب عشق۔ ۲۔ بہارعشق۔ ۳۔ زہر عشق

ان مثنویوں کی ترتیبِ تصنیف کی عمدگی سے کھوج کے ساتھ ساتھ ان مثنویوں میں بیان کردہ قصّوں کے مآخذات کا کھوج بھی لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے نہایت عمدگی سے ان مثنویوں کے قصوں، زبان، طرزِ ادا اور ان تہذیبی اثرات کا تجزیہ پیش کیاہے جن کے تحت یہ مثنویاں وجود میں آئیں اور اس عہد کے مخصوص کلچر (جسے ڈاکٹرجالبی ’’کسبی کلچر‘‘ قراردیتے ہیں)کی ترجمان ہیں۔ اس جلد کی آخری فصل یعنی فصل پنجم دوابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس فصل کو ’’انیسویں صدی کی دواہم ادبی، تہذیبی شخصیات ‘‘ کا عنوان دیتے ہوئے ان میں واجد علی شاہ اور نظیراکبرآبادی کے حالات زندگی اور تصانیف کا جائزہ لیاہے۔ پہلے باب میں واجد علی شاہ کے حالات، شخصیت تصانیف اور انکے ادبی اثرات کا جائزہ لیاگیاہے۔ واجد علی شاہ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مختلف محققین کی تحقیق کا جائزہ لینے کے بعد ۱۹ جولائی ۱۸۲۳ء کو درست تاریخ ولادت قرار دیتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے ذاتی اور سماجی حالات اور شخصیت کے حوالے سے انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ واجد علی شاہ کی تصانیف کاجائزہ اور پس منظر بھی اس باب کا انتہائی دلچسپ حصہ ہے۔ ڈاکٹرجالبی واجد علی شاہ کی ادب پروری اور شخصیت کے پہلو آشکار کرتے ہوئے

ان کی جس خوبی کی سب سے زیادہ داد دیتے ہیں وہ ان کی اختراعی صلاحیت ہے۔ واجد علی شاہ کی اختراعات کا ذکرکرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی تاریخ میں اس رنگ وضع کا کوئی دوسرابادشاہ شاید ہی ایسا گزراہو جس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے نئے رحجانات کو جنم دیا۔علم و ادب میں خود شریک ہوکر اس کی سرپرستی کی اور فنونِ لطیفہ میں اپنی ایجادات و اختراعات سے نئے میلانات کو ابھارا۔ واجد علی شاہ کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جس کا پل پل ان کی تصانیف سے نمایاں ہوتاہے اور ان کی پوری شخصیت کو ہمارے سامنے لاکھڑاکرتاہے''۔(جلد سوم،ص۹۶۲)

ڈاکٹرجالبی نے واجد علی شاہ کی تصانیف کی فہرست بمعہ ان کے سالِ تصنیف، زبان، صنفِ ادب اور کیفیت کے حوالے سے مرتب کی ہے جس کی تیاری میں واجد علی شاہ کی ''بنی'' کو کب قدر کی فہرست اور مسعودحسن رضوی ادیب کی فہرستوں سے مدد لی گئی ہے۔ (۱۰۴)ڈاکٹرجالبی، واجد علی شاہ کی شاعری کے تجزیے کے بعد ان کی شاعری میں ان کے عہد کے غالب رحجان ''طرزجدید'' کی پیروی کے ساتھ ساتھ آتش کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ واجد علی شاہ مثنویوں کے قصوں، مآخذات اورزبان کا تجزیہ کرتے ہوئے ان مثنویوں پر'گلزار نسیم' اور دیگر مثنویوں کے اثرات کی نشاندہی مثالوں کے ساتھ کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی، واجد علی شاہ کی مرثیہ نگاری کو ان کی غزل سے بہترقراردیتے ہیں اور مرثیہ نگاری کے ضمن میں واجدعلی شاہ کی اختراعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ واجد علی شاہ کی نثرکا مطالعہ ان کی نثران کی خوبیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹرجالبی، واجد علی شاہ کے کردار پر عمدگی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ دوسراباب ''نظیراکبرآبادی'' کے سوانحی حالات، سماجی پس منظر، تخلیقات'اور ان کے کلام کے لسانی تجزئیے پر مشتمل ہے۔ باب کی ابتداء میں ڈاکٹرجالبی اپنی گزشتہ جلدوں کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی مختلف روایتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے نظیراکبرآبادی کو اردو ادب کی ''ہندوی'' روایت کا شاعر قراردیتے ہیں جوکہ گجری شعروادب پر چھائی ہوئی تھی۔ زبان اصناف اور موضوعات کے حوالے سے ہندوی روایت کی پیروی کرنے کے باعث ہی نظیر اپنے عہد میں دیگر شعراء سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ بقول جالبی:

'نظیر اکبرآبادی نے ہئیت، اصناف سخن اور اوزان و بحور تو سب فارسی سے لئے ہیں لیکن انہوں نے جس طرح موضوعات کو اپنے مخصوص رنگِ سخن میں ڈھالاہے تونظم پڑھتے ہوئے یہ محسوس

نہیں ہوتاہے کہ یہ نظم فارسی ہئیت یاصنف سخن سے لی گئی ہے اور یہی خاص بات ہے ان کی اکثر غزلیں بھی نظمیں معلوم ہوتی ہیں اور شعروں کے موضوعاتی ربط و تسلسل کے باعث غزل کونظم کی طرح عنوان دیاجاسکتاہے۔ انہوں نے فارسی روایت شاعری کے اثرات قبول کرنے کے باوجود اپنا رشتہ چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی اور اپنے معاشرے کی عام تہذیب سے جوڑ کر عوام کو پہلی بار اپنے تخلیقی عمل میں شامل کیا۔ یہ راستہ طبقہ خواص کیراستے سے واضح طور پر الگ رہاتھا ‘‘۔(جلد سوم،ص۱۰۰۵)

مندرجہ بالا پیراگراف میں ڈاکٹرجالبی نے نظیر اکبرآبادی کے حوالے سے جن امور پر روشنی ڈالی ہے آگے چل کرباب میں انہی امور کے متعلق تفصیلی بحث موجود ہے۔ مثلا نظیر کے موضوعات، نظیر کی اختراعات،، نظیر کی نظمیں اور ان کا فنّی تجزیہ، نظر کی نظم نما غزل، نظیر کا عہد اور طبقۂخواص کے حوالے سے نظیر کی عدم پذیرائی اور عوامی مقبولیت وغیرہ۔نظیر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی، حالیؔ کے اس قول کی تائید کرتے ہیں نظیر نے اردو زبان میں شائد سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے۔ ڈاکٹرجالبی نے نظیر کے کلام کا عمدہ لسانی مطالعہ بھی پیش کیاہے۔

جبکہ ڈاکٹرتبسم کاشمیری ٗ نظیر کی شاعری کے دیگر پہلوؤں پرروشنی کے ڈالنے کے علاوہ اسے اردو زبان کے سماجی لسانیات کے مطالعے کے حوالے سے بہت اہم قراردیتے ہیں۔ نظیراکبرآبادی کی غزل کے تجزئیے میں دیگر امور کے علاوہ نظیرکی غزل کو موضوعاتی غزل کا مؤجد قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس با ب میں نہ صرف نظیرکے مختلف دواوین کے حوالے سے معلومات فراہم کی ہیں بلکہ مختلف مرتبین کے حوالے سے ان تصانیف کا تعارف یا ان میں سے اقتباسات پیش نہیں کئے جن سے یہ پتہ چلتاہے کہ یہ تصانیف ڈاکٹرجالبی کی نظرسے نہیں گزریں۔

جلدسوّم کے آخرمیں دیگرجلدوں کی طرح ایک وقیع اشاریہ ہے جوکہ ۵۸ صفحات پرمشتمل ہے۔ اشاریے کاپہلا حصہ حروف تہجی کے اعتبار سے افراد و اشخاص کے حوالے سے ہے جبکہ دوسراحصہ کتب، رسائل اور مخطوطات اور مکتوبات کے حوالے سے ہے۔ کتابیات کی کمی بدستور موجود ہے۔ جلد کے آخرمیں تین صفحات پرمشتمل صحت نامہ ہے جس میں جلد سوم میں موجود اغلاط کی درستگی کی گئی ہے۔ یہ تصحیح، سنین، اشخاص، کتب کے نام کی درستگی پرمشتمل ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد سوّم کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کے نظریۂتاریخ نویسی، طریقہ کار اور اسلوب کے حوالے سے پیش لفظ میں موجود مباحث کا تجزیہ باب کی ابتداء میں کی جاچکاہے۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم میں ڈاکٹرجالبی نے نہ صرف اپنے نظریۂ تاریخ نویسی کی پیروی کی ہے بلکہ مؤرخانہ ذمہ داریوں کابھی کماحقہ خیال رکھاہے۔ کسی بھی تخلیق کا ر کی تخلیق کا تجزیہ کرتے ہوئے سماجی، تہذیبی، سیاسی عوامل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ اس تخلیق کار کی شخصیت اور سوانحی حالات کے ضمن میں بھی کارفرما عوامل کو مدنظر رکھاہے۔ جس سے تخلیق کے ذہنی رحجانات، فکری روّیوں اور تخلیقی اپچ کے حوالے سے مفید معلومات سامنے آتی ہیں۔ جلد سوم، انیسویں صدی کے نصف اول پر محیط ہے۔ برصغیرمیں مغلیہ تہذیب اور حکومت کے زوال اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرو رسوخ کے حوالے سے یہ عہد نہایت اہمیت کا حامل ہے یہی وہ عہد ہے جب اردو زبان و ادب نہ صرف اپنے عروج پرنظرآتاہے بلکہ مغرب تمدن کے اثرات کے علاوہ مغرب کے ادبی رحجانات کو بھی اردو زبان وادب میں فروغ ملنا شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کا تہذیبی سیاسی اور سماجی منظرنامہ تغیرو تبدل سے شدید متاثر ہوا۔ یہ اثرات زبان کو متاثر کرنے کے ساتھ اصنافِ ادب کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جو رنگارنگی اور تنوع انیسویں صدی کے سیاسی،تہذیبی اور ادبی منظرنامے پر پائی جاتی ہے،تاریخِ ادبِ اردو جلد سوّم بھی اسی رنگا رنگی اور تنوّع کی عکاسی کرتی ہے۔ اردو شاعری میں مختلف رحجانات فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اس کے نتیجے میں ادبی تصانیف کے تراجم اردو نثر کے مختلف رحجانات، داستانوں اور مثنویوں کا عروج، ناسخ کی طرز جدید کا فروغ اردوڈراموں کے اوّلین نقوش، نظیر کی شاعری وغیرہ جلد سوم میں اپنے اثرو نفوذ کی عکاسی کرتے نظرآتے ہیں۔

تاریخ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی جس تہذیبی اور سماجی شعور کو بنیادی نکتہ قرار دیتے ہیں۔ اسے دیگر ناقدین بھی مؤرخ کی اوّلین ذمہ قرار دیتے ہیں۔ مشفق خواجہ،تاریخ نویسی میں سماجی اور تہذیبی شعور کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

’’وہ ہر عہد کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مدوجزر اور قدروں کو پیش نظر رکھ کر واقعات جانچنا، پرکھتا اور ان میں تضاد کے ہوتے ہوئے بھی باہمی تعلق کو دریافت کرتاہے اور پھروہ ایک ایسی تصویر پیش کرتاہے جس میں متعلقہ عہد اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آتاہے۔ تاریخ، افراد کی سوانح عمریوں اور کارناموں کے مجموعے کانام نہیں ہے۔ یہ افراد اور معاشرے کے باہمی تعلق کو سمجھنے اور سمجھانے کا وسیلہ ہے۔ یقیناًوہ افراد بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو معاشرے پراثرانداز ہوئے لیکن ان لوگوں کی اہمیت بھی کم نہیں ہے جنہوں نے اثر کو قبول کیا‘‘۔(۱۰۵)

ڈاکٹرجالبی کی تاریخِ ادبِ اردو(جلد سوم) میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بطور مؤرخ ان تمام امور کا خیال رکھا ہے۔ تاریخ ادب اردو،(جلد سوم)کے تعارف و تجزئیے میں ان اسب امور کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے جس تحقیقی دقتِ نظری سے جلد اوّل اور جلد دوّم کو مرتب کیا ہے وہی محققانہ شان، جلد سوّم میں بھی نظرآتی ہے۔ تخلیق کاروں کے سوانحی حالات کے بیان میں دستیاب مواد سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے نہ صرف تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا درست یقین کیاگیاہے بلکہ جس حد تک ممکن ہوسکا سوانحی حالات بھی ترتیب کے ساتھ قلم بند کئے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ مواد دونوں سے استفادہ کیاگیاہے۔ سنین کے سلسلے میں کہیں کہیں ڈاکٹرجالبی قیاس کاسہارا بھی لیتے ہیں لیکن اس قیاس کو محققانہ قیاس ہی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ قیاسی تعین کے سلسلے میں بھی مختلف مخطوطات و مطبوعات سے داخلی شواہد کا سہارالے کر قیاسی تعین کیاگیاہے۔

تخلیق کاروں کی تخلیقات کے حوالے سے نہ صرف مطبوعہ کتب کا تعارف پیش کیاگیاہے بلکہ غیرمطبوعہ اور نایاب کتب کے بارے میں بھی ممکنہ حد تک معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تمام تخلیقات نظم و نثر کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیاہے جس کی وجہ سے اس انیسویں صدی کے نصف اوّل کی تصویر نہایت واضح ہوکر سامنے آتی ہے۔ نظم و نثر میں ہونے والی تبدیلیاں ارتقائی صورت میں آگے بڑھتی نظرآتی ہیں۔ جس کے باعث اس جلد میں وحدت کا تاثر ابھر کر سامنے آیاہے۔ اسی ضمن میں کئی گم نام مخطوطات اور تخلیق کاروں کو بھی نظرانداز نہیں کیاگیا۔

شعراء کے کلام کے تجزئیے میں نہ صرف ان کے فکر ی و فنی ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے بکہ عصری تہذیبی و سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ معاصرین کے اثرات کی بھی مثالوں کی صورت میں نشاندہی کی ہے۔ بعض تخلیق کاروں کی تخلیقات اس قدر فکری و فنی تنوع موجود ہے کہ ان کا یہ ارتقائی مطالعہ و انتہائی دلچسپ صورتحال اختیار کرلیتاہے۔ خصوصاً غلام ہمدانی مصحفی کی ذیل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے کلام کے فکری و فنی ارتقاء کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کرلیاہے اور ان کے آٹھوں دواوین سے ان کی ارتقائی فنی مہارت کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ تخلیق کاروں کے فکری و فنی ارتقاء کے علاوہ اصناف سخن کی ایجاد اور مختلف صورتوں کو بھی بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے مثلاً داستانوں کی ابتداء اور عروج، ڈرامے کی ابتدائی صورتیں ریختی کی ایجاد، اردو میں ترجموں کی روایت اور نظم نگاری کی اوّلین صورتیں وغیرہ۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے حوالے سے پائے جائے ادبی مباحث کو بھی جلد سوم کا حصہ بنایاگیاہے۔ جن کا ذکر اس جلد کے تعارف و تجزئیے کے ضمن میں کیاجاچکاہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی جلد سوم کے حوالے سے تنقیدی اور تحقیقی کا وشیں جنہیں ڈاکٹر جالبی کے مطابق ''تحققید'' کہاجاسکتاہے کا مطالعہ کیاجاچکاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اس ''جلد سوم '' کی تالیف کے لئے جس قدر ادبی مآخذات سے رجوع کیاہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ہر باب کے آخر میں درج ان کے مآخذات کی فہرست پر نظرڈالی جائے تو اندازہ ہوتاہے ان کی یہ فہرست نہایت جامع و مانع ہے۔ ہر تخلقی کار کے متعلق تقریباً تمام مطبوعہ اور غیرمطبوعہ مآخذات کے علاوہ غیرادبی مآخذات سے استفادے کا بھی پتہ چلتاہے۔ جس سے ان کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ:

> ''میں نے ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی آراء یا سنی سنائی باتوں پر نہیں رکھی بلکہ سارے کلیات، ساری تصانیف کم و بیش سارے اصل تاریخی ادبی و غیر ادبی مآخذسے براہ راست استفادہ کرکے روح ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور پوری ذمہ داری اور شعور کے ساتھ کم سے کم لفظ میں اسے بیان کردیاہے''۔(۱۰۶)

ڈاکٹرجالبی نے بقیہ دوجلدوں کی نسبت اس جلد میں اولین مآخذات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیاہے جس کے باعث تحقیقی نقطۂ نظر سے اس جلد کو زیادہ وقیع قراردیاجاسکتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ''جلدسوم'' میں بھی اپنے امتزاجی تنقید کے رحجان کو برقرار رکھاہے۔ تخلیق کاروں کے فن پاروں کی جانچ پرکھ انتہائی احتیاط اور ذمہ داری سے کرتے ہوئے افراط و تفریط اور تعصبات سے بچتے ہوئے تنقیدی آراء کا اظہارکیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی ہرتخلیق کارکے مقام و مرتبے کے تعین کے حوالے سے نہ صرف اس کے عہد میں اس کی اہمیت کو اجاگرکرتے ہیں بلکہ موجودہ عہد کے حوالے سے بھی تخلیق کاروں کی اہمیت اجاگرکرتے ہیں۔ یہی روّیہ اصناف اور تحریکوں کی ذیل میں بھی دیکھنے میں آتاہے۔ مثلاً جرأت کی اپنے عہد میں کیا مقام تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری کیوں اپنی اہمیت کھوبیٹھی ؟ ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک اپنے عہد کو متاثر کرنے کے علاوہ بعد میں کس طرح اردو زبان و ادب کو متاثر کررہی ہے ؟ فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات نے اردو ترجمہ نگاری کے حوالے سے اپنے عہد کو بعد میں اردو زبان و ادب کو کسی طرح متاثرکیا ؟ نظیراپنے عہد میں کیوں ادبی پذیرائی نہ حاصل کرسکا اور بعد کے ادوار میں نظیر کس طرح اردو کے پہلے نظم نگار کے علاوہ سماجی شاعری کے حوالے سے اہم قرار پاتے ہیں۔ ان سب اور اس طرح کے دیگر امور پر اس جلد میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تمام عناصر اس جلد کی مختلف سطحوں کو اجاگر کرتے ہیں۔انیسویں صدی کے نصف اوّل کے لسانی منظر نامے کو تدریجی انداز میں مثالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ہر شاعر اورادیب کی تخلیقات کے حوالے سے زبان کے استعمال کے

مختلف رحجانات کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔اردو زبان پر انگریزی زبان کے اثرات اور الفا ظ کے اثرونفوذ کے حوالے سے عمدہ تحقیقی معلومات اس جلد کی اہم خصوصیت ہے۔اس جلد کا اسلوب بھی دیگر جلدوں کی مانند سادہ علمی، پراثر جامع اور دلچسپ ہے۔ بقول جالبی:''یہ نہ خشک قانونی عبارت ہے اور نہ خشک تحقیقی اسلوب ہے بلکہ بیان میں دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے بات کو داستان کی طرح بیانیہ اندازمیں بیان کردیاگیاہے ''۔ (۱۰۷)

ڈاکٹرجالبی نے جلد سوّم میں تاریخی حقائق اور تنقیدی فکرکے اظہار کے لئے نہایت عمدہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے ان حصوں کو قارئین کے لئے انتہائی دلچسپی کاحامل بنادیاہے۔ نہ تو تاریخی حقائق کا بیان قاری کو بوجھل کرتاہے اور نہ تنقیدی اصطلاحات قاری کے لئے کسی الجھن کا باعث بنتی ہیں۔ جلدّ سوم میں ڈاکٹرجالبی نے تاریخ نگاری کے لئے ایسا اندازِ بیاں اختیار کیاہے کہ ادب سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے قارئین اور ادب کے طلباء کے علاوہ عام قارئین بھی اس جلد کو نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ ساتھ تشبیہات کا بھی نہایت مؤثر انداز میں استعمال کیاگیاہے جو کہ ان کی تنقیدی آراء کو مزید دلچسپ بنادیتاہے مثلاً آتش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس دور کی لکھنؤی شاعری میں تصوف کا اثر بہت کم نظرآتاہے لیکن آتش نے اپنی شاعری میں تصوف کا چراغ روشن کرکے اپنی تخلیقی توانائی سے باطنی واردات کے چراغ جلائے اور اردو شاعری کو ایسا رخ دیا جو دورناِسخؔ کے لئے وقت کی راگنی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔اس دور مین آتش کی شاعری وہ چراغ ہے جس نے اس دور کے باطن کو روشن کیااور اس کی خارجیت میں داخلیت کا عنصر شامل کرکے اس کے توازن کو برقرار رکھا''۔ (۱۰۸)

ڈاکٹرجالبی جس دلچسپ، اسلوب بیان کے استعمال کا دعویٰ کرتے ہیں اس کی چند اور جھلکیاں درج ذیل ہیں:

> ''میرامن نے اپنی زبان کو سند کا درجہ دینے کے لئے خود کو دلی کاروڑا کہاتھا لیکن کسی فرد پر چوٹ نہیں کی تھی۔ سرور نے اپنی زبان کو مستند تر بنانے کے لئے میرامن کو بیچ میں لاگھسیٹا اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر سوکن کو رسوا کرنے کا سامان فراہم

کردیاہے اور دلیّ و لکھنؤ، کا جھگڑا کھڑا کرکے نئی نسل کے ادیبوں
کو مخالفت کا موقع فراہم کردیا‘‘۔ (۱۰۹)

مصحفی کی شاعری کے امتزاجی رنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’مصحفیؔ کی شاعری ایسے چمن کی طرح ہے جس میں مختلف قسم کے پھول کھلے ہیں۔ ان میں وہ پھول بھی ہیں جن کی قلم خود مصحفیؔ نے لگائی ہے اور جو چمن مصحفی کی شناخت ہے۔ یہ ایک ایساچمن ہے جورنگوں اور خوشبوؤں سے بھراہواہے اور جس کی سیر کرکے باغبانِ شاعری نہال ہوجاتے ہیں اور اپنے چمن کو اسی وضع پربنانے لگ جاتے ہیں‘‘۔(۱۱۰)

ڈاکٹرجالبی کا اسلوب دلچسپ اور روزمرّہ بول چال سے بہت قریب ہے۔ وہ قاری تک اپنے نقطۂ نظر کے ابلاغ میں بہت کامیاب نظرآتے ہیں۔تاریخِ ادب میں تحقیقی مواد اور تنقیدی اصطلاحات سے بوجھل کرنے کی بجائے ایسا دلچسپ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو کہ ادبی تاریخ نویسی کے شایان شان ہے۔جہاں ان کی مرتب کردہ تواریخ ادب دیگر تواریخ کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں وہیں ان کا دلچسپ ادبی اسلوب بھی ان کی تواریخ کو مقبول بنانے کا ضامن ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی،قاری کے ذہن پر اپنی علمیت کا رعب قائم کرنے کی بجائے تنقیدی اصطلاحات کو بھی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔دیگر جلدوں کی مانند اس جلد میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی قاری کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہوئے تاریخ نگاری کے سفر کو مکمل کرتے ہیں۔مثلا فصل اول کے اختتام پر جہاں انیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں اردو شاعری کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے،قاری کی توجہ نثر کی ترقی کی طرف دلچسپ انداز میں مبذول کرواتے ہیں:’’آئیے اب فورٹ ولیم کالج چلتے ہیں جو بہت دیر سے ہماری راہ تک رہا ہے۔‘‘(۱۱۱)

اسی باب کے اختتام پر اگلے مباحث کی طرف نہایت دلچسپ انداز میں قاری کو متوجہ کیا گیا ہے:’’ سفر لمبا ہے آئیے آگے چلیں اور نئے حکمرانوں کے شہر کلکتہ سے پرانے حکمرانوں کے شہر دلی جانے سے پہلے لکھنوء چلیں جہاں نئی نئی آرائشوں اور نئے نئے کھیل تماشوں کے ساتھ مغلیہ تہذیب کی صورتِ حال سنبھالا لے رہی ہے۔‘‘(۱۱۲)

تاریخِ نگاری میں ڈاکٹرجالبی کا یہ دلچسپ انداز نہ صرف قاری اور مصنف کے درمیان بے تکلفی اور مانوسیت پیداکرتاہے بلکہ آنے والے ابواب کے مباحث کی نشاندہی بھی ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اگر چہ یہ دلچسپ انداز پوری جلد میں اختیار نہیں کیا لیکن ’’تاریخ ادب اردو‘‘ جس

جگہ بھی یہ انداز نظرآتاہے اس میں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔مجموعی طور پر تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹرجالبی کا اسلوب سنجیدہ، باوقار، علمیت سے بھرپور اور ادبی شان لئے ہوئے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر تخلیق کار اور ہر صنفِ ادب کے تجزئیے میں اس کی نوعیت کو ملحوظ خاطر رکھاگیا اور تنقیدی آراء میں اندازِ بیان اسی خاص نوعیت کی عکاسی کرتاہے۔ مشفق خواجہ جالبی کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یوں جالبی کا شمار ہمارے اچھے نثرنگاروں میں ہوتاہے لیکن اس تاریخ ادب میں انہوں نے فکروریاض کے کچھ اور مرحلے طے کرکے ایک ایسا اسلوب اختیار کیاہے جسے اردو کابنیادی اسلوب کہاجاتاہے۔ اردو میں ایک سے ایک صاحب طرز ادیب موجود ہے لیکن وہ طرز کمیاب ہے جسے ہم غیرضروری آرائشوں سے پاک کہہ سکیں۔ میری مراد اس اسلوب سے ہے جونہ تو اتنامرصع اور پرکشش ہو کہ پڑھنے والا اس کے حسن میں کھوجائے اور مطالب کی حیثیت ثانوی روہ جائے اور نہ اتنا عالمانہ ہو کہ بات کہی جائے تو وہ لغت کے راستے ذہن تک پہنچتے اور ایسا اسلوب بھی نہ ہو جو علمی مباحث کا متحمل نہ ہوسکے۔ مولوی عبدالحق اور پھرڈاکٹر عابد حسین نے سیدھے لیکن باوقار طریقے سے بات کہنے کا جو دھنگ نکالاتھا۔ میرے نزدیک علمی تحریروں کے لئے اس سے بہتر اسلوب نہیں سکتا۔ جمیل جالبی نے اس طرزِ سخن کو آگے بڑھا یاہے ''۔ (۱۱۳)

تاریخ ادب جلد سوم پر بع کے اعتراضات بھی سامنے آئے۔جیسا کہ ڈاکٹر عقیل، جلد سوم' کی ترتیب پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تیسری جلد میں شاعری اور نثربڑی حدتک چاہے وہ ایک ہی باب میں علیحدہ علیحدہ ہی مطالعے کا موضوع بنائے گئے ہیں اور تاریخی اعتبار سے بے ربطی یوں نمایاں ہوجاتی ہے کہ جب فورٹ ولیم کالج کا ذکر آتاہے تو اس سے پہلے سلیمان شکوہ اور صادق اختروغیرہ کا ذکر گزرچکاہوتاہے۔ یہاں نثر میں فورٹ ولیم کالج کا ادب یکسر ایک علیحدہ دنیامیں تخلیق پاتاہواملتاہے اور محمدبخش مہجور، فخرالدین سخن اور رجب علی بیگ سرور بھی متوازی مطالعے میں آتے ہیں کہ پڑھنے

والوں کو پھر ناسخ وآتش کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ شاعروں میں ہم نظیر، مہر، شوق اور واجد علی شاہ اور ان کے متعدد معاصرین کو پڑھ لیتے ہیں لیکن ذوق، غالب اور مومن کا ذکرتک نہیں آتا، اگر یہ دور آتش کی توسیع کا دور ہے تو یہ شوق اور نسیم پر ختم تو نہیں ہوا''۔(۱۱۴)

اپنے مضمون میں ڈاکٹرعقیل امید ظاہرکرتے ہیں کہ شاید ان سب سوالات کے جوابات جلد چہارم مہیاکرسکے۔ ان کا اندازہ درست ہے کیونکہ جلد چہارم کے پیش لفظ میں بیان کردہ ڈاکٹرجالبی کے نقطۂ نظر کے مطابق چوتھی جلد، تیسری جلد کی توسیع ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس بیان کی روشنی میں ڈاکٹرعقیل کے اعتراضات کا جائزہ لیاجائے تو یہ اعتراضات بے جامعلوم ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر'تاریخ ادب اردو، جلد سوم' کی ترتیب و تنظیم نہایت مؤثر ہے۔ تاریخ ادب کو زمانی ترتیب سے مرتب کرتے ہوئے تخلیقات نظم و نثر کو ان کے اپنے عہد میں ر کھ کر ان کی خصوصیت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فصلوں کی تقسیم اور ابواب بندی میں ربط و ضبط، اس تاریخ ادب کی ایک اور خوبی ہے۔ فٹ نوٹ میں اضافی معلومات دینے کا جو رحجان جلد اوّل اور جلددوّم میں غالب نظر آتاہے۔ اس جلد میں اس اسے گریز کیاگیاہے اور ہرباب کے اختتام پر حواشی کے ذیل میں پہلے حوالہ جات اور حواشی درج کئے گئے ہیں جبکہ حواشی ''ب'' کی ذیل میں فارسی اقتباسات کے اردو تراجم دئیے گئے ہیں۔ پوری جلد میں صرف صفحہ ۴۲۳ پر میرامن کے حوالے سے اضافی معلومات فٹ نوٹ میں ملتی ہے۔ ڈاکٹرشگفتہ حسین جالبی کے اس طریقۂ کار پر معترض ہیں ان کے مطابق؛

''۔۔۔۔انداز ایسا نہ ہوجیسا ڈاکٹرجالبی کی تالیف تاریخ ادب اردو کی جلد سوّم کا ہے۔ انہوں نے حوالے بھی دئیے ہیں اور حواشی بھی۔ پھرفارسی تحریر کا اردو ترجمہ بھی حواشی ''ب'' کے عنوان سے دیاہے۔ حواشی در حواشی کے لئے طریقۂ کار یہ اپنایا گیاہے کہ پہلے آپ حواشی نمبر۱، ۲، ۳ وغیرہ وغیرہ دیکھیں۔ پھرحواشی ''ب'' میں بحوالہ حواشی نمبر۳، بحوالہ حوالہ نمبر ۴۰، وغیرہ کی ترتیب ملاحظہ کریں۔ ابواب کے آخرمیں دئیے گئے ان حواشی کی وجہ سے قرأت کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور اکثر تو مجھ نہیں آتاہے کہ حوالہ کہاں ہے اور حواشی کہاں۔ اگر حواشی اور حوالہ جات کو مختلف نشانوں سے واضح

کرتے ہوئے پاورقی میں تحریر کردیاجائے تومتن کی قرأت اور مفہوم آسان ہوجائے گا ‘‘۔(۱۱۵)

تاریخ ادب ’’جلد سوم‘‘ کے حواشی پرنظر ڈالی جائے تو ڈاکٹرشگفتہ حسین کا اعتراض بے جا معلوم ہوتاہے کیونکہ ڈاکٹرجالبی نے اس جلد میں حواشی ’’ب‘‘ میں صرف فارسی اقتباسات کے اردو تراجم درج کئے ہیں جبکہ جس طریقہ کار کی وہ سفارش کررہی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے تقریباً وہی طریقہ کار جلد اوّل اور دوّم میں اختیار کیاتھا اور فٹ نوٹ میں حوالے اور اضافی معلومات دینے کے سبب انہیں تنقید کا بھی نشانہ بنایاگیا۔ جبکہ اس جلد میں ڈاکٹرجالبی نے صرف ایک جگہ فٹ نوٹ کو معلومات کی فراہمی کے لئے استعمال کیاہے اور تمام معلومات کو متن کا حصہ بنایاہے جیساکہ ان پرپہلی دونوں جلدوں کے حوالے سے اعتراض کیاگیا تھا کہ انہوں نے اکثر متعلقہ معلومات کو بھی متن دینے کی بجائے فٹ نوٹ میں درج کیاہے۔

تاریخ ادب اردو جلد سوّم میں دیگر جلدوں کی مانند کتابیات کی فہرست نہیں ہے۔ بعض مقامات پر تکرارِ واقعات گراں گزرتی ہے جبکہ ناسخ کی تحریک حوالے سے ’’طرزجدید‘‘، ’’اصلاح زبان‘‘ کے حوالے سے بعض اصول باربار دہرائے گئے ہیں۔ ’فی الواقعی‘ اور ’فی الواقع‘ اور ’ہم جلیس‘کی مثال کو اس باب میں بار بار دہرایاگیاہے جبکہ تخلیق کاروں کے سال پیدائش اور سال وفات کے سلسلے میں اکثر قیاس کا سہارابھی لیاگیاہے جس کا ذکر جلد سوم کے تجزئیے میں کیاجاچکاہے بعض مقامات پر جلد اوّل اور جلد دوّم کی مانند واقعات کو بغیر حوالے کے درج کئے گئے ہیں اور بعض مقامات پر قیاس کا سہارالیاگیاہے مثلاً ص۔نمبر۶۲۷ پر رجب علی بیگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’قیاس کیاجاسکتاہے کہ سرور ان طویل داستانوں کے قاری ضرور رہے ہوں گے جوان کے زمانے اور ماحول میں عام تھیں۔ ان کے بہترین عناصر انہوں نے یکجا کرکے بڑی صنعت کاری سے اختصار اور ربط و ضبط کے ساتھ اپنی داستان میں جمع کردئیے ہیں ‘‘۔ (جلد سوم،ص۶۲۷)

مجموعی طورپر دیکھا جائے تو ڈاکٹرجالبی نے جلدسوّم میں دیگرجلدوں پر ہونے والے اعتراضات کی روشنی میں نہ صرف اوّلین مآخذات پر انحصار زیادہ کیاہے بلکہ طریقۂ کار کے حوالے سے بھی تبدیلیاں کی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے اپنے تصورِ تاریخ کی روشنی میں اس جلد میں تہذیبی، سیاسی، اور سماجی عوامل کی روشنی میں تخلیق اور تخلیق کار کو سمجھنے کی سعی کرتے ہوئے تاریخ میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین کیاہے۔ تاریخ کے بیان میں مؤرخانہ بصیرت کا اظہارکرتے

ہوئے بطور مؤرخ اپنی ذمہ داریوں سے بہترطریقے سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ تصنع بناوٹ اور مبالغے سے پرہیز کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے اپنی تنقید و اورتحقیق کو متوازن انداز میں بیان کیاہے۔ جلد اوّل اور جلد دوّم میں محمد حسین آزاد کے اسلوب کی پیروی کے حوالے سے جواعتراضات کئے گئے ہیں ڈاکٹرجالبی نے انہیں مد نظر رکھتے ہوئے اپنے اسلوب کو تاریخ نویسی کے حقیقی اسلوب سے قریب رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ’ تاریخ ادب اردو ’جلد سوم‘ اپنے مشمولات، طریقۂکار اور اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کی سب سے کامیاب جلد قراردی جاسکتی ہے۔ یہ جلد تحقیقی، تنقیدی، سوانحی، تجزیاتی اور اسلوب کی سطح پر نہ صرف دیگر جلدوں سے ممتاز ہے بلکہ ڈاکٹرجالبی نے تاریخ ادب کی چاروں جلدوں میں بھی انہی خصوصیات کی بناء پر منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو(جلد چہارم)کاتنقیدی و تحقیقی جائزہ:

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردوکی جلد چہارم جو کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کے سلسلے کی آخری جلد ہے، پہلی دفعہ فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔یہ جلدانیسویں صدی کے نصف آخر کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس جلد کے ابتدائی صفحے پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے الطاف حسین کی ’’حیاتِ جاوید‘‘ سے ایک اقتباس پیش کیا ہے اور یہ بہت معنی خیز ہے۔ا قتباس میں سرسید کی لغت نگاری، تاریخ نویسی اور انگریزی فنون کی کتب کے ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جب ایک ہی فرد کو قومی ضرورتیں پوری کرنے کا خیال ہو تو اسے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی زندگی بھر قومی ضرورت کے حوالے سے انہی شعبوں میں خدمات انجام دیں شاید اس اقتباس کو درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے چاہتے ہیں۔ یہ جلد مجموعی طورپر چار فصلوں پرمشتمل ہے ہر فصل متعدد ابواب کی حامل ہے۔

جلد چہارم کی تمہید کی ابتداء میں ایک نوٹ درج ہے جس کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی اس بات کو اہم قرار دیتے ہیں کہ جلد چہارم کی تمہید پڑھنے سے پہلے جلد سوم کی تمہیدکو ضرور پڑھا جائے کیونکہ جلد سوم کی تمہید پوری انیسویں صدی کے لئے لکھی گئی تھی۔ لہٰذا انیسویں صدی کے بقیہ نصف حصے کی تاریخ ادب میں ربط پیدا کرنے کے لئے جلد سوم کی تمہید میں پیش کئے گئے واقعات ورحجانات کا جاننا ازبس ضروری ہے۔تمہید میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے انیسویں صدی کے نصف آخر کے سیاسی،تہذیبی ومعاشرتی حالات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس عہد کی اہم تحریکوں اور زبان و ادب پر ان عوامل کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد کے حوالے سے بالخصوص انگریزی ادب کے ان ادبی رحجانات کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کی بنیاد پر بر صغیر کے لوگوں کے ظلم و بربریت کے اظہار کے لئے انگریزی زبان میں ادب تخلیق کیا گیا۔ عام طور پر ادبی تواریخ میں انگریزوں کی حکمرانی کے حوالے سے اردو زبان وادب پرہی اس کے اثرات کاجائزہ لیا جاتاہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمہید میں تصویر کے’’ دوسرے رخ ‘‘کو پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کسی بھی عمل کا ردِ عمل اس عمل کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے انگریز حکمرانوں کے سیاسی ہتھکنڈوں اور مسلمانوں کے ردّ عمل کی نشاندہی کرتے ہوئے سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد اور اس کے مومن کی شاعری کے حوالے سے اس کے مضرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی اسلامی بنیاد پرستی (جو کہ آج کی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے)کے حوالے سے اپنا

نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں‌بقول جالبی:''اسلامی بنیاد پرستی''کی تاریخ گواہ ہے کہ بنیاد پرستی (جہاد وغیرہ) ہمیشہ مغربی''استعماریت ''کی کوکھ سے ردِعمل کے طور پرپید ا ہوئی۔ آج اکیسویں صدی میں بھی جب سائنس وعقلیت اپنے عروج پر ہیں۔ اسلامی جہاد امریکہ ومغرب کی استعمار یت کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوا اورتیزی سے پھیل رہا ہے''۔(جلدچہارم،ص۲۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بقیہ تین جلدوں کی مانند، جلد چہارم کی تمہید میں اپنے تصورِر تاریخ،اسلوب اور طریقہ تاریخ نویسی پر روشنی نہیں ڈالی جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تمہید کی ابتداء ہی میں وضاحت کردی تھی کہ جلد چہارم کی تمہید،جلد سوئم کی تمہید ہی کاتسلسل ہے لٰہذا جلد چہارم کے حوالے سے ان امور کا تجزیہ جلد سوئم کی تمہید میں بیان کررردہ امور ہی کے حوالے سے لیا جائے گا۔

جلد چہارم کی فصلِ اوّل تین حصوں اور ۲۱ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جو کہ سات ابواب اور ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے غالب کے لئے مختص ہے غالب کے عہد،سوانح ان کی زندگی کے اہم واقعات، معرکے، سیرت، تصانیف وتالیف،فارسی شاعری اور غالب کی اردو نثر نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے غالب جیسے عہد ساز شاعر کے اتنے صفحات مختص کرنا تاریخ ادب میں ان کی اہمیت اور اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔(جلد دوّم میں میر کے لئے بہت زیادہ صفحات مختص کرنے پر ڈاکٹر جمیل جالبی کو تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔)پہلا باب ''غالب اور ان کا دور :پس منظر ورحجانات '' کے عنوان کے تحت ان سیاسی،معاشرتی، تہذیبی،معاشی اور لسانی امور کا احاطہ کرتاہے جو غالب کو ''غالب '' بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔ غالب کے عہد کے تضاد کو جو کہ طوائف اور قماربازی کے ساتھ صوفیاء کرام کی محفلوں کو بھی آباد رکھتا ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی دورِ زوال کی سب سے اہم پہچان قرار دیتے ہیں۔ یہ دور ایک عبوری دور تھا جس میں ایک تہذیب زوال پذیر ہو رہی تھی اور دوسری تہذیب تیزی سے اس کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی اس عبوری عہد کا احوال ان کی شاعری اورنثر دونوں میں موجود ہے۔ غالب ا س بدلتے ہیں عہد کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس کا اظہار انگریزوں کی مدح میں لکھے گئے قصیدوں اور آئین اکبری کی تعریف سے بخوبی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،غالب کو اپنے دور کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ غالب نے آنے والے عہد کی روح کو پہچان کو فارسی واردو شاعری اور نثر اس طرح سمویا کہ ان کی شاعری آج بھی ہم سے پوری طرح ہم کلام ہے اور یہی بات انہیں آفاقی شاعر بناتی ہے۔ غالب کے عہد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے،ڈاکٹر جمیل جالبی نے غالب کے عہد کے دیگر شعراء شاہ نصیر اور ذوق کے اثرات کے ساتھ ساتھ سید احمد شہید کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔

دوسرا باب غالب کی جامع سوانح، اہم واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ غالب کی ولادت، تعلیم، آغازِ شاعری، شادی، پینشن کے قضیے، کلکتہ کے ادبی معرکے، برہانِ قاطع کے معرکے، مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی وغیرہ پر تفصیل سے تاریخی شواہداور دستاویزات کی بنیاد پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کی سوانح اور دیگر امور سے متعلق معلومات کو تحقیقی بنیادوں پر اہم تاریخی دستاویزات کی روشنی میں قلم بند کیا گیاہے۔غالب کی زندگی ان کی پینشن کامسئلہ ایک بہت اہم مسئلہ جو لمبے عرصے تک انکے لئے کرب اور پریشانی کا باعث بنا رہا۔ غالب کی پینشن کے قضیے کے متعلق تمام معاملات کو بتدریج تاریخی شواہد کی روشنی میں غالب کی زبان اور الفاظ میں پیش کیاگیا ہے جس سے اس قضیے کے تمام پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔غالب کی زندگی میں کلکتہ کاادبی معرکہ بھی بہت اہمیت کاحامل ہے۔ مرزا افضل بیگ کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں جس نے پینشن کے معاملے میں مرزا غالب کی مخالفت کی بلکہ کلکتہ کے ادبی حلقوں میں مرزا غالب کے حوالے سے افواہیں بھی پھیلائیں تا کہ ان کی ادبی حیثیت کو متنازعہ بنایا جا سکے۔ کلکتہ کے ادبی معرکے کی تفصیل بیا ن کرنے کے بعد ان کی قماربازی اور گرفتاری کے واقع اور اس کے غالب پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

غالب کی زندگی کا ایک اور اہم واقعہ ''برہانِ قاطع' ' کے جواب میں ''قاطع برہان'' کی تصنیف تھا۔ غالب کی اس تصنیف نے ادبی حلقوں میں خوب مدّوجزر پیدا کیا۔ ڈا کٹر جالبی نے '' برہان قاطع'' کے حوالے سے نہ صرف غالب کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے بلکہ '' برہان قاطع'' کے دیگر ناقدین مثلاً سراج الدین علی خان آرزو، ڈاکٹر نذیر احمد کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ (۱۱۶)ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتب کی فہرست اور تعارف بھی پیش کیا ہے جو قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئیں اسی طرح ان کتب کا تعارف بھی درج کیا ہے جو ''قاطع برہان''کے دفاع میں تحریر کی گئیں۔باب کے آخر میں غالب کی زندگی کے ایک اور اہم قضیے'' مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی''کے اہم پہلوؤں کو تاریخی شواہد کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ غالب کی سوانح اور ان کی زندگی کے اہم واقعات کے لحاظ سے یہ باب بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عرق ریزی سے غالب کی زندگی کے اہم گوشوں کو تحقیقی شواہد کی روشنی میں بیان کرکے ان واقعات کی درست تصویر کشی کی ہے جو انہیں دیگر مؤرخین سے ممتاز کرتی ہے کسی بھی ادیب اور شاعر کی زندگی کے واقعات کے حوالے سے یہ تحقیق طلب گوشے کے متعلق مفید تحقیقی مواد کی فراہمی ان کی تاریخ کو وقیع بناتی ہے۔

تیسرا باب ''سیرت، شخصیت اورمزاج''کے عنوان سے ہے۔ غالب کی زندگی کے اہم واقعات کے تجزیے کے بعد یہ باب ان عصری، تہذیبی، معاشرتی اور غالب کی زندگی کے ذاتی حوادث پر

روشنی ڈالتا ہے جو ان کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج پر بھی اثر انداز ہوتے۔ غالب کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو آشکار کرنے کے لئے ان کے خطوط، شاعری اور حالی کی ''یادگارِ غالب'' سے حوالے درج کئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی غالب کی شخصیت کے جن اہم پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہیں ان میں غالب کی مصائب سے لڑنے کی خصلت، مذہب اور سماج کے حوالے سے تشکیک کا روّیہ، غالب کی آزادروی،ظرافت، انانیت،خودآگاہی وغیرہ شامل ہیں۔چوتھے باب میں غالب کی اردو اور فارسی تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ''دیوان غالب '' کی مختلف ارتقائی شکلوں کے حوالے سے مفید معلومات بیان کی گئی ہیں۔ غالب کے ایک نایاب رسالے '' رسالہ فنِ بانک''جو کہ ایک اردو رسالے کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے،کے متعلق بھی مفید معلومات درج کی گئی ہیں۔ غالب کی وفات کے بعد غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔پانچویں باب میں ''اردو شاعری کے مطالعہ'' کے عنوان سے غالب کی اردو شاعری کا تنقید ی محاکمہ پیش کیا گیا ہے غالب کی شاعری پر معاصرین کے اثرات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے اہم موضوعات اور ان موضوعات کے حوالے سے غالب کے نقطۂنظر کو ان کی شاعری کے حوالوں سے بہت عمدگی سے بیا ن کیا گیا ہے۔غالب کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے ایک اہم پہلو یعنی ان کی فلسفیانہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض مبا حث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مثلاً فلسفی شاعر سے کیا مراد ہے؟ اور کن بنیادوں پر غالب کو فلسفی شاعر قرار دیا ہے ؟ ڈاکٹر جمیل جالبی نے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ یورپ میں فلسفیانہ ادب کی ابتداء اور رحجانات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مغرب کے ادبی فلسفیوں کے نظریات کا غالب کے نظریات کا موازنہ پیش کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> ''غالب نے اپنی شاعری میں فکر و فلسفہ کو اس درجے پر پہنچایا ہے جس پر گوئٹے نے یورپ کو اپنی شاعری سے پہنچایا تھا۔ غالب کا فلسفہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر الہامی ہے اور اس کا اہم ثبوت یہ ہے کہ جو فلسفیانہ باتیں انہوں نے اپنی شاعری میں کہی ہیں ان میں سے ہر قسم کا فلسفہ دیکھا جا تا ہے اور دیکھا جاتا رہے گا''۔(جلدچہارم،ص۱۳۸)

پانچویں باب کے حصہ (ب) میں غالب کے طرز ادا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں غالب کی اہمیت کا ایک سبب ان کی زبان کے حوالے سے ''خلاّقی'' بھی ہے۔ غالب کی زبان پر ان کے ناقدین مختلف آراء کا اظہار کرتے ہیں ایک بات جس پر سب ناقدین متفق ہیں وہ ان کا طرزِ ادا

اور اندازِ بیان ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس حوالے سے ان کی شاعری کا بھر پور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق غالب نے اپنی نئی زبان کی بنیاد فارسی پر رکھی لیکن اردو زبان کے بنیادی مزاج اور خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا۔ اردو زبان کی ساخت پر اثر ڈالا بلکہ تراکیب کے وضع کرنے اور نثری جملوں کی تعمیر میں جدت پید اکی۔ اردو زبان میں فکر ی بلندی، تہداری، گہرائی اور لطافت پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے غالب کی جدت ادا اور طرزبیان کے حوالے سے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے اس باب کے اگلے حصے میں اردو زبان وادب پر غالب کے اثرات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو غزل پر غالب کے اثرات کا تجزیہ کرنے کے بعد ان شعراء کا ذکر کیا ہے جن کے ہاں غالب کے اثرات بآسانی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

چھٹے باب میں ''غالب کی فارسی شاعری'' کے عنوان کے تحت غالب کے قصیدوں، فارسی غزل، فارسی مثنویات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔فصلِ اول کے پہلے حصے کا آخری باب ''غالب کی اردو نثر نگاری'' کا احاطہ کرتاہے اردو نثر نگاری میں غالب کے خطوط ان کے ترجمان ہیں۔ باب کی ابتداء میں خطوط غالب کے مختلف مجموعوں کی تفصیل فراہم کی گئی ہے جو کہ ان کی زندگی میں اور ان کے بعد شائع ہوئے۔ دوسرے حصے میں خطوطِ غالب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنیاد پر خطوط غالب اردو نثر میں اہم مقام رکھتے ہیں خطوط غالب کے مختلف ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوانحی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط کے موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی انہیں تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) ذاتی معاملات (۲) عام حالات(۳) ادبی و علمی امور۔پہلی اور دوسری قسم کے خطوط غالب کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے عصری حالات کو اجاگر کرتے ہیں جبکہ تیسری قسم کے خطوط میں مختلف ادبی مباحث، لفظ وزبان کی باریکیوں اور شعری عمل کے حوالے سے مختلف امور کا بیان ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی غالب کے خطوط کو ان کی تاریخی، سوانحی اور ادبی اہمیت کے لحا ظ سے اردو نثر میں بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ غالب کے خطوط کی روشنی میں غالب کی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے انکے عہد کے ادبی رحجانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خطوط غالب کے تجزیے سے ان کی جن خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے ان میں سادہ نویسی، مدعا نویسی، مکالماتی انداز، ڈرامائی عنصر، بے ساختگی،جزئیات کا بیان، واقعیت، مختلف صنعتوں کا استعمال، علمی وادبی مباحث کا ذکر، ظرافت اور شگفتگی بالخصوص قابل ذکر ہیں۔باب کے آخر میں غالب کے خطوط کی زبان اور اس میں انگریزی زبان کے اثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ غالب کی

نثر کے حوالے سے رقم طراز میں؛’’غالب ؔکی نثر میں اتنے موضوعات اور اتنے پہلو بیان میں آئے ہیں کہ اتنی مشق اتنے رنگوں کے ساتھ اردو نثر نے اب تک نہیں کی تھی‘‘۔ (جلد چہارم،ص۱۹۲)

غالبؔ کی نثر کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا درج ذیل بیان بھی اہمیت کا حامل ہے جس میں غالب ؔکی زندگی کے المیے کی طرف بھی اشارہ موجود ہیں:

> ’’وہ شخص جو اپنی شعری عظمت پر نازاں اور زمانے کی ناقدردانی سے ہمیشہ نالاں رہا اپنے اردو خطوط کی وجہ سے مقبولیت اور قدردانی کی بلند منازل تک جا پہنچاتھا.......جس شاعر کی ابتدائی تخلیقی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ابلاغ تھا جس کا قاری اس کی شاعری کے ابلاغ سے تقریباً محروم رہتا تھا۔ اسی شاعر کی تخلیقی زندگی کے آخری دور میں قاری کے ساتھ مکمل ابلاغ کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ ان ادوار میں یہ رشتہ نثر کے حوالے سے استوار ہو سکا تھا ‘‘۔(۱۱۷)

فصلِ اول کے دوسرے حصے میں دوسرے بڑے شعراء کے عنوان کے تحت سب سے پہلے جس شاعر کی سوانح اور کلام کا جائزہ لیا گیا ہے وہ ’’شاہ نصیر ‘‘ ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مختلف حوالوں سے شاہ نصیر کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے معاصرانہ شہادتوں اور قیاس کی بناء پر ان کا سالِ ولادت ۱۱۷۵ھ مقرر کیا ہے۔ شاہ نصیر کی شعر گوئی کے حوالے سے ان کے معاصرین کے بیانات درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ شاہ نصیر کے ادبی معرکوں کی تفصیل بھی خاصی دلچسپی کی حامل ہے۔ بالخصوص شاہ نصیر اور ذوق کے درمیان پائی جانے والی رنجش اور اس کی وجوہات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیاہے۔ شاہ نصیر کی وفات کے بعد ان کے شائع شدہ دوادین کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ نصیر کے حوالے سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شاہ نصیر ناسخ سے تقریباً دس سال بڑے تھے اور جس طرزِ جدید کی بنیاد ناسخ نے رکھی تھی، شاہ نصیر اس سے پہلے ہی سے اختیار کرچکے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ نصیر کی شاعری کا تجزیہ ان کے عہد کے حوالے سے کرتے ہوئے ان کی شاعری کے موضوعات اور زبان وبیان کا عمدہ تجزیاتی مطالبہ پیش کرتے ہوئے اردو زبان کے حوالے سے ان کے تصرّفات پر روشنی ڈالتے ہیں اور انہیں ایک رحجان ساز شاعر قرار دیتے ہیں بقول جالبی:

> ’’شاہ نصیر ’’ آب دار مضامین ‘‘ کے موتی تلاش کرنے اور بول چال کی زبان میں انہیں پیش کرنے کو شاعری کا اصل الاصول جانتے تھے۔

انہیں قدرت نے ایسی غیر معمولی صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ روانی و برجستگی کے ساتھ ساتھ باریک سے باریک بات اور اچھوتے سے اچھوتا خیال آسانی سے بیان کر دیتے تھے۔ ایسی سنگلاخ زمینوں میں جہاں معنی کے لئے راستہ طے کرنا ناممکن ہو، وہ اسے ممکن بنا دیتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں کے وہ بادشاہ تھے''۔(جلد چہارم،ص۲۱۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ نصیر کی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی صلاحیت کے حوالے سے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اسے شاہ نصیر کی دستکاری و ہنر مندی قراردیا ہے۔ شاہ نصیر کی شاعری میں محاورہ بندی، تراکیب سازی،رعایت لفظی اور ضائع بدائع کے استعمال اور زبان دانی کے حوالے سے بالخصوص ان کی شاعری کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ ان سب خصوصیات کے باوجود ڈاکٹرجالبی، شاہ نصیر کو ''خارجیت '' کا شاعر قراردیتے ہیں۔شاہ نصیر کے حوالے سے دیگر ناقدین کی رائے جا ئزہ لیا جائے تو کم وبیش تمام ناقدین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ شاہ نصیر کی شاعری ایک لسانی کھیل کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹرتنویر احمد علوی کے مطابق:

''شاہ نصیر شعری مواد یعنی فکروخیال سے زیادہ دلی کے طرزِ ادا کا شاعر ہے''۔(۱۱۸)

بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''شاہ نصیر کے ہاں غزل میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو تغزل ہی ہے۔ تغزل ہی کے فقدان کے باعث ان کی غزل تاریخ ادب کے اوراق میں اسلوبیاتی تجزیے کے طور پر محفوظ ہے''۔(۱۱۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ نصیر کے لسانی تصرّفات کو اردو زبان کے حوالے سے اہم قرار دیتے ہیں۔ باب کے آخر میں شاہ نصیر کی شاعری کا لسانی تجزیہ بہت عمدگی سے پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتاہے کہ اردو زبان کسی طرح اپنا روپ بدلنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی بالخصوص بدلتے ہوئے سیاسی اور تہذیبی منظر نامے میں انگریزی زبان کے الفاظ اردو زبان کا حصہ بن رہے تھے اور یہ رحجان شاہ نصیر کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔

اس حصے کے دوسرے باب کا عنوان ''شیخ محمد ابراہیم ذوق''ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مختلف حوالوں سے ذوق کی تاریخ پیدائش کا جائزہ لیتے ہوئے محمد حسین آزادؔ کے بیان کردہ سال پیدائش ۱۲۰۴ھ کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ محمد حسین آزادؔ نے اس حوالے سے کوئی سند پیش نہیں کی۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی خود '' دہلی اردو اخبار ''اور سلطان الاخبار کلکتہ '' کے حوالے سے ۱۲۰۳ء

متعین کرتے ہیں۔ ذوق کے ابتدائی حالات تحقیقی حوالوں سے پیش کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد حسین آزاد کے حوالے سے ذوق کو دیے گئے ''خاقانیٔ ہند اور ملک الشعراء خان بہادر'' کے خطابات ملنے کے دعووں کو بھی رد کرتے ہیں۔ ذوقؔ نے اپنی زندگی اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا تھا ان کی وفات کے بعد جو دیوان مرتب کئے گئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کی تفصیل پیش کی ہے۔ ظہیر دہلوی کے مرتب کردہ دیوان ''نگارستانِ سخن '' کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ اس میں موجود کلام ذوق کے رنگِ سخن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اپنے قیاس کی تائید میں عابد پشاوری کی کتاب 'ذوق اور محمد حسین آزاد' سے ان کے بیان کا حوالہ بھی درج کیا ہے۔ذوق کے کلام کی تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد حسین آزادؔ کے حوالے سے تاریخی شواہد اور دلائل سے آزادؔ کے دیگر محققین کی آراء کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آزاد کے تصرّفات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس جائزے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزاد کے ان تصرّفات نے کلامِ ذوق کو مشکوک بنا دیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذوقؔ کے حالات اور شعروفن کا مطالعہ کرتے ہوئے ان سے منسوب مشکوک کلام کو نظر انداز کردیا ہے۔ تاریخ ادب میں ذوق کے حالاتِ زندگی اور شاعری کا مطالعہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ بہت کم ایسے شعراء ہوتے ہیں جو اپنے عہد میں عظیم ترین شاعر تسلیم کئے جائیں اور پھر بدلتے ہوئے ادوار میں اپنی حیثیت گنوا بیٹھیں حتیٰ کہ رشید حسن خان جیسے محقق و نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:'' مومن آور غالبؔ کے مقابلے میں غزل گوئی کی حد تک ذوق کا نام بھی گناہ ہے''۔ (۱۲۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذوق کی شاعری کے تجزیے میں ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے عظیم شاعر ہوتے ہوئے آنے والے ادوار میں اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔ بقول جالبی:

> ''اگر یہ سوال کیا جائے کہ ذوقؔ اس دور میں سب سے بڑے شاعر کیوں تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اسی روایت کی ترجمانی کررہے تھے جو موجود تھی اور جس میں ابھی تک شاعری دین کے تصورات اور اس کی ما بعد الطیعات سے الگ نہیں ہوئی تھی۔ ذوق کی شاعری اسی ما بعد الطیعات کی ترجمان ہے اور قلعۂ معلی اسی تہذیبی روایت کا پاس دار۔اسی تہذیب کا تصورِ حقیقت کس طرح تخلیقی طور پر ذوق کی شاعری میں رنگ بھرر ہاتھا ''۔(جلد چہارم،ص۲۵۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذوقؔ کے کلام سے ان عناصر کی مثالیں پیش کی ہیں جن کی بنیاد پر ذوقؔ کو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ بالخصوص زبان کے حوالے سے ذوقؔ کے تصرّفات کی نشاندہی کرتے ہوئے ناسخ اور شاہ نصیر کے ساتھ موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ذوق کے ہاں خالص اردو زبان کے استعمال کو ذوق کی انفرادیت قرار دیتے ہیں اردو کے جدیدمعیاری روپ کو ذوق کی دین قراردیا ہےڈاکٹر جمیل جالبی، ذوق کے قصائد کے تجزیے کے ضمن میں بھی مصدّقہ قصائد ذوق کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ''دیوانِ ذوق'' مرتبہ محمد حسین آزاد میں درج پہلے بارہ قصیدوں کو آزاد کی اختراعات قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذوق کے کا قصیدے کے اجزائے ترکیبی کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور قصیدے کے ہر جزو کے حوالے سے ذوق کے قصائد کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں آپس میں مکمل طور پر ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ ذوقؔ کی رباعی کا جائزہ لینے کے بعد قطعات کے تجزئیے میں ان کے قطعے ''شبِ تنہائی ''کو جدید اردو نظم کی پہلی مثال قرار دیا ہے۔ ذوق کے 'سہرے' کا تجزیہ کرتے ہوئے غالب اور ان کے درمیان پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ذوق کے سہرے کو سہرے کے رنگ ومزاج کے حوالے سے بہتر قرار دیا ہے۔ ذوق کی ایک غزل جس میں انہوں نے اپنے دور میں چلنے والی سیاسی تحریک (سید احمد شہید کی تحریک آزادی)کو موضوع بنایا ہے،ڈاکٹر جمیل جالبی اس غزل کو اس لئے اہم قرار دیتے ہیں کیونکہ اسی غزل کی وجہ سے ڈاکٹر منظور حسین کو سید احمد شہید کی تحریک آزادی کے حوالے سے اردو شاعری کا مطالعہ کرنے کا خیال آیا۔(۱۲۱)ذوق کی شاعری کا لسانی مطالعہ ان کے ہاں الفاظ کے استعمال کی مختلف صورتوں اور متروکات کی نشاندہی کرتا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان'' بہادر شاہ ظفر،آخری مغل بادشاہ،نامور شاعر ''ہے۔ بہادر شاہ ظفر جو کہ ایک مغل فرماں روا تھے۔ ان کے سوانحی حالات و واقعات کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد کے سیاسی حالات کی تصویر کشی بھی نہایت عمدگی سے کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو مخصوص واقعات کے حوالے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہادر شاہ ظفر کے دواوین کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے پانچ میں سے ایک دیوان کو ناپید قرار دیاہے اور بقیہ چار کے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تصنیف 'خیابانِ تصوّف' (جو کہ شیخ سعدی کے گلستان کی فارسی زبان میں تشریح پر مشتمل ہے)کا ذکر کرنے کے ساتھ ان کی ایک اور تالیف ''تالیفاتِ ابوظفری''(جو کہ لغت واصطلاحات دکن پر مشتمل ہے) کو بھی دیوان پنجم کی طرح نایاب قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیقی انداز میں اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے (جو بقول جالبی،محمد حسین آزاد نے پھیلائی) کہ بہادر شاہ ظفر کا کلام

ان کے استاد ذوق کا کلام ہے۔ اپنے تفصیلی تجزیے میں دیگر محققین، ناقدین کی آراء کے ساتھ ساتھ داخلی شواہد کی بنیاد پر محمد حسین آزاد کے اس دعوے کو رد کیا گیا ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے نہ صرف آزاد کی نادانی پر محمول کیا ہے بلکہ حکومت وقت (انگریز حکمران)کو بھی اس سازش میں شریک قرار دیا گیا ہے جس کا مقصد رعایا میں بہادر شاہ ظفر کی مقبولیت اور قدردانی کو کم کرنا تھا۔ باب کے بقیہ حصے میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے مزاج اور موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو ان کی آپ بیتی قرار دیتے ہیں جو نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، معاشی ومعاشرتی حالات کی عکاس ہیں بلکہ ان کی شاعری کے فنّی عناصر کو سمجھنے میں بھی معاون ہیں۔

چوتھا باب ''محمد مومن خان مومن'' کے عنوان کے تحت مومن کے حالاتِ زندگی، عصری حالات، مطالعۂ کلام اور لسانی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تذکرہ نویسوں کے بیان کردہ سالِ ولادت کو رد کرتے ہوئے معاصرانہ شہادتوں اور داخلی شواہد کی بنیاد پر ۱۲۱۴ھ کو سالِ ولادت قرار دیا گیا ہے۔ مومن ؔکے حالات زندگی اور اہم واقعات کے نتیجے میں ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے مومن ؔکے دیوان کے متعلق فراہم کی گئی ہے۔مومنؔ کی تصانیف کا تفصیلی تعارف وتجزیہ اس باب کا اہم حصہ ہے۔ مطالعہء شاعری کے ضمن میں مومن کے قصیدوں، واسوخت، تاریخ گوئی، رباعیات، مثنویات، غزل کا تجزیاتی مطالعہ شامل باب ہے۔ مومن کی تاریخ گوئی کے حوالے سے تعمیہ و تخرجہ کو مومن کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ مومن نے کل ۱۲ مثنویات لکھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مومن کی مثنویات کو ان کی آپ بیتیاں قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی مومن کی مثنویوں کے حوالے سے ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں؛''مومن اردو کے واحد شاعر ہیں کہ جن کی حیاتِ معاشقہ کے واقعات سچائی کے ساتھ مثنویوں کی صورت میں موجود ہیں''۔(۱۲۲)

مومن کی مثنویوں کے مطالعے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ نتیجہ اخذکیا ہے کہ یہ مثنویاں، مثنوی کی روائتی ہئیت سے انحراف کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ مومن کی مثنویوں پر غزل کا مزاج نمایا ں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مومن کی مثنویوں کو واقعاتی مثنویاں قرار دیتے ہیں اثر لکھنوی اور عطاء اللہ پالوی کی مثنویوں کو مومن سے متاثر مثنویاں قرار دیتے ہیں۔مومن کی غزل کا مطالعہ انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مومن کی غزلوں کے حوالے سے ان پر ان کے معاصر شعراء بالخصوص ناسخ ؔکے اثرات کی نشاندہی کی ہے بقول جالبی ''مومن،ناسخ کے اثر سے کبھی آزاد ہی نہیں ہوئے''۔(جلد چہارم،ص۳۵۶)

مومن کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مومن کی غزل میں عشقیہ رحجانات، جمال پسندی، رنگا رنگ کیفیات کی عکاسی،تخلص کا معنی خیز استعمال، غنائیت، زبان وبیان پر قدرت،تمثال نگاری جیسی خوبیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مومن کی شاعری کے لسانی مطالعے کے ضمن میں الفاظ کی مختلف صورتوں، واحد جمع کی مختلف صورتوں اور متروک الفاظ کے استعمال کا جائزہ لیا گیاہے۔

پانچواں باب ''مصطفی خان شیفتہ'' کے احوال و آثار کا مطالعہ پیش کرتا ہے نواب مصطفی خان کے تذکرے ''گلشنِ بے خار'' اردو دیوان کے دیباچے میں بیان کردہ عبارت کے تجزیے سے سال ولادت ۱۲۶۴ھ متعین کیا گیا ہے۔شیفتہ کے عہد کے تہذیبی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی سوانح اور زندگی کے اہم امور کے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں بالخصوص ان کے عشق اور سفرِ حج، تالیفِ قلب کے حوالے سے تفصیل سے معلومات فراہم کی گئی ہیں اور ان کے کلام سے اہم شواہد بھی پیش کئے گئے ہیں۔شیفتہ کی شخصیت اور حالات کے تجزیے میں سب سے پہلے ان کے تذکرے ''گلشنِ بے خار'' سے مدد لی گئی ہے۔ ان کی ناقدانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رائے دیتے ہیں کہ شیفتہؔ طبقہ خواص سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ڈاکٹر جمیل جالبی اور ان کی میر حسن اور نذیر اکبر آبادی کے متعلق دی گئی آراء کو ان کے طبقاتی شعور کا اثر قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ان کا تنقیدی شعور وقت کے ساتھ ساتھ پختگی اختیار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،شیفتہ کو اپنے عہد کی ایک اہم تہذیبی شخصیت قراردیتے ہیں کیونکہ اعلیٰ طبقے سے متعلق رکھنے کے باوصف ان کی شخصیت، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور تہذیبی رچاؤ کا عمدہ نمونہ تھی وہ ایک طرف مغل تہذیب کے زوال کے شاہد تھے تو دوسری طرف آنے والے دور کے درمیان کی کڑی تھے۔ گلشنِ بے خارکے تعارف کرواتے ہوئے اس تذکرے کی تکمیل کے مراحل، مختلف مرتبین کا جائز ہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان تذکروں کی نشاندہی کی ہے جو '' گلشن بے خار''لکھتے ہوئے شیفتہ کے پیش نظر تھے جب کہ شیفتہ نے خود کہیں بھی اس استفادے کا ذکرنہیں کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے شیفتہ کے تذکرے کی تحقیقی تسامحات کے نشاندہی بھی فرمائی ہے شیفتہ کی تنقید نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؛''شیفتہ کی تنقیدی نظر اس لئے کمزور ہے کہ اس میں دبے دبے ذاتی تعصبات، ان کا طبقاتی مزاج، ان کی ذاتی پسند نا پسند اور شاملِ تذکرہ شعراء کے کلام سے پوری طرح نا واقفیت شامل ہے''۔(جلد چہارم،ص۳۹۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیفتہ کی تنقیدی آراء کا تجزیہ بھی کیا ہے جب کہ پچھلے صفحے ۳۹۳ پر وہ بطور تذکرہ نگار شیفتہ کی رائے کو اس لئے اہمیت دینے کو تیا ر نہیں کیونکہ تذکرے انتخابِ

کلام کے لئے مختص کئے جاتے ہیں۔تنقیدی آراء کے لئے نہیں۔ شیفتہ کے سفرِحج کے سفر نامے ’’رہِ آورد‘‘ اور دیوانِ رقعات فارسی اور کلیاتِ شیفتہ اور حسرتی کا جائزہ لیا گیا ہے۔شیفتہ کی شاعری کے حوالے سے ان کی تصوّرِ شعر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیفتہ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے موضوعات کے ساتھ ساتھ، میر،مومن، غالب، ناسخ کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے شیفتہ کی شاعری پر ’جدید شاعری‘ کے اثرات کے تجزیے کے بعد ان کے کلام کا لسانی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

فصلِ اوّل کے تیسر ے حصے میں ’’ چند اور ممتاز شعراء‘‘ کی ذیل میں سید علی غمگین دہلوی، میر نظام الدین ممنون دہلوی، نواب محمد اصغر خان علی خان نسیم دہلوی، میرمہد ی حسین مجروح، قربان علی بیگ سالک، قلق میرٹھی، نظام رام پوری، ظہیر دہلوی اور انواری دہلوی کے احوال و آثار پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔سید علی غمگین (جو کہ غالب کے پیر ومرشد تھے) کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ غالب غمگین کی غزل کی زمین میں غزل کہتے رہے جبکہ شواہد کی بنیاد پر بتا یا گیا ہے کہ غالب کی غزلیں، غمگین کی غزل سے پہلے شائع ہوکر سامنے آچکی تھیں۔ میر نظام الدین ممنون دہلوی کے حالات زندگی بیان کرنے کے میدان کے کلیات کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ممنون کی شاعری کو اپنے عہد کی روایتی شاعری قراردیا گیا ہے جبکہ لسانی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی، ممنون کی زبان کو اٹھارہویں صدی کی زبان کے زیر اثر قراردیتے ہیں۔ نواب محمد اصغر علی خان نسیم دہلوی کے حالات، شخصیت کے تجزیے کے بعد ان کی تصانیف کا تجزیہ کرتے ہوئے کلیاتِ نسیم اور ’’ الف لیلیٰ نومنظوم ‘‘کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔غز ل کے تجزیے میں ان کی غزل کے موضوعات پردہلوی اور لکھنوء اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

میر مہدی مجروح بطور شاعر اپنے عہد میں شہرت حاصل کرنے کے علاوہ، غالب کے بہت سے مکاتب کے مکتوب علیہ ہونے کے حوالے سے بھی اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مجروح کی شاعری کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے موضوعات اور فنی عناصر کا تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مجروح کی شاعری پر غالب کے اثرات کے بجائے شاہ نصیر،ذوق اور ممنون کے زیر اثر ہونیکی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مجروح کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے اسے قابلِ رشک قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی تصانیف کا محض مختصر تعارف پیش کیاگیا ہے۔جس سے ان کی نثر کی خصوصیات پر روشنی نہیں پڑتی۔

قربان علی خان بیگ سالک کے سوانح حالات بیان کرتے ہوئے انکے عہد کے اہم واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے قربان علی بیگ سالک،مولانا مودودی کے نواسے تھے ان کی سالِ ولادت کے تعین میں حسب دستور، معاصرانہ شہادتوں اور داخلی شواہد کی بنیاد پر ۱۲۴۰ھ متعین کیا ہے۔ جبکہ ۱۲۹۷ھ کو سالِ وفات قرار دیتے ہوئے سالک کے کلام کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے کلام کے تجزیے کے بعد انہیں اپنے عہد کے مخصوص رنگِ سخن کے روایتی شاعر قرار دیتے ہیں سالک کی شاعری پر غالب اور مومن کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

غلام محمد مولیٰ قلق میرٹھی کے باب میں تحقیقی شواہد کی بنیاد پر ان کے سوانحی حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ''جواہرِ منظوم '' جو کہ قلق کی انگریزی نظموں کے منظوم اردو ترجموں پر مشتمل کتاب ہے، کو ڈاکٹر جمیل جالبی نظم گوئی کے رواج کا پہلا قدم قراردیتے ہیں''جواہرِ منظوم '' کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''جواہرِ منظوم'' انگریزی شاعری اور نظم نگاری کے روایت کی پہلی کڑی ہے اس لیے اوّلیت کی اہمیت سے اسے ہمیشہ حاصل رہے گی یہی روایات آزاد، حالی،اسماعیل میرٹھی اور پھر اقبال سے ہوتی ہوئی نئی نسل کے شعراء میں مقبول ہوئی اور نظم نگاری کا رواج عام ہو گیا،''(جلد چہارم،ص۴۸۳)

''کلیاتِ قلق '' کے حوالے سے قلقؔ کے کلام سے مختلف اصناف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے قلقؔ کی وضع کردہ تراکیب کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے علاوہ لسانی مطالعے کی ذیل میں قلقؔ کے کلام میں غرابتِ الفاظ کی نشاندہی کرتے ہوئے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ سید نظام شاہ، نظامؔ رام پور ی کے سوانحی حالات بیان کرنے کے بعد ان کے کلام کی اشاعت کے حوالے سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نظامؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کلام میں میرؔ کے رنگ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق '' یہ مشابہت محض طرز ادا تک محدود ہے۔ میر کے جذبات کی رفعت،تہ داری اور دل نشینی نظامؔ کے بس سے باہر ہے ''۔(جلد چہارم،ص۴۹۵)ڈاکٹر جمیل جالبی نظامؔ کی شاعری میں معاملہ بندی، ادا بندی کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ''ڈوبتے سورج کی تہذیب کا تماشا '' قرار دیتے ہیں۔ نظامؔ کی شاعری کے لسانی مطالعے کی ذیل میں پرانی اور مقامی زبان کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی کے سوانح حالات بیا ن کرتے ہوئے تحقیقی شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے عہد کے حالات و واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غدر کے بعد دلی کو چھوڑ کر مختلف جگہوں پر قیام کرنے کے بعد ٹونک میں اقامت پذیر ہوئے۔ یہ دو ر ان کی تخلیقی زندگی کے حوالے سے بہت اہم قرار دیا گیا ہے۔ ظہیر کی مختلف تصانیف کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی خود نوشت سوانح '' داستانِ غدر'' کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ''داستان غدر'' کو بیان کردہ واقعات اور تہذیبی مرقع کشی کے علاوہ زبان وبیان کے لحاظ سے اردو نثر میں ایک شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ ظہیر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ناسخ کے '' طرز جدید '' کے اثرات کے ساتھ ساتھ مومن ؔکے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ظہیر کی شاعری میں ''طرز جداگانہ '' کی سعی کی کمی دیکھتے ہوئے اسے، ڈاکٹر جمیل جالبی ظہیر کی مراثی کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں مراثی کی روایت کی تکرار کا شاعر قرار دیتے ہیں۔

''سید شجاع الدین انور دہلوی ''کے سوانح حالات قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے شخصیت کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے مزاج پر اضطراب اور شورشِ دماغ کا اثر قرار دیتے ہیں ان کی شاعری پر غالب ومومن کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''انورؔ نے مومن و غالب کے رنگ کو اس لئے اختیار نہیں کیا کہ وہ صرف ان جیسا شعر کہنا چاہتے تھے بلکہ یہ سارا عمل ان دونوں محبوب و پسندیدہ شاعروں کے طرزوں کو ملا کر پنا جداگانہ طرز نکالنے کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ طر ز کی جدت انورؔ کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہے اور زورِ بیان، نازک خیالی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی اس طرز میں رنگ بھرتے ہیں''۔(جلدچہارم،ص۵۳۵)

فصلِ دّوم اردو مرثیہ کی روایت، ارتقاء اور مرثیہ کے حوالے سے اہم شعراء کے کلام کے تجزیے کے متعلق ہے یہ فصل کل تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ فصل کے پہلے حصے میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلا باب میں اردو مرثیے کی روایت اور ارتقاء کا جائزہ اس عہد کے اہم مرثیہ گو شعراء کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ یہ باب اس فصل کا تمہیدی باب ہے لہذا اس باب میں مرثیہ کے ارتقاء کے حوالے سے اس عہد کے تہذیبی اور معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد پر بھی بطو ر خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق اردو میں مرثیوں کا سراغ سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔ اٹھارہویں صدی تک اردو مرثیے کی

خاص ہیئت مقرر نہیں کی گئی تھی۔ مثنوی،مثلث، مربع اورمخمس کی ہیئت میں مرثیے لکھے جاتے رہے لیکن بتدریج مسدس کو ہیئت کے طور پر مخصوص کردیاگیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی دکن میں مرثیے کے ارتقاء کا جائز ہ لیتے ہوئے اس کے موضوعات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔دسویں صدی ہجری اور اس کے بعد میں مرثیے کے موضوعات میں بتدریج جوارتقاء اور تنوع نظر آتا ہے، اسے اس عہد کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بقول جالبی:

> ''مرثیے کی تاریخ شاہدہے کہ مرثیے میں تخیل کی پرواز سے مرثیہ گویوں نے جزئیات میں جا کر نئے نئے قصے کہانیا ں بنائی ہیں اور واقعۂ کربلا کو داستانی رنگ دے کر اس میں انیسویں صدی اور خصوصاًلکھنوء اور دہلی کی معاشرت وکلچر کو سمو دیا ہے''۔(جلدچہارم،ص۵۴۶)ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں ''لکھنوء کی مجلسی تہذیب کو الگ کرکے ہم مرثیہ کی ساخت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے تہذیبی اسلوب سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں''۔(۱۲۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ناقدین کے اس رویے کی بھی مذمت کرتے ہیں جس کے تحت مرثیہ گو شعراء کو ایک دوسرے پر فوقیت دینے کا رحجان پایا جاتا ہے۔

مرثیے کی روایت کے حوالے سے سب سے پہلے جس مرثیہ نگار کے سوانح اور کلام کا جائزہ لیا گیا ہے وہ میر مستحسن خلیقؔ ہیں۔ میرمستحسن خلیقؔ کا سالِ ولادت تحقیقی حوالوں اور قیاسی تحقیق کے ذریعے ۱۱۸۱ھ متعین کیا گیا ہے۔ خلیق کے کلام کے متعلق مختلف تذکروں سے حوالے پیش کئے گئے ہیں خلیق کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان کی غزل کا فکری وفنّی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ میر خلیق کے مرثیے اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان غیر مطبوعہ نسخوں کے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی ہے۔خلیق کے مرثیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ا ن کے مرثیوں کو ''رزم'' کی بجائے ''بین '' کے مرثیے قرار دیتے ہیں۔ خلیق کے مرثیوں پر لکھنوی تہذیب و معاشرت کے اثرات کی نشاندہی انتہائی دلچسپ انداز میں کی گئی ہے لسانی مطالعے کے ذیل میں میر خلیق کی شاعری سے متروکات کے استعما ل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مظفر حسین ضمیر کے سوانحی حالات قلم بند کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیقی جانفشانی کا مظاہر ہ کرتے ہوئے ضمیر کے سال ولادت متعین کرنے کے لئے معاصرانہ شہادتوں اور داخلی شواہد کا سہارا لیتے ہوئے ۱۲۰۱ھ کو سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ میر خلیق کی زندگی کے اہم

واقعات کے بیان کے بعد ان کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ضمیر کی مثنوی' معراج نامہ' کا تجزیہ کرتے ہوئے اس دور کے انسان کے منفی، فکری و مجہولی، مذہبی رّویوں کے مطالعے کے حوالے سے اہم قرار دیتے ہیں۔ضمیر کی ایجاد کردہ صنفِ سخن مرثیہ کا جائزہ لینے کے بعد ان کے مرثیوں کی ہیئت اور اجزاء کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ضمیر کے مرثیوں سے بوقت ضرورت مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ضمیر کو مرثیہ گوئی کی روایت میں اس لیے اہم قرار دیتے ہیں کہ ان کے مرثیوں میں، مرثیے اپنی داخلی ہیئت کو ایک ترتیب کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم اس عہد کو مرثیے کا ''دورِتعمیر'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :''دورِ تعمیر کے مرثیہ گویوں میں میر خلیق، فصیح دلگیر اور میر ضمیر کے نام لئے جاتے ہیں۔ مرثیہ کے اس دور میں ان حضرات کی سعی سے مرثیہ کی ساخت مکمل ہوئی اور ادبی لحاظ سے اس کے قد میں اضافہ ہو''۔(۱۲۴)

چوتھے باب میں '' چھنو لال دلگیر'' کی سوانحی حالات اور شخصیت کے بیان کے بعد ان مرثیہ گوئی کا جائز ہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ''کلیاتِ مراثی '' چھ جلدوں اور ۲۷۳۷صفحات پر مشتمل ہے جبکہ بہت سے کتب خانوں میں ان کے مراثی غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ دلگیر کے مراثی کی تعداد ۰ ۴۵ تک بیان کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود فن مرثیہ گوئی میں وہ قدیم اور مروّجہ روایت کی تکرار کرتے ہیں۔

پانچواں باب ''مرزا جعفر علی فصیح '' کے لئے مختص ہے مرزا جعفر کے مختصر سوانحی کوائف درج کرنے کے بعد ان کی تصنیفات کاجائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مرزا جعفر علی فصیح کے مرثیے کو '' رنگ تصوّف '' کی آمیزش کے باعث اپنے عہد کے مرثیہ نگاروں سے ممتاز قرار دیتے ہیں،جس کے نتیجے میں انسانی نفسیات اور اسلامی ما بعد الطبیعات کے اثرات مرثیے کے رنگ کو نکھارنے کا باعث بنے۔ روایتِ مرثیہ کی تکرار کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مرثیے کے مضامین میں دلچسپی پید اکرنے کے لئے مبالغے کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔

''اردو مرثیے کا نقطہء عروج''کے تحت باب اوّل میں میر انیسؔ کے سوانحی حالات، شخصیت اور مرثیہ نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے اس باب میں انیسؔ کی مرثیہ گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے عصری رحجانات اورعصری تہذیب کے اثرات کی نشاندہی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔انیس نے جس عہد میں مرثیہ نگاری شروع کی اسے دور لکھنو کی بہار کا آخر ی دور قرار دیا جا تا ہے اور شیعت لکھنو کی فضاپر بطور مذہبی رحجان کے غالب تھی۔مرزا دؔ بیر اور مرزا انیسؔ اس عہد کے بڑے مرثیہ گو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لہذا انیس کی مرثیہ گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کا حوالہ بھی ضرور دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ناقدین کے حوالے سے انیس اور دبیر کے

موازنے کے رحجان پر روشنی ڈالی ہے۔ انیس ؔ کی مرثیہ گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھنوی تہذیب کے ان عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے جو صنف مرثیہ کو قبول عام دلوانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس عہد کی لکھنوی تہذیب کو سیاسی لحاظ سے زوال پذیر لیکن شیعہ مذہب کی نشاۃ الثانیہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی میر انیس کے معیارِ شاعری کے تحت ہی ان کی مرثیہ گوئی کا تجزیہ کیا ہے، ''زبان'' اور طرِز اعجاز طرازی وسحرپردازی'' جس کی سب سے نمایاں خصوصیات تھیں۔میر ؔ کے چندمرثیوں کے ''چہروں'' سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر انیس ؔ کے تصوّرِ شاعری کی وضاحت کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرثیہ ''بطور صنف '' کے تجزیہ کرتے ہوئے اس کے مختلف حصوں پر قصیدہ، مثنوی،واسوخت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ میر انیسؔ کے مرثیوں کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز میں:

> ''میرانیس ؔ مرثیے میں ان تمام پہلوؤں کو برت کر اپنے طرز ادا سے جوان کامعیار شاعری ہے،ایک ایسا روپ دیتے ہیں کہ اس میں علم بیان ومعنی کے زیر اثر فصاحت و بلاغت کا دلکش رنگ اجاگر ہوجاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ ادا ایک طرف ان کے مرثیوں کوکمال پر لے جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ جدید اردو شاعری کے نیچرل رنگ سے بھی آ ملتا ہے ''۔(جلد چہارم،ص۶۱۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرثیہ گوئی کے حوالے سے خاص طور پر جن امور کو مدنظر رکھا ہے ان میں رزم نگاری، طرزِ اداقابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر انیس ؔکے سلام، رباعیات کا بھی عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ لسانی مطالعہ کی ذیل میں اصلاح زبان کی تحریک کے حوالے سے انیس ؔ کی شاعری کی زبان کا جائزہ لیا گیا ہے اس باب کے اگلے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے امداد امام اثر، احتشام حسین، ڈاکٹر ا حسن فاروقی کے حوالے سے ان مباحث کو بیان کیا گیاہے جو میر انیس کے کلام کے حوالے سے ان وقتاًفوقتاً سامنے آتے رہے۔(۱۲۵) اس حصے میں ان تینوں ناقدین کے نظریات ہی کو جگہ دی گئی ہے جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنا نقطہء نظر دینے سے گریز کیا ہے۔

باب دوّم میں ''مرزا سلامت علی دبیر'' کے سوانحی حالات، شخصیت اور کلام کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دبیرکے باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتب کابھی تذکرہ کیا ہے جو مرزا انیس اور مرزا دبیر کے حلیفوں نے محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' اور شبلی کی ''موازنہ انیس ودبیر'' کے جواب میں تخلیق کی گئیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے دبیر کے مرثیے کے مختلف مجموعوں کا تعارف

کرواتے ہوئے دبیر کے کلام میں الحاقی مراثی شامل ہونے کی نشاندہی کی ہے۔ مرزا دبیر کے سلاموں، مثنویات اور نثری تصنیف ’’ابواب المصائب ‘‘ کابھی جائز لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مرزا دبیر کے کلام کے تجزیے سے پہلے شبلی کی رائے پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی رائے پیش کرتے ہیں جس کے مطابق’’ ان دو شعراء کا تقابلی موازنہ اس لئے درست نہیں کہ یہ دو شاعر الگ روایتوں کے پیروکار تھے۔ میر انیس، میر حسن اور اپنے خاندان کی روایت پر چل رہے تھے۔ مرزا دبیر سود اور ناسخ کی رویت پر چل رہے تھے‘‘۔(جلد چہارم،ص۶۴۷)

اس رائے کو پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے دبیر و انیس کے مرثیوں کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان دونوں شعراء کے ’’ ادراک‘‘،’’ طرزِادا‘‘کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے:

’’مرزا دبیر کے ہاں شکوہِ الفاظ،بلند آہنگ مردانہ لہجہ اور مبالغہ آمیز ادراک سے وہ طرز وجود میں آیا ہے جو رزمیہ کا طرز ہے اورجسے ہم پر شکوہ اور شاندار طرز کہہ سکتے ہیں۔میر انیس کے رزمیہ حصوں میں مردانہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دوالگ الگ مزاج ہیں اور ان سے دو الگ الگ رنگ اور طرز پید ا ہوئے ہیں۔ میر انیس کے ہاں ’بزم‘ کا مزاج انہیں عظمت کی بلندیوں پر لے جاتا ہے اور مرزا دبیر کے ’’ رزم‘‘ کا مزاج ’’علویت‘‘ پید اکرتا ہے ‘‘۔(جلد چہارم،ص۶۵۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے بار بار اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ اردو مرثیے کا تجزیہ ’’تاریخ ادب‘‘ میں ادب وشعر کے تعلق ہی سے کررہے ہیں جیسا کہ مرزا رفیع سودا نے ’’سبیل ہدایت‘ ‘ اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے ’’مرثیہ نگاریاور میرانیس‘‘ میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔مرثیے کو فنِ شعرو شاعری کے حوالے سے پرکھنے کے حوالے سے ہی ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمام مرثیوں نگاروں کے ہاں واقعات کے بیان میں ’’ جذبا تیت‘‘ کے عنصر کی مذمت کی ہے۔

مرزا دبیر کی سلام ورباعی کا تجزیہ کرتے ہوئے ’’عبدالغفور نساخ کے’’ انتخاب نقص‘‘ کے حوالے سے دبیر کی فنی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔’’روایتِ مرثیہ کی تکرار ‘‘کے تحت میر ضمیر اور میر خلیق سے لے کر مرزا دبیر تک مرثیہ کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں آنے والی تبدیلیوں اور اس کے عروج کا جائزہ لے کر روایت کی تکرار کے ضمن میں میر مونس کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق میر انیس اورمرزا دبیر ’’ مرثیہ نگاری ‘‘ کے تمام امکانا ت کو اپنے تصرف میں لاکر دور عروج کی اس منزل تک لے گئے تھے جہاں سے آگے جانا ناممکن ہے لہٰذا ان کے بعد آنے والے شعراء محض تکرار روایت کے شاعرہی قرار دیئے جا

سکتے ہیں۔البتہ ان مرثیہ نگاری کے کلام میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی بھی وضاحت مثالو ں کے ذریعے کردی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر مونس جو کہ میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان کے میرانیس بننے کی راہ میں حائل رہیں۔ ان خامیوں میں تکرار، جزئیات کا غیر ضروری پھیلاؤ، واقعہ نگاری میں طوالت شامل ہیں۔ اگرچہ میر انیس ایک مرثیے میں اپنے بھائی میر مونس کی شاعری میں ساری خصوصیات بتاتے ہیں جو ان کی شاعری میں موجود تھیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق میر مونس کے کلام کے تجزیے سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتاہے۔ میر عشق ؔ کے سوانحی حالات، شخصیت اور کلام کی تجزیہ کرتے ہوئے ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ میر عشق کی انفرادیت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''انہوں نے غزل کے رنگ کو مرثیے کے رنگ میں ملایا۔ اس دشوار عمل میں چہرے، گھوڑے تلوارسراپا اور بزم کے بیان میں غزل کا رنگ مرثیے میں ضرور مل گیا ہے لیکن رزم، شہادت اور بین میں اس کا رنگ چوکھا نہیں آیا''۔(جلد چہارم،ص۶۷۷)

باب کے اگلے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی، میر عشقؔ کے مرثیے کے مختلف حصوں کا اپنے مندرجہ بالا دعوے کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، میر عشق کو'' طرزِناسخ '' کا پیرو کار قرار دیتے ہیں اور زباں وبیان کے حوالے سے ان کے نقطہ نظر کو بھی پیش کیا گیا ہے جس کی میرعشق نے خود بھی سختی سے پیروی کی۔میر تعشق ؔ کے سوانحی حالات اورمطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے تعارف کے بعد ان کی مرثیہ نگاری میں انفرادیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مرثیوں میں بھر پور تغزل کی نشاندہی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی :

''میر تعشق '' رنگِ غزل کے مرثیہ گو اور منفرد نمائندے ہیں۔اس رنگ میں نہ صرف غزل کے لہجے کا دھیما پن شامل ہے بلکہ غزل کے اشارات و کنایات کے ساتھ غزل کے ارتقاء کے مضامیں و موضوعات بھی حسبِ امکان شامل ہیں۔ یہاں مرثیے کی خارجیت میں جذبے کو شامل کرکے مرثیے میں اثر وتاثیر پیدا کی گئی ہے ''۔(جلد چہارم،ص۶۹۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق مرثیہ نگاری میں جذبائیت، مبالغے اور واقعات کے بیان کے حوالے سے انہوں نے روایت کی پیروی کی ہے۔مرزا محمد اوجؔ کو بھی مرثیہ نگاری کی روایت میں تکرار کا شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے سوانحی حالات اور تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اوجؔ کی مرثیہ نگاری کے علاوہ ان کی دو تصانیف ’’قواعد حامدیہ ‘‘ اور ’’ مقیاس الاشعار‘‘ کا تعارف بھی پیش کیاگیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مرثیہ نگاری میں اوجؔ کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے واقعات کے بیان میں صحیح روایات کے بیان کو ا ن کی مرثیہ نگاری کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس ضمن میں اس دلچسپ حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اگرچہ مرزا محمد اوج، مراز دبیرؔ کے فرزند تھے لیکن بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی رحجانات کے انہوں نے میر انیسؔ کے رنگ سخن کی پیروی کی۔ میر نفیس جو کہ میر انیس کے فرزند تھے، ان کے مختصر سوانحی کوائف درج کرنے کے بعد ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ میر نفیس مرثیہ نگاری میں میر انیس ہی کے پیروکار تھے اس لئے بقول جالبی انہیں ’’ ثانئ انیس ‘‘ بھی کہا گیا۔

پیارے صاحب رشید، تکرارِ روایت کے آخری اہم شاعر قرار پاتے ہیں۔ پیارے صاحب رشید کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں؛

> ’’پیارے صاحب رشید مرثیے کے افق پر نمودار ہوئے اورمرثیے کو ایک انمول بے جوڑ چیز سے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ بہار اور ساقی نامہ کے مضامین گاہ گاہ بعض دوسرے مرثیہ گویوں نے بھی باندھے ہیں لیکن رشید نے تخلیقی سطح پر، چابک دستی سے، اسے اپنے مرثیے کاحصہ بنا کر سامعین کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا‘‘۔(جلد چہارم،ص۷۱۳)

پیارے صاحب رشید کی اس تخلیقی اُپیچ کے پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی ان تہذیبی اور سماجی عوامل کی بھی نشاندہی کر رہے تھے جو لکھنوی مزاج میں تغیّرو تبدل کا باعث بنے اور سامعین کا مذاق مجموعی طور پر اس حد تک بدل گیا کہ رشیدصاحب پیارے اپنے عہد کے سب سے مقبول مرثیہ گو بن کر ابھرے۔

فصلِ سوم کا عنوان’’ دورِ جدید کی توسیع، اردو نثر کا تنوع،طنز ومزاح کی روایت‘‘ ہے۔ پہلے حصے میں دوابواب ہیں دوسرے حصہ کا نام ’’ اردو کے عناصر خمسہ ‘‘ ہے جس میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن یہاں نمبر شمار کے

ذریعے حد قائم کی گئی ہے ’باب ‘ کا عنوان نہیں دیا گیا ہے۔ فصلِ سوم، باب اوّل کی تمہید میں ڈاکٹر جمیل جالبی اردو میں طنزومزاح کی روایت کے حوالے سے اودھ پنچ کا تاریخی پس منظر، سماجی عوامل اور اجراء کا جائزہ لیتے ہیں اودھ پنچ کے اجراء کے تاریخی اور سماجی عوامل کی نشاندہی کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی، اودھ پنچ کی پالیسی، اودھ پنچ سے متاثرہ اخبارات اور اس کی پیروی میں جاری کئے گئے پرچوں کی نشاندہی کرتے ہوئے، اودھ پنچ کی مقبولیت کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اودھ پنچ کی مقبولیت کے اسباب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی جن امور کی نشاندہی کرتے ہیں ان میں طنزو ظرافت کو بطور صنفِ ادب رواج دینا، فکاہیہ اسلوب کی پیروی، آزادی اظہار کو خاص طور پر قابل ذکر قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اودھ پنچ کے اردو ادب پر اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو ناول کے ارتقاء میں اودھ پنچ کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔ جبکہ زبان وبیان کے حوالے سے ’’فسانۂ عجائب‘‘ کے برخلاف عام بول چال کی زبان میں دلچسپی اور دلکشی کے عوامل کا ظہور بھی اودھ پنچ کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اودھ پنچ کے بانی اور مدیر سجاد حسین کے سوانحی حالات بیان کرنے کے بعد اودھ پنچ کے حوالے سے ا ن کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ سجاد حسین کی تصانیف کی روشنی میں اردو نثر کے حوالے سے ان کے طنزو مزاح کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے منشی سجاد حسین کے ناول حاجی بغلول کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر مغربی ناول کا اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور کرداروں کے حوالے سے مختصراًتقابل بھی پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے منشی سجاد حسین کے ناول حاجی بغلول کی تکنیک، کردار نگاری، طرزِ ادا کا تجزیہ کرتے ہوئے، منشی سجاد حسین کے تہذیبی پس منظر کا حوالہ دیتے ہوئے اس ناول کے علامتی رنگ کی بھی توضیح کی ہےڈاکٹر جمیل جالبی کسی بھی تصنیف کے مطالعہ میں اس تصنیف کے تہذیبی پس منظر کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اور یہ ان کی تاریخ نگاری کا ایک اہم پہلو بھی ہے یہاں حاجی بغلول کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی، ا ن شخصی اور اجتماعی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس تہذیب کا خاصہ بن چکے تھے بقول جالبی:

> ’’حاجی بغلول کے رویے میں ہمیں سارے معاشرے کے خلاف جہاد
> کا احساس ہوتا ہے ایسا معاشرہ جہاں دوست بے مروت اور بے وفا ہیں۔
> جہاں انسان انسان کا رشتہ کمزور ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں
> احساس کی ایک نئی دنیا عطا کرتی ہے جہاں ہمیں سطحی خلوص سے

نفرت ہونے لگتی ہے۔ محبت و نفرت کا مفہوم بدلنے لگتا ہے اور احساس میں تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں‘‘۔(جلد چہارم،ص۷۳۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی، منشی سجاد حسین کے دوسرے ناول ’’ طرح دار لونڈی ‘‘ کو اردو میں ڈرامائی ناول نگاری کی پہلی کوشش قرا ر دیتے ہیں اس حصے میں اودھ اخبار میں چھپنے والے مضامین کے حوالے سے منشی سجاد حسین کی طنزومزاح کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن ان کے دیگر ناول احمق الدین،میٹھی چھری اور دھوکا یا طلسمی دنیا کے حوالے سے ان کے طنزومزاح کا جائزہ نہیں لیا گیا۔

باب دوّم میں ’’ اودھ پنچ کے ممتاز لکھنے والے‘‘کے عنوان کے تحت، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف،جوالا پر شاد برق پنڈت، تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد کی تصانیف کا اور علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے دستیاب منفرد سوانحی حالات کے بیان کے بعد ان کی تصانیف کا تعارف کروایا گیا ہے جن میں سے اکثرکم یاب ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ستم ظریف کی شاعری کی خصوصیات کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری کے حوالے موجودنہیں۔ مجموعی طور پر اس حصے کے جائزے سے اندازہ ہوتاہے ڈاکٹر جمیل جالبی کو ستم ظریف کی تصانیف دستیاب نہیں تھیں۔’’جوالا پر شاد برق‘‘ کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی، چکبست کے مضمون میں درج معلومات سے استفادہ کیا ہے اور اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے حوالے سے کشن پرشاد کول اور چکبست کے علاوہ کسی محقق اور ناقد نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ برق کے مضامین کے حوالے سے ان کے زبان وبیاں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پنڈت تربھون ناتھ ہجر کے مختصر سوانحی حالات اور تصانیف کا تعارف پیش کرتے ہوئے ’مضامین چکسبت ‘سے لئے گئے ایک طویل اقتباس کی روشنی میں ان کی نثر کے مضامین کے خصائص مختصر اًبیا ن کئے گئے ہیں۔نواب محمد آزاد کے سوانحی حالات، شخصیت اور تصانیف پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق انہوں نے طنزومزاح کے لئے نئی نئی تکنیک اور ہیتیں استعمال کیں بالخصوص ان کی لغت نویسی اور اشتہار کی تکنیک کو سراہا گیا ہے اور ان کے مضامین سے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ’’نوابی دربار‘‘ جسے اودھ پنچ میں بطور ناول سلسلہ وار شائع کیا جاتا رہا، کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی اسکی تکنیک کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ڈراما قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی پنڈت سرشار اور اکبر الہ آبادی کو بھی بنیادی طور پر ’’ اودھ پنچ ‘‘ سے متعلق ہی قرار دیتے ہیں لیکن ان دونوں کی سوانح اور تصانیف کا تجزیہ

حصہ (ب)میں کیاجانا تھا لیکن حصہ (ب)میں صرفاکبر الٰہ آبادی کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کو شایدڈاکٹر جمیل جالبی شامل کرنا بھول گئے ہیں۔

باب دوّم میں حصہ (ب) کے عنوان سے ’’ اکبر الہ آبادی ‘‘کے عنوان کے تحت ذیلی سرخی طنزومزاح کی روایت دی گئی ہے۔ باب کی ابتداء میں اکبر الہ آبادی کے دور کا جائزہ لیا گیا ہے اکبر الٰہ آبادی کے سوانحی کوائف کے بیان میں اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ یہ کوائف کسی حوالے سے درج کئے گئے ہیں جبکہ حواشی نمبر (۱) میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اکبر کے مطالعہ کے لئے انہوں نے کلیاتِ اکبر کی جلد اوّل، دوّم اور سوئم سے استفادہ کیا ہے۔

اکبر الہ آبادی کے دور کا تجزیہ کرتے ہوئے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے اس تغیر کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں کے اثرات کا جائزہ لیاگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان تمام عوامل کے ادب اور ادب کی ماہیت پر اثرات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے ادب کے سماجی کردار کے حوالے سے اس عہد کے مجموعی روّیے کا جائزہ لیتے ہوئے سرسید کے اثرات اور ان کے ردّعمل کے نتیجے میں برپا ہونے والے ادبی ردّعمل کا تجزیہ پر بھی نہایت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس ادبی تناظر میں اکبر الہ آبادی کی شاعری کے تناظر اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکبر کی شخصیت اور مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اکبر کے عہد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے جن گوشوں کو اجاگر کیاہے ان میں ان کی واقعیت پسندی، نفسیاتی بصیرت، اسلام سے وابستگی کے مختلف پہلو اور جدید تہذیب کے خلاف ردّ عمل کومختلف واقعات اور مثالوں کی روشنی میں بیان کیاگیاہے۔ ان کی شخصیت کاتجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> ’’اکبر الٰہ آبادی اٹھارویں صدی عیسوی کی ان ہستیوں کی طرح تھے جو پوپ، والٹیئر اور سو فٹ کی صورت میں نظرآتی ہیں اور جوعقل و دانش اور حماقت میں تمیز کرسکتے تھے اور حماقت کا مذاق اڑا کر عقل ودانش کی طرف لاتے تھے وہ بھی نقادِ حیات، مصلح قوم اور مفکر تھے مگر وہ سطح زمین سے زیادہ اونچا اڑنانہیں چاہتے تھے ‘‘۔(جلد چہارم،ص ۷۷۱)

ڈاکٹرجالبی نے اکبر کی سنجیدہ شاعری کو ان کی مزاحیہ شاعری کی بنیاد قراردیا ہے اس لئے ان کی سنجید ہ کلام کی جن خوبیوں کی وضاحت کی گئی ہے ان میں رمزوکنایہ، رعایت لفظی اور

برجستگی قابل ذکر ہیں۔ طنزیہ، مزاحیہ کلام کے ضمن میں ان کے موضوعات شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی تکنیک کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی، اکبرکے قطعات کا تجزیہ کرتے ہوئے، اکبراور سرسید کی کشمکش کے پس منظر میں ان کی تہذیبی و تاریخی اہمیت بھی ا جاگر کرتے ہیں۔''اکبرکامزاح'' کے عنوان کے تحت اکبر کے کلام سے مزاح کے عناصر، عوامل اور پس منظر، موضوعات اور انداز بیان کا تجزیہ کیاگیاہے۔ اکبر کی مزاح نگاری کے ضمن میں ان کی حسِ ذکاوت کے حوالے سے بالخصوص ان کی شاعری کا مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ آخر میں ڈاکٹرجالبی اس بحث کو سمیٹتے ہیں کہ اکبرالہ آباد ی کو محض زکی (witty) کہاجائے یا طنزنگار بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی انہیں مزاح نگار اورطنز نگار قرار دیتے ہیں اور ان کی شاعری سے ان کی مزاح نگاری اور طنزنگاری کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے ان کے طرز ادا کا تجزیہ کرتے ہیں۔ باب کے آخر میں ''بزم اکبر'' کے حوالے سے اکبرالہ آبادیکے چند لطائف و ظرائف پیش کئے گئے ہیں۔(۱۲۶)

مجموعی طور پر اس باب میں الہ آبادی کے فن کا عمدہ تجزیہ کیاگیاہے لیکن بعض اوقات کچھ باتوں کی باربار تکرار ناگوار گزرتی ہے۔ اکبر کے فن کے حوالے سے طنزیہ، مزاحیہ کلام اکبرکا مزاح میں ایک ہی قسم کی باتوں کو دہرایاگیاہے۔ حواشی پر نظرڈالنے سے اندازہ ہوتاہے کہ اکبر کے باب زیادہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

''اردو کے عناصر خمسہ ''کے عنوان کے تحت سرسید اور ان کے قریبی رفقاء کی خدمت کا جائزہ لیاگیاہے لیکن ابواب کا تعین غیرواضح ہے۔ سب سے پہلے ''سرسید احمد خان'' کے عنوان کے تحت تمہید کے ضمن میں سرسید احمد خان کے سوانحی حالات و واقعات، شخصیت و مزاج اور تصانیف و تالیف کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ سرسید احمد خان جیسی عہد ساز شخصیت کے ضمن میں ان کے عہد کا مطالعہ ان کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لئے جس وضاحت کا طالب ہے، ڈاکٹرجالبی نے اس کا حق ادارکرتے ہوئے معاشی، سیاسی، سماجی و تہذیبی اور ادبی عوامل کاجائزہ لیاہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب انگیز تغیر کے نتیجے میں مسلمانوں کی ہمہ گیر بدحالی، ذہنی پس ماندگی، فکری درماندگی کی عمدہ طریقے سے نقشہ کشی کرتے ہوئے سرسید احمد کے سوانحی حالات و واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ سرسید ا حمد کی شخصیت پر ان کی والدہ کی سیرت و شخصیت کے اثرات کے ساتھ ساتھ سرسید احمد کی فطری دردمندی (جس کی بنیاد پر قوم کو قعرِ مزلت سے نکالنے کا فریضہ اپنے کندھوں پراٹھایا) کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیاگیاہے۔ سرسید کے سوانحی حالات کے ضمن میں ان کی ان تصانیف کا تعاف بھی پیش کیاگیاہے جوانہوں نے عصری،سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی

ضرورتوں کے تحت اپنی عمر کے مختلف ادوار میں تصنیف کیں۔ اس ضمن میں سرسید احمد خان کے قائم کردہ اداروں کے قیام، ان کے پس منظر میں موجود محرکات اور مقاصد کی بھی عمدگی سے وضاحت کی گئی ہے۔ گویا سرسید کی ذاتی زندگی سے ان کی تصانیف قائم کردہ اداروں، تہذیبی اردو تنازعے کے حوالے سے سرسید احمد کی کوششوں، مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے حوالے سے اقدامات وغیرہ کو الگ نہیں کیاجاسکتا۔ ایک قومی رہنما کے طور پر سرسید کی ذاتی زندگی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے حوالے سے ان کی مساعی ایک ہی سکے کے دور خ ہیں۔

سرسید احمد کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو مختلف واقعات کے تناظر میں بیان کرتے ہوئے، ڈاکٹرجالبی نے سرسید احمد کی شخصیت کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی ہے ان میں سرسید احمد خان کی، راست بازی، اعلیٰ کردار، ذہانت،واقعیت پسندی، دیانت، عدم تقلید اور وسعتِ نظری پربالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹرجالبی نے سرسید احمد خان کی ۳۱ تصانیف کا تعارف پیش کیاہے آثار الصنادیداور اس کے مختلف ایڈیشنز پر نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنز کا موازنہ کرتے ہوئے تفرقات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سرسید کے فکروعمل کے مطالعہ کے ضمن میں ڈاکٹرجالبی نے زندگی کے مختلف ادوار میں سرسید احمد خان کی فکری ارتقاء اور مسلمانوں کی علمی سیاسی، مذہبی تہذیبی، سماجی اور معاشی زندگی میں بہتری لانے کے لئے ان کی کوششوں کا عمدگی سے جائزہ پیش کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے سرسید کے فکروعمل کے حوالے سے تین صفات کی کارفرمائی کا تجزیہ کیا ہے (۱) مزاج اور فطرت کی امتزاجی صلاحیت) Syentheti ۲c (عام سوجھ بوجھ (Common Sense) کی سطح پر رہنا اور (۳) مفاد سے ہم آہنگی۔ ’’مذہبیات‘‘ کے عنوان کے تحت، ڈاکٹرجالبی نے سرسید کے عہد میں مذہب کے حوالے سے اجتماعی روئیے کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خان کے مذہب کے حوالے سے فکری ارتقاء اور ان کی تصانیف اور مختلف واقعات سے ان کے مذہبی تفکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تفسیرِ قرآن کے حوالے سے ان کے نظریات (جس کے باعث وہ آج تک متنازعہ ہیں) کاجائزہ لیاگیاہے۔ سرسید احمد خان بنیادی طور پر فطرت (نیچر) اور عقل کو اپنا راہنما تسلیم کر تے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ان کے فطرت اور عقل کے حوالے سے نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے دیتے ہیں :

> ’’میراخیال ہے کہ فلسفہ کے جس دائرے میں سرسید آتے ہیں وہ اس انگریزی فلسفے سے قریب ہے جس کی روسے علم، تجربہ یا عملی ثبوت سے حاصل ہوتاہے اور جسے تجربیت (Epmiricism) کے نام

سے موسوم کیاجاتاہے جس کا بانی بیکن (Beacon) تھا اور جو اپنے کمال پر لاک (Locke)کے ہا ں پہنچا۔ یہاں عقل، عام عقل Common) sense(ہے اور اس میں الہام اور دوسری چیزیں آجاتی ہیں۔(جلد چہارم،ص۸۵۳)

سرسید احمد خان کے سیاسی شعور کے ضمن میں، سرسید احمد خان کی ان کوششوں کا جائزہ لیاگیاہے جوانہوں نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کو بھانپتے ہوئے اس وقت کی ضرورت کے تحت کیں اور سیاسی زندگی میں سرگرم رہنے کی بجائے تعلیم پرزور دینے کے رحجان کو فروغ دیا۔ ’’تعلیم ‘‘ کے ضمن میں سرسید احمد خان کے عہد میں مسلمانوں کے لئے تعلیم کی اہمیت اور ان کی مساعی کو اجاگر کیاگیاہے۔ ’’تہذیب الاخلاق : اجراء و مقاصد‘‘ کے عنوان کے تحت رسالہ تہذیب الاخلاق کو جاری کرنے کے پس منظر اور سرسید احمد خان کے مقاصد کو اجاگر کیاگیاہے۔ ’’تہذیب الاخلاق‘‘ کے حوالے سے سرسید احمدخان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

’’سرسید نے ’’تہذیب الاخلاق‘‘ کے تعلق سے خود کو مذہب، تہذیب و شائستگی اور تعلیم تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ اپنی ہمہ جہتی فکر اور اصلاح احوال کے دائرے کو انشاء و ادب، اردو شاعری، اردو زبان اور دوسرے علوم و فنون تک پھیلا کر اور انہیں روایت و تقلید کی رسم پرستی سے نکال کر جدید دور سے ملانے کے لئے کوشاں تھے‘‘۔(جلد چہارم،ص۸۶۵)

’’سرسید کا تصور اخلاق و انسان‘‘ کو سرسید کی شخصیت، نظریات اور ان کے مضامین کے ذریعے واضح کیاگیاہے۔ سرسید کی ادبی خدمات کے ضمن میں سرسید کی مضمون نگاری، سرسید کا اسلوب بیان /طرز اداکا جائزہ لیتے ہوئے سرسید کے مقام، مرتبے کا یقین کیاگیاہے۔ سرسید کی مضمون نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں تین قسموں میں تقسیم کیاگیاہے۔ ۱۔ ادبی، ۲۔ علمی اور ۳۔مذہبی۔ ڈاکٹرجالبی سرسید کے ادبی مضامین کو ایڈسین واسٹیل کے اثرات کا نتیجہ قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے سرسید کے مضامین میں جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے ان میں تہہ داری، تبلیغی جوش، استدلال،مفکرانہ سنجیدگی، نیچرپرزور، طنز، خوش طبعی، انسانی نفسیات کا تجزیہ شامل ہے۔ سرسید کے مضامین کے اثرات اور خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی سرسید کو مضمون نگاری میں بانی قرار دیتے ہیں۔ سرسید کے مضامین کی ذیل میں ان کے طرز ادا کا تجزیہ کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی سرسید کا اسلوب /طرز ادا کے زیر عنوان ان کی نثر کی دیگر خصوصیات کی طرف توجہ

مبذول کرواتے ہیں۔ سرسید کو جدید اردو نثرکابانی قراردیتے ہیں اوران کی نثر کی جن خوبیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں سادگی، جامعیت، تشبیہات کا استعمال، حسب ضرورت تراکیب کااستعمال، متانت، ذکاوت، موضوعات کی ہمہ گیری خاص طور پر قابل ذکرہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے سرسید کی نثرمیں ان خصوصیات کی وضاحت کے لئے سرسید کی تصانیف سے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن سے ان کے دعوے کو اور تقویت ملتی ہے۔ حالی نے سرسید کی نثر میں جن تین عناصر (سادگی، بے تکلفی، مدعانویسی) کی نشاندہی کی ہے، ڈاکٹرجالبی اس میں ایک عنصر ''روانی'' کا اضافہ کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی نثر سے اردو نثرنگاری کے دائمی اصول متعین ہوجاتے ہیں۔ اس نثر میں عقل اور فن اور بات چیت کے لہجے کی آمیزش وہ اجزاء ہیں جو نثر کو جدید نثر بناتے ہیں اور اردو نثر کے لئے بڑا راستہ تیارکرتے ہیں ''۔ (جلد چہارم،ص۸۸۸)

سرسید احمد کی ہمہ گیر خدمات کے جائزے کے بعد سرسید کے مقام کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے سرسید کی علمی، سیاسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی، ادبی خدمات کو ان کے عہد کے تناظر میں جانچتے ہوئے، دیگر ناقدین کی رائے،ان کی اوّلیات اور مسلم قوم پر ان کے ہمہ گیر اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں ایسا ''ہیرو'' قراردیا ہے جو زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ بقول جالبی:

> ''تاریخ گواہ ہے کہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو ا جواپنی زندگی میں سارے مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہوگیاہو۔ کامیابی صرف اس میں ہے کہ انداز فکرونظر بدل کر قوم کی زندگی کا رخ بدل دیاجائے تاکہ پھرقوم جیسے بھی ہو، اس پر چلتی رہے۔ سرسید کو اس کام میں کامیابی حاصل ہوئی ''۔ (جلد چہارم،ص۸۹۴)

یہ باب مجموعی طور پر سرسید کی سوانح، حالات اور کارناموں پر عمدگی سے روشنی ڈالتاہے لیکن اس باب کے خاکے میں ترتیب و تنظیم کا فقدان نظرآتاہے۔ سوانحی حالات و واقعات کے بیان میں ان کی تصانیف کا ذکر موجود ہے جبکہ تصانیف کے لئے باب کا ایک الگ سے حصہ موجود ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے ضمن میں بیان کردہ بہت سے بیانات کو دہرایاگیاہے۔ ادبی خدمات کے ضمن میں ان کی صرف مضمون نگاری کا جائزہ لیاگیاہے اور مضمون نگاری ہی کی بنیاد پر ان کے انداز بیان /طرز ادا کا تجزیہ کیاگیاہے۔

سرسید احمد خان کے بعد اردو کے ارکان خمسہ میں جس ادیب و شاعر کا مطالعہ پیش کیاگیا ہے وہ خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ حالی کے سوانحی حالات پرنظرڈالنے سے پہلے ان کی شخصیت کو موضوع بحث بنایاگیاہے جوکہ ڈاکٹرجالبی کی پچھلی روش کے برعکس ہے۔ ڈاکٹرجالبی اکثر عصری حالات کے بیان کے بعد سوانحی حالات اور اس کے بعد شخصیت کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ حالی کی سوانح کے اہم واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اہم تصنیفی کاموں، اعزاز ات ملازمتوں وغیرہ کااحوال بیان کیاگیاہے۔ الطاف حسین حالی کی تصانیف کے ضمن میں ۱۳۔ نثری تصانیف کا تعارف پیش کرنے کے بعد ان کی ۴ شعری تصانیف کے علاوہ ڈاکٹرافتخار احمد صدیقی کے ’’کلیاتِ حالی‘‘ کا تعارف پیش کیاہے۔ کلام حالی کو دوحصوں (منظومات غزل) میں تقسیم کرتے ہوئے ان کی شاعری کے موضوعات اور زبان و بیان کا تجزیہ کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی حالی کی نظم نگاری کا’ قومی شاعری‘ کے عنوان کے تحت جائزہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی حالی کو جدید اردو شاعری کا بانی قراردیتے ہوئے انجمن پنجاب کے حوالے سے، جدید نظم کے فروغ میں حالی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔’انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب‘ کے زیر اثرحالی نے بڑھ چڑھ نئی طرز کی نظم نگاری میں حصہ لیا۔حالی کے اصلاحی جذبے کو ان کی شاعری سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ڈاکٹر جمیل جالبی،حالی کی نظموں کو اخلاقی،تعلیمی،اصلاحی اور قومی وملی شاعری کی ذیل میں رکھتے ہیں۔ حالی نے شاعری کے موضوعات میں ایسا تنوّع پیدا کیاکہ شاعری کارخ بدل کر اسے نیاموڑ دے دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اقبال کی شاعری کو حالی کی شاعری ’’کااوجِ کمال‘‘ قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی حالیؔ کی نظم نگاری میں ان کے انگریزی ادب کے اثرات اور حالیؔ کے اعتراف کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالی کی مسدس کے موضوع اور انداز بیان اور اثرات کاتجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مسدسِ حالی کو اردو شاعر ی میں ایک ’’انقلابِ عظیم ‘‘ قراردیااور حالی کے ’’نئے ادراک‘‘ کے حوالے سے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو عمدگی سے اجاگرکیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی،حالی کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے، واقعیت، مبالغہ سے احتزاز، لطفِ بیان، سادگی اور گداز کو ان کی غزل کی انفرادیت قراردیتے ہیں۔ حالی نے اپنی ’’جدید غزل‘‘ میں جن موضوعات کوچنا، ڈاکٹرجالبی نے ان کی نشاندہی کرتے ہوئے روائتی موضوع ’’عشق‘‘ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ حالی کی غزل کی تنقید کے ضمن میں ڈاکٹرجالبی نے ان کے ناقدین مجنوں گورکھ پوری اور محمد حسن عسکری کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

حالی کی نثر کے مطالعے کے ذیل میں انکی تصانیف ’’مجالس النساء‘‘ حیاتِ سعدی، مقدمۂ شعر و شاعری، یادگارِ غالب،حیاتِ جاوید کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ سرسید کی تحریک

کے زیر اثر حالی نے جو اہم ادبی خدمات سرانجام دی وہ اردو ادب میں سوانح نگاری کا فروغ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان کی تصنیف' حیاتِ سعدی '، کو اردو میں جدید طرز کی پہلی سوانح قراردیتے ہیں جس میں تنقید اور تحقیق کو بیک وقت بروئے کار لایاگیاہے۔ ''حیات سعدی '' کی خوبیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس سوانح کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جوکہ ڈاکٹرجالبی کی متوازن تنقید کی ایک مثال ہے۔

حالی نے جہاں اردو ادب میں باقاعدہ سوانح نگاری کا فریضہ انجام دیاوہیں اردو میں باقاعدہ جدید نتقید نگاری میں بھی انہیں اوّلیت کا مقام حامل ہے۔ ڈاکٹرجالبی نہایت عمدگی سے ''مقدمۂشعروشاعری '' کے محرکات اور اثرات کا جائزے لینے کے ساتھ ساتھ اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کرتے ہیں کہ حالی نے انگریزی تنقید اور انگریزی شاعری سے متاثر ہوکر مقدمہ لکھاڈاکٹرجالبی اس دعوے کے ردّ میں حالی کا نقطۂ نظرپیش کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حالی جوکچھ ''مقدمہ'' میں کہتے ہیں اس کے سرے عربی فارسی شاعری و تہذیب سے ملادیتے ہیں تاکہ ان کی باتقابل قبول ہوجائے ''۔
> (جلد چہارم،ص۹۵۳)

ڈاکٹرجالبی کے مطابق حالی جس اصلاحی رحجان کے تحت شاعری کی، مقدمہ اور سوانح نگاری بھی اسی اصلاحی رحجان کانتیجہ تھی۔ ''مقدمہ'' میں حالی کے نظریات پرتنقید کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو اجاگر کیا گیاہے۔ ڈاکٹرجالبی حالی کو اردو تنقید میں اصول تنقید کا قائد قراردیتے ہیں۔

حالی کی دوسری سوانح، 'یادگارغالب کا 'تجزیہ کرتے ہوئے، حالی کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بھی زیر بحث لایاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی حالی کی''یادگارِغالب ' کو مطالعہ غالب ' کی بنیاد قراردیتے ہیں۔ ''حیاتِ جاوید '' کو ڈاکٹرجالبی نے حالی کی سوانح نگاری کے حوالے سے شاہ کارقراردیا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے حالی نے پہلی دفعہ اپنے ہیرو کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کو بھی بیان کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی، سوانح میں، حالی کی کردار نگاری کو کمزور قرار دیتے ہیں۔ حالی سرسید کی خامیاں بیان کرتے کرتے ان کی خامیوں کاجواز دھونڈلاتے ہیں اور خامی کو بھی خوبی بنادیتے ہیں۔ حالی کے طریقہ ' سوانح نگاری کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی اصول سوانح نگاری اور حالی کی سوانح نگاری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ حالی کی سوانح نگاری کے نقائص کا جائزہ لیتے ہوئے ''حیات جاوید'' کے حوالے سے حالی پر ہونے والی تنقید کاتجزیہ بھی کیا گیاہے۔

حالی کی سوانح نگاری اور '' مقدمہ ء شعرو شاعری'' کے تجزئیے کے بعد بحیثیت نگار حالی کے مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے اور ان کی تنقید کے خصائص بیان کرنے کے ساتھ مغربی ادب کے ناقدین کے ساتھ جزوی موازنہ بھی کیاگیاہے۔ حالی کے تعمیری اندازِ نظر اور معقولیت کی بنیاد پر انہیں حقیقی نقاد قرار دیا گیاہے۔ حالی کے ''مقدمۂ شعروشاعری'' کو ڈاکٹرجالبی اردو ادب میں مرتب اور منظم انداز کی پہلی تحقیقی کاوش قراردیتے ہیں۔ حالی کی تنقید میں اصول سازی اور عملی تنقید کے عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ''حالی بحیثیت نقاد'' باب کے اگلے حصے میں حالی کی تخلیقی اصناف کی بنیاد پر ان کی شخصیت کے اثرات کا بھی تجزیہ کیاگیاہے۔ حالی کی نظم و نثر کے حوالے سے ان کے طرزِ اداکے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :''حالی کامزاج اور اس کا توازن '' اس کی اقلیت پسندی اور تصنع و مبالغہ سے گریز کے باعث اظہار کی سادگی یکساں طور پر نظم و نثر دونوں میں موجود رہتی ہے ''۔ (جلد چہارم،ص۹۷۲)

حالی اپنے عہد کی نبض پہچانتے ہوئے جس طرح معاشرتی اصلاح کے لئے نظم و نثر کا سہارالیتے ہیں اس کے طرز ادا کی خصوصیات کا یقین کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے سادگی، یکسانیت، توضیحی طرزادا، مدلل اور خطابتی رنگ (خطابیہ رنگ زیادہ بہترترکیب ہے) انگریزی و عربی الفاظ پر بالخصوص روشنی ڈالی ہے۔ طرز ادا یاسلوب کے تجزئیے میں مصنف کی شخصیت کو نظرانداز نہیں کیاجاسکتا تھا لہٰذا یہاں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی حالی کی شخصیت کے مختلف گوشوں کی روشنی میں ان کے طرزِ اداکا تعین کرتے ہیں۔باب کے آخر میں حالی کی ادبی کوششوں کے حوالے سے ان کی تاریخی اہمیت کو اجاگرکیا گیاہے۔ بقول جالبی:''۔۔۔۔ادب کی سطح پرحالی ہی ہمارے مسلّم قائد ہیں۔وہ تاریخ میں اردو ادب کے مصلح اور جدید ادب کے بانی کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔(جلد چہارم،ص۹۸۵)

حالی کے سوانح اور ادبی خدمات کے ضمن میں ڈاکٹرجالبی نے ۸۵ صفحات مختص کئے ہیں۔ پہلے باب جس میں سرسید کی خدمات اور سوانح کاجائزہ لیاگیاہے اس میں سرسید کے لئے ۱۰۰صفحے مختص کئے گئے تھے جبکہ اس باب کی ترتیب و تنظیم کا جائزہ لیاجائے، انتہائی مرتب اندازمیں حالی کی نظم و نثر کے تجزئیے کے ساتھ ساتھ ان کی ناقدانہ کوششوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے تاریخی مقام کا تعین کیاگیاہے۔ حالی کی شخصیت کے حوالے سے یہاں بھی بعض اوقات تکرار کا عنصر ملتا ہے۔

سر سیّد کے رفقاء کے ضمن میں حالی کے بعد محمد حسین آزاد کی سوانح اور ادبی کاناموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔باب کی ابتداء ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ

محمد حسین آزاد،سر سیّد احمد خان کے ہمعصر ہوتے ہوئے بھی اپنی تخلیقی فن پاروں کی بنیاد اصلاحِ قوم یا درستئ اخلاق پر نہیں بلکہ انشاء پردازی پر رکھتے ہیں اور یہی ان کی شہرت کا اصل سبب ہے۔محمدحسین آزاد کے سو انحی حالات کے ساتھ ساتھ معاصر سماجی اور تہذ یبی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے،ان واقعات کے آزاد کی زندگی اور شخصیت پر مرّتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔''جدید اردو نظم کا آغاز ۱۸۷۴ء'' کے عنوان کے تحت سکھشا سبھا، میں منعقدہ 19 اپریل۱۸۷۴ء کے حوالے سے آزاد کے دئیے گئے لیکچر کے بعد انجمنِ پنجاب کے تحت منعقد کئے گئے مشاعروں کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد کی ملازمت،سفرِایران، اور ان کی وفات تک کے حالات کو بیان کیا گیاہے۔ اسی عنوان کے تحت آزاد کی زندگی کے اہم واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے لئے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ''تصانیف،تالیفاتِ آزاد ''کے عنوان کے تحت انہیں دو زمروں میں تقسیم کیاگیاہے۔ پہلے زمرے میں ان کی ادبی وعلمی کتب کا تعارف و تجزیہ پیش کیاگیاجبکہ دوسرے زمرے میں ان کی درسی و تعلیمی کتب کا تعارف و تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ '' مطالعہ آزاد ''کے عنوان کے تحت آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس اور دربارِ اکبری کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔

'آب حیات' کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے ابتدائی دونوں ایڈیشنز کی معلومات فراہم کرنے کے بعد آزاد کے حوالے سے ہی آب حیات کی تصنیف کے مقاصد کا ذکرکرتے ہوئے ان مقاصدکا تجزیہ کیاگیاہے۔ ''آب حیات'' پرحافظ محمود شیرانی کے اعتراضات میں سے ۱۳، اعتراضات پیش کئے گئے ہیں جنہیں بیان کرنے کا مقصد،آزاد کی شخصیت کے مختلف گوشوں کواجاگر کرنا ہے۔''آبِ حیات'' کے مطالعے میں ڈاکٹرجالبی نے سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے اردو زبان کی ابتداء کے حوالے سے نظریے کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں اوّل محقق لسانیات قراردیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی، آب حیات کاتجزیہ کرتے ہوئے جن تضادات اور نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں ان میں فلاسفۂیونان کے حوالے سے شعر کی تعریف، نظم ونثر میں فرق، ناقص ادوار بندی، واضح تنقیدی اصولوں سے ناواقفیت کو اہم شعراء کو آب حیات میں جگہ دینا، تنقیدی عمل کا علم بیان کے دائرے میں رہنا، غیر ادبی تعصب کا اظہار وغیرہ شامل ہے۔

ڈاکٹرجالبی نے ''فرہنگِ خیال'' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹرصادق کی تحقیق کے مطابق ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین کے انگریزی مآخذات کی فہرست دی ہے۔ ان کے مضمون 'شہرتِ عام اور بقائے دوام' کاتجزیہ کرتے ہیں جسے ماخوذ ہونے کے باوجود، آزاد نے اپنی تخلیقی طرز ادا کے باعث طبع زاد مضمون کا رنگ دے دیاہے۔''سخن دانِ فارس'' کا تعارف وتجزیہ پیش

کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے محمدحسین آزادؔ کی لسانی سوجھ بوجھ کے حوالے سے آزاد کو اردو زبان میں جدید علم السّان کا بانی قرار دیا ہے۔ڈاکٹرجالبی نے ''سخن دانِ فارس'' میں دئیے گئے آزاد کے لیکچر کا تعارف اور تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان سے غلط طور پر منسوب ''نگارستانِ فارس'' کے حوالے سے بھی وضاحت فرمائی ہے کہ یہ آغا محمد طاہر نے آزاد کے اشارات اور یادداشتوں کو سامنے رکھ کر تحریر کی ہے۔

''دربارِاکبری'' کے تعارف میں اس کے دونوں ایڈیشنز کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے مولوی ممتاز علی (مترتب ''درباراکبری'') کے اس دعوے کو بھی داخلی شواہد کی بنیاد پر غلط قراردیاہے کہ انہوں نے اس کے نامکمل مسودے کو مکمل کیا۔''دربار اکبری'' کو بھی ڈاکٹر جمیل جالبی، آزادکی تحقیقی کاوش کے باوجود ان قیاس آرائیوں اور جانبداری کی بنیاد پر کمزور تحقیقی کتاب قراردیتے ہیں اور مثالوں سے اس دعوے کو ثابت کیا ہے۔'درباراکبری'کے نقائص کی نشاندہی کرنے کے باوجود ڈاکٹرجالبی نے اسے اردو تاریخ نویسی اور آزاد کی انشاء پردازی کے حوالے سے اہم کتاب قراردیا ہے۔

'آزاد کے اسلوب'کے عنوان کے تحت ان کی تصانیف کے حوالوں سے انہیں 'جدیدشاعرانہ نثر' کابانی قرار دیا گیاہے۔ آزادؔ کی انشاء پردازی کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے جن بنیادی خصائص کی نشاندہی ان میں جذبات،تخیّل، قدیم و جدید کا امتزاج، استعارہ و تشبیہ کا استعمال، شاعرانہ صفات کا متوازن استعمال، روانی، موسیقیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آزاد نے اگرچہ شاعری بھی کی اور اردو ادب میں نظم گوئی کو متعارف کروانے میں انہوں نے بہت اہم کردار اداکیالیکن اردو ادب میں ان کی اہمیت ان کی شاعری کی وجہ سے نہیں بلکہ شاعرانہ نثرکی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے نہایت عمدگی سے آزاد کی سوانح اور تصنیفات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کیاہے لیکن بحیثیت مؤرخ، آزاد کی تاریخ نویسی پر اتنی تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جس کے وہ حقدار تھے۔

''شبلی نعمانی'' کے زیر عنوان باب میں شبلی نعمانی کی سوانح اور تصنیفات کا جائزہ پیش کیاہے۔ تمہید، حالاتِ زندگی، عطیہ فیضی، شخصیت و مزاج، کے تحت انیسویں صدی کے بدلتے سیاسی، سماجی، مذہبی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے شبلی کی ابتدائی زندگی، تعلیم وتربیت خاندان، مختلف ملازمتوں، سفر روم و شام، ندوۃ العلماءِ کا قیام اور ندوۃ کے حوالے سے شبلی کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے عطیہ فیضی سے ان کے تعلق پربھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی زندگی کا احوال درج کرتے ہوئے ان کی مختلف تصانیف کے محرکات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مختلف

واقعات اور حادثات کے تناظر میں شبلی کی زندگی کے مختلف گوشوں کوبھی آشکار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق شبلی کی فکرونظر پر سرسید تحریک کا گہرااثر تھاشبلی کی تصانیف کے ضمن میں ۲۱ تصانیف کا تعارف پیش کیاگیاہے جن میں سے اکیسویں تصنیف یعنی باقیاتِ شبلی'' مشتاق حسین کی ترتیب کردہ ہے جس میں شبلی کے مضامین، تقریریں،رپورٹیں، یادداشتیں، چند خطوط شامل ہیں۔

ڈاکٹرجالبی ''علم الکلام'' کو شبلی کی فکر،رنگ مزاج اور تصانیف کا مشترک پہلو قراردیتے ہیں۔ان کے ''علم الکلام '' کا ان کی تصانیف کی روشنی میں تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کے اثرات سے علم الکلام سے ان کی دلچسپی اور نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ بالخصوص 'الغزالی'' اور ''سوانح مولاناروم ' میں غزالی و مولانا روم کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد شبلی کی ''کلامیات'' کی بحث کا تجزیہ کیاہے۔ مثنوی مولاناروم کے مباحث کے حوالے سے ارتقاءکے موضوع پر مولانا شبلی کے نظریات کو ڈاکٹرجالبی ڈارون پر فوقیت دیتے ہیں۔ 'سوانح مولاناروم 'کے خصائص کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ بالخصوص مثنوی مولاناروم میں مولانا رومی کے فنِ شاعری کے حوالے سے ان کی رائے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ 'شبلی اور تاریخی نویسی ' کے عنوان کے تحت ان کی تاریخ نویسی کے محرکات، ا ن کے نقطہ نظر اور طریقہ کارکا تجزیہ کیا گیاہے۔ شبلی کی تاریخ نویسی کا مغربی مؤرخین سے موازنہ بھی پیش کیاگیاہےڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق شبلی خود یورپی مؤرخین کو تاریخ نویسی میں ایک معیار تصورکرتے تھے لیکن وہ خود مکمل طور پران کی پیروی نہیں کرسکے۔ ''ادب اور تنقید'' کے عنوان کے تحت شبلی کی تصانیف کی 'موازنہ انیس ودبیر''،'شعرالعجم 'اور 'مکاتیب شبلی 'کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی، شبلی کو ان کے محققانہ مزاج کی بنیاد پر اردو کا پہلا ''محقق نقاد '' قراردیتے ہیں۔ '' علم وتحقیق، تاریخی عوامل اور کلامی مزاج، شبلی کی ادبی تنقید میں ایک اکائی بن کران کی تنقید کو ایک الگ رنگ عطاکرتے ہیں''۔ (جلد چہارم،ص۱۰۹۰)

> ''موازنہ انیس ودبیر''کاتجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی شبلی کے انیس کی طرف متعصبانہ رحجان کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے مطابق'' شبلی بنیادی طور پر انیس کے مرثیوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں اور مرزادبیر کا ذکر بیچ بیچ میں ضمناً آ جاتا ہے۔''(جلد چہارم،ص۱۰۹۰)

''موازنہ انیس و دبیر''کے جن خصائص کی ڈاکٹرجالبی نے نشاندہی فرمائی ہے ان میں شبلی کی تاریخی بصیرت،ترتیب،اصولی و عملی تنقید کا امتزاج، فصاحت و بلاغت کے اصولوں کے تحت

مراثی انیس کا تجزیہ خاص طور پر قابل ذکرہیں۔ شعراء العجم کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے خصائص اور نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ’ شعرالعجم ‘کے تحقیقی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دیتے، لیکن ’ شعرالعجم ‘کے تنقیدی پہلو کو اس کی جان قرار دیتے ہیں۔ ’’مکاتیبِ شبلی‘‘کے تجزئیے سے ان کی شخصیت کے مختلف رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بالخصوص ان کی سوانح، عقائد، نقطہ نظر، اندرونی خواہشات، ذہنی کشمکش اور ان کے عشقیہ زندگی کے کچھ پہلو بھی واضح ہوجاتے ہیں۔ شبلی کی نثر نگاری اور طرز ادا کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے شبلی کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے ان میں شبلی کے طرز ادا کی فصاحت و بلاغت، لفظ و معنی کی یکجائی، خطابیہ انداز، اعتدال کے ساتھ رنگین بیانی، سادگی و صفائی، استدلالی اور شاعرانہ انداز اور فنکاری کو مثالوں کے ذریعے نہایت عمدگی سے واضح کیاگیاہے۔ باب کے آخر میں شبلی کی شاعری بالخصوص ان کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے اور عطیہ فیضی کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

شبلی کی شخصیت، فکر اور علمیت کے جائزے کے لحاظ سے اس باب میں تمام بحث طلب امورکو خوبصورتی سے واضح کیاگیاہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی خدمات کے حوالے سے شبلی کے کارناموں اور مقام و مرتبے کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹرجالبی نہایت عمدگی سے تمام پہلو قاری کے سامنے رکھتے ہیں جس سے سرسید اور شبلی کی فکر میں موافقت اور مخالفت کے تمام پہلو واضح ہوجاتے ہیں۔

اردو ادب کے عناصر خمسہ کے ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح اور خدمات کا تجزیہ سب سے آخر میں کیاگیاہےڈپٹی نذیر احمد کی ابتدائی زندگی، خاندان، تعلیم اور ملازمتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹرجالبی ان کی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے مزاج کے حوالے سے ان کی زندگی میں آنے والے اتار چڑھاؤ کا جائزہ بھی لیاگیاہے۔ ’’سیرت، شخصیت اور مزاج ‘‘کے عنوان کے تحت ان کی صورت، سیر ت اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو آشکارہ کیاگیاہے جبکہ ان کی شخصیت کے حوالے سے چند معائب مثلاً بخل اور سودخوری وغیرہ کے حوالے سے غلط فہمی کے ازالے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی سیرت اور عادات کے مختلف پہلو مثلاً حق پسندی،راست بادی، صاف دلی، صاف گوئی،مطالعہ کی عادت، آزادی اظہار، قوم کی اصلاح کا جذبہ، واقفیت پسندی اور عام فہمی پر مختلف مثالوں اور واقعات سے روشنی ڈالی گئی ہے اور انہی عناصر کو ان کی فکر و ذہن کی تشکیل کا ضامن قرار دیاہے۔

ڈاکٹرجالبی نے ’’تصنیفات، تراجم و مکاتیب ‘‘ کے ضمن میں ان کی تصانیف کو ۶ زمروں میں تقسیم کیاہے۔ تراجم کی ذیل میں ان کی ۷ تصانیف کا تعارف پیش کیاگیاہے۔ درسیات کی ذیل میں بھی ۷

کتب کا تعارف پیش کیاگیاہے۔ مذہبی تصانیف کے ضمن میں ۶ تصانیف کا تعارف دیاگیاہے۔ ناول کے ضمن میں ۷ ناولوں کے نام دئیے گئے ہیں۔ مکاتیب کے ضمن میں دو مجموعوں کا تعارف پیش کیاگیاہے اور لیکچر کے ضمن میں ان کے لیکچرز کے مختلف مجموعوں کا تعارف دیاگیاہے۔

''نذیراحمد اور سرسید'' کے عنوان کے تحت نذیر احمد اور سرسید احمد خان کے درمیان تعلقات کے اتارچڑھاؤ ''ان کی وجوہات اور اختلافات اور ان دونوں کے درمیان مشترکات کی نہایت عمدگی سے مثالوں اور شواہد سے وضاحت کی گئی ہے۔ جس سے نذیر احمد اور سرسید احمد خان کے درمیان اختلافات کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجاتاہے۔ نذیر احمد جس عہد اردو زبان وادب کے افق پر نمودار ہوئے اس عہد میں مذہب کی حیثیت سب سے زیادہ اور برصغیر میں شاید پہلی بار متنازعہ ہوئی تھی لہٰذا ان کے عہد کے تناظر میں اور بالخصوص سرسید احمد خان کے مذہبی نظریات کے تناظر میں ان کے معاصر ہونے کے باعث، ڈپٹی نذیر احمد کے مذہبی نظریات کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے عمدہ تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیاہے اور ڈپٹی نذیر احمد کے مذہبی نظریات اور افکار ان کی تصانیف کی روشنی میں واضح کئے گئے ہیں۔ ڈپٹی نذیراحمد کے مذہبی افکار کا مطالعہ ان کی تصانیف کی تقسیم میں نہایت کارگر ہے۔

''ڈپٹی نذیراحمد بحیثیت مترجم'' میں ڈاکٹرجالبی نے انگریزی قانونی اصطلاحات کے اردو میں تراجم، ترجمۃ القرآن کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ ڈپٹی نذیراحمد کے تراجم کے مقابلے میں مختصر قرار دیاجاسکتاہے۔ اردو میں قرآن پاک کے پہلے بامحاورہ اور اردو کی نحوی ترکیب کے مطابق ترجمہ شدہ ہونے کے باعث اس کے مختلف پہلو پر تفصیل سے بحث کی جاسکتی تھی۔ اس طرح قانونی کتب کے تراجم جن سے آج بھی استفادہ کیاجارہاہے تفصیلی بحث کے مستحق تھے۔ باب کے اگلے حصے میں'' ڈپٹی نذیراحمد بحیثیت خطیب '' کے عنوان کے تحت ان کے مختلف لیکچرز کے موضوعات، زبان و بیان اور خطیبانہ انداز کا مختصر جائزہ لیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ڈپٹی نذیراحمد کے ساتوں ناول کا تجزیاتی مطالعہ نہایت تفصیل سے پیش کرتے ہوئے ہر ناول کے پس منظر، پلاٹ، کردار نگاری، زبان، مکالمہ نگاری، محرکات، مقاصد اور ادبی معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول کے حوالے سے ان کی تنقید کو ہمہ گیر قرار دیاجاسکتاہے۔

ڈاکٹرجالبی، ڈپٹی نذیراحمد کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کرتے ہیں، انہیں وہ ان کے ناول کے تناظر میں تفصیل سے زیر بحث لائے ہیں مثلاً ان کی مذہبی فکر اور مذہب پسندی، ان کا قصہ گوئی کا طریقہ، داستانی ماحول کی بجائے دلی کا واقعاتی ماحول، تمثیلی کردار اور ڈرامائیت کا عنصر بالخصوص قابل ذکر ہیں جبکہ ڈاکٹرجالبی ڈپٹی نذیراحمد کے حوالے سے ایک اہم

بحث ڈپٹی نذیراحمد کے ان سات قصوں کو ''ناول '' کہاجائے یا ''تمثیل'' کا تجزیہ کرتے ہوئے بالخصوص ڈاکٹراحسن فاروقی کے حوالے سے ان کی رائے پیش کرنے کے بعد اپنا نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں:''------ان قصوں کو دیکھاجائے تو نذیر احمد کے یہ قصے بیک وقت ناول بھی ہیں اور تمثیلیں بھی اور اس لئے انہیں تمثیلی ناول کہنا چاہیے ''۔ (جلد چہارم،ص۱۱۷۲)

ڈپٹی نذیراحمد کی ناول نگاری کے ضمن میں جن دیگر امور پر بحث کی گئی ہے ان میں ڈپٹی نذیراحمد کا واعظانہ طرز، عام فہمی، تعقل پسندی اور اصلاح کا جذبہ شامل ہیں۔ 'ڈپٹی نذیراحمد کا طرز ادا و اسلوب بیان 'کے ضمن میں ان کی نثر پر حوالے پر اعتراضات کے تجزئیے کے بعد جن خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں معتدل انداز بیان، استدلالی زبان، توضیحی رنگ، شوخی اور ظرافت مکالموں کی زبان اور عوامی طرز کی تخلیقی کی قوت شامل ہیں۔ ان عناصر کی بنیاد پر ان کی نثر کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے تاریخ ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ڈپٹی نذیراحمد کی ادبی کاوش اور اردو زبان وادب کی ترقی کے حوالے سے ان کے کردار پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس حصے میں ڈاکٹرجالبی نے اردو کے عناصر خمسہ یعنی سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیراحمد کی سوانح شخصیت اور تصانیف کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے عہد کے تہذیبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی منظر نامے پر ظہور پذیر ہونے والے تغیرات کے حوالے سے نہایت عمدہ تنقیدی، تحقیقی و تجزیات مطالعہ پیش کیاہے۔ اردو ادب میں نئی تصانیف کے ظہور کے ساتھ ساتھ نثر و شاعری میں ہونے والے نئے تجربات ان، ان تجربات کے محرکات، عوامل، مقاصد اور نتائج کا بھرپور تجزیہ ہررکن کے حوالے سے کیاگیاہے۔ اس فصل میں بالخصوص سرسید احمد خان اور ان کے معاصرین کی فکر و نظر کے اختلافات کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان باہمی مشترک جذبے یعنی قوم کی اصلاح پر بھی بھرپور اور تدریجی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک ہی عہد اور ایک ہی تحریک سے متاثر ہونے کے باوجود شخصی اور نفسیاتی اختلافات کس طرح متنوع قسم کے نتائج کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ان سب کا مطالعہ ڈاکٹرجالبی نے نہایت دقتِ نظری سے پیش کیاہے۔ یہ فصل نہ صرف ایک پورے تغیرپذیر عہد کا مطالعہ ہے بلکہ اس عہد پر اثر انداز ہونے والی شخصیات کا مطالعہ بھی ہے جو اپنی ذات میں ایک انجمن ہونے کے باوجود اپنے عہد کی علمی، سیاسی، مذہبی، ادبی اور سماجی سطح کو متاثر کررہی تھیں۔ ظاہرہے کہ اس قد راثرانگیز شخصیات، اپنی ذاتی حیثیت میں بھی ایک مخصوص ''شخصیت'' کی حامل تھیں۔

ڈاکٹرجالبی نے ان شخصیات کی ذات کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کی ذاتی زندگی اور ادبی حیثیت کے درمیان تال میل کو خوبصورتی سے اجاگر کیاگیاہے۔ اردو کے ارکانِ خمسہ جہاں اپنی تخلیقی اپچ کے باعث اردو زبان و ادب کے افق کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان کی ذات اور کاموں کے حوالوں سے مختلف ادوار میں شکوک و شبہات کا بھی اظہار کیاگیا۔ ڈاکٹرجالبی نے ہر ادیب کی ذات کے حوالے سے پائے جانے والے متنازعہ مباحث کا نہ صرف تجزیہ کیابلکہ ان کی ذات سے وابستہ منفی رحجانات کو دورکرنے کی سعی بھی کی ہے اور ہرمصنف کے مخصوص انفرادی رنگ کو اجاگر کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان کی حیثیت کا تعین کیاہے۔ جوکہ مؤرخ کے فرائض میں شامل ہے۔

فصل سوّم کے اگلے حصے میں ''روایت شعری کا فروغ ''کے عنوان کے تحت چار ابواب شامل کئے گئے ہیں۔ فصل سوم میں کہیں بھی ابواب بندی کی نشاندہی نہیں کی گئی جبکہ اس آخری حصے میں ابواب کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اس حصے میں شامل کئے گئے شعراء کا مطالبہ جس بنیادپر کیاگیاہے وہ پرانی روایت میں نئے رحجانات کے واضح اثرات کی نشاندہی اور روایتی شاعری کے آخری دور کا جائزہ شامل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے سوانحی حالات، شخصیت، تصانیف اور عصری حالات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ منیر شکوہ آبادی کے حالات زندگی کے بیان میں ڈاکٹرجالبی نے جابجا ان کی شاعری سے حوالے پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی یہاں اس امر کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ اردو میں اب تک کتاب تاریخ کو سامنے رکھ کر کسی بھی شاعر کے سوانح ترتیب نہیں دئیے گئے منیر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے بدلتے رحجانات کے عوامل اور ان کے معاصرین کے اثرات کی نشاندہی بھی عمدگی سے کی گئی ہے۔

منیر کی تصانیف کا تعارف کرواتے ہوئے ان کے ضائع شدہ کلام کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے۔ منیر کے تیسرے دیوان سے شاعری کے ان بدلتے رحجانات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنیا دپر منیر شکوہ آبادی کو بدلتے رحجانات کے شعراء کے زمرے میں رکھا گیاہے۔منیر کی قصیدہ نگاری کاتجزیہ کرتے ہوئے انہیں عربی قصیدے کی روایت کے پیروکار قراردیتے ہیں جس میں قصائد موضوعات پر لکھے جاتے تھے۔ ڈاکٹرجالبی، منیر شکوہ آبادی کے قصیدے ''مطلع الانوار'' کاتجزیہ کرتے ہوئے اسے مولوی فضل حق خیرآبادی کے چیلنج کے جواب میں تحریر کردہ قصیدہ قراردیتے ہیں۔ (ساراواقعہ ص۔۱۲۰۰ پر درج ہے) ڈاکٹرجالبی کے مطابق :''اس قصیدے میں منیر نے فارسی

قصیدہ گویوں کی اصطلاحات و کتابیات و رمزیات کو اس طرح باندھا ہے کہ اسے اپنی نوعیت کا فنی اعتبار سے منفرد و اکلوتا قصیدہ کہاجاسکتاہے ‘‘۔ (جلد چہارم،ص۱۲۱۳)

دوسرے باب میں سید مظفرعلی اسیر لکھنوی کی سوانح، شخصیت اور کلام کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ڈاکٹرجالبی نے سید مظفراسیر لکھنؤی کی اردو و فارسی کے ۸دواوین کا تعارف پیش کرنے کے بعد ۵ مثنویوں کا تعارف پیش کیاہے۔ اسیر لکھنؤی کی اردو اور فارسی کے ساتھ رسائل و کتب نثر کے علاوہ ۷ غیرمطبوعہ داستانوں کے نام بھی درج کئے ہیں۔ اسیر کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے موضوعات اور فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی انہیں روایتِ ناسخ کی تکرار کا شاعر قراردیتے ہیں۔ لیکن ان کی فنی پختگی کی کھل کرداد دی گئی ہے۔

تیسرے باب میں امیراللہ تسلیم لکھنؤی کی حیات، شخصیت اور کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔تسلیم لکھنؤی کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے اس عہد کی بدلتی قدروں اور ان پر ان کے رد عمل کے حوالے سے دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ تسلیم لکھنؤی کی ۷ تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیاگیاہے۔ تسلیم لکھنؤی کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کلام سے دہلوی اور لکھنؤی رنگوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنیاد پر نئے رحجان کی ابتداء کا سراغ ملتاہے جو بالاخر حسرت موہانی کی غزل میں نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہمارے دور سے آملتی ہے۔

چوتھے باب میں میر ضامن علی جلال لکھنؤی کی سوانح، شخصیت اور کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھنوی عہد کی اقدار اور مزاج کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس باب میں جلال کی زبان دانی کی مخالفت اور موافقت میں جو رسائل تحریر کئے گئے ان کا ذکر کرتے ہوئے شوق نیموی اور ان کے درمیان جاری رہنے والے معرکے کا احوال بھی قلمبند کیاگیاہے۔ جلال کی تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کرکے تجزیہ کیاگیاہے۔ شاعری کی ۶ کتب کا تعارف پیش کرنے کے بعد زبان اور قواعد کے حوالے سے ان کی ۵ کتب کا تعارف پیش کیاگیاہے جبکہ ان کی ایک غیرمطبوعہ داستان ’’داستان بالاختر‘‘ کا ذکر بھی کیاگیاہے۔نئے رحجان کی ابتداء کے حوالے سے شعر ا ء کے مطالعے کے ضمن میں ضامن ؔکو شامل کرنے کے باوجود ان کی شاعری سے زیادہ ان کی لغت نویسی اور لسانی حوالے سے کتب کا تجزیہ کیاگیاہے۔ ضامنؔ کے وضع کردہ کچھ لسانی اور قواعد ی اصولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی لغت نویسی کے حوالے سے کوششوں کاجائزہ بھی لیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی، ضامن کی زبان اور لغت کے حوالے سے ان کی کاوشوں کی بنیاد پر انہیں اپنے عہد اور ہم عصروں میں ممتاز زبان دان اور محقق قراردیتے ہیں۔ ضامن کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی شاعری میں رنگِ ناسخ اور رنگِ آتش کے امتزاج سے روایت کی پیروی اور

روایت سے انحراف کے عمل کو اہم قرار دیتے ہیں،جو دورِ زوال کی نشانی ہونے ساتھ ساتھ نئے عہد کے طلوع ہونے کا اظہار بھی ہے۔

فصل چہارم جوکہ جلد چہارم کی آخر فصل ہے، میں ابواب بندی کرتے ہوئے ابواب کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ اس فصل میں متنوّع رحجانات اور اصناف کا جائزہ لیاگیا ہے جبکہ اس سے پہلے فصلوں کی تقسیم میں ڈاکٹرجالبی اصناف یا ادوار کے لحاظ سے حد بندی کو ملحواظ خاطررکھتے تھے۔ اس فصل میں داستانوں، سفرناموں، مذہبی تصانیف، تذکروں، کتب تواریخ، اردو لغت گوئی کی نئی روایت، شاعری کے دوروائتی رنگ اور جدید دور کا ارتقاء کے عنوانات کے تحت مختلف مصنفین اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیاہے۔ فصل کی ابتداء میں ''اردو داستانیں ' ' کے عنوان سے تمہید میں انیسویں صدی میں اردو داستانوں کے فروغ کے عوامل کے ساتھ ساتھ ناول اور داستان کے درمیان بنیادی فرق کو بھی واضح کیاگیاہے۔' طلسم ہوشرباء 'اور 'بوستانِ خیال 'کے مختلف مآخذات، زبان، کردار نگاری، معاشرت کی عکاسی، زبان و بیان کے حوالے سے جائزہ لیاگیاہے۔ اس باب میں ڈاکٹرگیان چند کے حوالے سے داستان امیرحمزہ کی ۴۶ نول کشوری جلدوں کی تفصیل کے علاوہ داستان امیر حمزہ کے دوسلسلوں کی تفصیل بھی فراہم کی گئی ہے۔(۱۲۷) ''طلسم ہوشربا'' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس قصے کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرجالبی، داستانوں کے حوالے سے مختلف مباحث اور اعتراضات کا تجزیہ کرتے ہیں بالخصوص داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر، حقیقی زندگی سے بُعد اور مصنوعی زبان کے حوالے سے اعتراضات کا خوبصورت تجزیہ کرتے ہوئے ان اعتراضات کو ردّ کیاگیاہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''اردو داستان گوئی وہ صنف ادب ہے جس میں تصوراتِ مشرق اپنی پوری روح کے ساتھ موجود ہیں۔ جیسے ''ناول '' مغربی تہذیب کے تصور انسان و تصورکائنات کا ترجمان ہے اسی طرح ''داستان '' مشرق کے تصورات انسان وکائنات کی ترجمان ہے ''۔ (جلد چہارم،ص۱۳۱۴)

داستانوں کے اندازِ بیان کا تجزیہ کرتے ہوئے ''طلسم ہوشربا'' کے داستان گو محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کے نثری اقتباسات کی روشنی میں دونوں کی نثراور اندا زبیان کی خوبیوں کا تقابل بھی پیش کیاگیاہے۔ ''بوستان خیال'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے وجود میں آنے والے عوامل اور اس کے مصنف تقی خیال کے حالات و واقعات کے علاوہ اس داستان کے مترجمین خواجہ امان اور خواجہ قمرالدین کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور داستان کے ترجمے کے ضمن میں آنے

والی مشکلات کا بھی احاطہ کیاگیاہے۔ داستان’ بوستانِ خیال‘ کی زبان و بیان کا بھی عمدگی سے تجزیہ کیاگیاہے۔

’’داستان اور ناول کا متزاج ‘‘ کے عنوان کے تحت پنڈت رتن ناتھ سرشار کے حالات زندگی، ان کی شخصیت اور تصانیف کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ’’فسانہ آزاد ‘‘ تفصیلی تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ ’’فسانہ آزاد‘‘ کاتجزیہ کرتے ہوئے سرشار کے عہد کے تہذیبی روّیوں اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کے حوالے سے’’فسانۂ آزاد‘‘ پر ان کے اثرات کا تجزیہ بھی کیاگیا ہے۔’’ دوسرے ناول اور تصانیف ’’کے عنوان کے تحت دوبارہ’ فسانہ آزاد ‘ہی کاتجزیہ کیاگیاہے اس حصے میں ’فسانۂ آزاد‘کے مآخذات کردار نگاری، مزاح، اس کے پلاٹ کا تفصیلی تجزیہ کیاگیا ہے جبکہ ان سب مباحث کو’’ فسانۂ آزاد کا مطالعہ‘‘ کے ضمن میں شامل کرنا چاہئے تھے۔ سرشار کے دوسرے ناول ’’سرکہسار‘‘کے پلاٹ، کردار نگاری زبان وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے سرشار کی شخصیت اور ان کے عہد کے عام روّیوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ ’’دوسری اصناف نثر کا مطالعہ‘‘ کے عنوان سے یوسف خان کمبل پوش کے ’’عجائبات فرنگ‘‘ ’’سیاحت نامہ ‘‘ ازکریم خان ’’روزنامچہ‘‘ از سید مظہر علی سندیلوی کاجائزہ لیاگیاہے۔ یوسف خان کمبل پوش کی اردو سفرنامے میں اولیّت ثابت کرنے کے علاوہ ان کی شخصیت، ان کے نام اور مذہب کے حوالے سے بھی قابل قدر معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سفرنامے ’’عجائباتِ فرنگ‘‘ کی زبان کی ساخت اور ترکیب نحوی کا جائزہ لیتے ہوئے اردو نثر کے ارتقاء میں اس کے کردار پرروشنی ڈالی گئی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو نثر کے مذہبی تصانیف میں استعمال کے حوالے سے’ تقویۃ الایمان‘ از شاہ اسماعیل شہید، سعید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کی ’’تذکرۂغوثیہ‘‘ کی اردو نثر کا تجزیہ کرنے کے بعد تذکروں میں اردو نثر کاجائزہ لیاگیاہے۔ اردو زبان میں تصنیف کئے جانے تذکروں، گلشنِ ہند، خوش معرکۂ زیبا، گلستانِ سخن، تذکرہ طبقاتِ الشعرائے ہند اور انتخاب یادگارسے اقتباسات درج کرکے اردو زبان کے بدلتے رحجانات اور مختلف اصناف میں اردو کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو نثر کی اسی قدر قیمت کے حوالے سے تاریخی کتب’’ تاریخِ روہیل کھنڈ‘‘ اور’’ تاریخ بندیل کھنڈ‘‘ کے اقتباسات کی روشنی میں اردو نثر کے ارتقاء اور رواج کا جائزہ لیاگیاہے۔ ’’اردو نعت گوئی کانیا رنگ، نئی روائت‘‘ کی ذیل میں سب سے پہلے محسن کا کوری، کے حالات زندگی، ان کے مزاج،شخصیت اور تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محسن کاکوری کی لغت گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے رنگِ شاعری کا جائزہ بھی کیا گیا ہے۔ بقول جالبی:

’’محسن کاکوری نے اپنے موضوع کی مناسبت سے جذبۂعشق کو اپنی شاعری میں شامل کرکے طرزِ ناسخ کو ایسا رنگ دیاہے جس میں ناسخ و الی خارجیت بھی ہے اور وہ داخلیت بھی جو اظہارِ عشق سے پیداہوتی ہے۔ خارجیت میں داخلیت اور داخلیت میں خارجیت یہی طرز محسن ہے ‘‘۔ (جلد چہارم،ص۱۴۰۸)

محسن کاکوری کی لغت گوئی کے علاوہ ان کی مثنویوں اور قصائد کا فکری و فنی تجزیہ بھی پیش کیاگیاہے اور لغت گوئی اور عشق رسول ؐ کے حوالے سے ان کے شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پرروشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی، محسن کاکوری کی تخلیقی دنیامیں ہندو مسلم کلچر امتزاج کی روایت کو میران جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور امین اعلیٰ کی روایت کی توسیع قراردیتے ہیں۔ لغت گوئی کے حوالے سے کرامت علی شہید ی پرتنقیدی آراء کا اظہار ان کے مطبوعہ دیوان، تذکروں اور دیگر ذرائع سے ملنے والے کلام کی بنیاد پرکیاگیاہے۔

’’شاعری کے دوروائتی رنگ انیسویں صدی کا خاتمہ ‘‘ کے عنوان کے تحت ’’امیرمینائی ‘‘ اور ’’مرزاداغ دہلوی‘‘ کوموضوع بحث بنایاگیاہے۔ امیرمینائی کی سوانح اور شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس عہد کی تہذیبی اقدار کے تضاد اور امیرمینائی کی شخصیت کے تضاد کو بھی اجاگرکیاگیاہے جو ان کے عہد کے لوازمۂ تہذیب کا حصہ تھا۔ تضاد کا یہ رنگ ان کی شاعری میں بھی دیکھا جاسکتاہے جہاں ایک طرف ان کی مذہبی شاعری ہے دوسری طرف غزل میں نشاطیہ رحجان جس میں سوقیت اور عریانی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے امیر مینائی کی ۴۴ فارسی اور اردو نثری و شعری تالیفات اور تصنیفات کا تعارف کروایاہے جن میں مطبوعہ و غیرمطبوعہ تمام کتب شامل ہیں۔ ان کی نثری تصانیف کو علمی و لسانی، مذہبی اور ادبی زمروں میں تقسیم کرکے ان کا تجزیہ کیاگیا ہے۔ امیرمینائی کے تذکروں اور لغات کے تجزئیے میں ان کی وجۂتصنیف پرروشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے طریقۂکار کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ امیرمینائی کے خطوط کے تجزئیے سے عروضی و لسانی مسائل کے حوالے سے مفید نکات کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے۔ امیرمینائی کی نثرکامطالعہ، اردو نثر کے اس جدید اسلوب کی نشاندہی کرتاہے جو خالص علمی، ادبی اور مذہبی کو بحسن و خوبی پیش کرنے کی صلاحیت حاصل کرچکاتھا۔ امیرمینائی کی شاعری کو ڈاکٹرجالبی ولی دکنی کی روایت کی شاعری کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے ان کی شاعری کی مختلف اصناف، موضوعات اور زبان و بیان کو موضوع بحث بنایا گیاہے۔ بقول جالبی:

''شاعری کی اسی روایت کے تعلق سے ان کے کلام میں وہ سارے کنابات، تلمیحات و رمزیات موجود ہیں جن سے یہ روائت عبارت ہے اور یہ کنایات، تلمیحات نئے معنی میں نہیں بلکہ انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں گزشتہ اساتذہ نے انہیں استعمال کیاتھا''۔(جلد چہارم،ص۱۴۶۵)

ولی دکنی کی روایتِ شاعری کے آخر ی شاعر کے طور داغؔ دہلوی کی سوانح، شخصیت تصانیف کا تجزیہ، ''مرزا داغ دہلوی'' کے زیر عنوان کیاگیاہے۔ داغؔ کے محرکات و موضوعاتِ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی تعمیر کے حوالے سے ان کی سوانح دلچسپ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ ایک ایسے عہد میں جب ایک تہذیب مکمل طور پر زوال پذیر تھے اس کی اقدار، نظریات، رکھ رکھاؤ، اور تقاضے جس رخ کو اختیار کرلیتے ہیں، ان سب کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی داغؔ کی شخصیت اور ان کے عہد کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس عہد کی تہذیبی علامت،طوائف کی ضرورت و اہمیت کے علاوہ اس عہد کی دیگر تہذیبی سرگرمیوں یعنی شاعروں، تہذیبی رسومات اور عشق بازی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگرکیاگیاہے۔ ان سرگرمیوں میں داغؔ کی شرکت اور ان کے نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے داغؔ کے چار دواوین کے علاوہ'' ضمیمہ یادگارِ داغ'' اور خطوط کے دومجموعوں کا تعا رف پیش کیاہے۔ داغؔ کی شاعری کے مطالعے کے ضمن میں ان کے قصائد اور مثنویوں کا تجزیہ کیاگیاہے جبکہ داغؔ کی غزل کے عنوان کے تحت ان کی غزل گوئی کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ داغ کی غزل کے موضوعات، تصورمحبوب، نظریۂعشق کا نفسیاتی تنقید کے اصولوں تحت تجزیہ کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اگرچہ جلد سوّم کے دیباچے میں ہر قسم کی تنقید یعنی تہذیبی، عمرانی، نفسیاتی، رومانوی اور تاثراتی وغیرہ کو برتنے کادعوٰی کیاہے لیکن نفسیاتی تنقید کو جس خوبصورتی اور عمدگی سے داغ کی شاعری کے ضمن میں استعمال کیاگیاہے اس کی مثال ان کی دوسری جلد وں میں نظرنہیں آتی۔ ''داغ کی غزل۔مزید مطالعہ'' کے عنوان سے ایک اور سرخی جمائی گئی ہے جوکہ اضافی ہے۔ داغ کی غزل کے مطالعے میں ان امور کو باآسانی شامل کیاجاسکتاتھا۔ اس حصے میں داغ کی غزل کا فن کے نقطۂ نظر سے مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ داغ کی غزلوں کی ردیف، قافیہ بندی، ضائع و بدائع کا استعمال، محاورہ و روزمرہ، بے ساختگی، طنزو مزاح موسیقیت وغیرہ کا تجزیہ کیاگیاہے اور داغ کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس حصے میں بھی داغ کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اس کے نفسیاتی اثرات زیربحث لائے گئے ہیں۔ داغ کا مقام ومرتبہ متعین کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

''بحیثیت مجموعی داغ دہلوی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے لئے عظیم،
کا لفظ تو استعمال نہیں کیاجاسکتا،مگر جوپوری طرح آج بھی زندہ ہیں
اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔ ان میں شاعری کی وہ پراسرار قوت ہے
موجود ہے جس سے شاعر اپنے ماحول کی زندگی اور اپنے فن کی
روایت کو زندہ کردیتاہے''۔ (جلد چہار،ص۱۵۶۰)

اس حصے کے اختتام پر جلد چہارم کی بے ترتیبی بھی واضح ہوکرسامنے آتی ہے۔ داغ کے مطالعے کی آخری سطور میں ڈاکٹرجالبی مطلع کرتے ہیں کہ اب نئے عہد کی آوازوں شبلی، سرسید وغیرہ کا مطالعہ کیاجائے گا۔ (ص۱۵۲۳) لیکن ان سب کا مطالعہ ''اردوکے عناصر خمسہ'' کے ضمن میں پہلے ہی کیاجاچکاہے۔

آخری حصے کو ''جدید دورکاارتقاء ''کانام دیاگیاہے اور اس میں محمد اسمٰعیل میرٹھی کے عہد، سوانح اور نیچرل شاعری کے ارتقاء اور مقبولیت کا جائزہ لیاگیاہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کو جالبی،تحریکِ سرسید سے متاثر قراردیتے ہوئے ان کی تحریک کے زیر اثر شاعری میں واقعیت کی عکاسی کو اہم قراردیتے ہیں۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی کی مختصر سوانح اور تصانیف کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کی شاعری کے مطالعے کے ضمن میں ان کی غزل گوئی قصیدہ گوئی، مثنویات (جنہیں ڈاکٹرجالبی نظمیں قراردیتے ہیں)کا تجزیہ کرتے ہوئے نئی شاعری کے حوالے سے ان کی انفرادیت اور اختراعات پرروشنی ڈالی گئی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے موضوعات اور طرز ادامیں تحریک سرسید کے اثرات کی نشاندہی عمدگی سے کی گئی ہے۔ خصوصاً بچوں کی درسی اور نصابی کتب کے حوالے سے ان کی شاعری کے اخلاقی پہلو پربالخصوص توجہ دی گئی ہے۔ یہاں اس جلد کا اختتام ہوتاہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ جلد سوم کا اختتام بھی جدید شاعری کے ارتقاء کے حوالے سے محمداسمٰعیل میرٹھی کے ذکر پرہوتاہے اور چوتھی جلد کااختتام بھی ان کے کلام سے حوالے سے ہوتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے جیساکہ اس جلد کے پیش لفظ میں وضاحت کردی تھی کہ یہ جلد، جلد سوم کی توسیع ہے لہٰذا ان کے نظریہ تاریخ نویسی، اسلوب اور طریقہ کار کو 'جلدسوم میں بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں تصنیف کیاگیاہے۔ جلد سوّم میں بیان کئے گئے۔ نظریہ تاریخ نویسی اور طریقہ کارکے تحت اگراس جلد کا تجزیہ کیاجائے تو اس جلد کو ڈاکٹرجالبی کی تاریخ ادب اردو کے سلسلے کی سب سے کمزور جلد قراردیاجاسکتاہے۔ اس سے پہلے کہ اس جلد کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے بہترہے کہ اس جلد کے محاسن پر نظرڈال لی جائے، ڈاکٹرجالبی جلد سوّم کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :''میں نے کوشش

کی ہے کہ ادب کی تفہیم اور اس کا مطالعہ سماج، تہذیب، کلچر اور لسانی پہلوؤں کے ساتھ، ایک اکائی کے طور پرکیاجائے ‘‘۔ (۱۲۸)

ڈاکٹرجالبی نے ادب کی تفہیم کے اپنے اس نظریے کی چوتھی جلد میں بھی بھرپور پاسداری کی ہے۔ اس جلد میں ڈاکٹرجالبی نے جن شعراء، تحاریک، اصناف، نثر نگار حضرات کا مطالعہ پیش کیاہے، ان پر تہذیبی، سماجی، سیاسی عوامل کے اثرات کی بھرپور نشاندہی کی گئی ہے۔ غالب کو غالب بنانے میں جوتہذیبی اور سماجی عوامل تھے وہ غالب کے مطالعے کی ذیل میں بھرپور طریقے سے واضح کئے گئے ہیں۔ اردو مرثیہ کن عوامل کے باعث لکھنؤی معاشرے میں مقبول ہوکر شاعری میں مرکزی صنف کی حیثیت کرلیتاہے ؟ مرثیہ نگاروں نے کس طرح اپنے عہد کے سیاسی، تہذیبی اور سماجی عوامل کو بھانپتے ہیں اپنے لئے انفرادی راہیں نکالیں ؟ سرسید احمد خان کی تحریک کن سیاسی و معاشرتی حالات کا نتیجہ تھی؟ اردو زبان کس طرح مسلمانوں کے دورِ زوال مین بھی ترقی کے راستے پرگامزن رہی ؟ نئی تہذیب کے اختلاط سے کسی طرح نئی اصناف اردو ادب کے قافلے کاحصہ بنتی رہیں اور اردو نظم کے دور میں اردو نثر کسی طرح اپنا رنگ بدل کرنئی تہذیبی و لسانی ضرورتوں کو پوراکرنے کے قابل بنی ؟ اردو شاعری کی روایت کس طرح تہذیبی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرتی دورِ عروج کو پہنچ کر ایک نئی روایت کی صورت میں جلوہ گری کرتی ہے ؟ ان سب سوالوں کے جوابات انہیں تہذیبی، معاشرتی، لسانی اور سیاسی عوامل میں چھپے ہیں جو اس صدی کو متاثر کرتے رہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے انہیں پس منظری مطالعے کے ذیل میں نہایت خوبصورتی سے واضح کیاہے۔ ڈاکٹرعبدالعزیز ساحرکے مطابق:

> ’’ڈاکٹرصاحب نے ہنداسلامی تہذیب کے تناظر میں، اردو ادب کی روایت کا مطالعہ کیاہے۔ انہوں نے زبان کی ساخت و داخت کے منظر نامے سے لے کر ادب کے آغاز و ارتقاء تک کے پیش نامے کاتجزیہ کیاوہ عہد بہ عہد بدلتے ہوئے معنوی منظرنامے کی کڑیاں جوڑتے رہے اور یوں انہیں ایک وحدت کی صورت عطاکی۔ انہوں نے ادبی تاریخ کی تشکیل اورتہذیب میں محض ادبی رویوں کے بدلتے ہوئے خدوخال ہی کو نہیں دیکھا۔ بلکہ انہیں تہذیبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقدار کے پس منظر میں رکھ دیکھنے کا جتن کیاہے وہ ادب سے تہذیب فہمی اور تہذیب سے ادب شناسی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور تاریخ کے تناظر میں تہذیب کی کلی معنویت اپنے تمام تررنگوں

کے ساتھ آشکار ہوتی رہی اور تہذیب کے آئینے میں ادب کا چہرہ اپنی بہار دکھاتارہا‘‘۔(۱۲۹)

ڈاکٹرجالبی نے جلد چہارم میں بھرپور طریقے سے علامات، رمزیات، اصناف اور اسالیب، پرسماجی، سیاسی، تہذیبی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں ہرشاعرکی شاعری کی لسانی خصوصیات کے جائزے میں ان الفاظ کی نشاندہی کی گئی ہے جو متروک ہوگئے تھے یاجوصورت بدل کرنظم و نثر میں ظہور پذیر ہورہے تھے بالخصوص مغلیہ عہد حکومت کے زوال کے ساتھ اور انگریزی زبان کے الفاظ کا اردو زبان میں دخل بڑھ گیا تھا جس کے نتیجے میں ادیبوں اور شاعروں نے انگریزی الفاظ کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناناشروع کیا۔الفاظ کے اثرو نفوذ کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے واقفیت کے نتیجے میں جب مغربی ادب تک رسائی ہوئی تو برصغیر کے تخلیق کاروں نے نہ صرف نئی اصناف کو اپنایا بلکہ نئے نئے موضوعات، اسالیب، رمزیات حتیٰ کہ تنقیدی نظام فکر پربھی اس کے بھرپور اثرات مرتب ہوئے، ان سب کی نشاندہی فصل چہام میں نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔

ڈاکٹرجالبی کی تاریخ نویسی کا اہم پہلو اس کا عمدہ تحقیقی معیار ہے۔ ڈاکٹرجالبی کی تاریخ ادب کی دیگر جلدوں کی مانند اس جلد میں بھی شعراء اور نثرنگاروں کے سوانحی حالات کے ضمن میں تحقیقی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قابل بھروسہ مآخذات پربھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی دقت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے سوانحی کوائف محفوظ کئے گئے ہیں۔ تحقیقی شعور کی بنیاد پر دستیاب مآخذات کی جانچ پرکھ کے بعد کوائف کو تاریخ ادب کا حصہ بنایاگیاہے۔ خصوصاً غالب کے حوالے سے ان کی زندگی کے ہرپہلو کے بارے میں معلومات دستاویزی شہادتوں کسی بنیاد پر فراہم کر دی گئی ہیں۔

تخلیق کار کی زندگی کے اہم واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کے حوالے سے مختلف معرکوں اور مقدموں کی تفصیل بھی جامعیت اور ٹھوس دستاویز ی ثبوت کی بنیاد پر درج کی گئی ہے۔ غالب کا پنشن کے حوالے سے مقدمہ ہویا قاطع بربان‘‘ کے حوالے سے مقدمہ، غالب کی شراب نوشی کا ذکر ہویاقماربازی کے نتیجے میں گرفتاری کا، سرسید کے مذہبی نظریات، اکبراور سرسید کے فکری تضادات اور ان کا پس منظر، ڈپٹی نذیراحمد کی شخصی خامیاں ہویاداغ کی ذاتی زندگی اور تہذیبی زندگی کے مختلف مظاہران سب اور دیگر امور کی تفصیل غیرجانبداری اور دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر اس تاریخ ادب کے صفحات پربکھری ہوئی ہے۔

ڈاکٹرجالبی، جلد سوم کی تمہید میں اپنے شاعروں، ادیبوں اور فکشن نگاروں کے اپنے ادب اور روایت کے حوالے سے مطالعے پرزوردیتے ہیں اور مغربی تخلیق کاروں سے ان کے موازنے کو مسترد کرتے ہیں۔ تاریخ ادب جلد چہارم کے تخلیق کاروں کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے اپنے اس نظرئیے کی پاسداری کی ہے لیکن کہیں کہیں مغربی ناقدین اور شعراء کا حوالہ بہرحال موجود ہے۔ لیکن اس تقابلی مطالعے کو باقاعدہ موازنہ یا تقابل قرار نہیں دیا جاسکتاکیونکہ مغربی ناقدین، تخلیق کاروں کا حوالہ محض چند سطری ہے یا اسی اصناف کے ضمن میں ہے جو مغرب ہی سے برآمد کردہ ہیں۔ یہ ذکر ایسے مباحث کے جائزے میں آیا ہے جو اردوادب میں پہلے سے زیر بحث ہیں جن میں برصغیر کے تخلیق کاروں کا موازنہ مغرب کے تخلیق کاروں سے کیا گیا ہے۔ مثلاً سرسید احمد خان اور بیکن کا موازنہ (ص۔۸۷۴-۸۷۵)، حالی کا ڈرائیڈن اور جون سن سے موازنہ (ص۔۹۶۸-۹۷۰)، محمد حسین آزاد کی نثر کی خصوصیات کے ضمن میں، بیکن،سڈنی،للی (lily)آزاد، ایڈیسن اسٹیل اور ڈی فوکی نثر کاجائزہ (ص۔۱۰۴۹-۱۰۵۰(ان مثالوں کے علاوہ حالی، سرشار، سرسیداحمد خان وغیرہ کے ابواب میں جہاں کہیں مغربی ناقدین اور تخلیق کاروں کاذکر آیا ہے اس کا مقصد موازنے سے زیادہ مثالیں مہیا کرنا ہے۔

جلد چہارم میں نظم ونثر کا مطالعہ زمانی ترتیب کے مطابق کیا گیاہے لیکن فصل بندی کرتے ہوئے اصناف سخن پر توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً فصلِ اول میں غالب کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین ابراہیم ذوق، مومن خان مومن وغیرہ کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے دوسرے درجے کے شعراء کا تجزیہ لیا گیاہے۔جبکہ فصلِ دوم میں مرثیہ نگاری پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے انیسویں صدی کے اہم مرثیہ نگاری کے فکروفن کا جائزہ لیا گیاہے اسی طرح تیسری فصل میں ایک طرف ’’اودھ پنچ‘‘ اور اسی کا تخلیق کاروں کاتجزیہ شامل ہے وہیں اردو کے عناصر خمسہ کے مطالعے کے ضمن میں سرسید احمد خان، حالی، آزاد، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے بعد اردو داستانوں، سفر ناموں، مذہبی تصانیف، تذکروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو شاعری کی روایت جو کہ غالب سے شروع کی گئی تھی اسے نذیر احمد کے بعد دوبارہ جوڑتے ہوئے روایت شاعری کا فروغ کے تحت اس عہد کے دوسرے درجے کے شعراء کا ذکر کیا گیاہے۔ شاعر ی کی روایت کے اس سلسلے کو دوبارہ جوڑتے ہوئے فصل چہارم کے آخر میں امیر مینائی اور داغ کے مطالعے کے ذریعے دوبارہ جوڑتے ہوئے، ’’جدید دور کے ارتقاء‘‘ کے عنوان کے تحت اسمٰعیل میرٹھی پر ختم کیا گیا ہے۔ جلد سوّم کے پیش میں کئے گئے ڈاکٹر جمیل جالبی کے دعوے کے مطابق انہوں نے ایسے شعراء اور تخلیق کاروں کا متعارف کروایا ہے جنہیں پہلے تاریخ ادب میں جگہ نہیں ملی جبکہ چہارم کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی

کے اس دعوے پر یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس جلد میں موجود تمام تخلیق کار اپنے عہد میں تاریخ ادب میں کسی نہ کسی حوالے سے معروف رہے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی تخلیق کار کو نو دریافت شدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ انیسویں صدی کے نصف اوّل اور نصف آخر میں '' دلی کالج '' کے حوالے سے کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئی حالانکہ اردو کے بہت سے معروف تخلیق کار ''دلی کالج '' سے وابستہ رہے۔ مثلاً مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، امام بخشی صبہائی وغیرہ حالانکہ ان مصنفین کے ذکر جلد سوم اور چہارم میں موجود ہے۔سرسید احمد خان کی تحریک کے ضمن میں، نواب محسن الملک، وقار الملک اور مولوی ذکاؤ اللہ کا ذکر موجود نہیں۔ اسی طرح عبدالحلیم،شرر اور راشدالخیری کا ذکر بھی موجود نہیں۔جلد سوم کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ:''میں نے کم وبیش ساری تصنیف نظم و نثر، جن کا تجزیہ و مطالعہ '' تاریخ '' میں آیا ہے براہ راست مطالعہ کر کے تجزیاتی و تنقیدی رائے قائم کی ہے''۔(۱۳۰)جلد چہارم کا جائزہ اگر اس بیان کی روشنی میں لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادب کی دیگر جلدوں کی نسبت، اس جلد (چہارم) میں تخلیق کاروں کے معرکے، یا تنقیدی مباحث مثلاً مرثیہ اور ایبیک کا موازنہ، غالب کا سفر کلکتہ، انیس اور دبیر کا موازنہ، آب حیات کے حوالے سے آزادی کی تاریخ نگاری، نقائص، آزاد کے مضامین کے مآخذ ات اور اس طرح کے دیگر مباحث پر اپنی رائے دینے کی بجائے دیگر ناقدین کی رائے کو زیادہ جگہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جلد میں حوالے کے 'اقتباسات' دیگر جلدوں سے کہیں زیادہ اور طویل ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس جلد میں تجزیہ اور تنقید کے حوالے سے عمدہ نمونے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی دیگر جلدوں کی مانند اس جلد میں بھی امتزاجی تنقید کے طریقہ کار کو اپنایا ہے لیکن اس جلد میں بالخصوص نفسیاتی تنقید کے بعض بہت اچھے نمونے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً غالب، آزاد اور داغ کے ضمن میں کی گئی تنقید میں نفسیاتی تنقید کا طریقہ کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔

جلد چہارم کا اسلوب بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی بقیہ جلدوں کی طرح عام بول چال کی زبان سے قریب ہوئے بھی علمی ہے۔(تفصیلی جائزہ دیگر جلدوں کے ضمن میں کیا جا چکاہے)البتہ ایک فرق جو دیگر جلدوں میں موجود نہیں ہے وہ انگریزی اصطلاحات اور الفاظ کا نسبتاً زیادہ استعمال ہے۔ انگریزی الفاظ کا استعمال کر تے ہوئے اس کا اردو متبادل بھی دے دیا گیا ہے لیکن جب دوبارہ وہی انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا اردو متبادل بھی دوبارہ دیا گیاہے۔ بعض اوقات انگریزی الفاظ کا یہ استعمال غیر ضروری بھی محسوس ہوتاہے مثلاً(ص۔۷۶۹) پر موجود الفاظ حقیقت (reality)، فریب (llusion) اور بالخصوص طنزومزاح کا"sense of humer" شاید جلد بازی کی

کارفرمائی ہے۔ اسی طرح واقعیت پسندکے لئے (realist) اور عام فہم (common (sense کا لفظ جا بجا موجود ہے جو کہ اگرچہ درست ہے لیکن باربار تکرار بے معنی لگتی ہے۔ اسی طرح بعض دیگر آسان الفاظ کے انگریزی مترادفات بھی اکثر جگہوں پر پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ مضامین کا ترجمہ (essays)دینا بھی ضروری سمجھا گیا۔

جلد چہارم کی دیگر خامیوں پر نظر ڈالی جائے تو ایک روّیہ جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکاہے وہ واقعات بالخصوص پس منظری مطالعے کے ضمن میں بعض امور کی تکرار پائی جاتی ہے مثلاً غالب کی اپنی نظم ونثر کے حوالے سے دعویٰ:

’’نظم و نثر کے قلم روکا انتظام ایزدِ داناوتوانا کی عنایت واعا نت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی رہے گا‘‘(ص۔۱۵۲)، ناسخ کی تحریک کے حوالے سے باربار’ شاعری سے جذبے‘ کے اخراج اور ’حسن کا بیان‘ پر زور ہے۔ جلد سوم اور جلد چہارم میں جہاں کہیں ناسخ کی تحریک کا ذکر کیا گیا ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے تحریک اصلاح زبان کے حوالے سے ناسخ کے اقدامات کو باربار دہراتے ہیں۔ جبکہ ہردفعہ ’’تحریکِ ناسخ‘‘ کے تحت وضع کردہ اصول کہہ دینا کافی تھا۔ لکھنوی طرز ادا کے شاعروں کے ضمن میں لکھنوی تہذیب کے بعض مظاہر کو ہر بار دہرایا گیا ہے۔ تکرار کا یہ عمل اکثر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالعموم تنقیدی آراء کا اظہار کرتے ہوئے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے لیکن ’’شیفتہ‘‘ کے ضمن میں ان کی مروت کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’میرحسن کی مثنوی کے بارے میں جو رائے انہوں نے دی ہے یا نذیر اکبر آبادی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسے طبقاتی شعوری کا اثرہے۔ وہ ’’ روایت پسند‘‘ انسان تھے۔ انہوں نے شاعری میں کوئی ’’تجربہ‘‘ نہیں کیا۔ وہ شاعری کو ایک سنجیدہ،شریفانہ،مہذب و متین سرگرمی سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ انشاء اللہ انشا ء نے جو تجربے نثر وشاعری میں کئے انہیں وہ ہزل، پھکڑپن سمجھ کرنا پسند کرتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کا ذہنی منظر بدلتا رہا اور ان کے مذاقِ سخن اور تنقیدی راء کا وقار قائم ہوتا گیا۔‘‘(۱۳۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:’’ ان کی شخصیت میں اس تہذیب کی وضع داری، رکھ رکھاؤ، اعلیٰ ظرفی، بلند نظری اور ذوقِ شعر کی مثبت قدریں یک جا ن تھیں‘‘۔(۱۳۲)اس اقتباس کی روشنی میں ان

کی شخصیت کی ''وضع داری''،''بلند نظری''، اور '' ذوق شعر' ' کا جائزہ ان کی تنقید ی آراء جو کہ ص۳۹۴-۳۹۵پر دی گئی ہے، کی تردید ہوجاتی ہے۔

جلد چہارم میں بھی دیگر جلدوں کی مانند بعض جگہوں پر اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا یا پھر سنی سنائی آراء درج کردی گئی ہیں مثلاً ص نمبر ۱۲۲۶ پر درج کیا ہے۔ ''بعض حضرات نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ کی مثنوی ''عشق نامہ'' اسیر کی تصنیف ہے '' یہاں ''بعض حضرات'' سے کیا مراد ہے ! اس کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح ص-۱۴۳۴ پر امیر مینائی کے حوالے سے فرماتے ہیں '' کہا جاتا ہے کہ یہ دانح کا آسیب تھا جو امیر پر چھا گیا تھا،''یہاں'' کہا جاتا ہے تحقیقی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے۔

جلد چہارم میں ترتیب کی غلطی موجود ہے جس کا ثبوت جلد چہارم میں ص-۱۵۲۳ پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ موجود ہے۔ امیر مینائی اور داغ کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی جن نئی آوازوں اور اثرات و شخصیات (حالی، سرسید وغیرہ) کے مطالعے کو اگلے صفحات کا حصہ قرار دیتے ہیں ان کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے فصل سوم میں جہاں ''روایت شاعری کے فروغ ''کے ضمن میں سید اسمٰعیل حسین، منیرشکوہ آبادی اور تین اور شعراء کا جائزہ لیا گیا ہے وہیں'' شاعری کے دو روایتی رنگ ''کے تحت امیر اور داغ کو جگہ دینی چاہیے۔ جبکہ ترتیب کی غلطی کے باعث سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کا تجزیہ پہلے شامل کرلیا گیا ہے۔ جلد چہارم کا خاکہ بھی دیگر جلدوں کے برعکس واضح اوربامعنی نہیں ہے۔ فصل سوم میں باب دوم کی درجہ بندی کے بعد ابواب بندی کرتے ہوئے ابواب کی نشاندہی نہیں کی گئی محض سرخیاں موجود ہیں۔ فصل چہارم کی تقسیم میں بھی یہی طریقہ اختیار کیاگیا ہے۔ فصل کی ابتداء میں ابواب کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ فصل کی تقسیم میں ابواب بندی جس وضاحت اور عمدگی سے دیگر جلدوں میں کی گئی ہے۔ جلد چہارم میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ جلد چہارم میں بعض امور کے حوالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جلد پر نظر ثانی کر کے اسے اور بہتر طریقے سے پیش کیا جا سکتا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث شاید اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ایک اور امر جس کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ غالب کے ضمن میں اس بحث سے متعلق ہے کہ غالب کو اپنے زمانے میں ذوق کی نسبت کیوں کم پذیرائی ملی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ذوق اور غالب کی شاعری کا تقابل کرتے ہیں نہ ہی اس طرف کوئی اشارہ کرتے ہیں حالانکہ غالب کو اس با ت کا ہمیشہ قلق رہا ہے کہ انہیں ان کی زندگی میں وہ پذیرائی نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اسی طرح ذوق کا موازنہ ناسخ اور شاہ نصیر کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن غالب کے ساتھ نہیں کیا گیا۔

مجموعی طور پر بعض خامیوں اور طریقۂ کار کے مطابق جلد چہارم، ڈاکٹر جمیل جالبی کی دیگرتاریخِ ادب کی جلدوِں کی نسبت کمزور جلد ہے لیکن اپنے مشمولات کی جامعیت اور معلومات کی فراہمی کے لحاظ سے دیگر جلدوں سے کسی طور بھی کم نہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی چاروں جلدوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ انفرادی طورپر گزشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر جمیل جالبی کا تصور تاریخ اور طریقہء تاریخ نویسی انہیں دیگر موئرخین سے ممتاز کرتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی بنیادی طور پر اس نظریئے کے قائل ہیں ہیں کہ ادبی تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس زبان کے بولنے والوں کی اجتماعی تہذیبی روح کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ایک ایساآ ئینہ جو کہ ادب پر اثر انداز ہونے والی روایات اور رحجانات کا عکاس ہوتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی چاروں جلدیں ان کے نظریہء تاریخ نویسی کی بھر پور عکاسی کرتی ہیں۔ہر ادیب کی ذاتی زندگی کے علاوہ اس کے عہد کے سیاسی،معاشرتی،مذہبی،معاشی اور تہذیبی عوامل کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے تخلیق اور تخلیق کار کا جائزہ لیا گیا ہے۔اسی امر کے باعث اردو ادب میں وقت کے ساتھ ساتھ فروغ پانے والے مختلف رحجانات اور اصناف کا ارتقاء زیادہ بامعنی ہو کر سامنے آتا ہے۔ غزل،ریختی، مرثیہ، قصیدہ،نظم،رہس اور ناٹک وغیرہ جیسی اصناف کے فروغ کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اردو ادب میں فروغ پانے والے مختلف رحجانات مثلاًایہام گوئی کی تحریک،صلاح زبان کی تحریک،علی گڑھ تحریک وغیرہ کی ابتداء کے اسباب اور نتائج پر اس عہد کے معاشرتی،سیاسی،تہذیبی اورادبی عوامل کی روشنی میں کھل کر بحث کی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جا لبی نے ادب کی تاریخ کو چاروں جلدوں میں ارتقائی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے سفر کے ہر اہم واقعے پر بھر پور توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ ہر اس واقعے کو تاریخ ادب کا حصہ بنایا گیا ہے جوکسی نہ کسی صورت میں اردو زبان و ادب پر اثر انداز ہوا۔ڈاکٹڑ جمیل جالبی تاریخ ادب کے مآخذات بھی متنوع ہیں۔انہوں نے بوقت ضرورت ادبی مآخذات سے رجوع کرنے کے علاوہ غیر ادبی مآذات سے بھی استفادہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تاریخ ادب کی وقعت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ادبی مآخذات کے ضمن میں قدیم مخطوطات سے استفادہ ان کی تاریخ ادب کی جلدوں کی افادیت کا ضامن ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مخطوطات سے استفادہ کرتے ہوئے ان مخطوطوت سے زیادہ سے زیاہ حوالے بھی درج کئے ہیں تاکہ اردو ادب کے قارئین تک ان کی رسائی کو آسان بنایا جا سکے اور انہیں محفوظ کیا جا سکے۔ خاص بات یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے انہیں اردو اب کے قدیم ادب کے نمونے ملے مثلاً محمود کی غزلیں،نصرتی

کا کلام اور حسن شوقی کا دیوان وغیرہ۔ اس کلام کو انہوں نے مدون کیا اور نہایت عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔اسی طرح ان کی مرتب کردہ ’قدیم اردو کی لغت‘بھی ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے جو قدیم ادب کے مطالعے کے دوران ان کے سامنے آئے اور انہوں نے ان الفاظ کو جمع کرکے اردو ادب کے قارئین کے لئے لغت کی صورت میں مرتب کیااور اردو زبان و ادب کے قابل ذکر مدونین کی فہرست میں جگہ بنائی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب کی پہلی جلد میں اردو زبان و ادب کی ابتداء سے متعلق اپنے نظریئے کو ارتقائی صورت میں پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان و ادب کے فروغ کو برصغیر کے کسی ایک علاقے سے مختص نہیں کرتے۔ان کے مطابق اردو زبان و ادب کی ابتداء برصغیر کے مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں ہوئی لیکن اس کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اس نظریئے کو سیاسی،معاشرتی اور مذہبی عوامل کی روشنی میں نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان کے اس نظرئے سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے پیش کردہ شواہد کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی چاروں جلدوں میں ان کے تاریخ نویسی کے طریقہ کار میں اختلاف نظر آتا ہے۔مثلاً پہلی جلد کو انہوں نے زبان و اد ب کی روایت کے تناظر میں ترتیب دیا ہے اور ترتیب زمانی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جبکہ دوسری جلد میں ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور رد عمل اور تبدیلی کو بھی سامنے رکھا ہے۔تیسری جلد میں انہوں نے نثر و نظم کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیتے ہوئے نثر و نظم کا مطالعہ ایک ساتھ پیش کیا ہے۔ جبکہ جلد دوم میں ڈاکٹر جالبی نے اٹھارویں صدی کی نثر کا تجزیہ جلد کی آخری فصل میں پیش کیا تھا۔ چوتھی جلد کی ترتیب کے متعلق اگرچہ انہوں نے اپنے طریقہ کار کی وضاحت نہیں کی لیکن چوتھی جلد ترتیب کے حوالے سے سب سے ناقص جلد قرار دی جا سکتی ہے۔چوتھی جلد میں کہیں زمانی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور کہیں اصناف ادب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔انیسویں صدی ایک طرف سیاسی لحاظ سے بہت متوع رحجانات کی حامل رہی وہیں زبان و ادب کے حوالے سے بھی نہایت اہم صدی شمار کیجاتی ہے۔اتنے بھر پور زمانی عرصے کے ادب کو ایک جلد میں سمیٹنے کی کوشش میں ڈاکٹر جالبی کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہو گا یہی وجہ ہے کہ یہ جلد بے ترتیبی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ بعض امور کے حوالے سے سے دیگر جلدوں کی نسبت اس جلد کو کمزور جلد قرار دیا جا سکتا ہے۔زمانی ترتیب،اصناف ادب کے لحاظ سے ترتیب اور نامور شعراء اور نثر نگاروں کے حوالے سے تاریخ نگاری کو الجھا دیا گیا ہے۔اس جلد میں ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے روایتی طریقۂ کار کو مد نظر

نہیں رکھا یعنی مختلف ماہرین کی آراء کے بیان کے بعد ان کی آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے واضح اور دو ٹوک انداز میں پیش کرتے ہیں۔لیکن اس جلد میں بعض امورکے حوالے سے دیگر ناقدین کی آراء پر ہی بھروسہ کیا گیا ہے۔(چوتھی جلد کے تجزئے میں ان امور کی وضاحت تفصیل کے ساتھ مثالوں کے ذریعے کر دی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ یہ تاریخ ادب فرد واحد کی کوششوں اور انتھک محنت کا ثمر ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس مبسوط تاریخ کے علاوہ جن تاریخوں میں اس قدر مواد،معلومات اور شخصیات کو یکجا کیا گیا ہے وہ کسی فرد واحد کی سعی کا نتیجہ نہیں۔اس طرح کی تفصیلی تواریخ،اداروں،اشخاص اور انجمنوں کی مشترکہ کاوشوں کا ثمر ہیں جن کے لئے انسانی اور دیگر وسائل دستیاب تھے جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ کارنامہ تنہا کسی فرد یا ادارے کی مدد کے بغیر سر انجام دیا ہے۔اگرچہ اس طرح کے کارنامے فرد واحد کے لئے سرانجام دینا آسان نہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ کارنامہ ایک لمبے زمانی عرصے میں انجام دیا ہے مثلاً تاریخ ادب کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔دوسری جلد کی ۱۹۸۶ء میں دو جلدوں کی صورت میں شائع ہوئی۔تیسری جلد۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی جبکہ آخری یعنی چوتھی جلد ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی،اسطرح ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ نگاری کا سلسلہ تقریباً چالیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے کیونکہ انہوں نے تاریخ نگاری کی ابتداء۱۹۶۶ء سے پہلے کر چکے تھے لیکن پہلی جلد کی تکمیل ۱۹۷۱ء ہوئی جبکہ یہ جلد شائع ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ اتنے طویل زمانی عرصے میں چار جلدوں کی صورت میں تاریخ نگاری مشکل تو ہے لیکن نا ممکن نہیں۔لہٰذا ڈاکٹر جمیل کا یہ عظیم کانامہ نہ صرف لائقِ تحسین ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے قابل تقلید بھی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(جلد دوم) طباعت ششم ‘ مجلس ترقی ادب، لاہور ۲۰۰۹ ء، ص۱۲۔۱۱

۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،مکالمہ (تاریخ ادب اردو کے موضوع پر) از پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مشمولہ سہ ماہی ارمغان (جمیل جالبی نمبر) شمارہ نمبر۳ اپریل مئی جون ۹۶ء، کراچی۔ ص ۱۸۱

۳۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،’تاریخِ ادب۔مقاصدو محرکات‘،مشمولہ ’اردو کی ادبی تاریخیں‘ (نظری مباحث) مرتبہ: سلمان احمد، قصرالادب، حیدرآباد ۱۹۹۹ء، ص۱۵۸

۴۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۱۱

۵۔ رضی عابدی، ’اردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے ‘، مشمولہ ’ماہ نو‘، لاہور ‘ اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۲۱

6.Rene Wellek, 'Theory of Literature Penguine Book',3rd edition, 1963,p.no.267

7.William Henery Hydsan, 'An Introduction to the study of literature.2nd eddition, George G. Hamp Co. P. No. 36

۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘ (جلد دوم)،لاہور، مجلس ترقی ء ادب،طبع سوم،۱۹۹۴ء ص ۱۲

۹۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل ‘،مشمولہ، تخلیقی ادب ۵، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۱۱

۱۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(جلد اوّل)، طبع سوم، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۷ء، پیش لفظ

۱۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘ (جلد دوم) ایضاً، ص ۱۴

۱۲۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، ’ادبی تاریخ ‘،مشمولہ، ’اردو کی ادبی تاریخیں‘ (نظری مباحث)، ایضاً، ص ۲۰۸

۱۳۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) ایضاً، ص ۱۱

۱۴۔ ظفرالحسن لاری، ’ادبی تاریخ کے اصول ‘، مشمولہ، ’اردو کی ادبی تاریخیں ‘، (نظری مباحث)، ایضاً، ص۳۹

۱۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(جلد دوم) ایضاً، ص ۱۳

۱۶۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو ‘ (ایک تحقیقی جائزہ)، حصہ اوّل، المضراب پبلشرز، ملتان،ص۱۹

۱۷۔ روش ندیم،ڈاکٹر’اردو ادب کی تاریخ نگاری میں ادوار بندی کا مسئلہ ‘،مشمولہ،دریافت،شمارہ نمبر۱۱،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد،ص ۷۷

۱۸۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون’اردو ادب کی تاریخ کیسے نہیں لکھنی چاہیئے؟‘از رالف رسل،مشمولہ،ادبی تاریخیں (نظری مباحث)،ایضاً،ص۱۳۳

۱۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(جلد دوم) ایضاً، ص ۱۲

۲۰۔ ایضاً، ص۱۳

۲۱۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،’اردوادب کی مختصر ترین تاریخ ‘،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۹۷

۲۲۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، ’تحقیق کافن ‘، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۹۴ء، ص۱۴۳

۲۳۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۲ء، ص۱۵

۲۴۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ مصحفی کے تذکرے کا تجزیاتی مطالعہ‘،مشمولہ ادبی تحقیق‘ ایضاً، ص۳۲۱

۲۵۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر، ’اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری‘، ایضاً، ص ۱۵

۲۶۔ کلیم الدین احمد، ’اردو تنقید پر ایک نظر ‘ ایضاً،ص۲۴۶

۲۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ ادبی تحقیق ‘، ایضاً، ص ۳۱۲

۲۸۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر، ’ادبی تاریخ نویسی، صورتحال اور تقاضے ‘، مشمولہ، بازیافت، شمارہ ۱۰، ۲۰۰۸ء، ص۱۸

۲۹۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر، ’اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ایضاً، ص۸۸

۳۰۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے’ادبی تحقیق‘،ایضاً،ص۳۰۰

۳۱۔ یہ معلومات سیّدہ جعفر اور ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب’’اردو کی ادبی تاریخیں‘‘سے لی گئی ہے۔

۳۲۔ وقار عظیم،سیّد، ’جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو ‘، مشمولہ، ’ارمغان ‘(جمیل جالبی نمبر) ایضاً، ص۷۷

۳۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’ادبی تحقیق ‘، ایضاً، ص ۳۵

۳۴۔ سیّد ہ جعفر،گیان چند جین،ڈاکٹر ,’ اردو کی ادبی تاریخیں‘، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص۲۱

۳۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ تاریخ ادب اردو ‘(جلد اوّل)، ایضاً،پیش لفظ

۳۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو ‘(جلد اوّل)، پیش لفظ، ص’ح‘

۳۷۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘(ابتداء سے ۱۸۵۷ء)،ایضاً،ص۳۷

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۴

۴۰۔ ایضاً، ص۶۸

۴۱۔ حسن اخترملک،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو‘ (مکمل اور مستند)، یونیورسٹی بک ایجنسی، انارکلی، لاہور ۱۹۷۹ء، ص۳۵

۴۲۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء)، ایضاً، ص۷۳

۴۳۔ ایضاً،ص۱۱۱

۴۴۔ ’’محمد نامہ‘‘ کا قلمی نسخہ افسر صدیق امروہی کی ملکیت ہے۔بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی،تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل ایضاً، ص۲۷۵۔اس حوالے سے مزید تفصیل ’اردو شہ پارے ص۴۴؛مقدمہ ’قصۂ بے نظیر‘،مرتبہ:عبدالقادر سروری ص،’ب‘؛’دکن میں اردو،از نصیرالدین ہاشمی،کراچی۔۱۹۶۰ء،ص ۱۲۱پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۴۵۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء) ایضاً،ص۱۱۹

۴۶۔ ایضاً،ص۱۴۳

۴۷۔ ایضاً،ص۔۵۱

۴۸۔ ایضاً،ص۱۶۷

۴۹۔ حسن اخترملک،ڈاکٹر،’ تاریخ ادب اردو ‘ (مکمل اور مستند)، ایضاً، ص ۵۲

۵۰۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’’اردو ادب کی تاریخ ‘‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء) ص۱۶۰

۵۱۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب' تاریخ ادبِ اردو' میں خان رشید صاحب کے حوالے سے اس بات کی تردید کی ہے کہ قطب مشتری اور سب رس کا وجہی ایک ہی شخصیت ہیں۔ص ۶۰ پر ڈاکٹر ملک حسن اختر اس بات کو تحقیق طلب قرار دیتے ہیں۔

۵۲۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، 'اردو ادب کی تاریخ ' (ابتداء سے ۱۸۵۷ء)،ایضاً،ص۱۸۱

۵۳۔ ایضاً،ص۱۹۰

۵۴۔ آزاد،محمدحسین، 'آب حیات'چہاردھم،خزینۂ علم و ادب،لاہور،۲۰۰۱ء، ص۸۹

۵۵۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے' تاریخ ادب اردو(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک)از ڈاکٹر تبسم کاشمیری،ص۲۱۸

۵۶۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے 'ولی گجراتی اور شاہ گلشن'از محمد اکرم چغتائی،مشمولہ،'اردو نامہ'،شمارہ مارچ،۱۹۶۶ء

۵۷۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر 'اردو ادب کی تاریخ ' (ابتداء سے ۱۸۵۷ء)،ایضاً،ص۲۲۵

۵۸۔ حسن اختر ملک،ڈاکٹر،' تاریخ ادب اردو'، (مکمل اور مستند) ایضاً، ص ۸۸

۵۹۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، 'ڈاکٹرجمیل جالبی '، تاریخ ادب اردو، مشمولہ، 'ادبی تاریخ نویسی'، ایضاً، ص۳۹۰

۶۰۔ وقار عظیم،سیّد، 'جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو'، مشمولہ، سہہ ماہی،' ارمغان'، (جمیل جالبی نمبر) ایضاً، ص۷۷

۶۱۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، 'جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو۔ایک جائزہ'، مشمولہ، 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ ''، ایضاً، ص ۳۱۲

۶۲۔ مصطفی خان،غلام،ڈاکٹر،'تاریخ ادب اردو کا ایک جائزہ' ایضاً، ص۳۱۲

۶۳۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے 'ادبی تحقیق،مسائل اور تجزیہ'،ص۲۹۱۔۲۹۸

۶۴۔ رشیدحسن خان، ''تاریخ ادب اردو '' مشمولہ، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ''، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص۲۹۹

۶۵۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے،ایضاً،ص۲۹۹

۶۶۔ گیان چند،ڈاکٹر، جین، 'اردو کی ادبی تاریخیں '، ایضاً، ص۶۸۸

۶۷۔ ایضاً، ص۶۹۰

۶۸۔ ایضاً، ص۶۹۱

۶۹۔ ایضاً، ص۶۹۳

۷۰۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے ڈاکٹر گیان چند جین کا مضمو ن ڈاکٹر جمیل جالبی:تاریخ ادبِ اردو ‘مشمولہ’ادبی تاریخ نویسی(نظری مباحث)،ایضاً،ص۳۸۵

۷۱۔ مشفق خواجہ، ’اردو ادب کی پہلی تاریخ ‘، مشمولہ، ’جمیل جالبی۔ ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۴۴۹

۷۲۔ عظیم الشان صدیقی،ڈاکٹر، ’ادبی تاریخ نویسی ‘، مشمولہ، ’اردو کی ادبی تاریخیں ‘، (نظری مباحث)، مرتبہ؛ سلمان احمدقصر الادب حیدر آباد، ۱۹۹۹ء، ص۲۲۲

۷۳۔ مشفق خواجہ،’اردو ادب کی پہلی تاریخ، ’مشمولہ،’جمیل جالبی۔ایک مطالعہ ‘، ایضاً، ص۲۹۹۔۳۰۰

۷۴۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،’ اردو دیس کا سیاح‘، مشمولہ،’ جمیل جالبی ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۱۹۷

۷۵۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، ’جمیل جالبی کی تاریخ ادب۔ایک جائزہ‘، مشمولہ، جمیل جالبی ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۲۶

۷۶۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ’اردو ادب کی تاریخ‘ میں جعفر زٹلی کے محقیقین اور ناقدین کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے مطابق محمود شیرانی کی تالیف ’پنجاب میں اردو‘میں جعفر زٹلی پر تبصرہ کیا گیا۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ’علی گڑھ تاریخ ادب اردو‘ میں زٹلی پر چند صفحات کا نوٹ لکھا۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر نعیم نے ’کلیاتِ جعفر زٹلی‘ ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔جواہر لال یونیورسٹی کے علی جاوید نے پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا جو کہ شائع نہ ہو سکا۔۱۹۷۹ء میں سمیع اللہ نے ناگ پور یونیورسٹی سے جعفر زٹلی پر مقالہ لکھا۔بحوالہ ص۲۵۳

۷۷۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’’اردو ادب کی تاریخ ‘‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء) ص۲۷۴

۷۸۔ ایضاً، ص۲۷۷

۷۹۔ گیان چندجین،ڈاکٹر، ’جمیل جالبی کی تاریخ ادب۔ایک جائزہ‘، مشمولہ، ’ادبی تاریخ نویسی‘، ایضاً، ص۴۲۳

۸۰۔ مخزنِ نکات،تذکرہ ریختہ گویاں،تذکرہ شعرائے اردو میں ان کا نام احسن اللہ خان تحریر ہے۔

۸۱۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء) ص۲۶۷

۸۲۔ گیان چندجین،ڈاکٹر،’جمیل جالبی کی تاریخ ادب۔ایک جائزہ‘، مشمولہ، ’ادبی تاریخ نویسی‘، ایضاً، ص۴۲۵

۸۳۔ عبداللہ سیّد،ڈاکٹر، ’ولی سے اقبال تک‘، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۸۷

۸۴۔ تبسم کاشمیر ی،ڈاکٹر، ’اردو ادب کی تاریخ ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء)ایضاً، ص۳۵۶۔۳۵۷

۸۵۔ گیان چندجین،ڈاکٹر،’جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو:ایک جائزہ‘،مشمولہ،’ادبی تاریخ نویسی(نظری مباحث) ،ایضاً،ص۴۲۸

۸۶۔ یونس احمر،’پاکستانی کلچر اور تاریخ ادب اردو‘،مشمولہ،سہ ماہی’ارمغان‘(جمیل جالبی نمبر)،ایضاً،ص۹۰

۸۷۔ گیان چندجین،ڈاکٹر،’جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو:ایک جائزہ‘،مشمولہ،’ادبی تاریخ نویسی(نظری مباحث)‘،ایضاً،ص۴۳۴

۸۸۔ نجم الاسلام،ڈاکٹر،’اردو ادب کی تاریخیں‘،مشمولہ،’اردو کی ادبی تاریخیں‘(نظری مباحث)،ایضاً،ص۱۵۴

۸۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’تاریخ ادب اردو‘(جلد دوم)،ایضاً،۲۱۲

۹۰۔ ایضاً،ص۱۱۰۸

۹۱۔ عبدالعزیز،ڈاکٹر،’جمیل جالبی،شخصیت اورفن‘،ایضاً،ص۶۹

۹۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’تاریخ ادب اردو‘(جلد دوم)،ایضاً،ص۹۹

۹۳۔ ایضاً،ص۵۷۶

۹۴۔ عبدالغفار،قاضی،ڈاکٹر،’ڈاکٹر جمیل جالبی،اسلوب کی باتیں‘،مشمولہ،’جمیل جالبی ایک مطالعہ‘،ایضاً،ص۱۸۷

۹۵۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر‘ اردو ادب کی تاریخ ‘(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء، ص۴۴۷

۹۶۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے،ڈاکٹر ملک حسن اختر،’تاریخ ادب اردو‘ (مکمل اور مستند)، یونیورسٹی بک ایجنسی، انارکلی، لاہور ۱۹۷۹

۹۷۔ وقارعظیم سیّد،’ فورٹ ولیم کالج، تحریک اور تاریخ‘، مرتب، ڈاکٹر معین الرحمن، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء،ص۱۵۸۔۱۵۷

۹۸۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،‘ ایضاً، ص۵۳۲

۹۹۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر، ’اردوداستانیں ‘، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص۱۷۷

۱۰۰۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،‘ اردو ادب کی تاریخ،ایضاً، ص۶۰۶

۱۰۱۔ ایضاً، ص۶۳۶

۱۰۲۔ وقار عظیم سیّد، ’اندرسبھا‘، اردو مرکز لاہور ۱۹۵۷ء، ص۸۰۹

۱۰۳۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،‘ اردو ادب کی تاریخ ‘(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) ایضاًء، ص۶۲۷

۱۰۴۔ ان فہرستوں کی تفصیل 'واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات'،نئی دہلی،۱۹۹۵ء اور 'سلطان عالم واجد علی شاہ'،میر اکادمی لکھنؤ،۱۹۷۷ء میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۱۰۵۔ مشفق خواجہ، 'اردو ادب کی پہلی تاریخ '، مشمولہ 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'، مرتبہ ڈاکٹرگوہرنوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص۲۹۲۔۲۹۳

۱۰۶۔ یونس احمر '، پاکستانی کلچر اور تاریخ ادب اردو '، مشمولہ 'ارمغان، (جمیل جالبی نمبر)، اپریل، مئی، جون ۶۹۶، شمارہ ۳، ص۸۸

۱۰۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو '(جلدسوم) لاہور،مجلس ترقی ء ادب،۲۰۰۶ء، ص۱۷۔۱۸

۱۰۸۔ ایضاً، ص۷۳۴

۱۰۹۔ ایضاً، ص۲۵۴

۱۱۰۔ ایضاً، ص۲۵۲

۱۱۱۔ ایضاً،ص۴۰۳

۱۱۲۔ ایضاً،ص۵۸۱

۱۱۳۔ مشفق خواجہ، 'اردو ادب کی پہلی تاریخ '، مشمولہ 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'، مرتبہ ڈاکٹرگوہرنوشاہی، ایضاً، ص۳۱

۱۱۴۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر، 'ادبی تاریخ نویسی، صورتحال اور تقاضے''، مشمولہ، ادبی تاریخ نویسی، ایضاً، ص۱۲۴بگ ن

۱۱۵۔ شگفتہ حسین،ڈاکٹر، 'ادبی تاریخ نویسی،' مرتبین، ڈاکٹرسید عامرسہیل، نسیم عباس احمر، ایضاً، ص۲۴۰

۱۱۶۔ سراج الدین علی خان آرزو نے 'سراج الغات' میں فرہنگ نظام جلد پنجم کے مقدمے میں دس اوراق اس مقصد کے لئے مختص کئے ہیں جبکہ ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب 'نقد قاطع برہان' غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۷۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،' اردو ادب کی تاریخ '(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) ایضاً، ص۷۳۶

۱۱۸۔ 'کلیات نصیر شاہ '، مرتبہ، ڈاکٹر تنویر علوی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء،

۱۱۹۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر' اردو ادب کی تاریخ 'ایضاً، ص۶۶۸

۱۲۰۔ شمس الرحمن فاروقی، 'ذوق کی غزل'، مشمولہ، 'شیخ ابراہیم ذوق،' مرتبہ، اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو، دلی ۱۹۹۹ء،ص۲۹۷

۱۲۱۔ ڈاکٹر منظور حسین کی یہ کتاب ’تحریک جدوجہاد بطور موضوع سخن‘،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔

۱۲۲۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر‘ اردو ادب کی تاریخ‘ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) ایضاً، ص۷۶۰

۱۲۳۔ ایضاً، ص۸۰۹

۱۲۴۔ ایضاً

۱۲۵۔ ان مباحث کی تفصیل امداد امام اثر کی تصنیف ’کاشف الحقائق‘،مکتبہ معین الادب،لاہور(۱۹۵۶ء)،احتشام حسین کی تصنیف ’مراثی انیس(جلد اوّل)ادارہ فروغِ اردو،لکھنؤ(بار دوم)۱۹۶۴ء اورڈاکٹر احسن فاروقی کی تصنیف،’مرثیہ نگاری اور میر انیس‘،ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ،(بار دوم)۱۹۶۴ء میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۲۶۔ بزمِ اکبر از قمرالدین بدایونی۔مطبوعہ انجمن ترقیء اردو،ہند،دہلی۔۱۹۴۴ء

۱۲۷۔ گیان چندجین،ڈاکٹر،’اردو کی نثری داستانیں‘،اردو اکادمی لکھنؤ،۱۹۸۷ء

۱۲۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر،’تاریخ ادب اردو‘(جلد سوم) ایضاً، ص۱۶

۱۲۹۔ عبدالعزیز،ڈاکٹر، ’ڈاکٹرجمیل جالبی، شخصیت اور فن ‘،اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۶ء، ص۵۵

۱۳۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو‘ (جلد سوم) ایضاً، ص۱۷

۱۳۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو‘ (جلد چہارم) ایضاً، ص۳۸۴

۱۳۲۔ ایضاً، ص۳۸۵

باب سوّم

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مدوّنہ اور مرّتبہ کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

تدوین عربی زبان کا لفظ ہے۔فارسی زبان میں تدوین کے معنی گردآوردن،فراہم آوردن چیزی (مانندشعر، نثر وغیرہ)،تالیف کردن، گردآوری تالیف تدونیات درج ہیں۔(۱)''فرہنگِ عامرہ''میں تدوین کے جو معانی دئیے گئے ان میں جمع کرنا، تالیف کرناشامل ہیں۔(۲)''اردو لغت''میں تدوین کے معنی ''جمع و ترتیب، تالیف'' تحریر ہیں۔(۳)

ڈاکٹرگیان چندجین کے مطابق:

> ''اردومیں تدوین متن کی حد تک ہم متن اس تحریرکوکہہ سکتے ہیں جسے کوئی محقق ترتیب دینا چاہتاہے۔ وہ تخلیق،نظم و نثر ہو یا غیر تخلیقی مثلاً تذکرہ یا انشا کی دریائے لطافت یا گلکرسٹ کا رسالہء قواعد وغیرہ۔ تدوینِ متن، مختلف نسخوں، شاذوحید نسخے کا مطالعہ کرکے،مصنف کے اصل متن کی باز تشکیل کرنے کوکہتے ہیں''۔(۴)

تدوین،تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے۔ تدوین متن کا تقاضاہے کہ مدون تحقیقی و تنقیدی شعورسے کام لیتے ہوئے متن کو ترتیب دے۔ متن کے حوالے سے ترتیب اور تدوین کا فرق واضح کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اردومیں تدوین متن سے زیادہ مقبول اصطلاح ترتیبِ متن ہے۔ دونوں قریب المعنی ہیں۔ ترتیب کے معنی کسی شئے کے اجزاء کو مناسب تقویم و تاخیر سے رکھنا ہے، تدوین کے معنی متفرق اجزاء کو اکٹھا کرکے ان کی شیرازہ بندی کرنا ہے۔ شعراء کے مجموعہء کلام کو اسی لئے دیوان کہاگیا کہ ان میں غزلیں اور نظمیں جمع کی جاتی ہیں---- ترتیب ایک عام لفظ ہے اور تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے اس لئے اس اصطلاح کو ترجیح ہے''۔(۵)

تدوینِ متن کے مراحل پر روشنی ڈالنے سے پہلے متن کی اقسام کی وضاحت ضروری ہے۔متن کو علمِ تحقیق کی رو سے درج ذیل اقسام میں تقسیم کرکے دیکھا جا سکتا ہے:

۱۔ اصل متن:یہ متن قلمی نسخہ کی صورت میں ہوتاہے۔

۲۔ املائی متن:قلمی نسخے کی بجائے کاتب سے لکھوایا گیا متن، جس پر مصنف کے دستخط موجودہوتے ہیں۔

۳۔ اضافی متن:مصنف کی تحریر کے ساتھ شاگردہ وغیرہ اپنی طرف سے اضافہ کردیں تو اسے اضافی متن قرار یاجاتاہے۔

۴۔ سماعی متن:ایسا متن جس میں مصنف کے خیالات کی بجائے اسلاف کے خیالات یاایسی باتیں جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں، کوئی شخص ان خیالات کو تحریر کر ے تو انہیں سماعی متن کہیں گے۔ کسی بھی اصل متن کی تلاش سے لے کر ضروری تصحیح و ترتیب اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ اسے پیش کرنے کے درمیان کئی مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ڈاکٹر نورالاسلام لکھتے ہیں۔

تدوین متن کے مختلف مراحل کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیاہے، ان کے مطابق تدوین متن کے درج ذیل مراحل ہیں ؛

> ’’متن کی تصحیح و ترتیب دراصل ایک عملی فن ہے جس میں مدون کتاب اپنی پوری توجہ اور محنت سے کسی متن کی کتاب کو پوری صحت کے ساتھ ترتیب دیتاہے، سب سے پہلے تو وہ اصل متن کی تلاش کرتاہے خواہ وہ ایک جگہ ہو یا اس کے اجزاء منتشر حالتوں میں مختلف جگہوں پرہوں اسے فراہم کرتاہے بھر اس متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیتاہے‘‘۔(۶)

۱۔ تالیف متن:

اس مرحلے میں مدوّن کتب خانوں، ذاتی لائبریریوں اور قلمی نسخوں میں ماخذ تک رسائی کی کوشش کرتاہے۔

۲۔ تنقید متن:

تحقیق و تنقید کی روشنی میں متن کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا جائزہ تنقید متن کہلاتاہے۔

۳۔ تحقیق متن:

اس مرحلے میں متن کی ہئیت، تصریفات، الحاق و اضافات اور متن کے گمشدہ سلسلوں کی بازیافت کی جاتی ہے۔

۴۔ تاریخ متن:

اس مرحلے میں تلاش کردہ نسخوں کا تقابل کرکے غیرمشمولہ اجزائے متن اور الحاق و اضافت کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۵۔ تاریخ کتابتِ متن:

اس مرحلے میں نسخوں کی کتابت کا جائزہ لیاجاتاہے۔ تاریخ کتابتِ متن کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بعض ایسے نسخ ہوتے ہیں جن پر کاتب یا مصنف نے تاریخِ کتابت تحریر کر دی ہوتی ہے۔ اگر تاریخِ کتابت تحریر نہ ہوتو کاتب کے تحریر کردہ ترقیمہ کی مدد سے مصنف کے زمانے اور تاریخِ کتابت کا اندازہ لگایاجاتاہے۔ ترقیمہ میسر نہ ہوتو داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر مصنف کے زمانے اور تاریخِ کتابت کا تعین کیاجاتاہے۔

۶۔ تاریخ طباعت متن:

اگر متن کے ایک سے زائد نسخے موجود ہوں تو تاریخِ طباعت متن کا جائزہ لیاجاتاہے۔ مطبوعہ نسخوں پرعموماً سنِ طباعت درج ہوتاہے جس سے نسخے کے زمانی تعین میں آسانی ہوتی ہے۔ تاریخ طباعت کے معلوم ہونے سے مصنف کے زمانے میں طبع کئے ہوئے نسخے کاپتہ چل جاتاہے جوکہ نسخے کو مستند بناتاہے۔

۷۔ تصحیح متن:

تدوین متن میں ایک اہم مرحلہ تصحیح متن ہے۔ متن کی روایت کو تبدیل نہ کرتے ہوئے غلط متن کی نشاندہی کی جائے بلکہ مدوّن، مصنف کے طرزِ املاء، زبان، صرفی ونحوی ساخت اور ناقابل مطالعہ جگہوں پر قیاسی تصحیح بھی کرسکتاہے۔

۸۔ ترتیبِ متن:

متن کو مصنف کے تحریرکردہ نسخے کے مطابق ترتیب دینے کے لئے ترتیب متن میں تحقیقی، استقرائی تعین اور تقابلی تعین سے کام لیاجاتاہے۔ ’’تحقیقی تعین‘‘ میں لسانی، تحقیقی یاعملی سطح پر تفحص و تجسس سے کسی لفظ کی قرأت کی جاتی ہے۔ ’’استقرائی تعین‘‘ سے مراد کسی غلط درج ہونے والی روایت کی تصحیح یا اس کی صحیح صورت کا یقین کرنا ہے۔ تقابلی تعین میں مختلف نسخوں کے تقابل سے متن کی تصحیح کی جاتی ہے اور اختلاف نسخ کو حاشیہ میں تحریر کیاجاتاہے۔

۹۔ تحشیہء متن:

متن کے مختلف مآخذات اور اختلافی قرأتوں کی نشاندہی کرنا تحشیہ ء متن کہلاتاہے۔ حوالہ جات یا تحقیقی و تنقیدی حواشی کے بغیر متن کی تصحیح وترتیب کاکام درجہء اسناد سے محروم رہتاہے۔

۱۰۔ تعلیقاتِ متن:

متن کے اختتام پر متن کی توضیح کے لئے اضافی معلومات مثلاً سوانحی کوائف، شجرۂ نسب، خطوط، تصاویر یا ملفوظات وغیرہ کو تعلیقات کا حصہ بنایاجاتاہے۔(۷)

اردوکے قدیم سرمائے کو منظرعام پر لانے والے مدوّنین کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ کسی بھی زبان کی ابتدائی صورت کی دریافت اور ارتقائی منازل کا تعین اس زبان کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اردو تدوین کی روایت اگرچہ بہت پرانی نہیں لیکن مدوّنین کی کاوشوں کی بدولت جوقدیم ادبی سرمایہ محفوظ اور دریافت کیاجاچکاہے وہ یقیناًاردو کی ادبی تاریخ کا قابل قدر اثاثہ ہے۔ قدیم کتب تک رسائی کے لئے تاریخی تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت متن ہی کو حاصل ہے۔ متن کے اسناد کے لئے تدوینِ متن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

زبان و ادب کی تحقیق کے حوالے سے دستاویزی تحقیق بنیادی طریقہء کار کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دستاویزی تحقیق میں مرکزی حیثیت متن کو حاصل ہے۔ متن کے ذریعے ہی ماضی کے فکری و لسانی سرمائے کی تفہیم ممکن ہے۔ قدیم متون کے سلسلے میں سب سے اہم عنصر ان کا مستند ہوناہے۔متون کا استناد، تدوینِ متن کے اصولوں کی پیروی کرکے ہی ممکن بنایاجاسکتاہے۔ لہٰذا قدیم مخطوطات اور غیرمطبوعہ متون کی درستگی، زبان وادب کی تحقیق کا بنیادی مطالبہ ہے۔ اردو زبان و ادب کو اس حوالے سے خوش قسمت قراردیاجاسکتاہے کہ ابتداء ہی سے اسے ایسے محنتی اور قابل مدوّنین کی خدمات حاصل ہوئی جن کی کاوشوں سے قدیم اردو زبان وادب کا بہت ساعلمی سرمایہ محفوظ ہوگیالیکن اس کے باوجود آج بھی اردوزبان و ادب کا ایک کثیرسرمایہ غیرمطبوعہ اور غیرمدوّن صورت میں موجودہے۔

اردو تدوین کی ابتداء کاجائزہ لیاجائے تو سب سے پہلے سرسید احمد خان کی مدوّن کردہ ’’آئینِ اکبری‘‘ (سال تدوینّ ۱۸۵۵۔۵۶ء) کوباقاعدہ تدوین کی پہلی کاوش قراردیاجاتاہےحبیب الرحمن خان شیروانی نے ۱۹۲۲ء میں تذکرہ شعرائے اردواور ۱۹۲۶ء میں نکات الشعراء اور خواجہ میر درد کے دیوان کی تدوین سے،اردو میں تدوین کی روایت کو آگے بڑھایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو اردو تدوین نگاری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے تدوینی کارناموں کی بدولت اردو شاعری کی روایت ولیؔ سے قبل، حسن شوقی،نصرتی اور ملاّوجہی تک پہنچتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے نوتذکرے (نکات الشعراء، تذکرہ ریختہ گویاں، مخزنِ نکات، چمنستانِ شعراء، گلِ عجائب، عقدِثریا، تذکرہء ہندی، ریاض

الفصحااور مخزن الشعراء) چارمثنویات (خواب و خیال، قطبِ مشتری، گلشنِ عشق، علی نامہ) چاردیوان (خواجہ میردرد، میر عبدالحنی تاباں، انتخابِ کلامِ میر، انتخابِ داغ) اورقواعد کی کتاب دریائے لطافت کی تدوین شامل ہے۔(۸) مولوی عبدالحق کے علاوہ سید مسعود حسین رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، مولانا امتیازعلی عرشی، محی الدین قادری، عبدالقادر سروری، مجنوں گورکھ پوری، احسن مارہروی، مشفق خواجہ، رشید حسن خان، افسر صدیق امردہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی اہم مدوّنین میں شامل ہیں۔ ان مدوّنین نے تذکرات، مثنویات، کلیات، دواوین اور نثری کتب سے اردو ادب کو روشناس کروایاہے۔یہ سب کتب اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی کتب ہیں جونایاب ہیں۔ قدیم ادب سے عدم دلچسپی کے باعث طبع دوّم نہ ہونے کے باعث ان مدوّن کردہ کتب تک رسائی بہت مشکل ہے۔
اردو ادب میں دکنی ادب کی بازیافت کے بارے میں ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> ’’دکنی ادب کی تلاش و تحقیق کے پہلے مرحلے کا آغاز بیسویں صدی کے ربع اوّل سے ہوتاہے۔ حکیم شمس اللہ قادری، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری،نصیرالدین ہاشمی،سیدّ محمد، میر سعادت علی رضوی اور عبدالمجید صدیقی نے دکنی اردو کے ادب پاروں کی ترتیب و تدوین کی۔ قدیم ادبیات کی بازیافت کی ان اوّلین کوششوں کے نتیجے میں دکنی ادب کی جو کتابیں منظرعام پرلائیں ان میں تحقیق سے زیادہ تدوین کی جانب توجہ دی گئی‘‘ (۹)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ’’قدیم دکنی ادب پرتحقیقی کام کے دوسرے مرحلے کی ابتداء ۱۹۶۵ء میں شعبہ ء اردو جامعہ عثمانیہ سے شائع ہونے والے مجلے ’’قدیم اردو‘‘ سے ہوتی ہے۔ اس مجلے میں قدیم دکنی ادبیات کے منتخب متون کو ’تنقیدِ متن‘ کے جدید اصولوں کی روشنی میں مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد، صحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ ’قدیم اردو ‘کے ابتدائی چند شمارے آج بھی مستند نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مجلے میں مسعود حسین خان، غلام عمرخان، اکبرالدّین صدیقی، سیدّہ جعفر،حسینی شاہد، ابوالنصر محمد خالدی اورمبارزالدّین رفعت وغیرہ قابل ذکر ہیں (۱۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی کو تاریخِ ادب اردو جلد اوّل تحریر کرتے ہوئے قدیم متون سے دلچسپی پیداہوئی۔اردو کا ابتدائی شعری سرمایہ انہیں تاریخ ادب کی تصنیف کے دوران دستیاب ہوا اور ابتدائی دور کے حوالے سے خصوصا دکنی ادب کے دیوان دستیاب ہوئے تو انہوں نے اس عہد کے تین اہم شعراء کے دواوین کی تدوین کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ دیوانِ حسن شوقی (۱۹۷۱ء)

۲۔ دیوانِ نصرتی (۱۹۷۲ء)

۳۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۹۷۳ء)

''دیوانِ حسن شوقی''

دیوان حسن شوقی (۱۹۷۱ء)میں انجمن ترقیء اردو پاکستان سے شائع ہو ا اس سے پہلے مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۹ء میں حسن شوقی کی دو مثنویات اور تین غزلیں شائع کیں۔(۱۱)سخاوت مرزا نے ۱۹۵۴ء میں مزید تین غزلوں کو تلاش کرکے مدوّن کیا۔(۱۲)۱۹۶۵ء میں حسینی شاہدنے پانچ غزلیں تلاش کرکے شائع کروائیں۔(۱۳)دیوانِ حسن شوقی کی اس قدر بازیافت کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کے مزید کلام کو دریافت کیا۔بقول ڈاکٹر جالبی :

> ''قدیم ادب کا اس سے بڑا خزانہ پاکستان میں نہیں ہے اور بہت سے مخلوطات ایسے ہیں جن کی اشاعت اردو ادب کی بنیادی ترقی اور ادبی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کوملانے کے لئے ازبس ضروری ہے۔دیوانِ حسن شوقی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں ''فتح نامہ نظام شاہ''،''میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ''کے علاوہ تیس غزلیں، جوقدیم بیاضوں میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، شامل ہیں۔ چند غزلوں کو چھوڑ کر باقی سب چیزیں پہلی بار شائع ہورہی ہیں''۔(۱۴)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے 'دیوانِ حسن شوقی' میں حسن شوقی کے جس کلام کو مجتمع کیاہے وہ مختلف بیاضوں سے لیاگیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان بیاضوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ جس میں حسن شوقی کاکلام موجود ہے۔ انجمن کے کتب خانہء خاص میں ''فتح نامہ نظام شاہ'' کے دو نسخے موجود ہیں جن کا تعارف مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیاتھا اسے وہ نسخہء اوّل قرار دیا ہے جبکہ دوسرے نسخے کو (نسخہء ثانی) کو ناقص قراردیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انہی دونسخوں سے دیوان حسن شوقی کو ترتیب دیاہے۔ دیوان حسن شوقی '۱۹۴' صفحات پر مشتمل ہے جسے انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ دیوان کا عنوان ''دسویں صدی ہجری میں

اردو شاعری کی روایت کا سراغ دیوان حسن شوقی‘‘بہت بامعنی ہے۔ اسکی وضاحت ڈاکٹر وحید قریشی اس طرح کرتے ہیں:

’’جالبی صاحب ولیؔ کو دکنی روایت سے الگ کرکے دیکھنے کے قائل نہیں۔ انہوں نے نصرتی سے لے کرولیؔ تک کی دکنی شاعری میں،جس طرح فارسی روایت کے انجذاب کا عمل ہوتارہاہے،اس کا سراغ لگاکر ادبی روایت کے تسلسل کی نشاندہی کی ہے۔ اس اعتبار سے وہ حسن شوقی کے کلام کو ایسا ’’درمیانی پل‘‘ قراردیتے ہیں جس کے بغیر روایت تک نہیں پہنچایاجاسکتا‘‘۔(۱۵)

’’دیوانِ حسن شوقی‘‘ کے ابتدائی ۲۸ صفحات پرمحققانہ مقدمہ موجود ہے، جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختصراً ’میزبانی نامہ‘ اور فتح نامہ نظام شاہ کے قصے کوبیان کیاہے۔مقدمے میں حسن شوقی کے کلام کی خوبیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ۱۰۷ صفحات پردو مثنویوں ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ اور مثنوی میزبانی نامہ‘‘ تیس غزلیات اور ایک طویل نظم کا متن دیاگیاہے۔ قدیم دکنی زبان کی تفہیم میں آسانی کے لئے آخرمیں فرہنگ دی گئی ہے۔

’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کے تفصیلی مقدمے میں داخلی شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹرجمیل جالبی نسخہء اول اور نسخہء ثانی کے متن سے الحاقی اشعار سے متعلق مولوی عبدالحق کے خیالات سے اختلاف کیا ہے(۱۶) اور نسخہء ثانی کو دیوان کی تدوین میں اہم قراردیا ہے ؛جبکہ ڈاکٹرجمیل جالبی کے مطابق:

’’دلچسپ بات یہ ہے کہ نسخہء اوّل ’’فتح نامہ‘ ‘ کے دستور /ہئیت کے خلاف میدان جنگ اور فتح کے فوراً بعد کے حالات اور بغیر دعائیہ کلمات کے بے ربطی سے ختم ہوجاتاہے لیکن نسخہء ثانی میں وہ مضمون جونسخہء اوّل میں اٹھایاگیا ہے آگے بڑھتاہوا نظرآتا ہے اور مثنوی باقاعدہ طور پر دعائیہ کلمات پر ختم ہوتی ہے۔ میدان جنگ میں کیا قیامت برپا ہوئی اس کی تفصیل نسخہء اوّل میں نہیں ہے لیکن نسخہء ثانی میں موجود ہے۔ دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر پڑھنے سے معلوم ہوتاہے کہ ان دونوں نسخوں کے درمیان چند اشعار اب بھی غائب ہیں لیکن اس نقص کے باوجود جومجبوری ہے جب تک کوئی اور نسخہ اس مثنوی کا دریافت نہ ہوجائے۔ اگر ان دونوں نسخوں کو ملا دیا جائے تو مثنوی مکمل ہوجاتی ہے۔ مولوی صاحب کو نسخہء ثانی کے اشعار الحاق ہونے کا شبہ اس وجہ سے ہوا کہ انہیں بظاہر یہ ممکن نظرنہیں آیا کہ کوئی شخص ۹۷۲ھ میں زندہ ہو اور شعر کہہ رہاہو، وہ ۱۰۴۰ھ میں بھی زندہ ہو اور شعر کہتارہے‘‘۔(۱۷)

’دیوان حسن شوقی ‘مقدمے کا جائزہ لیاجائے تو ڈاکٹر جمیل جالبی کا طریقۂ تحقیق و تدوین واضح ہوجاتاہے۔ دیوان حسن شوقی کی اشاعت سے پہلے حسن شوقی کا کچھ کلام اگرچہ منظرعام پرآچکاتھا لیکن اس کی سوانح کے بارے میں کچھ خاص معلومات دستیاب نہ تھیں۔ مولوی عبدالحق نے ’’قدیم اردو‘‘میں لکھا ہے:’’--------افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا لیکن اتنا ضرور معلوم ہواہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء میں سے تھے‘‘۔(۱۸)

حسن شوقی کے کلام سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے نام اور تخلص کے متعلق اشعار کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے:

> ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کے آخر میں یہ الفاظ ملتے ہیں ’مرتب شدفتح نامہ نظام شاہ ‘ گفتار حسن شوقی ‘اور ’’میزبانی نامہ‘‘ کے ترقیمہ میں ’مرتب شد ہ میزبانی نامہ سلطان محمدعادل شاہ گفتار حسن شوقی ‘کے الفاظ ملتے ہیں۔ایک اور مخطوطے میں ’شیخ حسن شوقی مرید آنحضرت تاریخ وصال آن قطب دائرہ کمال را چنیں گفتہ کہ قطب آخرالزّماں ‘کے الفاظ ملتے ہیں ان شواہد کی روشنی میں شیخ حسن نام اور شوقی تخلص ٹھہرتاہے‘‘۔(۱۹)

حسن شوقی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کسی تذکرے میں نہیں کیاگیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کی مثنوی ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کومدّنظر رکھ کر تاریخ پیدائش کا تعین اس طرح کیاہے۔ ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کے اشعار میں حسن شوقی نے مدح کے جو اشعار لکھے ہیں ان سے بھی واضح ہوتاہے جب شوقی نے مثنوی لکھی تو حسین نظام شاہ زندہ تھا کیونکہ مدح زندہ شخصیات ہی کی لکھی جاتی ہیں۔ اگر حسن شوقی ۹۷۲ھ میں زندہ نہ ہوتا کئی سال بعد یہ مثنوی لکھتا تو اس مثنوی کا نام ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کی بجائے جنگ تالی کوٹ رکھتا۔ ڈاکٹر جالبی اپنی بات کی تصدیق کے لئے درج ذیل تاریخی حقائق،مقدمے میں شامل کئے ہیں:’’فتح احمد نگر کے گیارہ دن بعد حسین نظام شاہ روز چہار شنبہ، ہفتم ذیقعد ۹۷۲ھ کومرگیا،’ آفتاب دکن بشدپنہاں ‘ سے اس کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ حسین شاہ نظام بحری بھی وفات پاگیا اور یہ فتح نامہ اسی سال لکھاگیا اور بادشاہ کے حضور پیش کیاگیا‘‘۔(۲۰)

حسین نظام شاہ کے ۹۷۲ھ انتقال کے متعلق ڈاکٹر جالبی کے دعوے کی تصدیق تاریخِ فرشتہ سے بھی ہوتی ہے۔ ’’حسین نظام شاہ بھی احمد نگر پہنچا۔عیش و عشرت کی زیادتی کی وجہ سے اس

کی حالت خراب ہونے لگی وہ سخت بیمار ہوا اور احمد نگر میں آنے کے گیارہ روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے پورے گیارہ سا ل احمدنگر پرحکمرانی کی‘‘۔(۲۱)

فتح نامہ نظام شاہ‘‘حسین نظام کی وفات یعنی ۹۷۲ھ کے بعد لکھی جاتی تو حسن شوقیؔ جیسا قادرالکلام شاعر یہ شعر ہرگز نہ کہتا ؛

سدا جیوے راجے راج کر

بسے لگ دنیا نت نوے کاج کر

مبارک ظفر آسمانی اچھو

تجھے فتح نصرت سبحانی اچھو

ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کے عہد کا تعین کرنے کے لئے حسن شوقی کی تخلیقات سے داخلی شواہد پیش کئے ہیں، اس حوالے سے یہ دلائل قابل ذکرہیں :

> ’’------- عادل شاہی سلطنت کی کسی تاریخ میں حسن شوقی کا نام نہیں ملتا۔ دوسرے جنگ تالیکوٹ کی فتح کے موقع پر جس میں علی عادل شاہ اوّل، علی برید شاہ، حسین نظام شاہ اوّل اور ابراہیم قطب شاہ متحد ہوکر جیانگر کے راجہ رام سے لڑے تھے اوراسے شکستِ فاش دے کرجیانگر کوہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفحہء ہستی سے مٹا دیاتھا۔ حسن شوقی نے’’فتح نامہ جنگ تالیکوٹ‘‘ نہیں لکھا بلکہ اسے ’’فتح نامہ نظام شاہ‘‘ کا نام دیا۔اگر وہ کسی اور دربار سے وابستہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ نظام شاہ کو اصل فاتح جنگ قرار دیتا----پھر اس مثنوی کے زبان و بیان پر بیجا پورکا ادبی اسلوب غالب نہیں بلکہ اس میں فارسی اسلوب و آہنگ کااثر نمایاں ہے۔(۲۲)

ڈاکٹرجمیل جالبی کے دیئے گئے دلائل کی صداقت اس بات سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ ۱۶۳۳ء میں ہواتھا جس کے بعد حسن شوقی عادل شاہی سلطنت چلاگیا۔ اس بات کی تصدیق حسن شوقی کی دوسری مثنوی میزبانی نامہ سے بھی ہوتی ہے اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کو موضوع بنایاگیا ہے۔ اس مثنوی کے ترقیمے میں تحریر ہے ؛

’’مرتب شدہ میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ گفتار حسن شوقی‘‘(دیوانِ حسن شوقی،ص۴)

ڈاکٹرجالبی کی تحقیق کے مطابق جنگ تالیکوٹ کے وقت حسن شوقی کی عمر پچیس برس ہوسکتی ہے۔ مثنوی کے مطالعے سے ڈاکٹر جالبی کے اس دعوے کی تصدیق ہوئی ہے کہ جنگ تالیکوٹ کے

وقت نہ صرف حسن شوقی زندہ تھا بلکہ اس قدر باشعور ہوچکا تھا کہ جنگ کے واقعات لکھنے کے ساتھ ساتھ اس نے جہانگیر کی شان و شوکت کا مشاہدہ بھی کررکھا تھا۔ ان شواہد کے پیش نظر جہاں جالبی کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوتاہے، نسخہء ثانی ۱۰۹۶ھ کالکھا ہواہے اور الحاقی اشعار سے پاک ہے۔

حسن شوقی کے حالات زندگی کسی تذکرے میں موجود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے حسن شوقی کی وفات کے یقین کے لئے نشاطی کی مثنوی''پھول بن''کے اس شعر سے استفادہ کیاہے

ے حسن شوقی اگر ہوتے تو فی الحال

ہزاراں بھیجتے رحمت مجہ اُپرال (دیوان حسن شوقی ص۱۴)

اس حوالے سے ڈاکٹر جالبی استدلال پیش کرتے ہیں کہ شاہ حبیب اللہ کے انتقال کے وقت ۱۰۴۱ھ میں حسن شوقی نے ''قطب آخرالزماں'' کے الفاظ سے ان کی تاریخ وفات نکالی تھی۔ گویا ۱۰۴۱ھ تک شوقی زندہ تھا۔ اگر جنگ تالیکوٹ کے وقت اس کی عمر پچیس، چھبیس سال مان لی جائے تو ۱۰۴۱ھ میں اس کی عمر ۹۳، ۹۴ سال ہوسکتی ہے اور اسکی عمر تک کسی شخص کا زندہ رہ جانا بعید از قیاس نہیں۔''اس طرح حسن شوقی کا سن ولادت تقریباً ۹۴۸ھ بنتاہے اور اس کی وفات کا سن ۱۰۴۲ھ اور ۱۰۵۰ھ کے درمیان متعین کیاجاسکتاہے''۔(دیوان حسن شوقی،ص۱۴)

دیوان حسن شوقی میں دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' ہے۔ مثنوی' میزبانی نامہ' میں سلطان محمد کی شادی سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محیؔ الدّین زدر، نصیرالدین ہاشمی۷ اور حسینی شاہد(۲۳) سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کیاہے کہ ''میزبانی نامہ'' میں سلطان محمد کی جس شادی کو موضوع سخن بنایا ہے وہ مصطفی خان کی بیٹی سے ہوئی تھی اس بیان کی تصدیق کے لئے درج ذیل سرخی درج کی ہے: ''دربیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ راؤ دادن جہیز دختر نواب مظفرخان''۔(۲۴)

میزبانی نامہ ۲۱۴۔ اشعار پر مشتمل ہے اور اسے چار حصوں میں تقسیم کیاگیا ہے۔ ابتداء میں حمد ومدح سلطان محمد ملتی ہے اور باقی تین حصوں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ مجلس آراستن وبخشش کردن سلطان محمد مردماں رادر میزبانی خود

۲۔ دربیان شہر گشت سوار شدن سلطان محمد عادل شاہ

۳۔ دربیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ راہ دادن جہیز دختر نواب مظفرخان

مقدمے میں ڈاکٹر جالبی نے ''میزبانی نامہ'' میں درج واقعات بیان کئے ہیں بلکہ اس مثنوی کے فکری و فنی محاسن پربھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیاہے۔''مثنوی میزبانی نامہ'' کو اس حوالے سے اہم

قراردیتے ہیں کہ اس مثنوی میں حسن شوقی نے اپنے دور کے رسم و رواج، عادات و اطوار، طورطریقے، ادب آداب، کھانے پینے اور اوڑھنے کے ڈھنگ، آرائشی سامان، ظروف، ناچ گانے کی محافل اور بارات کے اہتمام اور جہیز سے متعلق عمدہ معلومات فراہم کی ہیں گویا یہ مثنوی اپنے دور کے معاشرتی، معاشی اور مذہبی حالات کی آئینہ دار ہے۔

مثنوی ''میزبانی نامہ'' اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس مثنوی میں شوقی کا قلم زورِتخیل دکھاتاہے اور واقعات کی عکاسی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی ''میزبانی نامہ'' کو اس کے فارسی اسلوب کی وجہ سے ''فتح نامہ نظام شاہ'' سے مختلف قرار دیتے ہیں۔ بقول جالبی:''جب ہم میزبانی نامہ کا مقابلہ ''فتح نامہ'' سے کرتے ہیں تو فتح نامہ پرہندی اسلوب کا اثرنمایاں طور پرمحسوس ہوتاہے اور میزبانی نامہ میں فارسی اسلوب وآہنگ'' (دیوانِ حسن شوقی،ص۲۸)

''میزبانی نامہ'' میں حسن شوقی کی قافیہ پیمائی کو ڈاکٹر جمیل جالبی بہترقراردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تلفظ اور املاء کے لحاظ سے بھی یہ ''فتح نامہ'' سے بہترہے۔ ''میزبانی نامہ'' کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی حسن شوقی کی شاعری کی اس خوبی کے بھی معترف نظرآتے ہیں کہ اس مثنوی میں اس نے خیال واحساس کو لفظوں کے ذریعے بہت خوبصورتی سے پیش کیاہے۔ لفظوں کی نئی جھنکار اور تکرار سے کلام میں موسیقیت پیداکی گئی ہے مثلاً درج ذیل اشعار

''طبل کی آواز سنیے

ؔ طبل ڈھول جم جم کریں دھمدھاٹ
فرنگیاں و تالاں کیرا کڑ کڑات

رقاصاؤں کی تیزی اور سرعتِ رفتاری دیکھیے

ے بھمبیریاں بھمیں یوں نہ پھرکیاں پھریں''(دیوانِ حسن شوقی،ص۲۹)

حسن شوقی کے مقدمے کا ایک اہم حصہ دکنی اور اردو غزل کی روایت کا مطالعہ کرتے ہوئے حسن شوقی کے مقام اور مرتبے کا تعین ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جالبی نے حسن شوقی کے کلام کا درج ذیل پہلوؤں سے جائزہ لیاہے۔

۱۔ شوقی سے متاثر شعراء کے کلام کی تلاش
۲۔ شوقی کے بعد آنیوالے شعراء پر شوقی کی غزل کے اثرات
۳۔ شعراء کا حسن شوقی کے کلام سے متعلق نقطہ ء نظر

ڈاکٹر جالبی نے جن شعراء کے کلام سے حسن شوقی کے کلام کا موازنہ کیا ہے ان میں فیروز، ملاخیالی اور محمود شامل ہیں۔ ان تمام شعراء کی ایسی غزلیات جوایک ہی زمین میں لکھی گئی ہیں ان کے مطالعے مقدمے میں درج کئے ہیں۔مثلاًفیرو ز کی غزل کا مطلع:

ے سروقد ت سہاوے جونوبہاربن میں
نازک نہاں پنجیا اس جیو کے چمن میں

ملاخیالی کی غزل کا مطلع ؛

ے بالی سروپ سودھن جوں پوتلی نین میں
صاحبِ جمال ایسے سکہے نہ کوئی لنگہن میں

حسن شوقی کی غزل ؛

ے جو بن سوں قدسہاوے، لٹکے جودھن اگن میں
جوپھول پریاں سوں ڈالی دستی ہے جیوچمن میں

ان تینوں کی غزل میں قافیہ اور ردیف یکساں ہے۔

بقول جالبی:

''ان تینوں غزلوں کوایک ساتھ پڑھ کر اندازہ ہوتاہے کہ یہ تینوں شاعر مزاج کے اعتبار سے، رنگ و ادب کے اعتبارسے، احساس وفکر کے اعتبار سے ایک ہی روایت کے حامل ہیں اور غزل کا یہی وہ رنگ اور زبان و اسلوب کایہی ڈھنگ تھا جو اس دور میں نیااور منفرد تھا اور جس کی وجہ سے ان کی استادی کی دھوم سارے دکن میں مچ گئی''۔(دیوان حسن شوقی،ص۳۷)

جالبی صاحب اس حوالے سے شوقی کو دیگر شعراء پربرتر ی دیتے ہیں کہ انہوں نے صنائع وبدائع، تجنیسِ لفظی اور حسن تعلیل کو غزل کا جزو بنایا گویا قدیم غزل کو جدید رنگ و آہنگ دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن شعراء پرحسن شوقی کے اثرات تلاش کئے ہیں ان میں اشرف، تائب، رحیمی، قریشی اور یوسف شامل ہیں۔بقول جالبی:

''شوقی کی غزل میں مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور خیالی کے اثرات کے نئے روپ میں ڈھلتے ہیں اور پھریہ نیا روپ شاہی، نصرتی، ہاشمی، اشرف، سالک، یوسف، نائب، قریشی اور ایسے بہت سے

دوسرے نامعلوم گمنام شعراء کے پاس سے ہوتاہوا ولی کی غزل میں
رنگ جماتاہے‘‘۔(دیوانِ حسن شوقی،۴۸)

جن دکنی شعراء نے حسن شوقی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیاہے ان میں ابن نشاطیؔ ، اشرف ؔاور ولی ؔشامل ہیں۔ ان کے اشعار کو جالبی نے مقدمے کا حصہ بنایاہے جن میں شوقی کوخراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر،جالبی کے اس کارنامے کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’دیوان حسن شوقی‘‘ ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک ایساکارنامہ ہے جس کی بدولت ان گمنام شعراء کو منظرعام پر لایاگیا جووقت کی گردمیں دب گئے تھے۔ اس کاوش کے سبب اردو ادب کے گم شدہ سلسلوں کی دریافت کا عمل شروع ہوا اور اردو ادب کی روایت بامعنی تسلسل کے ساتھ پھرسامنے آتی ہے اس کے علاوہ اس کی اہمیت ا س لئے بڑھ جاتی ہے کیونکہ:’’انہوں نے مستنداور بنیادی مآخذ سے اس کے حالات اور کلام کی تہذیب کی۔ خاص طور پر شاعرکے کلام اور اس کی زبان وبیان کا مطالعہ اس عہد کے تہذیبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی احوال کی روشنی میں قلمبند کیاہے‘‘۔(۲۵)

’’دیوان حسن شوقی‘‘ کے مقدمے کا ایک اہم حصہ شوقی کے کلام کا لسانی مطالعہ ہے۔ انہوں نے حسن شوقی کے کلام میں ماضی مطلق، صرفی و نحوی صورت، اسم صفت، اسماء کی جمع بنانے، مصدر، اسم فاعل، حروف جار اور اسمائے مؤنث کی جمع فاعل وغیرہ کے حوالے سے کلام میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان کا ذکرکیا ہے اور مثالوں سے واضح کیاہے۔ ضمائر کے حوالے سے ضمائرکے ارتقائی مراحل درج ذیل صورتوں میں شوقی کے کلام ہمارے سامنے آتے ہیں ؛

متکلم ؛ میں، مجہ، مجے، میرا (واحد)

ہمن، ہمنا (جمع)

دکنی اردو میں ’’ہائے‘‘ کی آواز کو حذف کردیاجاتاہے۔ شوقی کے کلام میں بھی ’’ہائے‘‘ مخذوف صورت میں سامنے آتاہے مثلاً ’ سنیرے (سنہرے)، روپیرے (روپہرے) مجے (مجھے) تجے (تجھے)، پین (پہن)، سیڑیاں (سیڑھیاں)، دیک (دیکھ) وغیرہ۔ جمع بنانے کے قاعدے کے حوالے سے شوقی کے کلام میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اگر فاعل جمع مؤنث ہے تو فعل بھی جمع مؤنث ہوگا جوکہ قدیم اردو میں عام رحجان نظر آتاہے۔ مثلاً

خوشی خرمی میں او بلتیاں چلیاں ؎

اکھرتیاں و پھرتیاں اوچھلتیاں چلیاں

افعالِ معاون اور حروفِ ربط کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہے۔ اہے۔ اہیں وغیرہ

۲۔ تا۔ اتھا۔ اتھے۔ اتھا ر وغیرہ

۳۔ تھا۔ تھیا۔ تھیاں وغیرہ

۴۔ اچھو۔ اچھے۔ اچھیں وغیرہ

ڈاکٹر جالبی نے ''لسانی مطالعے'' کے آخر میں ''میزبانی نامہ'' کے سواشعار کاسندھی زبان سے موازنہ کیا ہے اور ایسے لفظوں کی نشاندہی کی ہے جوان کے مطابق سندھی زبان سے متعلق ہیں۔ مثلاً

نانوں، سٹن، ماڑیاں، مڑے، دتے

پھیارے، کنگ، پھل، سکال،ہتھ

سریا،چکالے،دکال ،چھپے، لپے

چند الفاظ درج ذیل ہیں جو سندھی زبان سے متعلق ہیں:

سٹن :سندھی میں مارنا، ختم کرنا

ماڑیاں :ماڑی کی جمع

کنگ :شامیانے کے معنی میں سندھی میں مستعمل ہے

سکال :اچھا زمانہ

سریا :سرن (سندھی) ملنا، حاصل ہونا

ہتھ :ہاتھ

پُھل :پھول

رتڑے :رنگے ہوئے کپڑے

سچلی :سچ مچ

سٹیا :سٹن۔چھوڑنا۔ پھینکنا

ڈاکٹرجمیل جالبی نے 'میزبانی نامہ' کے ابتدائی سو اشعار میں سے سندھی زبان کے مشترک الفاظ کو جداکیاہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان الفاظ کو محض سندھی الفاظ قرار دینے کے خلاف ہیں۔انہوں نے اپنے مضمون ''دیوان حسن شوقی'' میں پنجابی کے چند الفاظ درج کئے ہیں جنہیں محض سندھی

الفاظ قرار دینے کے خلاف ہیں۔ مثلاً ،سٹن،ماڑیاں،مڑے، وتے،پھل، سکال، رے، سریہ، لپیّ، بھوئیں، سالو، ہتھ، رتڑے، سچلی، گاچتے،دوہڑے، ڈیوٹیاں، سنیا‘وغیرہ۔

ڈاکٹر وحید قریشی اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کے لسانی مطالعے میں سندھی زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ پنجابی کی اہمیت کو تسلیم کیاہے لیکن اسے بہت دور تک لے جاکر نہیں دیکھا اس لئے ان بعض آراء سے جزوی اختلاف ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ پنجابی اور سندھی میں ساخت کے اعتبار سے بعض عناصر مشترک ہیں لیکن جالبی صاحب اسے صرف سندھی سے مخصو ص کرتے ہیں حالانکہ پنجابی بھی اس عنصر سے خالی نہیں‘‘۔(۲۶)

ڈاکٹر وحید قریشی کے اس اعتراض کا جائزہ اگر ڈاکٹر جمیل جالبی کے مؤقف کے حوالے سے لیاجائے تو یہ اعتراض درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ زبان کے لسانی مطالعے میں کلام کی صرف و نحوی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کی نشاندہی کردی ہے کہ کون سی خصوصیت حسن شوقی کے کلام پرکس زبان کی وجہ سے ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کا مؤقف ہے:

’’اس فہرست سے میرامنشاصرف یہ دکھانا ہے کہ اردو زبان کا ذخیرہء الفاظ عربی، فارسی، ترکی کے ساتھ ساتھ برصغیر کی ہرزبان کے ساتھ اس طور پر مشترک ہے کہ یہ زبان کم و بیش سب زبانوں کی زبان بن جاتی ہے‘‘۔(۲۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کے کلام میں جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے ان میں حرف عطف ’’و‘‘ کا کثرت سے استعمال فارسی و ہندی الفاظ کے مطابق اضافت کا استعمال، حرف اضافت کی بجائے ’’ے‘‘ کا استعمال، الفاظ میں ’’ھ‘‘ یا ’’ہ‘‘ کو مخذوف کرنا، واؤ معروف کی پوری آواز کی بجائے پیش کا استعمال، مرّوجہ تلفظ اور ضرورتِ شعری کے مطابق متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک باندھنا،ضرورت شعری کے مطابق ناموں کوتوڑنا موڑنا،ہندی طریقے سے مرکبات بنانا اور درست قافیہ پیمائی شامل ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقیؔ کے کلام کے املاء اور رسم الخط کا جائزہ بھی لیا ہے۔ڈاکٹر جالبی نے قدیم اردو اور جدید اردو کے املاء کے فرق کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔حسن شوقیؔ کے کلام میں ڈاکٹر جالبی نے ’’ہ‘‘ اور’’ھ‘‘ کو بدلا ہے تاکہ قارئین کو پڑھنے میں آسانی ہو۔قدیم اردو میں الفاظ کوالگ الگ لکھاجاتاتھا، جالبی صاحب نے الفاظ کو

الگ الگ لکھا ہے۔ قدیم متون کی تدوین کے وقت ایک اہم مرحلہ املاء کا تعین بھی ہے۔ محققین میں اس سلسلے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں آیا نسخہ مرتب کرتے ہوئے املاء تبدیل کردیاجائے یا وہی رہنے دیاجائے، بعض محققین کی آراء درج ذیل ہے:

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' میں ڈاکٹر سیّد مبارزالدّین کی رائے درج کی ہے۔

''بعض الفاظ کا املاء ان کے قدیم متون میں،ان کے اس وقت کے تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔ آج ان کا املا ء مروجہ املاء کے مطابق ہوجائے گا لیکن تلفظ وہی رہے گا مثلاً دکنی میں صورت کو ''صرت'' اور امام کو ''امم'' کے تلفظ کے ساتھ نظم کیاگیاہے۔ اب اسے متن کی ترتیب کے وقت ان کاا ملاء ''صورت'' اور ''امام'' ہی رکھا جائے لیکن حاشیہ میں تلفظ کو بروزن شکل [کذا، فعل؟] لکھ کر ظاہر کردیا جائے گا''۔(۲۸)

عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''متن تیار کرتے ہوئے وقت املاء کا خیال رکھنا ضروری ہے یعنی املاء وہی ہوگی جو اس عہد میں رائج تھا''۔(۲۹)

ڈاکٹر تنویر علوی کے مطابق:

''قدیم متون کا املاء ان کے رائج الوقت املاء ہی کے مطابق ہونا چاہیے۔ جدید املاء میں ان کو پیش کرنا حقائق سے رشتہ توڑنا ہے''۔(۳۰)

ڈاکٹر گیان چند کی تجویز ہے:

''الف: جن مقامات پر مخطوطے کا املاء موجود ہ تلفظ سے کوئی فرق ظاہرنہیں کرتا بلکہ محض فرسودگیء املاء ہے وہاں جدید املاء اختیار کیاجائے مثلا 'اوس، فرسنگ، خوشے، ساتہی کو بالترتیب اس،فرسنگ،خوشی،ساتھی لکھا جائے۔

ب:جن مقامات پر فرسودہ املاء کسی فرسودہ تلفظ کی ترجمانی کرتاہے اور جسے بدلنے میں مصنف کا پیش کردہ تلفظ بدل جائے گا وہاں مخطوطے کے اصل املاء برقرار رکھاجائے۔ مثلاً کوں، سوں، کبھو،

جد، تد، تلپھنا کو جدید کرکے کو، سے جب، تب تڑپنا، ہرگز نہ لکھاجائے‘‘۔(۳۱)

جبکہ رشید حسن کے مطابق:

’’مخلوطے میں واقعی املاء کے پیچھے منشائے مصنف کی تلاش کیجئے اگرچہ اس نے ’’کی‘‘ کویائے مجہول سے ’’کے‘‘ لکھا ہے تو بھی اس کا منشا ’’کی‘‘ لکھنے کا تھا۔ اسلئے آج ہم اسے ’’کی‘‘ ہی لکھیں گے اگر اس نے گھر کو ’’گہر‘‘ لکھا ہے توہم جانتے ہیں کہ اس کا منشا ’’گھر‘‘ لکھنے کاتھا‘‘۔(۳۲)

ان تمام محققین کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیاجائے تو ڈاکٹر گیان چند جین کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ مذکورہ املاء کی جگہ جدید املاء درج کرنا اور منشائے مصنف کا خیال رکھنا زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے املاء کے حوالے سے اس خیال کوپیش نظررکھا ہے کہ زیادہ تر الفاظ کا املاء اصل املاء کے مطابق رہنا دیاہے جبکہ قارئین کی سہولت کابھی خیال رکھا ہے۔ ایسے الفاظ کا املاء درست کیاہے جو ان کے خیال میں اس وقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے جیسے غوص اعظم کو غوث اعظم کردیاہے اور حجرت کو ہجرت اور نصل کو نسل کردیاہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹرجمیل جالبی کی اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ مذکورہ الفاظ اس زمانے میں بھی درست نہیں مانے جاتے ہوں گے وہ لکھتے ہیں: ’’مجھے ڈاکٹر جالبی کی اس بات سے اختلاف ہے کہ یہ لفظ اس زمانے میں صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے کیونکہ بعض صاحبِ علم کاتبوں کے ہاں بھی یہ عمل جاری دکھائی دیتاہے۔ میرے نزدیک اسے ایک فطری لسانی عمل قرار دینا مناسب ہوگا‘‘۔(۳۳)

ڈاکٹروحید قریشی کا اعتراض درست معلوم ہوتاہے ان الفاظ کو غلط کہنے کی بجائے املاء کا ارتقائی عمل قراردیاجاسکتاہے۔ الفاظ میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ مثنوی میں اسے بہت سے الفاظ ہیں جنہیں محض کاتب کی غلطی قرار نہیں دے دیا جا سکتا۔

اندرصبا اندر سبھا

آنکہ آنکھ

سد صد

لاکہ لاکھ

لکہ لکھ

بیچہ بیچ

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تقریباً ۶۱الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے جس میں الفاظ کے قدیم اور جدید املاء کی وضاحت کی گئی ہے۔ مقدمے کے اختتام میں ''ترتیب کے بارے میں'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جالبی ''دیوان حسن شوقی'' کی ترتیب کے حوالے سے وضاحت فرمائی ہے۔ مثلاً نسخہء اوّل اور نسخہء ثانی کے اشعار کے اختلاف کو حاشیے میں بیان کرنا،تسلسل قائم رکھنے کے لئے نسخہء ثانی کے اشعار کو نسخہء اول کے اشعار سے ملانا اور اختلافِ متن کو حاشیے میں میں بیان کرنا، دونوں نسخوں میں موجود مشترک اشعار پر ''صہ'' کا نشان لگانا، ترقیموں کو مخطوطات کے تعارف میں شامل کرنا، دیگرمحققین کی دریافت کردہ حسن شوقی کی غزلوں کے اختلافات کوحاشیے میں بیان کرنا شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر جالبی نے ایک طویل فرہنگ دی ہے اس فرہنگ کو جالبی صاحب نے بڑی محنت سے تیارکیاہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی معترض ہیں کہ اس فرہنگ میں بعض مقامات تصحیح طلب ہیں ان کے مطابق بعض الفاظ کے معنی غلط درج کئے گئے ہیں جبکہ بعض الفاظ کے معانی متعین ہی نہیں کئے گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لفظوں کی بعض املائی صورتوں کو بھی فرہنگ کا حصہ بنادیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق انہیں فرہنگ کا حصہ نہیں ہونا چاہئے الفاظ کے معانی مزید غور کا تقاضاکرتے ہیں مثلاً

> ''اڑ کا معنی غرور دیاہے، ہٹ اور ضد کے معنوں میں اب بھی رائج ہے، انڈڑیاں کامطلب انڈے دیاہے، حالانکہ چھوٹے انڈوں کو انڈڑیاں کہتے ہیں، بالن کا مطلب جلانادیاہے۔ بالنا کا مطلب جلاناتو ہے لیکن بالن جلانے کی لکڑی کہتے ہیں۔(۳۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عرق ریزی سے ''دیوانِ حسن شوقی'' کوترتیب دیاہے۔ ان کا تحقیقی طریقہء کاراستدلال پر مبنی ہےدلائل کی ترتیب میں انہوں نے خاص طریقہء کار اختیار کیاہے انہوں نے قیاسی اور غیر یقینی دلیلوں کو پہلے اور حتمی دلائل کو بعد میں جگہ دی ہے دیوان حسن شوقی میں بھی انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیاہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیئے گئے دلائل کے مطا بق ان کی بات سے اتفاق نہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔
ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''دیوانِ حسن شوقی'' کی تدوین سے دکنی ادب کی گمشدہ کڑیوں کو دریافت کرنے کی روایت کے تسلسل کو آگے بڑھایا۔ ''دیوانِ حسن شوقی'' ہمیں اس دور کی مذہبی، معاشی، معاشرتی اور حکومتی امور سے واقفیت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کے املاء، زبان کے ارتقائی مراحل، اس دور کے مروّجہ اسلوب اور غزل کے مزاج سے بھی واقفیت فراہم کرتاہے۔ ''دیوان حسن شوقی'' کی بدولت اردو ادب گمنام شعراء مثلاً فیروز، محمود، خیالی، سالک، اشرف، رحیمی،

قریشی اور تائب سے واقف ہوا۔ تدوینِ متن کے حوالے سے ’’دیوان حسن شوقی‘‘ ایک قابل ستائش کوشش ہے۔

دیوان نصرتی:۔

تدوینِ متن کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا اہم کانامہ ’’دیوانِ نصرتی‘‘ کی ترتیب و تدوین ہے۔ جو کہ ’’دیوانِ حسن شوقی‘‘ کی اشاعت کے دوسرے سال ۱۹۷۲ء میں مطبع قوسین لاہور سے شائع ہوئی۔ ’’دیوانِ نصرتی‘‘ کی اس اشاعت سے قبل اسے سہ ماہی ’’صحیفہ‘‘ لاہورمیں ۱۹۷۲ء میں شائع کیاگیا۔ نصرتی کے اس دیوان میں ۲۳ غزلیں، ۲۸رباعیاں، تین قطعے، ۲مخمس، ایک ہجو، ۵۵۰کی ایک مثنوی (تاریخِ سکندری) اور ایک نعتیہ قصیدہ ’’چرخیات نصرتی‘‘ شامل ہیں۔ قصیدے میں ۱۳۳ اشعارہیں ان کے علاوہ ’’ایک گھوڑا مانگنے کی درخواست‘‘ اور ایک مختصر قصیدہ اور بھی ہے۔ نعتیہ قصیدہ کا تعلق واقعہ ء معراج سے ہے، دیوان کے اختتام پر ایک فرہنگ دی گئی ہے۔ ’’دیوان نصرتی‘‘ سے قبل نصرتی کا کچھ کلام شائع ہوچکاتھا۔ مولوی عبدالحق نے نصرتی کی دو مثنویوں،’’گلشنِ عشق‘‘ ’’علی نامہ‘‘ اور ’’تاریخِ سکندری‘‘ کو ’’نصرتی‘‘ کے عنوان سے۱۹۴۴ء میں انجمن ترقیء اردو سے شائع کرادیا۔ حکیم شمس اللہ قادر ی نے ’’اردوئے قدیم‘‘ میں نصرتی کا مختصر تعارف ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔’’نصرتی کی تصنیفات میں تین مثنویاں ہیں۔ ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ علی نامہ ۲۔ گلشنِ عشق ۳۔ گلدستہ ء عشق۔ یہ تینوں کتابیں سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھیں‘‘۔(۳۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی اور مولوی عبدالحق کے مطابق تیسری تصنیف گلدستہ ء عشق کی بجائے مثنوی ’’تاریخ سکندری‘‘ یافتح نامہ بہلول خان ہیں۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:’’ملانصرتی، (۱۰۸۵ھ) کی تین تصانیف یادگارہیں۔ ایک گلشنِ عشق (۱۰۶۸ھ) دوسری علی نامہ (۱۰۷۶ھ) او ر تیسری ’’دیوانِ نصرتی‘‘ جس میں تاریخِ سکندری یعنی فتح نامہ بہلول (۱۰۸۳ھ) شامل ہیں‘‘۔(۳۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کے کلام کو جن بیانوں کی مدد سے ترتیب دیاہے ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے جبکہ اصل بیاضیں قومی عجائب گھر کا حصہ ہیں۔ ’’دیوانِ نصرتی‘‘ کے مقدمے میں نصرتی کے حوالے سے اہم باتوں کو موضوع بنایا گیاہے۔ مولوی عبدالحق نے نصرتی کی دو مثنویوں ’’گلشنِ عشق‘‘ اور ’’علی نامہ‘‘ کا تعارف کروایا ہے اور مختصراً ان کے قصے پر روشنی ڈالی ہے۔ نصرتی کی سوانح بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نصرتی کے کلام کی خصویات کا جائزہ لیاہے۔ ’’دیوانِ نصرتی‘‘ میں شامل مثنوی ’تاریخِ سکندری ‘کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کا دعویٰ ہے کہ وہ پہلی بار شائع کی جارہی ہے جبکہ مولوی عبدالحق اس مثنوی کوپہلے شائع کرچکے ہیں۔ فرق یہ

ہے کہ ڈاکٹر جالبی نے مکمل مثنوی کو عنوانات کے ساتھ شائع کیاہے۔ اس طرح ''دیوانِ نصرتی'' میں نصرتی کی ۲۸ رباعیات شامل ہیں۔ جبکہ مولوی عبدالحق نے نصرتی کی ۹ رباعیات ''نصرتی''میں شائع کی تھیں۔۷ رباعیات دونوں کتابوں میں مشترک ہیں، جبکہ دو رباعیات ایسی ہیں جو ''دیوان نصرتی'' کا حصہ نہیں ہیں۔ ''دیوان نصرتی'' میں نصرتیؔ کی سوانح کے حوالے سے جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ ڈاکٹر جالبی کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے کیونکہ نصرتیؔ کی سوانح کے بارے میں کسی بیاض اور تذکرے میں معلومات درج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے داخلی شواہد کی بنیاد پر نصرتیؔ کی سوانح مرتب کی ہے۔ نصرتیؔ کے نا م کے حوالے سے مولوی عبدالحق کا مؤقف تھا کہ''تخلص کی مناسبت سے محمد نصرت نام ہونا قرینِ قیاس تو ہے مگر یقینی نہیں---'' (۳۷)

حکیم شمس اللہ قادری کے مطابق،''نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے'' (۳۸)

جبکہ ڈاکٹر جالبی کی تحقیق کے مطابق:''جہاں نصرتی نے بنی ابن عبد الصمد کی زبان سے چند اشعار کہلوائے ہیں وہاں یہ شعر ملتاہے،

ے دکھن میں توں آج نصرت قریں — بلند شعر کی فن میں سحر آفریں

اس شعر سے بھی نصرتی کا نام ''محمد نصرت'' ہونے کی تصدیق ہوتی ہے''۔(۳۹)

اس شعر میں نصرتی کانام ''نصرت'' آیا ہے جبکہ مدوّن نے شاید مسلمان ہونے کی بنا پر ''محمد نصرت'' کر دیاہے۔ نصرتی کے مذہب کے حوالے سے بھی مختلف آراء پائی جاتی تھیں مثلاً گارساں دتاسی نے اسے برہمن بتایا جبکہ مولوی عبدالحق اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ان کے مطابق:

''گارساں دتاسی نے''گلشنِ عشق'' کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جوکانجی ورم میں لکھا گیا تھا۔ اسے برہمن بتایا۔بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے بھی گارساں دتاسی کے اسی بیان کی بنیاد پر اسے برہمن لکھ دیا------خود نصرتی نے اپنے متعلق ''گلشنِ عشق'' میں ایک آدھ جگہ جو سرسری سا ذکر کیاہے اس سے اس قول کی تردید ہوتی ہے---

بحمداللہ کرسی بہ کرسی میر ی — چلی آتی ہے بندگی میں تیری''۔(۴۰)

ڈاکٹر جالبی، مولوی عبدالحق کی تحقیق کو درست تسلیم کرتے ہیں، نصرتی کے آبائی پیشے کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں:

''گلشن عشق'' سے بھی یہ معلوم ہوتاہے کہ نصرتی کے آباؤ اجداد پیشہ ور سپاہی تھے۔

کہ میں اصل میں ایک سپاہی ا تھا — فدا درگہ بادشاہی ا تھا
کہ تھا مجھ پیدر سر شجاعت مآب — قدیم یک سلحدار جمع رکاب

وہ اس خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے پیشہء سپاہ گری چھوڑ کر شاعری اختیار کی''۔(۴۱)

نصرتی کے کلام سے ڈاکٹر جالبی نے اس بات کا سراغ بھی لگا یا ہے کہ نصرتی دکن کا رہنے والا نہیں تھا۔

ے دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیانئیں ہواکیا سب گز ر گئے یودیکھو حاضر وودفتر ہے۔

اس شعرسے پتہ چلتاہے کہ نصرتی کہیں اور کا رہنے والاتھا اس کے اشعارسے اس بات کا بھی پتہ چلتاہے کہ وہ علی عادل شاہ ثانی کے بلانے پر ان کے دربار کا حصہ بنا؛

ے میرا شہ جوبوجک رہے جوہری وہ شہزادگی میں اتھا مشتری

بلا بھیج بندے کو اس حال میں نظرکرمرے بے بہا مال میں

پرکھتا چلیا یو رتن سر بسر تھکے دیکھ پا رکھ یو اہلِ نظر

وہیں جگ میں بندہ رہنے بے نیاز رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

ڈاکٹر جالبی نے نصرتی کے کلام سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیاہے کہ نصرتی کو اہل دکن سے جان کا خطرہ تھا۔ نصرتی کی وفات پر لکھے گئے قطعہء تاریخ سے جالبی صاحب نے نہ صرف ان کی تاریخ وفات کا تعین کیاہے بلکہ ان کی طبعی موت کے بجائے ان کے قتل کی طرف اشارہ کیاہے۔ ان کے مطابق''تذکرہ شعراء دکن'' میں عبدالجبار ملکا پوری نے نصرتی کا سال وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔ ''اردو مخطوطات'' کتب خانہ سالار جنگ میں نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے یہ قطعہ تاریخ وفات دیاہے ؛

ے ضرب شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ جاکے جنت میں خوش ہورہے ؟

سال تاریخ آ ملا یک نے یوں کہی ''نصرتی شہید اہے''

نصرتی شہید اہے سے ۱۰۸۵ھ برآمد ہوتاہے''۔(۴۲)

ڈاکٹر جالبی نے مقدمے میں ''اردو شہہ پارے''(۴۳)میں درج نصرتی کی تاریخِ وفات سے اختلاف کیاہے۔ ان کے مطابق تاریخ اسکندری کا سن تالیف ۱۰۸۱ھ ہے جبکہ''اردو شہہ پارے ']میں تاریخ وفات ۱۰۸۱ھ درج ہے جوکہ غلط ہے کیونکہ تاریخ اسکندری لکھتے وقت نصرتی زندہ تھا۔ نصرتی کی قبر کے بارے میں وہ مولوی عبدالحق کی تحقیق سے متفق ہیں اور مولوی عبدالحق کے حوالے سے لکھتے ہیں ؛''بیجا پور میں نصرتی کی قبرآج بھی موجود ہے''۔(۴۴)

ڈاکٹرجالبی نے مقدمے میں نصرتی کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیاہے اور ان کا تاریخی پس منظر بیان کیاہے۔''گلشن عشق'' کو نصرتی کی پہلی مثنوی قراردیتے ہیں جوعلی عادل شاہ کے دورمیں لکھی گئی۔ اس میں نصرتی نے ' منوہر و مد مالتی' کی داستانِ عشق کو بیان کیاہے۔ نصرتی کی

یہ مثنوی اگرچہ طبع زاد نہیں ہے لیکن بقول جالبی:’’نصرتی نے اس میں اتنا اضافہ کیاہے کہ اس قصے کے مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ چنپاوتی اور چندر سین کی داستانِ عشق کے سلیقے سے شامل کرکے دوآتشہ بنادیاہے‘‘۔(دیوانِ نصرتی،ص۱۷)

’’گلشن عشق‘ ‘ کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کا مؤقف ہے کہ نصرتی ؔنے فارسی روایت کی پیروی میں قصّہ نگاری پر زور دینے کی بجائے جزئیات نگاری اور فضابنانے پر زیادہ زور دیاہے۔ گویا’’گلشنِ عشق‘‘ بیجا پور کی پہلی مثنوی ہے جو گولکنڈہ کے اسلوب اور مزاج کے قریب ہے۔ نصرتی کی اگلی مثنوی ’’علی نامہ‘‘ ہے جوبقول جالبی’’علی نامہ قاضی کریم اللہ اور شاہ نوراللہ کی فرمائش پرلکھا۔’’علی نامہ‘‘ علی عادل شاہ کی حکمرانی کے ابتدائی دس سالوں کی جنگوں، فتوحات، سیاسی واقعات اور معرکوں پرمشتمل ہے۔ علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں اپنے دور کی معاشرت اور سیاست کی عکاسی بہت خوبی سے کی گئی ہے۔ ’’علی نامہ‘‘ کو اردو کی قدیم رزمیہ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی صاحب کا نقأہ نظر یہ ہے کہ:

’’خاور نامہء رستمی میں حضرت علی ؑ مرکزی کردارکی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے سارے کارنامے خیالی ہیں۔ ’’علی نامہ‘‘ نہ صرف صحیح تاریخی واقعات پر مبنی ہے بلکہ نصرتی کا ممدوح علی عادل شاہ ایک زندہ و حقیقی شخصیت ہے۔ ’’علی نامہ‘‘ میں مغلوں کی ان جنگی غلطیوں اورشکستوں کا حال بھی معلوم ہوتاہے جس کا ذکر شمال ہند کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا‘‘۔(ص،۱۰)

تاریخِ اسکندری جسے پہلی دفعہ ’’دیوان نصرتی‘‘ میں شائع کیاگیا،کوجالبی صاحب نصرتی کے آخری دورکی تصنیف قراردیتے ہیں۔ مثنوی کی ابتدا ء میں اس کے نام اور سالِ تصنیف دونوں کو بیان کردیاہے۔

ے کہہ ہار یو تاریخ اسکندری   لگے جس کی گفتار یوں سرسری
سہس ہو راسی پر جوتھے تین سال   کرے یک میں،برسب زمانے نے حال

اس مثنوی میں نصرتی نے اس دوروزہ جنگ کو موضوع بنایاہے جوکہ علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سکندر عادل شاہ کے تخت پر متمکن ہونے کے بعد سیواجی ؔسے لڑی گئی۔ اس مثنوی کو نصرتی نے چھ عنوانات کے تحت تقسیم کیاہے۔’’اسکندر نامہ‘‘میں بھی وہی شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں جو ’’علی نامہ‘‘ کا خاصہ ہیں جبکہ مولوی عبدالحق نے ’گلشنِ عشق اور علی نامہ ‘ سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’یہاں نصرتی کے کلام میں وہ زور اور شگفتگی نہیں ہے جو اوّل الذکر مثنویوں میں ملتاہے‘‘۔(دیوانِ نصرتی،ص۲۲۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی اس موازنے کو غیرمنطقی قراردیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں:''علی نامہ'' علی عادل شاہ کے ہنگامہ پرور دس سالہ دور کی بڑی مہمات کی تاریخ ہے اور''تاریخ اسکندری'' صرف دو روزہ جنگ کی داستان ہے''۔(دیوانِ نصرتی،ص۱۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مؤقف درست ہے کیونکہ دونوں مثنویوں کی نوعیت اور واقعات میں بہت اختلافات پایا جاتاہے لہٰذا ''اسکندر نامہ'' میں وہ شان و شوکت نہیں پائی جاتی جو ''علی نامہ'' کا خاصاہے جبکہ نصرتی کے کلام کی خاص خوبی یعنی زورِ کلام اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ے کئے حکم سب پر کہ اب بس کرو چکاٹیاں پہ ظاہر نکو کس کرو

بھلے مر دکا مرد پر وار ہے نگوڑیاں کو چپ دیکھنا عار ہے

کدھیں پھر کہ مردے پکڑ آئیں گے کریں گے سو اپنا سزا پائیں گے

یہی بات کر شکر حق لیا بجا کھڑا رن پہ ر ہ شادیانے بجا

''تاریخ اسکندری'' کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا دعویٰ ہے کہ ''لطف کی شیرینی،تخیل کی پرواز اور چند لفظوں کے دفتربیان کردینا نصرتی کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو ہمیں اس طور پر بہت کم شعراء کے ہاں نظرآتی ہیں''۔(دیوانِ نصرتی،ص۱۳)

'دیوانِ نصرتی' میں نصرتی کے قصائد بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد کے حوالے سے جمیل جالبی صاحب لکھتے ہیں:

''علی نامہ'' میں نصرتی کے سات قصیدے ملتے ہیں، 'گلشن عشق]او'ر علی نامہ' کے عنوانات مل کردو اور قصیدے اوربن جاتے ہیں۔ اگر ہجوِ سخنور، مدح علی عادل شاہ، قصیدہ گھوڑا مانگنے کی درخواست پر، قصیدۂچرخیہ کو شامل کرلیاجائے تو اس طرح اور نصرتی کے کل قصائد کی تعداد تیرہ ہوجاتی ہے''۔(دیوانِ نصرتی،ص۱۳)

جبکہ مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق نصرتی کے کل بارہ قصائد دریافت ہوئے ہیں۔ مقدمے میں ڈاکٹر جالبی نے نصرتی کی قصیدہ گوئی پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی لیکن ''دیوانِ نصرتی'' میں شامل قصائد کے حوالے سے وہ نصرتی کو اردو کا بڑا قصیدہ گو شاعر تسلیم کرتے ہیں اور ''علی نامہ'' کے آخری قصیدہ ''فتح ملناڑ'' کو بیان کی رچاوٹ، شوکت الفاظ، قدرتِ بیان اور ترتیب کے حوالے سے نصرتی کا شاہکار تصور کرتے ہیں۔ دیوان نصرتی میں شامل قصیدہ ''قصیدۂچرخیہ'' اس حوالے سے اہم ہے۔

اس میں تمام تر الفاظ اور اصطلاحات چرخ کے حوالے سے لائی گئی ہیں۔

ہے رین کی تس چرخ پر نجم عجائب دسیا تھا جو د بیر فلک راقم سال و قرن

فن میں دبیری کے تئیں بدسوں اور روشن ضمیر جیب پہ از بردھر یں علم کی بھاکے چھنن

دفتر سبع سما ملک جسے ہے شہاب سرخ شفق شنجرف دودہ رین کا انجن

قصیدہ گوئی میں نصرتی کے مقام و مرتبہ کے حوالے ڈاکٹر جالبی فرماتے ہیں۔ ’’بحیثیت مجموعی اردو قصائد کا ذکر میں جہاں ہم سوداؔ اور ذوقؔ کا اب تک نام لیتے آئے ہیں وہاں ہمیں دورِقدیم اور قبل ولیؔ کے مولانا نصرتیؔ کا نام ان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ان دونوں سے پہلے لینا چاہیے‘‘۔(دیوانِ نصرتی،ص۱۴)

’’دیوانِ نصرتی‘‘ شامل قصیدہ ’’گھوڑا مانگنے کی درخواست‘‘ہمیں اس عہد کے رویے کی یا د دلاتاہے جس کے مطابق بادشاہ وقت سے مراعات کے حصول کے لئے شعراء قصیدہ گوئی کیاکرتے تھے۔ گویا دیوانِ نصرتی نہ صرف قدیم اردو کے شاعرانہ مزاج سے واقفیت کا ایک ذریعہ ہے بلکہ اس عہد کی معاشرت کا عکاس بھی ہے۔ نصرتیؔ کا یہ قصیدہ ۱۸ اشعار پر مشتمل ہے اور قصیدہ گوئی کا روائتی طریقہ اختیار کیاگیاہے جس میں ممدوح کی حمد کے بعد مطلوبہ چیز طلب کرتے ہوئے ممدوح کے لئے دعا کی جاتی ہے۔

دیوانِ نصرتی کے مقدمے میں ڈاکٹر جالبی نے نصرتیؒ کی غزلیات کے حوالے سے اس کے تصورِ عشق پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ نصرتیؒ کے تصورِ عشق کو فاسقانہ قراردیتے ہیں اور اس کی غزلوں کو تخیل،جذبہ اور معنی آفرینی کے لحاظ سے کمتر قرار دیتے ہیں۔ افسر صدیق امروہی، ڈاکٹرجمیل جالبی کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’اول تو اردو شاعر کے اس ابتدائی دور مین جب نصرتی فکرِسخن میں مصروف تھا اور شاعری پر ہندی شاعری کا پرتوزیادہ تھا اس لئے معنی آفرینی کی کمی شکایت مناسب نہیں، یہ خوبی تو شاعری کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد پیداہوتی ہے۔ جس طرح آبرو، ناجی اور حاتم کے زمانے میں غالب کی سی معنی آفرینی تلاش کرنا بے سود ہے۔ اسی طرح نصرتی کے عاشقانہ کلام میں ولیؔ اور سراجؔ کے زمانے کا تخیل بھی تلاش کرنامناسب نہیں‘‘۔(۴۵)

افسر صدیق امروہی ڈاکٹر جالبی کے مقدمے میں نصرتی کی شاعری کی چند خصوصیات کا ذکر نہ کرنے کا بھی حوالہ دیتے ہیں بقول افسر صدیق امروہی:''نصرتی نے صنائع و بدائع سے بھی اغماض نہیں برتا۔ جابجا اس کی مثالیں موجود ہیں اسے ان صنائع میں تضاد، مراعات النظیر اور تجنیس زیادہ مرغوب تھیں''۔(۴۶)اس حوالے سے افسر صدیق نے اپنے مضمون میں مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ دیوان نصرتی میں ۲۸ رباعیاں شامل ہیں۔ نصرتی کی رباعیوں کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''نصرتیؔ کی رباعیوں میں کچھ حمد ونعت میں ہیں اور کچھ ناصحانہ و عاشقانہ ہیں۔ ان رباعیوں کی زبان غزلوں کی زبان کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے اور اس جدید اسلوب سے قریب تر ہے۔ جوآئندہ دورمیں ولی کی شاعری میں نظرآتاہے''۔(۴۷) ان بیان کئے گئے موضوعات کو نصرتی کی رباعیوں میں تلاش کیاجائے تو جمیل جالبی کا مؤقف درست معلوم ہوتاہے۔ چند مثالیں:

حمدیہ رباعی:

ے اے اسم ترا سب میں مجے وافی ہے ہر در د کوں اس دل کے وہی شافی ہے

غیرت ہے میرے جیوں کوں تیرے غیرکی آس یک تونچ دو عالم میں مجھے کافی ہے

ناصحانہ رباعی:

ے خوبی نہیں یکتل بھی تری کس ہٹ میں ہر در کوں پھرہان نکر عزت میں

آخر وہی انپڑیگا لگا تجھے بے کم و بیش اول جو لکھیا ہے سو تری قسمت میں

''نصرتی کے دیوان میں دو مخمس شامل ہیں۔ پہلی مخمس میں ۸ بند اور دوسری میں ۷ بند ہیں۔ دوسری مخمس کو حوالے سے ڈاکٹر جالبی نے دعویٰ کیاہے کہ''دوسرا مخمس شاہی کی غزل کی تضمین ہے۔ جس میں''عشق کے کھیل''کو موضوع بنایاہے''۔(۴۸)جالبی صاحب کے اس مؤقف کی تصدیق مخمس کے آخری بند سے بھی ہوتی ہے جس میں نصرتی نے خود اعتراف کیاہے کہ اس بند کا قافیہ شاہیؔ کی غزل سے لیاہے اور شاہیؔ کو استاد تسلیم کیاہے۔

ے ائے نصرتی جب توں منگیا لکھنے مخمس بے بدل توقافیہ میں لیا ہندیااستادِ عالم کی غزل

الحق بنایاہے پدک نگ اوس میں جوڑا یسانول زینت ہے دنیاں کی رہنا نت عار خاں کے جؤ کی کل

یعنی پچھانے قد روئی جو صاحب ہوئے سوبات کا

’’دیوان نصرتی‘‘میں تین قطعات اور ایک فارسی غزل شامل ہیں جوپہلی دفعہ شائع ہوئے ان کے علاوہ دیوانِ نصرتی کی ایک فارسی غزل بھی شامل ہے جس کے بارے میں متضاد آراء پائی جاتی ہے کہ آیا یہ غزل نصرتی کی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے حاشیے میں ان شخصیات کا ذکرکیاجن سے یہ غزل منسوب ہے۔ افسر صدیق امروہی ڈاکٹر جالبی کے اس دعوے سے سو فیصد متفق نظرآئے۔ان کے مطابق:’’اس سلسلے میں ظہوری ملک قمی،حیدرذہنی وغیرہ فارسی گویانِ ایران کی بیجا پور میں موجودگی اور والیانِ بیجا پور فیروزی و یوسف وغیرہ کی فارسی شاعری کے علاوہ خودنصرتیؔ کے کلام سے بھی مدد لی جاتی تو دعوے میں زیادہ جان پڑجاتی۔‘‘(۴۹) مذکورہ غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

ہ از پنجہء من چاک گریباں گلہ دارد ازگریہ ء من گوشہ داماں گلہ دارد

اس غزل کو نصرتی سے منسوب کرنے کے لئے نصرتی کی فارسی دانی کو دلیل بنایاجاسکتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب میں نصرتی کے مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نصرتی کو اردو کے عظیم ترین شعراء میں شامل کرتے ہیں لیکن سوال یہ پیداہوتاہے کہ تاریخ ادب میں نصرتیؔ کو وہ مقام میسر کیوں نہ آیا جو ولیؔ کو حاصل ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی وجہ تاریخی واقعات بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> ’’مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی زبان دکنی ادب کی روایت پر غالب آگئی اور تیزی سے سارے براعظیم میں ادبی اظہار کا واحد معیار بن گئی۔ یہ تہذیبی و لسانی تبدیلیوں کی ستم ظریفی ہے جو تاریخ کے موڑ پر اکثر اس طرح اچانک آتی ہیں کہ بڑے بڑے درخت گرجاتے ہیں اور پھر یہ ہوتاہے کہ چھوٹے درخت بڑے نظرآنے لگتے ہیں۔ تاریخ کی اس ستم ظریفی نے نصرتی کو چھوٹا اورولیؔ کو بڑابنادیا‘‘۔(۵۰)

ڈاکٹر جالبی نے ’’دیوانِ نصرتی‘‘ مرتب کرکے دنیائے ادب کو نصرتیؔ کے کلام سے روشناس کروایا۔ ڈاکٹر جالبی کی ترتیب کردہ اس دیوان کو قارئین کی طرف سے خوب سراہا گیا لیکن

اس دیوان کی تدوین میں چند ایسی خامیاں رہ گئی ہیں جن کی طرف سے اگر توجہ دی جاتی تو اس دیوان کی اکملیت میں کوئی شک نہ رہ جاتا۔ ڈاکٹر جالبی نے اس دیوان کی تدوین کے لئے جن بیاضوں کی سے مدد سے اکٹھا کیاہے ان کے کاتبین کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ رشید حسن خان معترض ہیں:

> ''......جب تک وہ کسی بیاض کے متعلق یہ وضاحت نہیں کریں گے کہ اس کا احوال کیاہے اس وقت تک اس حوالے کو کس طرح مانا جاسکتاہے۔ ان کے ایسے سارے حوالے قطعاً غیرمعتبر اور لازماً ناقابل قبول ہوں گے''۔(۵۱)

جبکہ گیان چند جین بیاضوں کو بطور حوالہ استعمال کرنے کے حوالے سے فرماتے ہیں:''اگر مجہول الاسم مخطوطوں اور بیاضون کو حرف غلط قرار دے دیاجائے تو آئندہ کے لئے قدیم اردو ادب میں ایک نظم، ایک شعر، ایک نثری سطر کا اضافہ ممکن نہ رہے گا''۔(۵۲) گویا ڈاکٹرجالبی نے جن بیاضوں کو بطور اوّلین مآخذ استعمال کیا ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھاکیونکہ طباعت کے عام ہونے سے قبل بیاضیں ہی کسی شاعر کے کلام کو محفوظ کرنے کا ذریعہ تھیں۔ اگربیاضوں کوبطور حوالہ استعمال کرنے کے رحجان کی حوصلہ شکنی کی جائے گی تو قدیمی ادبی سرمائے کی دریافت اور حفاظت ناممکن ہوجائے گی۔

ڈاکٹر جالبی نے حتمی المقدور کوشش کی ہے کہ دلائل کے ذریعے متنازعہ حقائق کی تہہ تک پہنچ کرقارئین تک مستند معلومات پہنچائی جائیں اس سلسلے میں داخلی شواہد کی فراہمی ڈاکٹرجالبی کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں اور اس دیوان میں نصرتیؔ کی سوانح اور ادبی کارناموں کے سلسلے میں بھی انہوں نے اسی سے مدد لی ہے۔ افسر صدیق امروہی نے ''دیوان نصرتی'' کے حوالے سے طباعت اور اشاعت کی چند خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

''درجنوں الفاظ کے اجزاء ملے ہوئے ہوناچاہئیں تھے، جداجداہیں اور جدا ہونے چاہئیں تھے وہ ملادئے گئے ہیں، کچھ دوسری غلطیاں بھی ہیں۔ مثلاً

زرد کنک کا بخور،روم کا دیوے حکیم شام کی سردی سوں جب چرخ کوہوتاہے سن

دوسرے مصرعے میں چرخ کی جگہ چراغ چھپا ہے''۔(۵۳)

''دیوان نصرتی'' سے پہلے ''دیوان حسن شوقی'' منظرعام پر آیاتھا۔ ''دیوان حسن شوقی'' کے حوالے سے مرتب نے تدوین کے حوالے سے تما م امور کی وضاحت ایک تفصیلی مقدمے میں کردی تھی جبکہ ''دیوانِ حسن شوقی'' کا مقدمہ اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ اس میں نصرتی کے کلام

کو مدوّن کرتے ہوئے املاء کی تبدیلیاں کی گئیں یا نہیں اس حوالے سے کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ جالبی صاحب نے بعض جگہوں پر الفاظ کو بھی تبدیل کیاہے۔ مثلاکہیں ہائے ہوز (ہ) اور کہیں دو چشمی ہائے (ھ) استعمال ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں مقدمے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ الفاظ کو جوڑ کرلکھنے یاالگ الگ لکھنے کے حوالے سے کسی واضح مؤقف کا اظہار نہیں کیاگیااور متن میں جگہ جگہ الفاظ کی دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ الفاظ کے قدیم املاء اور جدید املاء کے حوالے سے بھی مقدمے میں کوئی وضاحت نہیں۔ متن میں دونوں قسم کے املاء نظرآتے ہیں۔ بہرحال یہ تمام خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ جن سے ''دیوان نصرتی'' کی افادیت اور اہمیت کم ہو سکے۔ ''دیوانِ نصرتی'' ڈاکٹر جالبی کی ان کاوشوں کا عملی اظہار ہے جو وہ اردو ادب کی گم شدہ کڑیوں کی دریافت اور روایت کے تسلسل کی دریافت کے حوالے سے کررہے ہیں۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ:

دکنی ادبیات کی تحقیق و تدوین کے حوالے سے ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' کی تدوین ڈاکٹرجمیل جالبی کا ایک اور کارنامہ ہے۔ ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' کی دریافت کے حوالے سے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''حیدر آباد دکن میں ایک علم دوست بزرگ تھے۔ لطیف الدین ادریسی ؒ، کتابوں کی تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ وہ تلاش اور محنت سے کتابیں خصوصاً قلمی کتابیں حاصل کرتے تھے اور انہیں اہل علم تک پہنچاتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں ایک دکنی مثنوی کا مخطوطہ کہیں سے ملا انہیں یہ معلوم نہ ہوسکاکہ یہ کس کی اور کس زمانے کی تصنیف ہے اور ادریسی صاحب نے یہ مخطوطہ مشہور محقق مولانا نصیرالدین ہاشمی کو دکھایا۔ ہاشمی صاحب نے اسے سرسری طور پر دیکھا اور اس کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون ''بہمنی عہدِ حکومت کا ایک دکنی شاعر'' کے عنوان سے رسالہ ''معارف اعظم گڑھ کے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں چھپوا دیا''۔(۵۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی ''کدم راؤپدم راؤ'' کے تعارف میں اس مثنوی کی ملکیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مثنوی ''کدم راؤپدم راؤ'' کا مخطوطہ جودنیا بھرمیں اس کتاب کا واحد نسخہ ہے عمریافعی صاحب کی ملکیت تھا اور ۱۹۴۹ء میں ان کے ذخیرہ کتب کے ساتھ انجمنِ ترقی اردو آگیاتھا، عمریافعی مرحوم کو نادرو نایاب ادبی، علمی اور تاریخی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ ذخیرہ کتب جوانہوں نے انجمن کو دیاتھا تقریباً ۱۸ ہزاربیش بہا مطبوعات اور مخطوطات پر مشتمل تھا''۔(۵۵)

یوں یہ مخطوطہ لطیف الدین ادریسی سے ہوتاہوا نصیرالدین ہاشمی تک پہنچا اور انہوں نے سب سے پہلے اس مثنوی کا تعارف کروایا۔ مولوی عبدالحق دکنی ادب پر گہری نظررکھتے تھے۔ یہ نسخہ جب ان کے پاس پہنچا تو وہ بھی اس مثنوی کو شائع کروانا چاہتے تھے۔ کثیرالمشاغل ہونے کے باعث وہ خود اس نسخے کی تدوین سے معذور تھے لہٰذا انہوں نے کئی ماہرین دکنیات کو اس مثنوی کی تدوین کی طر ف راغب کرنے کی کوشش کی لیکن انتہائی بد خط ہونے کے باعث کوئی ماہر بھی اس کی تدوین کیلئے تیار نہ ہوا۔ مثنوی کی اہمیت کے پیش نظر بقول ڈاکٹرجالبی ؛

''آخر میں انہوں نے یہ طے کیاکہ اس نادر و نایاب مخطوطے کے ہر صفحے کے بلاک بنواکر اسے اسی طرح شائع کردیا جائے، اس کے کچھ صفحات انہوں نے قومی زبان میں شائع بھی کئے لیکن اس عرصے میں کہ ان کا خواب شرمندہ ء تعبیر ہوتا موت نے نقارہ بجا دیا اور وہ اس حسر ت کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ اب اس بات کو بھی ۱۲ سا ل ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں پہلی بار میں اس مخطوطے سے متعارف ہوا''۔(۵۶)

یوں اردو کی پہلی مثنوی تحقیق و تدوین کی ابتداء ڈاکٹر جمیل جالبی کے حصے میں آئی۔ انہوں نے اس کام کو ۶ برس میں مکمل کیا۔ اس مثنوی کی اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ کتاب کا عنوان ''اردو زبان کی پہلی تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' درج ہے۔ مصنف کے طور پر فخرالدین نظامی کا نام دیا گیاہے جبکہ سرور ق پر سن تاِلیف سے متعلق یہ عبار ت درج ہے؛

(۱۴۶۱ء۸۲۵7241ھ اور ۱۴۳۵ء/ ۸۳۹ھ کے درمیان لکھی گئی)

اصل نسخے کو کاتب نے خط نسخ میں تحریر کیاہے لیکن ڈاکٹرجمیل جالبی نے متن کو خط نستعلیق میں پیش کیاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اصل نسخے کے عکس کو کتاب کے دائیں جانب درج کیاہے جبکہ تدوین شدہ متن بائیں جانب شائع کیاگیاہے۔ کتاب کا انتساب درج ذیل ہے ؛

''بابائے اردو کے نام
حق بحقدار رسید''

''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' کی طبع اوّل میں دیاگیا تعارف جوکہ حرف چند کے نام سے دیاگیاہے جمیل الدین عالی کا تحریر کردہ ہے جبکہ طبع دوّ م نیا ایڈیشن جوکہ نظرثانی شدہ ہے،کاتعار ف ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحریر کردہ ہے۔ تعارف کے بعد تفصیلی مقدمہ دیاگیاہے۔ مقدمے میں مثنوی کی دریافت، زمانہ تصنیف، مثنوی کے نام،مصنف کے حالات،مثنوی کا خلاصہ، مثنوی کے قصے کے

حوالے سے دنیا کے مختلف خطوں میں مروّج قصوں میں مماثلت، مثنوی کے املاء اور کاتب اور مثنوی کے لسانی مطالعے جیسے امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ موجود ہ حالت میں مثنوی کل اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ ہے۔ جبکہ آخری شعر نامکمل ہے۔ مثنوی کے آخر میں فرہنگ دی گئی ہے۔ فرہنگ میں الفاظ کو قدیم اردو میں تحریر کیاگیاہے جبکہ معنی جدید املاء میں دئے گئے ہیں۔ ایک لفظ کے تمام ممکنہ معنی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ فرہنگ اس مثنوی کی تفہیم کے ساتھ ساتھ قدیم اردو کی دیگر کتب کے مطالعے اورتفہیم میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ مثنوی میں دو ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا ضمیمہ بہمنی سلاطین کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس ضمیمے میں ڈاکٹر جالبی نے بہمنی سلطنت کے ۱۸ سلاطین کے ناموں اور عہد کی نشاندہی کی ہے۔ دوسرا ضمیمہ ان شخصیات کے حوالے سے ہے جن کا ذکر اس مثنوی میں آیاہے۔ اس ذیل میں ۱۸ شخصیات کا تعارف پیش کیاگیاہے۔ کتاب کے آخر میں مآخذات کی فہرست فراہم کی گئی ہے۔ جس میں ۲۵ کتب، ۶ر سائل اور ۹ انگریزی کتب شامل ہیں۔

’’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘‘ کی دریافت اور تدوین اردو زبان و ادب میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس مثنوی کو اردو کی سب سے قدیم معلوم مثنوی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ قدیم اردو مخطوطات کوپڑھناایک دقت طلب کام ہے۔ قدیم ادب کی تفہیم کے لئے محض اردو جاننا کافی نہیں ہے بلکہ عربی فارسی اور ہندی زبانوں سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مثنوی کو مرتب کرنا یوں بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس مثنوی کی زبان اردو کی قدیم صورت کی بجائے ایک غیر زبان معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں زیادہ تر فارسی اور عربی الفاظ کا تلفظ و ہ نہیں ہے جس سے اردو دان واقفیت رکھتے ہیں۔ مثنوی کی زبان کے حوالے سے ڈاکٹرجمیل جالبی رقمطراز ہیں:

> ’’اس مثنوی میں بیک وقت کھڑی، پنجابی، راجھستانی، برجی، گجر ی، سندھی،سرائیکی اور مرہٹی کے آثار واضح طور پر نظرآتے ہیں۔ میں نے جب کھڑی، پنجابی، راجھستانی، برجی، سندھی اور گجراتی بولنے والوں کو ایک الگ الگ اس مثنوی کے اشعار پڑھ کر سنائے تو انہیں نے جہاں اور کئی باتیں کہیں، وہاںیہ بات مشترک تھی کہ یہ زبان ان کی اپنی زبان سے قریب ہے اور آج بھی اس کے بہت سے الفاظ ان کے گھروں میں بولے جاتے ہیں۔ اس تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ قدیم زبان جو اس مثنوی میں استعمال ہوتی ہے اس میں صوبوں کے میل جول سے متعدد زبانوں کا خون شامل ہے‘‘۔(۵۷)

گویا اس مثنوی کی زبان میں فارسی، عربی اثرات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی موجودہ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اگرچہ بہت سے قدیم علاقائی الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ متروک ہوچکے ہیں۔ اس تصنیف کے مطالعے اردو زبان کے ابتدائی خدوخال کو اجاگر کرنے میں بہت معاون ہیں۔ مثنوی کے سنِ تصنیف کا حتمی تعین تو نہیں کیاجاسکا البتہ جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق یہ مثنوی ۱۴۳۵ سے ۱۴۶۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ یہ وہ دور ہے جب بہمنی دور حکومت میں علاؤالدین کی فوجیں شمالی ہند سے دکن منتقل ہوئیں اور محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان کا ملاپ جب دکن کی بولیوں سے ہوا تو ایک نئی زبان بننا شروع ہوئی، مثنوی اسی دور کی یادگار ہے۔ لہٰذا اس میں علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ مثنوی کے عنوانات فارسی زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ان عنوانات کو اگر مثنوی سے الگ کرکے پڑھا جائے تب بھی مثنوی کا قصّہ باآسانی ترتیب کے ساتھ سمجھ میں آجاتاہے۔

نصیرالدین ہاشمی سنِ تالیف کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''یہ مثنوی علاؤالدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ خاندانِ بہمنی کے سلسلہ سے واضح ہوتاہے کہ سوائے گیارہویں حکمران علاؤالدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاؤالدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ثالث ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمران رہاہے۔ اس لئے اس مثنوی کی تصنیف بھی اس زمانے میں قرار دینی چاہیے اگرچہ' تاریخِ فرشتہ 'میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھاہے مگر جو سکیّ ۸۶۵ھ ۸۶۷ھ تک مضروب ہوئے ہیں ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے''۔(۵۸)

جبکہ افسر صدیق امروہی نتیجہ نکالتے ہیں:

> ''نظام شاہ صرف دو سال بادشاہ رہا-----اور اس دوسال کی مدت میں دو جنگیں ہوئیں۔بادشاہ اور اس کے حواریوں کو اتنی فرصت کہاں مل گئی ہوگی کہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ نظام شاہ کی خردسالی میں اس کی والدہ مخدومہ ء جہاں اور خواجہ محمود گاواں تمام امورِ سلطنت کے منتظم و مہتمم تھے۔ نظامی اگر اس عہد میں ہوتاتو یہ کس طرح ہوسکتاتھا کہ وہ بادشاہ کا ذکر تو کرتا اور ان شخصیتوں کو

نظرانداز کردیتاجو دراصل مہمات ملکی کی سربراہ تھیں۔ تاریخِ فرشتہ کا آغاز ۹۹۸ھ میں بیجاپور میں ہوا۔ کیا اتنی سی مدت میں بہمنی سلاطین کے سکیّ اس قدر نایاب ہوگئے تھے کہ فرشتہ کو ایک بھی نہ مل سکا۔ جس کے سہارے وہ نظام شاہ کا نام احمدشاہ تحریر کرکے غلط فہمی کی بنیاد چھوڑ جاتا''۔(۵۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیقی امور میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اصل حقائق تک پہنچنے کے لئے اس دور کی تواریخ، سفرناموں،، یاداشتوں، معاصردواوین اور ذاتی بیاضوں سے بھی مدد لی ہے۔ مثنوی 'کدم راؤپد راؤ 'کے سنِ تصنیف کے درست تعین کے لئے بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمام مآخذات کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کیے ہیں۔ افسر صدیق امروہی کے اعتراض کے جواب میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:''مثنوی ناقص الاوسط ہے۔ مخطوطہ کے ص۔۴ کے بعد جس پر مدحیہ اشعار ملتے ہیں، تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اس نامکمل مدح کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا''۔(۶۰) نصیرالدّین ہاشمی صاحب کے اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:''اس دور کے قریب ترین موؤخ فرشتہ کو صرف سکّوں کی بنیاد پرکیوں اور کیسے ردّکیا جا سکتاہے۔'' (۶۱)اس طرح تحقیقی دلائل اور داخلی شواہد سے ڈاکٹرجالبی اس نتیجے پرپہنچتے ہیں کہ احمد شاہ ولی بہمنی کے دور حکومت (۱۴۲۱ء/۸۲۵ھ، ۱۴۳۵ء / ۸۳۹ھ) میں مثنوی لکھی گئی۔ مثنوی میں بیان کئے گئے قصے کے حوالے سے مثنوی کا نام ''کدم راؤ پدم راؤ'' رکھا گیا۔(۶۲) مصنف کے نام کے حوالے سے مختلف محققین نے فخر دین کے بجائے فخرالدین تحریر کیاہے۔ مثلاً نصیرالدین ہاشمی نے پورانام لکھنے کی بجائے صرف تخلص تحریر کیاہے۔ ''نظامی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں استادانہ مہارت رکھتاتھا''۔(۶۳)داخلی شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی مصنف کا نام فخرالدین کی بجائے فخردین تحریر کرتے ہیں۔درج ذیل اشعار کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے نام اور تخلص کا تعین کیاہے۔

ے کہے فخر دین ایک ساچا بچن — پہلے پرکھے جے کرے کوئی سن
ے کہ جے فخردین گیان ہے دیہہ سدھ — پدم مکھ بانچے کدم کون بدھ
ے سنوئے فخردیں توؤ بسر آنکھیا — محمد ؐنبی خاتم انبیاء
ے نظامی کہنہار جس یارہوئے — سننہا ر سن نغز گفتار ہوے

مولوی عبدالحق نے اس مخطوطے کے ابتدائی صفحے پر مصنف کا نام فخر دین کے بجائے فخرالدین تحریر کیاتھا لہٰذا دیگر محققین نے بھی اسی طرح لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جبکہ ڈاکٹر

جمیل جالبی فخرالدین کی بجائے فخردین لکھنے کے حوالے سے فرماتے ہیں:''یہ اندازِ تخاطب آج بھی پنجاب میں رائج ہے اور اکثر قدیم شعراء میں پنجاب اپنے کلام میں خود کو اسی طرح مخاطب کرتے ہیں۔ اسی طرح فخردین قسم کے نام آج بھی پنجابی مسلمانو ں میں عام ہیں''۔(۶۴) ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی جمیل جالبی کے اس مؤقف کی تائید کرتے ہیں:

' 'کدم راؤ پدم راؤ کے شاعر کا نام 'فخردین ' ہے، یہ نام توجہ طلب ہے۔ بہمنی دور کے ایک اور استاد شاعر فیروز کا نام قطب دین ہے۔ یہ دونوں نام ایک ہی وضع کے ہیں۔ دکن یا دلی کی روایت میں اس قسم کے نام نہیں ملتے۔ امام دین، سراج دین، معراج دین قسم کے نام پنجاب کے مسلمانوں کی روایت رہے ہیں''۔(۶۵)

مثنوی کے مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کے املاء کے حوالے سے اہم امور کی نشاندہی کی ہے۔ یہ نسخہ چونکہ ناقص الاوّل اور ناقص الآخر بھی ہے لہذا اس کے کاتب کا تعین نہیں کیاجاسکا۔ اگرچہ مخطوطے کا رسم الخط مسخ شدہ ہے لیکن جالبی صاحب اسے خطِ نسخ قراردیتے ہیں۔ املاء کے حوالے سے کاتب نے کسی معیار کو پیش نظر نہیں رکھا اور ایک ہی حرف کئی طریقوں سے لکھا ہے۔ مختلف حروف کی مختلف آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے کاتب نے ا پنی مخصوص علامتیں استعمال کی ہیں اور ان کی وضاحت نہیں کی۔ اعراب کی کثرت کی وجہ سے نسخہ پڑھنے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتاہے۔ یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں رکھا گیا۔ قدیم مخطوطات میں 'ٹ' کو 'ث' کی شکل میں لکھا جاتاہے۔ اسی طرح 'گ ' کے لئے 'ک' کے نیچے تین نقطے لگادیے جاتے ہیں۔ کاتب نے اس مثنوی میں بھی اسی اصو ل کی پیروی کی ہے لیکن اس اصول کو ہرجگہ یکسانیت کے ساتھ برتا نہیں گیا۔ گویا اس مثنوی کا مخطوطہ تضادات سے بھرپور ہے۔ لسانی مطالعے کے ذیل میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کی زبان کا اس باریک بینی سے جائزہ لیا ہے کہ اس چھ سوسال پرانے مخطوطے کے ذریعے اس وقت کی اردو کی ابتدائی صورتحال اور بنیادی ڈھانچہ ہمارے سامنے لایا ہے۔ اس مثنوی میں کھڑی، پنجابی، راجھستانی، برجی، گجری، سندھی، سرائیکی اور مرہٹی کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ مثنوی کی زبان اور محاورے اور روزمرّہ کے خوبصور ت استعمال سے اس بات کا پتا چلتاہے کہ یہ مثنوی اس زبان کا پہلا نمونہ نہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''کدم راؤ پدم راؤ میں فارسی، عربی کے اثرات لہجہ میں، اسلوب میں، ذخیرہ الفاظ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں صرف سوا سو الفاظ عربی، فارسی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں آئے ہیں''۔(۶۶)

مثنوی میں استعمال کی گئی زبان کابنیادی ڈھانچہ اردو سے قریب ترین ہے۔ مثنوی میں استعمال شدہ فاعل، فعل،مفعول کی ترتیب، مصرعوں کی ساخت، ضمائر اور افعال کا استعمال بھی اردو زبان سے قریب ترین ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ے کدم راؤ کہیا پدم راؤ سن کہ جے ساچ مانے کہوں آپ گن
نہ اگلا سنبھالے کہ پچھلا کہاں نہ پچھلا سنبھالے کہ اگلا کہاں
کہ جے بول میرا سنےِ تس کہوں کہ جے نہ سنے تلِ گھڑی نہ رہوں

روزمرّ ہ اور محاورے کے استعمال کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

ے بھلا دیکھ سنبھل برادیکھہ چھانٹ کہ پھرپھول پھل ہوئے تھی کانٹ کانٹ

ے گیار اج تجہ جب اٹھیابول یہ جو سیوٹ اٹھیا لوگ یہ بول کہہ

ے جہاں سوں ملیں پرکھ کِل کِل نہ ہوئے تہاں ہوئے کِل کلِ جہاں نا ردوے

اردو زبان میں مستعمل کہا وتوں کا بھرپور استعمال بھی مثنوی میں نظرآتاہے۔

ے بڑے ساچ کہہ گئے بول اچوک دَدَھادُودکاچھا چھیاپیوسے پوک

ے جنتر گھال چھمّاس کھینچے جو کوئے نہ سیدھی کدھیں کوتری پُونچ ہوئے

ے سنیاہے کہ کرتار جس دیہہ جَس تسے دوار بند ایک دے کھول دَس

مثنوی کدم راؤپدم راؤ میں ہندی اور اسلامی تلمیحات خوبصورتی سے استعمال کی گئی ہیں۔

ے نہ منجہ دھیرایوب نہ نوح نانو نہ منجہ درب قارون رکھوں کت پانو

ے دھرم بھیم سہد یوں ارجن چگل اکنکی کروں پانچ پانڈو کھکل

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی پر مرہٹی، پنجابی، گجراتی، سرائیکی اور سندھی زبان کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور مثالیں پیش کی ہیں۔ مثنوی میں اسم فاعل جمع بنانے کی مختلف شکلیں، اسم ضمیر کی مختلف اشکال، حروف، فعل، مضارع، فعل امر، فعل نہی، مرکب کی مختلف قسموں، اضافت کے اصولوں، حرف کی مختلف قسموں اور نون غنہ کے استعمال، سابقوں اور لاحقوں کے استعمال کاجائزہ لیا گیاہے اور اردو کے ارتقائی خدوخال کی بھرپور نشاندہی کی گئی ہے اسی لئے

جدید اردو اور قدیم اردوکے گمشدہ سلسلوں کی بازیافت میں مثنوی' کدم راؤ پدم راؤ 'کی دریافت اور تدوین نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

''نظامی دکنی مثنوی کی اشاعت سے اردو ادب کی تاریخ بلاشبہ دو صدیاں پیچھے چلی گئی ہے۔ اس کی مدد سے لسانی تغیرات کی جو روایت ولیؔ تک قائم ہوتی ہے اس سے معراج العاشقین کی حیثیت اور بھی مشکوک ہوگئی ہے۔ دوسری کتاب جس نے اردو کے لسانی سرمائے کو ایک بار پھر لسانی نقطہ نظر سے الٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیاہے وہ فضلی کی کربل کتھا ہے۔ جنوب اور شمال کی ادبی روایتوں کی شناخت اور ان کے عہدبا عہد ارتقاء کا دائرہ،تاریخ ادب کے نقادوں ہی کے لئے نہیں، لسانیات کے ماہرین کے لئے کئی چیلنج رکھتاہے۔ اردوادب کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی نظامی دکنی کی مثنوی اور کربل کتھا دواہم انکشافات شمار ہوتے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر اردو ادب کی روایت کے علاوہ لسانی روایت کی شناخت کے مباحث بھی غوروفکر کی نئی راہیں کھولتے رہیں گے''۔(۶۷)

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں مثنوی کے حوالے سے بعض اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثنوی کے مخطوطے کے سنِ تالیف کے تعین کے سلسلے میں وہ جمیل الدین عالی کے دعوے کہ یہ مثنوی ۶سو برس پرانی ہے کو قبول نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں آج کے زمانے میں جب کہ فنون نے اتنی ترقی کرلی ہے اس مخطوطے کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں لیبارٹری سے مدد لی جاسکتی تھی۔ داخلی شواہد کی بنیاد پر وہ متن کے املاء کو گیارہویں صدی عیسوی کااملاء قراردیتے ہیں۔ ان کے مطابق:

''نسخ کایہ رحجان جو اس نسخے میں ہے چھٹی صدی میں فارسی میں شروع ہوا، ساتویں اور آٹھویں صدی تک بعض حروف کے دوائر کو حاشیے میں دور تک کھینچ کر لے جانے کا طریقہ عام تھا۔ 'ت، ٹھ ا ور گ ' کی مرقومہ صورتیں جو نویں، دسویں اور گیارہویں اور بعض خاص خاص صورتوں میں بارہویں صدی کے اوائل تک آئی ہیں لیکن

> بعض داخلی شہادتیں کاتب کو نویں صدی ہجری سے متعلق کرنے سے مانع ہیں۔ دکنی ادوار میں' ہور' کی جگہ 'اور'کااستعمال گیارہویں صدی میں عام ہے لیکن نویں صدی میں اس کا رواج مشکوک ہے''۔(۶۸)

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون میں مثنوی کے کاتب کے نشانات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مضمون میں انیس اشعار کی نشاندہی کی ہے اور مرتب (ڈاکٹر جمیل جالبی) سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی درستی فرمائی ہے۔ بہرحال ان تمام امور کے باوجود اس حقیقت سے انکارممکن نہیں کہ اس مثنوی کی تدوین و ترتیب میں ڈاکٹر جالبی نے انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام کیاہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو زبان و ادب کا پہلا ادبی نمونہ ہے اس سے قبل جوتحریریں دریافت ہوئیں وہ مذہبی نوعیت کی تھیں اور اردو زبان و ادب کی تاریخ اور لسانی ارتقاء کے حوالے سے کد م راؤ پدم راؤ کی اہمیت مسلّم ہے۔ مشفق خواجہ جالبی صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں.:

> ''جالبی صاحب نے یہ مثنوی مرتب کرکے بلاشبہ ایک عہد آفریں تحقیقی کارنامہ انجام دیاہے اس قسم کے تحقیقی کاموں کے لئے جس تنقیدی شعور، صحیح ذوق، محنت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ جالبی صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے''۔(۶۹)

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو بلاشبہ اردو ادب کی گمشدہ کڑیوں کی تلاش کے سلسلے کی بنیادی کڑی قراردیاجاسکتاہے اور اس کوشش کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کانام اردو ادب کے محققین کی فہرست میں سب سے اوپر موجود ہے۔

قدیم دکّنی ادب کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدید شعراء کے کلام کی تدین بھی سرانجام دی ہے۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

کلیاتِ میرا جی:

میراجی(۱۹۱۲ ء سے ۱۹۴۹ء) اردو شاعری کی اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری کو عدم ابلاغ اور اردو کی کلاسیکی ادبی روایت سے جداہونے کے باعث ان کی زندگی میں پذیرائی نہ مل سکی۔ میراجی کی شاعری پر معیار ی تنقید کا بھی فقدان رہا۔ بہت کم ایسے محققین اور ناقدین تھے جنہوں نے میراجی کی شاعری اور شخصیت کو موضو ع بنایا۔ ان چند محققین، ناقدین میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بھی آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے''میراجی کو سمجھنے کے لئے''کے عنوان

سے مضمون تحریر کیا جو ستمبر ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ جالبی صاحب نے اس مضمون میں سب سے پہلے میراجی کی شاعری کے پس پردہ نفسیاتی عوامل کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد بھی میرا جی کے حوالے سے مختلف تنقیدی مضامین قارئین کے سامنے آتے رہے۔

'کلیات میراجی ' ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان کاوشوں کی ایک کڑی ہے جو انہوں نے میراجی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو محفوظ بنانے کے لئے کیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مرّتب کردہ ''کلیاتِ میراجی'' لندن اردو مرکز سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا طبع دوم ۱۹۹۶ء میں سنگِ میل پبلیکیشنز نے ترمیم واضافے کے ساتھ شائع کیا۔ طبع اوّل کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۰ جبکہ طبع دوم کی تعدا د ۱۲۷۲ ہے۔ ''کلیات میراجی'' کا مقدمہ' کلیات میراجی کے بارے میں 'کے عنوان سے پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں جمیل جالبی نے کلیات میراجی کی تدوین کے حوالے سے مختلف امور کی وضاحت کی ہے۔ اس کے علاوہ میراجی شخصیت شاعری اور جدید شاعری پر میراجی کے اثرات کا جائزہ بھی لیاگیاہے۔

مشمولاتِ کلیات میراجی کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> ''کلیات میراجی کی اشاعت سے پہلے میراجی کے پانچ سفری مجموعے شائع ہوچکے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں ؛۱۔ میراجی کی نظمیں۔(۱۹۴۴ء)،میرا کے گیت۔(۱۹۴۳ء)، گیت ہی گیت (۱۹۴۴ء)،تین رنگ(۱۹۶۸ء)۵۔ پابند نظمیں۔(۱۹۲۸ء)۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ نظمیں 'نیا دور' کراچی اور' سیپ' کراچی میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ عام رائے یہ تھی کہ ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام اخترالایمان کے پاس محفوظ ہے۔ اخترالایمان بھی اسے ایک مجموعے کی صورت میں مرّتب کرنا چاہتے تھے لیکن بوجوہ وہ ایسانہ کرسکے۔ جمیل جالبی نے' کلیات میراجی' میں نہ صرف ان کے مطبوعہ کلام کو شامل کیا بلکہ اخترالایمان اور میراجی کے دوسرے دوستوں سے بھی کچھ دستیاب ہوسکا اسے ایک جگہ جمع کردیا''۔(۷۰)

جمیل جالبی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر میں برادرم محترم اخترالایمان صاحب کا انتہائی شکرگزارہوں جنہوں نے کلام میراجی اور ان کی بیاضوں کی قلمی نقلیں فراہم کیں۔ سب سے زیادہ کلام انہیں سے ملا اگر وہ یہ کلام فراہم نہ کرتے تو یہ

کلیات منہ بسورتی رہ جاتی۔ میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تہہ دل سے
شکرگزارہوں جنہوں نے ''حلقہ پشم سیہ'' کی عکسی نقل بغیرکسی
تامل کے مجھے ۱۹۷۲ء ہی میں فراہم کردی تھی''(۷۱)

ڈاکٹر جالبی کلیات میرا جی میں اخترالایمان کی بیاضوں کا حوالہ دیاہے جبکہ وحید قریشی کی بیاض کا حوالہ موجود نہیں۔اس طرح کلیات میراجی میں بیاض ضیاء جالندھری کا حوالہ موجودہے لیکن مقدمے میں اس کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ اس حوالے سے محترمہ رضوانہ نسیم اپنے مقالے میں ڈاکٹر جالبی سے انٹرویو کے حوالے سے یہ قول درج کرتی ہیں:''بیاض ضیاء جالندھری کی میرے پاس نقل موجود ہے۔ وہاں سے اس کتاب کو کلیات میراجی میں شامل کیاگیا ہے۔ حوالہ مقدمے میں چھوٹ گیا ہے''۔(۷۲)

مقدمے کے بعد ''کوائف میراجی'' کے عنوان سے دوصفحات پر مشتمل سوانحی خاکہ موجود ہے جس سے پتہ چلتاہے کہ میراجی ساحری، بسنت سہائے، لندھور،بشر چند اور بندے حسن بھی تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ''کلیات میراجی'' کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کے طریقۂ تدوین کا جائزہ لیاجائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

*تمام نظموں کے سامنے ان کے سنین درج کئے ہیں اور حاشیے میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ نظم کس مجموعے میں شامل ہے۔

*جوکلام کسی رسالے سے لیاگیاہے اس کی نشاندہی بھی کردی مثلاً

ترقی پسند ادب۔ ۱۹۹۴ء میراجی کی نظمیں ص۔۸۰۔۸۱

طبارہ (اشرف کے نام) ادبی دنیا، لاہور ص۔ ۱۸۵۔۱۸۶

دیو مالا سے سائنس تک ادبِ لطیف، لاہور، ص۔ ۲۱۸۔۲۲۰

اس طریقہ سے درج کرنے سے بخوبی اندازہ ہوجاتاہے کہ کون سی نظمیں ان کے نظموں کے مجموعوں میں شامل ہیں اور کون سی محض ادبی رسائل کی زینت بنیں۔

*کلیات زمانی ترتیب سے مرتب کیاگیاہے تمام اصناف جو مجموعوں میں شائع ہوئیں ان کے بعد زمانی ترتیب کے مطابق رسائل میں شائع ہونے والے کلام کو درج کیاگیاہے۔

*کلیات کو شاعری کی مختلف اصناف کے مطابق ترتیب دیاہے۔ حصہ نظم میں ۲۵۷ نظمیں شامل ہیں۔ ان کی ترتیب و تقسیم اس طرح ہے؛

۱۔ ۵۸ نظمیں از میراجی کی نظمیں

۲۔ ۴۵ نظمیں از تین رنگ

۳۔ ۲۷ نظمیں از ہمایوں، لاہور

۴۔ ۳ نظمیں از ادبی دنیا، لاہور

۵۔ ۱۲ نظمیں از ساقی، دہلی

۶۔ ۵ نظمیں از ادب لطیف، لاہور

۷۔ ۱ نظم از آجکل، دہلی

۸۔ ۱ نظم از خیال، بمبئی

۹۔ ۴ نظمیں از نیا دور، لکھنؤ

۱۰۔ ۳۰ نظمیں از سیپ،کراچی

۱۱۔ ۱۰ نظمیں از ہمارا ادب، لکھنؤ

۱۲۔ ۱ نظم از سوغات، بنگلور

۱۳۔ ۲ نظمیں، اظہار،بمبئی

۱۴۔ ۲ نظمیں از ایشیاء، بمبئی

۱۵۔ ۱ نظم از، اس نظم میں

۱۶۔ ۱ نظم از، شعر وحکمت

۱۷۔ ۹ نظمیں از بیاضِ ضیاء جالندھری

۱۸۔ ۳۴ نظمیں از بیاضِ میرا جی

۱۹۔ ایک نظم، افکار نمبر

ایک سہ آتشہ ’’متفرقات‘‘ کے عنوان سے ’ اے دوست کبھی لاہور نہ آنا ‘، دیپالکا، اے دل، سہرا، تہنیت عید، ایک نظم، مبارکبادیاں،اور ایک ’ادھورا گیت‘، کلیات میں شامل ہیں۔ یہ کلام’ شعر وحکمت‘ سے لیاگیا ہے جبکہ نظم’ رقیب‘ (ص ۴۸۶) کے بارے میں کوئی وضاحت در ج نہیں ہے کہ اس نظم کا مآخذ کیاہے۔

حصہ دوئم ؛’’ہزلیات‘‘ کے عنوان سے ہے جس میں ۵ ہزلیات شامل ہیں۔ ان کا ماخذ ’’شعروحکمت‘‘ ہے۔ حصہ سوئم میں ۱۳۸ گیت شامل ہیں۔ ان میں ’’میراجی کے گیت‘‘ سے ۵۰ گیت شامل ہیں باقی ۶۰ گیت ’’گیت ہی گیت‘‘، ۱۲، تین گیت، ۱۰ نیا دور، کراچی ۱۔ساغر، بمبئی، ۳ شعروحکمت اور ۲ سہ آتشہ سے لئے گئے ہیں۔حصہ چہارم ۱۹ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۹ غزلوں کا مآخذ، ’’تین رنگ‘‘ ۵ کا نیادور کراچی، ایک کا سیپ، کراچی، ایک کاخیال بمبئی، ۲، کاشعر وحکمت اور ایک کا راوی لاہور ہے۔ پانچویں حصے میں میراجی کے تراجم شامل کئے گئے ہیں۔

میراجی نے جن ملکوں کے شعراء کے کلام کے تراجم کئے ہیں ان میں سنسکرت زبان کے علاوہ، چینی، جاپانی، کوریا، یونانی، روم، فرانسیسی، روس، جرمنی، امریکہ اور براطانیہ شامل ہیں۔ حصہ تراجم میں ’’دیس دیس کے گیت‘‘ کے عنوان سے مختلف مملک کے شعراء کے کلام کے منظوم تراجم شامل ہیں۔

’’کلیات میرا جی‘‘ کی تدوین میرا جی کے حوا لے سے ہونے والی تحقیق کے سلسلے میں محققین کی رہنما کتاب ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلیات میرا جی کی تدوین میں تدوین متن کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھر پور کو شش کی ہے۔ میراجی کا کلام جو کہ مطبو عہ اور غیر مطبو عہ صورت میں بکھرا ہوا تھا اسے کلیات کی صورت میں جمع کر کے نہ صرف ان کے کلام کو محفوظ کیا بلکہ ان کے کلام پر تنقیدی مقدمہ لکھ کر ان عوامل کو سمجھنے کی سعی بھی کی ہے جن کے باعث ان کی شاعری پر ابہام کا الزام لگتا رہا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحریر کردہ مقدمہ میرا جی کے ادبی مقام کے تعین کے حوالے سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

بقول ڈ اکٹر رشید امجد:

> ’’کلیات میرا جی کی اشاعت کے بعد اب میرا جی پر کئی پہلو ؤ ں سے کام ہونے کی گنجا ئش پیدا ہو گئی ہے۔ ڈ اکٹر جمیل جالبی کی اس عطا نے نہ صرف میرا جی کے نئے گوشوں کو وا کیا ہے بلکہ اردو شاعری خصوصاََ اردو نظموں کو بھی ایک نئے منطقے سے آشنا کر کے اس کے خزانے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے‘‘۔ (۷۳)

’’کلیات میراجی‘‘ میں چند تسامحات کی نشاندہی کرتے ہوئے رضوانہ نسیم اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

> ’’کلیات میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوتاہے۔ وہ یہ ہے کہ ڈاکٹرجمیل جالبی نے ان رسائل و جرائد کی مکمل نشاندہی نہیں کی جس میں میراجی کاکلام چھپتا رہا یعنی حوالہ نا مکمل ہے۔ اگر نام کے علاوہ حواشی میں سنہ اشاعت اور صفحہ نمبربھی دے دیتے تو محققین کو ان رسائل کی مکمل فائل کھنگالنے کی ضرورت نہ پڑتی‘‘۔(۷۴)

ان معمولی اعتراضات کے باوجود، ’’کلیاتِ میرا جی‘‘ کی تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تدوینی خدمت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا،بالخصوص اس تناظر میں جبکہ میرا جی کا تمام

کلام دستیاب اور محفوظ نہیں تھا،’’کلیاتِ میرا جی‘‘کی تدوین،میرا شناسی کی روایت میں عمدہ اضافہ ہے۔

ن۔ م۔ راشد ایک مطالعہ:

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ ’’ن۔م۔ راشد۔ ایک مطالعہ‘‘ ۱۹۸۶ء میں مکتبہ اسلوب، کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۳۷۶ صفحات اور پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اس کتاب میں ن۔م۔ راشد کے سوانحی کوائف مہیاکرنے کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں ’’ن۔م۔ راشدکے فکروفن کے حوالے سے شائع شدہ مضامین کو یکجا کردیاہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جو اس سے پہلے کی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر جالبی کی یہ کاوش،ن۔م۔ راشدکے کلام کو سمجھنے کے لئے محققین اور ناقدین کے لئے ایک تحفہ ہے۔ بقول جالبی:’’میراخیال ہے کہ وہ لوگ جو راشد پر کام کریں گے یا جوراشد کی شخصیت اور اس کے فکرو فن کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے کتاب یقیناً مفید ثابت ہوگی‘‘۔(۷۵)

’’ن۔م۔ راشد۔ ایک مطالعہ‘‘ کے پہلے حصے میں ن۔م۔ راشدکی شخصیت کے حوالے سے ساقی فاروقی (حسن کوزہ گر)، آغا عبدالمجید (راشد ؛ چندیادیں) اورغلام عباس کے مضامین شامل ہیں۔ ن۔م۔ راشدکے ’’مطالعہء فن‘‘ کے حوالے سے درج ذیل مصنفین کے مضامین شامل ہیں۔

۱۔ راشد کا ذہنی ارتقاء ازڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

۲۔ ن۔م۔ راشد۔ابتدائی دورِ شاعری از فیض احمد فیض

۳۔ شاعروں کا شاعر از آفتاب احمد

۴۔ ن۔م۔ راشد؛ نئی نظم اور پوراآدمی از سلیم احمد

۵۔ ن۔م۔ راشد از عزیز احمد

۶۔ن۔م راشدکی شاعری از وارث علوی

۷۔ ن۔م۔ راشداز ڈاکٹر وزیر آغا

۸۔ راشد کی شاعری کا کریکٹر از ممتاز حسین

۹۔ ن۔م۔ راشد، انسان اور خدا از عالم خوند میری

۱۰۔ راشد کی تین نظمیں؛ تجزیاتی مطالعہ ازمیراجی

۱۱۔ راشد کی ایک نظم، ایک تجزیہ از محمد حسن عسکری

۱۲۔ ن۔م۔ راشد از علی جواد زیدی

۱۳۔ راشد کی چند نظموں کی ابتدائی صورتیں از جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل نے کتاب کے دوسرے حصے میں ن۔ م۔ راشد کے ۵۸ غیر مطبوعہ خطوط کو کتاب کاحصہ بنایاہے۔ یہ خطوط ۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۵ء کے عرصے کے درمیان لکھے گئے ان خطوط کے مکتوب علیہ آغا عبدالحمید، ضیاء جالندھری، ڈاکٹر سید عبداللہ، امین حزیں اور خود ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ اس کتاب میں ن۔ م۔ راشد کے تین تنقیدی مضامین، 'جدید شعری روّیے '، 'ہیئت کی تلاش' اور ' نظم و غزل' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ن۔ م۔ راشد کی ۱۰ غیر مطبوعہ نظمیں بھی اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں لیکن ڈاکٹر جالبی نے ان نظموں کے حوالے سے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ نظمیں انہیں کہاں سے دستیاب ہوئی لیکن خطوط کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ:''یہ سب خطوط انہی شخصیات سے لیے گئے ہیں۔انہوں نے اصل خطوط کی فوٹو کاپی مجھے فراہم کی تھیں۔ آغا عبدالمجید نے تو ۱۰۰ خطوط کی فوٹو کاپی دی تھی لیکن میں نے ان خطوط میں سے ۱۴ خطوط کا انتخاب کرکے کتاب میں شامل کئے ہیں''۔(۷۶)

میراجی۔ ایک مطالعہ:

میراجی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی ایک اور مرتبہ کتاب ''میراجی۔ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ۱۹۹۰ء میں سنگ میل پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مختلف رسائل و جرائد میں میراجی کے حوالے سے چھپنے والے مضامین کو یکجا کیاگیاہے۔ ان رسائل و جرائد میں، نقوش، نئی تحریریں، فنون، سویرا، نفسیاتی جائزے، اوراق، نیادور، صحیفہ، ماہ نور وغیرہ شامل ہیں۔

ابتدا ء میں''اس کتاب کے بارے میں'' کے عنوان کے تحت کتاب میں شامل میراجی کے حوالے سے مضامین اور میراجی کی تحریروں کا تعارف پیش کیا گیاہے۔ ''کوائف میراجی'' بیان کرنے کے بعد ''میراجی۔ایک مطالعہ'' کے عنوان کے تحت میراجی کی سوانح اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ مضامین میں میراجی کی شخصیت کے حوالے سے ۹ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

۱۔ میراجی از شاہد احمد دہلوی ۲۔ تین گولے از سعادت حسن منٹو

۳۔ میراجی از محمد حسن عسکری ۴۔ میراجی کا اخلاق از اخلاق احمد دہلوی

۵۔ میراجی از محمود نظامی ۶۔ میراجی ایک تصویر از الطاف گوہر

۷۔ اکیلا از احمد بشیر ۸۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے از سحاب قز لباش

۹۔ میراجی کے آخری لمحے از اخترالایمان

میراجی کی گیت نگاری کے حوالے سے درج ذیل مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

۱۔ میراجی کے گیت از مظفرعلی سید ۲۔ میراجی کے گیت از سجاد باقر رضوی

۳۔ میراجی کا سرگیان از شاد امرتسری

میراجی کی نثرا رو تنقید کے حوالے سے درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ میرا جی کا فن از فیض احمد فیض

۲۔ از میراجی کی نثر از صلاح الدین احمد

۳۔ میراجی کی تنقید از سید وقار عظیم

حصہ اول کے اختتام پر ’’متفرق مطالعے‘‘ کی ذیل میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ تراجم میراجی، رباعیات، عمرخیام از قیوم نظر

۲۔ میراجی کے چند خطوط ازالطاف گوہر

۳۔ میراجی کی کچھ قلمی یادگاریں از مختارصدیقی

’’میراجی۔ایک مطالعہ‘‘کے دوسرے حصے میں میراجی کی ان تحریروں کو شامل کیاگیاہے جومختلف رسائل میں شائع ہوئیں لیکن کسی مجموعے میں دستیاب نہیں ہیں۔ ان رسائل میں دہلی سے شائع ہونے والا ’ساقی ‘اور بمبئی سے شائع ہونے والا’ خیال‘ شامل ہیں۔ ان تحریروں میں اداریے، ابتدائیے، خطوط اور مضامین شامل ہیں۔ میراجی کے خطوط بنام عبدالطیف (۴ خطوط)، قیوم نذر (۱۹خطوط)، میراسین (۲ خطوط) اور وشوننددن (۱ خط) بھی شامل ہیں۔کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صدیق جاوید کی مرتب کردہ ’میراجی منتخب کتابیات‘ شامل ہیں۔

حصہ اوّل میں ’مطالعہ میراجی‘ کے عنوان کے تحت سب سے پہلے ڈاکٹرجمیل جالبی ہی کا تحریر کردہ مضمون ’’میراجی۔ایک مطالعہ‘‘ ایک مطالعہ شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر جالبی نے میراجی کی شخصیت اور فن کو ان کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اس مضمون میں انہوں نے ۱۹۴۰ء کے بعد کے اہم شعراء فیض، راشد اور میراجی کا مختصرتقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔

میراجی کی شخصیت کے حوالے سے ان کے ناقدین نے ان کی شخصیت کی جس قسم کی نقشہ کشی کی ڈاکٹر جالبی اسے میراجی کی شخصیت کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش قراردیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی ذات پر توجہ دینے کی بجائے ’’میراجی کی تخلیق سے میرا جی کی طرف سفرکیاجاتااور پھر اسی کے ساتھ فوراً سفرِواپسی یعنی میراجی سے پھر تخلیق کی طرف، یہاں عمل الٹا ہوا‘‘۔(۷۷)

ڈاکٹر جالبی، میراجی کی شخصیت اور تخلیقی اپچ کے درمیان تفاوت کو بود لیئر کے اثرات کا نتیجہ قراردیتے ہیں۔ اس حوالے سے بودلیئر اور میراجی کی زندگی اور شخصیت کے حوالے سے

واقعات بھی بیان کئے ہیں بود لیئر اور میراجی کے درمیان تقابل کے بعد ڈاکٹر جالبی اس نتیجہ اخذ کرتے ہیں :

’’میراجی کے تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انہوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعراء کی وہ سب حرکات و سکنات جو انہیں اچھی لگیں اختیار کرلیں اور اپنی زندگی کے روپ کو بہروپ بنالیا۔ اس طرح انہوں نے متضاد عناصر کو اپنی ذات میں جمع کیا اور اس جمع آوری سے اپنے خارجی وجود کو آباد کرلیا۔ بود لیئر، ایڈگرایلین پو، ہائنے، لارنس، میلارمے اور چنڈی داس وغیرہ سے ثناء اللہ ثانی ڈار نے میراجی کو تخلیق کیا اور پھر ساری عمر اپنے تخلیق کئے ہوئے میراجی کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے جیسی کہ انہوں نے کی‘‘۔(۷۸)

ڈاکٹر جالبی نے، میراجی اور ان کے عہد کے حوالے سے ان کی شاعری کے تنا ظر کا تجزیہ کرتے ہوئے میراجی کی شاعری میں ابہام، نفسیاتی حقائق، داخلیت، تصورِ عشق، تصورِ جنس اور ان کی شاعری کے فنی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔ فیض راشد اورمیراجی کی شاعری کا تقابل کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں ؛’’راشد و فیض اظہار وبیاں میں اردو فارسی روایت سے استفادہ کرکے اپنا رشتہ اس سے قائم رکھتے ہیں لیکن میراجی اس روایت سے بغاوت کرکے رد عمل کے طور پر ہندی شاعری کی روایت سے ناتا جوڑ لیتے ہیں‘‘۔(۷۹)

ڈاکٹر جالبی کا یہ مضمون، میراجی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کی اوّلین کاوشوں میں شامل ہےمطالعہ شاعری کے ضمن میں چھ مضامین کو کتاب کا حصہ بنا یا گیا ہے سب سے پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون ’’میر ا جی کو سمجھنے کے لیے‘‘ شامل ہیں۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ ڈ اکٹر جالبی نے میر ا جی کی دیگر شعراء پر تنقید ی آراء کے حوالے سے ہی میر اجی کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کی کاوش کی ہے مثلاًان کی کتاب ’’مشرق و مغرب کے نغمے‘‘میں میرا جی نے ہائنے (جرمن شاعر) ،ایڈگرایلین پو، چنڈی داس، لارنس اور دیگر شعراء کے حوالے سے جن تنقیدی آراء کا اظہار کیاگیا ہے ڈاکٹر جالبی نے میرا جی کی شخصیت اور فن پر انہی اثرات کی عمدگی سے نشاندہی کی ہےگویا وہ میرا جی کو میرا جی ہی کے نظریات کی روشنی سمجھنے کی کاوش کرتے ہیں۔اس مضمون میں میرا جی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جن امور کی طرف بالخصوص توجہ دلائی گئی ہے ان میں چیزوں سے زیادہ چیزوں کے تصور سے پیار،شاعری کی خواب آگیں فضا، احساس تنہائی کی شدت، جسم اور روح کی یکجائی، جسم اور جنس کا اظہار، ماضی پرستی، شاعری میں خیال اور اظہار دونوں سطحوں پر آفاقی مزاج، تخلیقی انفرایت، میراجی کی علامتیں، میراجی کی شاعری میں ابہام، ابہام کی وجہ اور مختلف صورتیں بالخصوص اہم ہیں۔ میراجی

کی شاعری کا ارتقائی مطالعہ اور میراجی کا فکری ارتقاء جامعیت کے ساتھ پیش کیاگیاہے۔ میراجی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے رائے دی ہے کہ:''حقیقت کو خواب بنانے کا عمل، نامعلوم ذہنی کیفیات کو لفظوں کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش، جدید اردو شاعری میں میراجی واحد شاعر ہیں جن کے ہاں، خالص شاعری کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں''۔(۸۰)

''میراجی۔ایک مطالعہ'' میراجی کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے سلسلے کی نہایت اہم کڑی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جالبی نے میراجی کی شخصیت اور فن پر مختلف نقطہء نظر رکھنے والے نقّادوں کی تحریروں کو جمع کیاہے، جس سے میراجی کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشے غیرجانبدارانہ انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر جالبی کے اس طریقہ ئکارکو سراہتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''میراجی کی شخصیت و فن، مطالعہ ء شاعری، گیت، نثرو تنقید اور متفرق مطالعے کے عنوانات کے تحت تیس مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بعض عرصہ سے نایاب تھے۔ جالبی صاحب نے انہیں تلاش کرکرے یکجاکردیاہے جس سے میراجی کو اس کے پورے سماجی و سیاسی تناظر اور شخصیت کے اتار چڑھاؤ کے حوالے سے سمجھا جاسکتاہے۔ ان میں سے کئی مضامین مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میراجی کی شاعری کے بارے میں فتح محمد ملک اور جمیلہ شاہین کا نقطہ نظر اعجاز احمد، سلیم احمد اور مظفرعلی سید کے نتائج سے خاصا مختلف ہے اسی طرح شخصیت کا جو تاثر الطاف گوہر، حسن عسکری اور قیوم نظر کے ہاں ملتاہے وہ شاہد احمد دہلوی، احمد بشیر اور اخلاق احمد دہلوی کے مطالعوں میں موجود نہیں۔ اسی تنوع کے درمیان ہی کہیں سچائی موجودہے''۔(۸۱)

ڈاکٹر جالبی نے میراجی کی نثر کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایاہے جس سے میرا جی کی نثر کے مختلف رنگوں کی تنقیدی بصیرت اور ترجمہ نگاری کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے میر اجی کے خطوط سے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں سے واقفیت ملتی ہے اور میرا جی کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور کتب کی فہرست مطالعہ میر ا جی کے سلسلے میں ناقدین اور محققین کے لیے ایک مفید عنصر ہے مجموعی طور پر میرا جی کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کی دونوں کتب ''کلیات

میرا جی‘‘اور ’’میرا جی-ایک مطالعہ‘‘اردو زبان وادب میں تدوین کی روایت میں ایک عمدہ اضافہ ہیں-

ڈاکٹر جالبی نے تدوین میں تحقیق وتنقید کے خوبصورت امتزاج سے نہ صرف اردو زبان وادب کے قدیم علمی سرمائے کو تحفظ فراہم کیا بلکہ جدید ادب کے حوالے سے بھی ان کی تدوینی خدمات اردو زبان وادب سے ان کی محبت اور لگن کاثبوت ہیں- ڈاکٹر جمیل جالبی کی قدیم ادب کے حوالے سے تدوینی خدمات سر انجام دینے سے بہت پہلے اردو ادب میں قدیم متون کی دریافت اور تدوین کی باقاعدہ کامیاب مثالیں موجود ہیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کی تدوینی خدمات درست معلومات کی فراہمی اور ترتیب متن کے اصولوں کی عمدہ کے پیروی کے باعث منفرد اہمیت کی حامل ہیں-اردو کے قدیم ادبی سرمائے کو محفوظ بنانے کے لئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی خدمات لائق تحسین ہیں لیکن ان کے تحقیقی تدوینی متون پر سنین کی صحت کے حوالے سے اعتراضات کئے جاتے رہے-اس کے علاوہ قدیم متون میں اپنی مرضی سے حذف و اضافے اور املاء کے حوالے سے کسی ایک قاعدے کی پیروی نہ کرنے کے حوالے سے بھی اعتراضات کئے جاتے رہے لیکن ڈاکٹر جالبی یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے دستیاب حقائق کو جانچ پرکھ کے بعد قبول کیا اور مدوّن کر دہ کتب کی وقعت میں اضافہ کیا- تدوینِ متن کے سلسلے میں ڈاکٹر جالبی نے صرف متن کی درستگی کو مرکزی اہمیت دی بلکہ مصنف کے سوانحی حالات اوردستیاب متن کے حوالے سے بھرپور تحقیقی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے مستند معلومات پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی اور اس کے کلام کے لسانی مطالعے کو بھی متن کی تفیہم میں استعمال کیا- ڈاکٹر جالبی نے تدوینِ متن میں نہ صرف تمام اصولوں اور مراحل کو مد نظر رکھا اور مولوی عبدالحق کے کام کو مزید بہتر انداز میں آگے بڑھایااور اپنے شگفتہ اور رواں اسلوب سے اپنے تنقیدی اور تحقیقی نتائج کو مزید دلچسپ بنا دیا تا کہ علم وادب کے مخصوص قارئین کے علاوہ عام قاری بھی ان کی علمی تحقیقات اور نتائج سے استفادہ کر سکے-

حواشی و حوالہ جات باب سوّم

(1) فرہنگ فارسی، تالیف:ڈاکتر محمد معین-

(2) فرہنگ عامرہ(عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی لغت)،محمد عبداللہ خان خویشگی-

(3) (اردو لغت، اردو ڈکشنری بورڈ کراچی، جلد پنجم

(4) گیان چند جین،ڈاکٹر ’، تحقیق کا فن ‘، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۲ء،ص ۳۹۸

(5) ایضاً، ص ۳۹۸

(6) نورالاسلام،ڈاکٹر، 'ریسرچ کیسے کریں'، شاد پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء،ص۲۱۰

(7) تنویر احمد علوی،ڈاکٹر،اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن،سنگت پبلشرز۔لاہور ۲۰۰۳ء

(8) تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ''حیدرآباد دکن میں اردو تحقیق کی روایت''،مقالہ نگار،طارق محمود،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی،ملتان،۲۰۰۷ء

(9) محمد علی اثر،ڈاکٹر،' ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق '، مشمولہ،' ارمغان '، شمارہ نمبر۳(اپریل، مئی جون ۹۶ء) کراچی، ص۱۰۶

(10) ایضاً ص۱۰۷

(11) عبدالحق،مولوی،'قدیم اردو'،انجمنِ ترقئ اردو،۱۹۴۱ء

(12) رسالہ' اردو'،کراچی،اپریل ۱۹۵۴ء،ص۱۴۔مشمولہ دیوانِ حسن شوقی،انجمنِ ترقی ء اردوپاکستان،۱۹۷۱ء،ص۱۔

(13) ' قدیم اردو'جلد اوّل،مرّتبہ،مسعود حسین خان،دکن،ص۵۱۲۔۵۲۰،مشمولہ دیوانِ حسن شوقی،ایضاً

(14) ' دیوان حسن شوقی'، مرتبہ، جمیل جالبی، ایضاً،کراچی۔ ص۱

(15) وحید قریشی،ڈاکٹر، 'دیوان حسن شوقی '، مشمولہ،' ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ایک مطالعہ'، ایضاً، ص۲۶۳

(16) مولوی عبدالحق مرحوم۱۹۲۹ء میں شائع کردہ نسخہء اوّل کو مکمل سمجھتے ہیں۔دوسرے نسخے کو ناقص تصوّر کرتے ہیں کیوں کہ ناقص نسخے کے آخر میں اشعار زائد ہیں۔ان میں فتح نامہ کا سن بھی دیا ہے۔تفصیل کے لئے دیکھئے 'قدیم اردو'از مولوی عبدالحق انجمن ترقئ اردو،کراچی۱۹۶۱ء،ص۷۵،۷۴

(17) 'دیوان حسن شوقی '، مرتبہ ؛ جمیل جالبی ایضاً، ص۷

(18) عبدالحق،مولوی،،' قدیم اردو '،ایضاً، ص۷۴

(19) ' دیوان حسن شوقی '، مرتبہ ؛ جمیل جالبی، ایضاً، ص۴

(20) ایضاً، ص۱۲

(21) محمد قاسم فرشتہ، 'تاریخ فرشتہ'، جلد سوم، چہارم، ص۲۲۱

(22) ' دیوان حسن شوقی '، مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،ایضاً، ص۵

(23) تفصیل کے لئے دیکھئے، ’قدیم اردو‘از مولوی عبدالحق،ص۸۶،اردو شہ پارے ۱۹۲۹ء،ص۱۰۲،’’دکن میں اردو‘‘،ص۵۹،کراچی۱۹۶۰ء ور’ قدیم اردو‘ مرتبہ مسعود حسین خان،جلد اوّل

(24) ’ دیوانِ حسن شوقی ‘ مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،ایضاً، ص۲۴

(25) عبدالعزیز،ڈاکٹر، ’ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن ‘، اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء، ص ۷۹

(26) وحید قریشی،ڈاکٹر، ’دیوان حسن شوقی‘، مشمولہ، ’ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ‘،ایضاً، ص۲۲۵

(27) ’ دیوان حسن شوقی ‘، مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاً، ص۶۱

(28) گیان چند جین،ڈاکٹر،’ تحقیق کا فن‘، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۴۳۴

(29) عبدالرزاق قریشی،’مبادیات تحقیق‘، انجمن اسلام اردو۔ ریسرچ، انسٹی ٹیوٹ، بمبئی، ۱۹۴۸ء ص۹۲

(30) تنویر علوی،ڈاکٹر، ’ اصول تحقیق و ترتیب متن ‘، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۷ء ص۲۸۳

(31) گیان چند جین،ڈاکٹر،’ تحقیق کا فن‘، ایضاً، ص ۴۳۵

(32) ایضاً، ص ۴۳۶

(33) وحید قریشی،ڈاکٹر، ’دیوان حسن شوقی‘، مشمولہ، ’ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ‘، ایضاً ص۲۹۲

(34) وحید قریشی،ڈاکٹر، ’دیوان حسن شوقی‘، مشمولہ، ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، ایضاً ص۲۶۷

(35) شمس اللہ قادری، ’اردوقدیم ‘، مطبع لول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۹ء، ص۸۵

(36) ’ دیوان نصرتی ‘، مرتبہ:جمیل جالبی، قوسین، لاہور ۱۹۷۲ء ص۷

(37) عبدالحق،مولوی،’ نصرتی‘، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۴۴ء، ص ۱۰

(38) شمس اللہ قادری،حکیم، ’اردوئے قدیم ‘، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۹ء، ص۸۴

(39) ’ دیوان نصرتی ‘، مرتبہ: جمیل جالبی،ایضاً،ص۴

(40) عبدالحق،مولوی، ’اردوئے قدیم ‘، ایضاً، ص۱۰

(41) ’ دیوان نصرتی ‘، مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاًص۴۔۵

(42) ایضاً، ص۔ ۵

(43) تفصیل کے لئے دیکھئے، ’اردو شہ پارے‘از پروفیسر محی الدین،ص۶۰

(44) ’ دیوان نصرتی ‘، مرتبہ:جمیل جالبی،ایضاً،ص۵

(45) (۱فسرصدیق امروہی،’دیوان نصرتی‘، مشمولہ، ’جمیل جالبی۔ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹرگوہر نوشاہی‘،۱یضاً،ص۲۷۰۔۲۶۹

(46) ایضاً، ص۲۷۰۔۲۷۱

(47) ’ دیوان نصرتی ‘،مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاً،ص ۱۴۔۱۵

(48) ایضاً،ص ۱۵

(49) ۱فسرصدیق امروہی ’ دیوان نصرتی‘، مشمولہ، ’جمیل جالبی۔ایک مطالعہ‘، مرتبہ، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ایضاً، ص۲۶۹

(50) ’ دیوان نصرتی ‘،مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاً ص۔ ۱۵

(51) رشید حسن خان:’ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ‘، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور ۱۹۸۹ء، ص۳۰۴

(52) گیان چند جین،ڈاکٹر،’تحقیق کافن ‘،ایضاً،ص۱۴۱

(53) ۱فسرصدیق امروہی، ’دیوان نصرتی‘، مشمولہ، جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، مرتبہ، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ایضاً، ص۲۷۲۔۲۷۱

(54) مشفق خواجہ:’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘‘،مشمولہ جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، مرتبہ، ڈاکٹر گوہر نوشاہی،ایضاً، ص ۲۴۸

(55) ایضاً، ص۸

(56) جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’اردو زبان کی پہلی تصنیف ؛ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ‘، مشمولہ، ’ادبی تحقیق‘، مجلس ترقی ادب، لاہور،۹۹۴ء، ص ۹۵

(57) ’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۷۳ء، بار اوّل، ص۳۵۔۳۶

(58) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۴۰ء، ص۳۵

(59) افسر صدیق امروہی،' مخطوطات '، انجمن ترقی اردو، کراچی، جلداوّل،۱۹۶۵ء، ص ۳۶۷

(60) 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'، مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاً، ص۱۵

(61) ایضاً، ص۱۵

(62) نصیرالدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' صفحہ نمبر ۳۴ پر اس مثنوی کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔

(63) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، ایضاً،ص۳۶

(64) 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'، مرتبہ ؛ جمیل جالبی، ایضاً، ص۱۷

(65) تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، 'اردو ادب کی تاریخ '(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک)،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۶ء، ص۸۰۔۸۱

(66) 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'، مرتبہ:جمیل جالبی، ایضاً، ص۳۶

(67) وحید قریشی،ڈاکٹر،'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'، مشمولہ، 'مقالات، تحقیق '، مغربی پاکستان اردواکیڈمی، لاہور، ص ۳۱

(68) ایضاً، ص ۳۴

(69) مشفق خواجہ؛ 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'، مشمولہ، 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ '، ایضاً، ص۲۵۲

(70) رشید امجد،ڈاکٹر، 'میراجی پر دواہم کتابیں '، مشمولہ، جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، ایضاً، ص ۲۳۰

(71) 'کلیاتِ میراجی'، مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، طبع دوم، ص ۳۱۔۳۲

(72) انٹرویو، مقالہ نگار، رضوانہ نسیم، 'ڈاکٹرجمیل جالبی بحیثیت مدون'، بذریعہ فون ۲۵: ۹۔۲۰۰۵ء

(73) رشید امجد،داکٹر، 'میراجی پر دواہم کتابیں '، مشمولہ، جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، ایضاً، ص ۲۳۱

(74) 'ڈاکٹرجمیل جالبی بحیثیت مدون'، مقالہ نگار رضوانہ نسیم، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ص ۱۴۹

(75) 'ن۔ م۔ راشد ایک مطالعہ '، مرتبہ؛ ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۵

(76) مقالہ' ڈاکٹر جمیل جالبی، بحیثیت مدوّن 'از رضوانہ نسیم، ایضاً، ص ۱۴۵

(77) 'میراجی۔ ایک مطالعہ'، مشمولہ،'میراجی۔ایک مطالعہ'، مرتبہ:ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۰ء، ص۲۳

(78) ایضاً، ص۲۷

(79) ایضاً، ص۳۴

(80) جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'میراجی کو سمجھنے کے لئے '، مشمولہ '، میراجی۔ایک مطالعہ '، ایضاً، ص۲۹۰

(81) رشید امجد،ڈاکٹر، 'میراجی پر دواہم کتابیں '، مشمولہ،' جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'، ایضاً، ص ۲۳۱۔۲۳۲

باب چہارم

ڈاکٹر جمیل جالبی بطور ماہر لسان

زبان انسان کے ماضی الضمیر کو بیان کرنے کا اہم آلہ ہے اور اس کا اصل سرمایہ الفاظ ہیں۔ کسی بھی زبان کے لسانی سرمائے کی حفاظت اور توسیع کے لئے لغات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں بلکہ جدید ترین سائنسی و صنعتی ترقی نے لغات کی اس اہمیت کو دوچندکردیاہے۔ انسان کی روزافزوں ترقی کرتی زندگی کی ترجمانی کے لئے زبان کی وسعت اور ہمہ گیری مسلّمہ ہے۔ زبان کو اپنے عصر سے ہم آہنگ کرنے کے لئے دیگر زبانوں سے ارتباط کی اہمیت سے انکار نہیں کیاجاسکتا۔

اردو زبان اس لحاظ سے خوش قسمت تصور کی جاسکتی ہے کہ اسے اپنے ابتدائی اور ارتقائی ادوار ہی میں لغت نویسوں کی توجہ میسر آگئی تھی۔ اردو میں لغت نویسی کی ابتداء کا سہرااہل یورپ کے سرباندھا جاتاہے۔ اردوزبان کی اولین لغت ۱۶۳۰ء میں ترتیب دی گئی۔ رضیہ نورمحمد اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ’’گیریسن نے لنگو سٹک سروے آف انڈیا کی جلد نہم میں ہندوستانی لغات و قواعد کی جائزہ لیتے ہوئے جو تفصیلات دی ہیں، ان سے معلوم ہوتاہے کہ اردو کی سب سے پہلی لغت مسٹرکورچ کے ہاتھ جوکا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ یک جا درج تھے۔ اس کی تالیف ۱۹۳۰ء میں سورت کے مقام پرہوئی‘‘۔(۱)

ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے قائم ہونے کے بعد ہندوستانی زبان کی تعلیم کے پیشِ نظر لغت نویسی کی ضرورت اور اہمیت دوچند ہوگئی۔ اسی ضرورت کے پیش نظر یورپی مؤلفین نے فرہنگیں اور لغات مرتّب کیں۔ ڈاکٹر ہیزی ہیرسن،کپتان جوزف پیکر، کپتان ٹامس پیکر،جان شیکسپیئر، ڈنکن فاربس،ڈاکٹر فیلن، جان پلیٹس وغیرہ نے ہندوستانی انگریزی لغت مرتب کئے۔ یہ تمام لغات اور فرہنگیں کمپنی کے تاجروں اور افسران کو ہندوستانی (اردو) سکھانے کی غر ض سے مرتّب کی گئیں۔

انگریز اور فرانسیسی مرتبین کی لغات سے ہٹ کر اگر اردو میں لغت نگاری کا جائزہ لیاجائے تو اردو میں باقاعدہ لغت نگاری کی ابتداء مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ(۱۸۶۸ء) کو قرار دیا جاسکتا ہے جو چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔امیر مینائی کی حرف الف کی تقطیع پر مشتمل پہلی جلد ۱۸۹۱ء میں سامنے آئی۔’نورالغات ‘۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ان کے علاوہ خواجہ عبدالحمید کی ’جامع الغات‘،مہذب لکھنوی کی’ مہذب الغات‘ اور مولوی عبدالحق کی’ لغت کبیر‘ اور اردو لغت بورڈ کی تاریخی اصول پر

شائع کردہ لغت ’اردو لغت ‘ کو لغت نگاری کی باقاعدہ اور کامیاب کوشش قرار دیاجاسکتاہے۔ لغت نگاری ایک پیچیدہ اور محنت طلب کام ہے۔ اردو زبان کے سلسلے میں جو لغات مرتب کی گئیں ان کاجائزہ لینے سے معلوم ہوتاہے کہ لغت نگاری کے جوبھی کام منظرعام پرآئے چاہے وہ انفرادی کوشش تھی یا اجتماعی، اس کام میں اغلاط اور اشتبہات سے بچنا مشکل ہے۔ لغت نویسی کے لئے بے انتہا تلاش و جستجو، تحقیق و تفتیش اورتفحص کی ضرورت ہوتی ہے اردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے لہٰذا اردو لغت کی تیاری کے مسائل بھی زیادہ ہیں۔ اردو میں مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور پرتگالی کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اردو کی ایک جامع لغت مرتب کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اردو زبان کی لغت نویسی کے مسائل کے بارے میں پروفیسر سید حسن رقمطراز ہیں:

> ’’اگرچہ ایشیاء و یورپ میں بعض اہم زبانوں کی عمربہت مختصر ہے لیکن ڈھائی سوسال کے عرصے میں اس نے تحول وتکامل کی بہت سی منزلیں طے کرلی ہیں۔ اس کے الفاظ کے املاء، معانی و مفاہیم اور استعمال میں تھوڑی تھوڑی مدت میں ان تبدیلیوں کی تاریخ و تشریح کرنا ہوگی‘‘۔(۲)

لغت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ زبان کا وسیع علم رکھتا ہو۔لغت نگار کو بیک وقت ایک ماہر لسان،ناقد اور ایک محقق کے فرائض انجام دینے چاہئیں۔لغت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے لغوی اور مجازی معنوں کی تشریح کرنے کے علاوہ الفاظ کے مترادف فراہم کرے،ان کا محلِ استعمال بتائے،ان کی اصل کا کھوج لگائے۔الفاظ کے درست تلفظ کی نشاندہی اور معیاری عوامی تلفظ کی نشاندہی کرنا بھی لغت نگار کے فرائض میں شامل ہے۔ان امور کے علاوہ الفاظ کے مرکبات اور مشتقات کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے معنی بیان کرنا، الفاظ کے معانی کے سلسلے میں درست اور غلط کا تعین بھی لغت نگار کے فرائض میں شامل ہے۔متروک اور رائج الفاظ کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔یہ اصول اور فرائض یک لسانی لغت کے حوالے سے درج کئے گئے ہیں جبکہ ذولسانی لغات کے سلسلے میں لغت نگاری کے فرائض میں مزید اضافہ ہوجاتاہے۔ ذولسانی لغت نگار کا اوّلین فریضہ ہے کہ وہ الفاظ کا ترجمہ اور تشریح دوسری زبان کے الفاظ میں کرے۔اس مقصد کے لئے دونوں زبانوں کے مزاج سے واقفیت ازحد ضروری ہے۔ ذولسانی لغات کے مرتب کے لئے ضروری ہے کہ زبانوں کے تہذیبی پس منظر سے اچھی واقفیت رکھتاہو۔بقول ڈاکٹر حنیف کیفی:

> ’’اکثروبیشتر ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ایسی صورت اختیار کرلیتاہے جس میں اصل زبان کی روح بری

طرح مجروح ہوتی ہے۔ یہ ایک ایساکانٹوں بھراراستہ ہے جس پر ایک دو لسانی لغت نویسBilingual Lexicographer کوبڑی احتیاط سے قدم رکھنا اور بہت سنبھل سنبھل کرچلنا ہوتاہے''۔(۳)

لفظ شناسی کو ایک تخلیقی عمل قرار دیاجاتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جہاں ایک طرف تحقیق، تنقید اور ترجمہ نگاری میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے وہیں لغت نویسی کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دئیے ہیں۔لسانیات سے اپنی دلچپسی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:''لسانیات سے بھی مجھے گہری دلچسپی ہے۔ اشتقاق کی تلاش میں ایک لطف آتا ہے، لفظوں کے معنی تلاش کرنے اور متعین کرنے میں مجھے ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتاہے''۔(۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی کو قدیم اردو سے ایک خاص دلچسپی رہی ہے۔ تاریخ ادب اردو مرتب کرنے کے سلسلے میں بھی ان کا واسطہ قدیم مخطوطات سے رہاہے۔ قدیم اردو الفاظ سے واقفیت اور دلچسپی کے باعث انہوں نے لغت نگاری کے سلسلے میں بھی اردو ادب کی گراں مایہ خدمت سرانجام دی ہے۔ اردو لغات نگاری اور اصطلاح سازی کے سلسلے میں انہوں نے درج ذیل کتب مرتب کی ہیں:

۱۔ قدیم اردو کی لغت،دسمبر۱۹۷۳ء،مرکزی اردو بورڈ،لاہور

۲۔ فرہنگ اصطلاحات ''جامعہ عثمانیہ''(جلد اوّل)،۱۹۹۱ء،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد

۳۔ فرہنگ اصطلاحات ''جامعہ عثمانیہ'' (جلد دوّم)،۱۹۹۳ء،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد

۴۔ قومی انگریزی اردو لغت،۱۹۹۲ء،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد

قدیم اردو کی لغت:

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتّب کردہ’’قدیم اردو کی لغت‘‘مرکزی اردو بورڈ، لاہور سے پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ انتساب پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفی خان صاحب کے نام ہے، لغت کا’تعارف ‘معروف مصنف اشفاق احمد کا لکھا ہواہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے ڈاکٹر اشفاق لکھتے ہیں:

> ’’اس لغت کے مطالعے سے یہ بات بھی قاری کے سامنے آئے گی کہ ہمارے اسلا ف لفظوں کو کس تلفظ سے اداکرتے تھے؟ ان کی املاء کیاتھی ؟ ان کے اصول و قواعد کیاتھے ؟ اور پاکستان کی علاقائی زبانوں نے اردو زبان کی ابتدائی تشکیل میں کیا کردار اداکیاتھا ؟ آپ کو اس لغت میں قدیم اردو کے ہزاروں الفاظ ملیں گے جوآج بھی پاکستان کی علاقائی زبانوں میں زندہ و مستعمل ہیں اور ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں‘‘۔(۵)

قدیم اردو کی لغت کو اپنی نوعیت کی پہلی لغت قراردیاجاتاہے کیونکہ اس میں صرف وہ الفاظ شامل کئے گئے جو اردو کے قدیم ادب میں استعمال ہوئے اور دیگر لغات میں وہ الفاظ نظرنہیں آتے۔ قدیم اردو کی لغت نویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری کے اوائل تک کے ادب کااحاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں وہ الفاظ بھی شامل کئے ہیں جو اردو کی پہلی مثنوی ’’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘‘ میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں گجری اردو میں تحریر کردہ کتب مثلاً شیخ باجن، شاہ جیوگام دھنی، قاضی محمود دریائی اور خوب محمد چشتی کی تصانیف کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار کی تصانیف کے الفاظ بھی اس لغت میں شامل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی چونکہ قدیم اردو ادب سے متعلق مخطوطات اور کتب سے استفادہ کرتے رہے ہیں لہذا قدیم اردو سے متعلق نامانوس اور اجنبی الفاظ کے معانی متعین کرنے کے بعد انہیں محفوظ فرمالیتے۔ جب یہ الفاظ کا ذخیرہ اچھی خاصی تعداد مین جمع ہوگیاتو انہوں نے عام لوگوں کے فائدے کے لئے ان الفاظ کو قدیم اردو کی لغت کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان کی یہ کوشش ایک مستقل تالیف کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔ یہ لغت تقریباً گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ قدیم اردو کی لغت مرتّب کرنے کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تقریباًدو سو مخطوطات اور قدیم مطبوعات سے استفادہ کیا۔ لغت مرتب کرنا ایک دشوار عمل ہے اس کے لئے مرتب کو بہت جانچ پڑتال اور تحقیق کے عمل سے

گزرنا پڑتاہے۔ قدیم زبان کی لغت مرتب کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ الفاظ کے معانی متعین کرنے میں مرتّب کو قیاس کا سہارابھی لینا پڑتاہےڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کے بقول:

''دکنی ادب کے لغت کی تشکیل اور تہذیب کے عمل میں چونکہ ذخیرۂالفاظ کے معنوی خدوخال ابھارنے میں قیاس کو بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل تھی اس لئے قیاس آرائی اگروجدانی اور مکاشفاتی رنگ و آہنگ سے لذت گیر نہ ہوتی، تو معنی کے درست تعین کی یہ روایت اپنی اصل اور حقیقی صورت سے مملو نہ ہوپاتی''۔(۶)

قدیم اردو کی لغت کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل صاحب نے لغت مرتب کرنے کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے:

''اس لغت کو مرتب کرتے وقت میں حسب ضرورت مصدر، حاصل مصدر، امر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشترشکلیں شامل کردی ہیں تاکہ قدیم ادب کا مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکل پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ساتھ ساتھ اگرایک ہی لفظ مختلف املائی شکلوں میں ملا،تو اس کی یہ شکلیں بھی شامل کردی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو کسی غلط فہمی یاالجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر مختلف مآخذ سے ایک ہی لفظ کے مختلف معانی سامنے لائے ہیں تو ان سب معانی کو اسی لفظ کے تحت یکجاکردیاہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس لغت میں الفا ظ کے وہی معنی دیے گئے ہیں جو قدیم دور میں رائج تھے۔ بہت سے الفاظ کے معنی ایسے ہوں گے جوآج کے معنی سے مختلف مثلاً بانگ کے معنی اذان، جنگی کے معنی سپاہی ہوادار کے معنی عاشق و دوست، البتہ کے معنی یقینا، ضرور کے معنی بے شک، چال کے معنی گھر، پاک کرنی کے معنی جھاڑو، اڑانی کے معنی پنکھا، اُپرنی کے معنی اوڑھنی، دوپٹہ وغیرہ''۔(۷)

یہ لغت ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے اختتام پر ان کتب کی تفصیل دی گئی ہے جن سے لغت کے لئے الفاظ منتخب کئے گئے ہیں۔ لغت کی ترتیب میں حروف تہجی کی ترتیب کو مدّنظر ررکھاگیاہے۔ قدیم اردو کی لغت مرتب کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم مخطوطات کے لفظوں کوقدیم

طریقۂ املاء کے مطابق تحریر کیاہے۔ایساکرنے سے قارئین الفاظ کے قدیم املائی صورت سے واقف ہوجاتے ہیں مثلاً کچھ الفاظ درج ذیل ہیں۔

قدیم اردو کی لغت جدید املاء

آپنا اپنا

آرایش آرائش

تواف طواف

تہار تہال

یگانت یگانگت

یینے یعنی (ص۲۳۲،۸۶،۱۰،۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں اس بات کا خاص اہتمام کیاہے کہ ایک ہی لفظ مختلف مخطوطات میں مختلف املائی صورتوں میں لکھا گیاہے تو اس لفظ کی تمام اشکال پیش کی گئی ہیں۔ قدیم اور جدید املاء میں بنیادی فرق ہے کہ قدیم املاء میں الفاظ کو جوڑ کرلکھا جاتا تھا جبکہ جدید املاء میں الفاظ کو الگ الگ لکھاتاہے۔مثلاً

قدیم املاء جدید املاء

آپی آپ ہی

آئیاں آئی ہیں

توج تجھ کو

تولگن، تولگوں جب تک، تب تک

یوچ۔ یونج یوں ہی (ص،۲۳۲،۸۶،۱۳،۹)

جدید اردو املاء میں ہائے ہوز، ہائے مخلوط اور دوچشمی ہائے کے استعمال میں بھی کافی فرق آچکاہے۔ مثلاً

کھوانا کہلانا

کھوایا کہلوایا

کھنا کہنا

کہستان کوہستان

ڈاکٹر جالبی نے چونکہ اس لغت میں درج الفاظ،قدیم مخطوطات اور کتب سے جمع کئے ہیں لہٰذا معانی کے اندراج میں انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ہرلفظ کے معنی درج کرتے ہوئے

مختلف معانی دئیے جائیں تاکہ مختلف قدیم متون کی تفہیم میں قاری کو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے مثلاً

درج ذیل معانی دیکھیں:

چال، گھر، مکان،رفتار، روش، طرز

توڑا، زرہ، توڑی کی بندوق

آہار، خوراک، کھانا، مسطر، پرپھیری جانے والی لئی۔

آلی جانب، طرف، سہیلی، سکھی، محبوب، چنچل، اعلیٰ، عالی، رنگین مزاج

آکار مقید، تعلق،نظر،صورت، روپ، ہئیت، ظہور، خوش ترتیبی، خوش شکل۔(ص۱۱،۱۳،۸۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم اردو کے ان الفاظ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جوکہ علاقائی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کا استعمال جدید ار دو میں رائج نہیں ہےمثلاً درج ذیل الفاظ:

آسا(آشا) آس امید

چمتکار کرامت، نادر

آکار مقید، تعلق، نظر، صورت، روپ، ہئیت

تمبو خیمہ

آساوری سسرال

دھیوتا نواسہ

ﹸگ زمانہ (ص۲۳۲،۱۹۳،۱۰۹،۱۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں مصدر، حاصل مصدر، امر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشتر شکلیں درج کی ہیں تاکہ قدیم ادب کی قرأت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ مثلاًایک ہی لفظ کی مختلف صورتوں کو درج کرنے کی چند مثالیں درج ذیل ہیں ؛

آلیس سستی، دیری، غنودگی

آلسی کاہلی، خواب آلود

آلکسیا سست، کاہل

آرتا نظر بددورکرنے کاعمل،بلادور

آرتی دیوتاؤں کی مورتی کے چاروں طرف چراغ پھرانے کی رسم۔

نثار، وہ بجھن جوآرتی کے وقت گایا جاتاہے۔ حمد

آرت کرنا آرتی اتارنا، ہندوءں کی ایک مذہبی رسم

مشفق خواجہ نے اپنے مضمون ’’قدیم اردو لغت‘‘ کے حوالے سے بعض تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔ جوکہ درج ذیل ہیں؛

۱۔ کہیں واحد کو لغت بنایاہے اور کہیں جمع کو، اور کہیں دونوں ہی کو الگ الگ لغت مان کر معنی درج کردئے گئے ہیں۔

۲۔ الفاظ کی مختلف املائی صورتوں کا اندراج الگ الگ ہواہے مثلاً اپڑنا بھی ہے اور ’’انپڑنا‘‘ بھی لیکن دونوں جگہ یہ نہیں بتایاگیا کہ اس لفظ کی دوسری املائی صورت بھی ہے جسے اس لغت میں شامل کیاگیاہے۔ ایسے الفاظ کے ساتھ دیگر حوالے نہیں دئیے گئے جوکہ دینا ضروری تھے۔

۳۔ بعض جگہ الفاظ کے اندراج میں اندرونی الفبائی ترتیب کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا مثلاً ’’اساس‘ کے بعد ’’اوساس ہے‘‘ اور پھر اساس (بلاشد) ان الفاظ کی ترتیب یوں ہونی چاہیے تھی۔ ’’ساس، اساس، اوساس ‘‘

۴۔ بعض الفاظ مرکبات میں ملتے ہیں لیکن اسے الگ سے لغت نہیں بنایاگیا جیسے ’’باتی‘‘ بمعنی بات موجود نہیں ہے لیکن ’’بیتی باتی‘‘ کو لغت بنایاگیاہے۔

۵۔ لغت میں مصدر کی بدلتی ہوئی تمام صورتیں ملتی ہیں جوکہ عام روش (لغت نگاری کے خلاف ہے لیکن دکنی کی حد تک اس اصول کی پیروی نہیں ہوسکتی کیونکہ قاری کو بعض اوقات کویہ معلوم نہیں ہوتاکہ کوئی خاص لفظ کس مصدر سے بنایاگیاہے۔

۶۔ بعض الفاظ جن کی املائی صورت ایک جیسی ہے ان کے معنی ایک ہی جگہ لکھ دیتے ہیں مثلاً ’’آلی‘‘ بمعنی محبوب اور ’’آلی‘‘ (جو’’عالی‘‘ کی املاء ہے) دونوں کو ایک ہی جگہ درج کرکے مختلف معانی ایک ساتھ لکھ رہتے ہیں۔

۷۔ آلی اور (عالی) کو لغت قرار دینا درست نہیں۔(۸)

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے مضمون ’’ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق‘‘ میں چند الفاظ کی فہرست پیش کی ہے جو ان کے خیال میں قدیم اردو کی لغت میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں جوکہ درج ذیل ہیں؛

۱۔ بنگا (ٹیڑھا،ترچھا) بنگی (ٹیڑھی) نواچاند بنگی کھرک ہے کہ جان (دیپک، پتنگ)

۲۔ پنچ(پیدائش) پہنچنا (پیداہوا) پہنچپا (پیداہوا)

پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (قطب مشتری)

نہ پنچے نہ پنچیا ہے اس ٹھان میں (سیف الملوک وبدیع الجمال)

۳۔ پھاڑ (پہاڑ) پھاڑاں (پہاڑ کی جمع) پھاڑے پھاڑ (پہاڑ پہاڑ)

کنکر میں گھوس کر پھاڑ کوں کون دیکھیا ہے۔(سب، س)

دانش کے تیشے سوں پہاڑاں الٹا یا تو یوشیریں پایا (سب رس)‘‘(۹)

ان اعتراضات کا جائزہ لیاجائے تو پتہ چلتاہے کہ خامیاں اس لغت کی قدر حیثیت کو کم نہیں کرسکتیں اور یہ خامیاں اور اعتراضات نظراانداز کئے جاسکتے ہیں۔ مشفق خواجہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں ؛’’جالبی صاحب کا یہ کام اپنے موضوع پربڑی حدتک پہلاکام ہے۔ خوبیوں کا پلہ بھاری ہے اور خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ جن کی تصحیح آئندہ ایڈیشن میں نہ سکے‘‘۔(۱۰)

ڈاکٹر محمد علی اثر’ قدیم اردو کی لغت‘ کی افادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:’’لغت دراصل محققین، ماہرین زبان اور اہل علم کے لئے نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے کے بغیر مستقبل میں کسی بھی قدیم اردو کی لغت کی ترتیب و تدوین ادھوری اور نامکمل رہے گی‘‘۔(۱۱)

فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد اوّل)

اردو میں اصطلاح سازی کا عمل اتنا ہی پرانا ہے جب سے اردو زبان، علوم وفنون کے اظہار کا ذریعہ بننا شروع ہوئی۔ اردو کی ترکیب میں چونکہ عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کاوسیع ذخیرہ موجود ہے اس لئے اصطلاح سازی میں بھی ان تینوں زبانوں کا عمل دخل ناگزیرہے۔ ابتدائی اردو اصطلاح سازی میں عربی، فارسی اور سنسکرت کا غالب حصّہ شامل رہا لیکن اٹھارویں صدی میں جب انگریزوں کے اقتدار کا سورج طلوع ہوچکاتھا تو جدید مغربی علوم کو اردو زبان کے ذریعے حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کسی بھی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے اصطلاح سازی کی اہمیت سے انکار نہیں کیاجاسکتا۔ اصطلاح کیاہے ؟ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:’’اگرمروّج معانی کے علاوہ کسی لفظ کے کوئی اور معنی صلاح و مشورے سے مقرر کرلئے جائیں تو معنی اس صورت کو اصطلاح کہتے ہیں‘‘۔(۱۲)

پروفیسر وحیدالدین سلیم کے مطابق:’اصطلاحین دراصل اشارے ہیں جوخیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو منتقل کردیتی ہیں‘‘۔(۱۳)

اردو میں اصطلاح سازی کی باقاعدہ کوششوں کا سراغ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ملتاہے۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کے قیام کے ساتھ ہی کالج میں کیمیا، نباتیات، معدنیات، ریاضی، طب، علمِ ہندسہ اور دوسرے علوم کی اصطلاح سازی کے لئے دہلی ورنیکلر، ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خا ن نے مسلمانوں کو علمی لحاظ سے مضبوط بنانے کے لئے جو اقدامات کئے ان میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جدید سائنسی کتب اور امہات الکتب کو اردو میں منتقل کیاجائے۔ وضع اصطلاحات کمیٹی کے قیام کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا۔ برصغیر کے متعدد تعلیمی اداروں مثلاً رڑکی انجینئرنگ کالج اور آگرہ میڈیکل کالج میں بھی اصطلاح سازی کا کام ہوا۔

تعلیمی اداروں کے علاوہ جن اداروں میں اصطلاح سازی کو فروغ دیا ان میں سائنٹیفک سوسائٹی مظفرپور کے تحت فلکیات، معدنیات، طبیعات، جغرافیہ اور فنِ تعمیر و غیرہ کی کتب کو ترجمہ کروایاگیااور یوں اصطلاح سازی کو فروغ ملا۔ شاہان اودھ غازی الدین حیدر اور نصیرالدین حیدر کے دورمیں بھی علمی و سائنسی کتب کا ترجمہ ہوا۔ اردو میں اصطلاح سازی کے رحجان کو سب سے زیادہ فروغ جامعہ عثمانیہ کے تحت ملا۔ ڈاکٹر جالبی اس امرپر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام دکن نے یہ فرمان جاری کیاکہ اپنی تخت نشینی کی یاد گار میں سلطنتِ آصفیہ میں اک جامعہ کے قیام کا حکم دیتاہوں جس کا نام جامعہ عثمانیہ ہوگا۔ اس زمانے میں چار مہینے کے اندر اندر ۱۴، اگست ۱۹۱۷ء کو شعبۂ تالیف و ترجمعہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے سربراہ مولوی عبدالحق مقرر کئے گئے۔ اس شعبے کا مقصد رہا تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے لیے ضروری کتب لکھوائی اور ترجمہ کرائی جائیں تاکہ یہ کتابیں جامعہ عثمانیہ میں درسی کتب کے طورپر استعمال کی جا سکیں۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم چونکہ اردو زبان تھی اس لیے وہاں اصطلاح سازی کے کام میں بھی غیر معمولی اورمفید پیش رفت ہوئی''۔(۱۴)

جامعہ عثمانیہ کے تحت اصطلاحات سازی کا کام''شعبۂ تالیف وترجمہ'' کے تحت شروع ہوا اصطلاحات سازی کا کام چونکہ تدریسی ضرورت کے تحت شروع کیاگیا اس لئے یہ اصطلاحا ت یکسانیت کے ساتھ درسی کتب میں استعمال ہوئیں اور ان کا رواج عام ہوگیا۔ ''فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو انہیں مرتب کرنے کا خیال کیوں پیش آیا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سقوطِ حیدرآباد (دکن) کے فوراً بعد جب اردو ذرائع تعلیم کی روایت وہاں ٹوٹی تو یہ ساراعلمی سرمایہ بھی منتشر ہوگیا۔ اب جیسے جیسے وقت گزرتا جاتاہے اس سرمائے کی شیرازہ بندی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ سرمایہ یکجا و مرتب کرکے شائع کیاجاتاتا کہ یہ نہ صرف محفوظ ہوجاتابلکہ وضع اصطلاحات کی جدید روایت سے بھی اس کا رشتہ قائم ہوجاتا۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے کم وبیش اس سارے سرمائے کو کھنگالا جوپاکستان کے مختلف

کتب خانوں میں محفوظ تھا اسے یکجا کرکے مرتب کردیا۔ ’’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘‘ انہی اصطلاحات کا مجموعہ ہے‘‘۔(۱۵)

’’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد اوّل فروری ۱۹۹۱ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوئی، صفحات کی کل تعداد ۴۶۶ہے۔ ’’فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ‘‘ کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس فرہنگ کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ میں اردو میں اصطلاحات سازی کے حوالے مختصر روایت کا جائزہ لیاگیا۔ پیش لفظ ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولوی عبدالحق کے حوالے سے وضع اصطلاحات کے اصول بھی پیش کئے ہیں جو دارالترجمہ میں کثرت رائے سے منظور ہوئے۔ مجلس وضع اصطلاحات کے تحت جوکمیٹیاں تشکیل دی گئیں ان کی فہرست سید یعقوب میراں مجتہدی کے مطابق یہ ہے ؛

۱۔ کمیٹی برائے طبیعات، کیمیا ء و ریاضیات

۲۔ کمیٹی برائے فنون(آرٹس)جس کی ذیلی کمیٹیاں یوں بنائی گئی تھیں؛

(الف) کمیٹی برائے فلسفہ، نفسیات، منطق اور اخلاقیات۔

(ب) کمیٹی برائے تاریخ و جغرافیہ۔

(ج) کمیٹی برائے عمرانیات، سیاسیات و معاشیات

۳۔ کمیٹی برائے حیاتیات (نباتیات و حیوانیات)

۴۔ کمیٹی برائے انجینئری

۵۔ کمیٹی برائے طب

۶۔ کمیٹی برائے قانون‘‘۔(۱۶)

جامعہ عثمانیہ کے’’شعبہ تالیف و ترجمہ‘‘ میں مختلف علوم و فنون کی تقریباً پانچ سو کتب تالیف و ترجمہ کا منصوبہ بنایا اور ۳۸۵کتابیں شائع کیں۔ اس کے لئے ۹۰ ہزار سے زائد اصطلاحات اردو میں وضع کیں۔ ڈاکٹر جمیل نے اس فرہنگ میں ان اصطلاحات کو یکجا کیاہے جو پاکستان مین دستیاب جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات میں بطور فرہنگ درج تھیں لہذااس فرہنگ میں ۳۵ ہزار کے قریب اصطلاحات شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتب کی فہرست فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کے آخر میں درج کی ہیں جن سے انہوں نے استفادہ کیاہے۔ ان کتب کی تعداد ۱۲۴ ہے۔ اس فہرست کو ڈیوی کے اصول درجہ بندی کے مطابق ترتیب دیاہے۔

فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ میں تمام علوم و فنون کی اصطلاحات کو انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش لفظ کے بعد ’’مخففات‘‘ کے عنوان سے مختلف علوم و فنون کی ۳۳ اصطلاحات کے مخففات درج کئے ہیں ؛

مثلاً ؛

’’زراعت(Agric) Agriculture

لسانیات(Ling) Liguistics

فلزیات(Metal) Metallurgy

ٹیکنالوجی) ‘‘(Tech) Technology ص۔مخففات)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے فرہنگ میں الفاظ کا املاء جامعہ عثمانیہ کی روایت املاء کے مطابق رکھا ہے۔ اصطلاح کے ساتھ قوسین میں متعلقہ شعبہ علم کی بھی صراحت کردی ہے۔مثلاً

جغرافیائی نصف النہار(phys) Geographical meridian

جغرافی(میل(Math) (miles) Geographical

جغرافی قطب(phys) Geographical pole

ارضیہ(Astron) Geoid

ارضیاتی قرن)‘‘(Tech) Geological epoch ص۱۸۰)

’’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘‘میں ڈاکٹر جالبی نے اشخاص، مقامات اور کیمیائی مرکبات کے ناموں کو قارئین کی آسانی کے لئے اردو میں ان کے تلفظ کی ادائیگی کی غرض سے شامل کردیاہے۔

مثلاً ؛

’’جی لیو (.Hist) Gilio

گیمون(.Hist) gimon

جیو/جیوو (.Hist) Giurgeve

گروزیا (.hist) Gerousia

گیلز ڈارف)‘‘ Gielsdorf (.hist) ص۱۸۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرہنگ مرتب کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اگر ایک ہی اصطلاح مختلف علوم و فنون میں استعمال ہوتی ہے تو ان تمام علوم وفنون کے مخففات اس اصطلاح کے سامنے درج کردئیے ہیں۔ مثلاً

’’بائی یورٹیس(Bi- Urates (Chem, Physiol

کالی وبا۔ سیاہ موت (Black Death (Law, Med

کدم العین، آنکھ کامل (Black eye (Anat, Pathol

تنصیف(Bisection (Anat, Math, Phys

ناصف، منصف)(Bisector (Phys) (Math, Serv, Tec ص۴۹)

فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ(جلد دوم):

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتّب کردہ ’’فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘‘ جلد دوم ۱۹۹۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی، جسے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا۔ یہ فرہنگ۴۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ فرہنگ کی ابتداء میں ’’پیش لفظ‘‘کے عنوان سے مقدمہ درج ہے۔ اس مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ’’زوال حیدرآباد (دکن) کے بعد جب جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو اصطلاح سازی کا عمل بھی رک گئی۔ دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی اور کم و بیش سارادخیرہ نذر آتش ہوگیا۔ جو بچا اسے ۱۹۶۸ء میں آصف ثامن نواب میربرکت علی (مرکم جاہ بہادر) کو تحفتاً دے دے دیاگیا،جنہوں نے اسے ٹرسٹ (لائبریری) کے حوالے کردیاگیا۔ آج برصغیر میں ایک بھی کتب خانہ ایسا موجود نہیں ہے جہاں یہ سب ذخیرہ موجود ہو۔ اسی لئے میری دلی خواہش تھی کہ اس سے پہلے ان کتابوں کا حصول مشکل یا ناممکن ہوجائے اصطلاحات کے اس عظیم ذخیرے کو محفوظ کردیاجائے۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی یہ دونوں جلدیں اس خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اب اہل علم اصطلاحات کے مطالعے اور ردوقبول کے عمل سے اصطلاح سازی کی اس عظیم روایت کو آگے بڑھاسکتے ہیں‘‘۔(۱۷)

فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دو م میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے صرف انہی اصطلاحات کو شامل کیاہے جوجلد اوّل میں شام نہ ہوسکی تھیں یا جن کی ذیلی اصطلاحات بعد میں دستیاب ہوئیں۔اصطلاحات کو اسی وضع میں پیش کیا گیا ہے جس صورت میں دارالترجمہ نے وضع کی تھیں۔مختلف علوم و فنون کے انگریزی مخففات کو ہر اصطلاح کے سامنے قوسین میں درج کیا گیا ہے اور اگر ذیلی اصطلاح کا موضوع اصل اصطلاح کے مطابق ہے تو اسے دوبارہ درج نہیں کیا گیاہے نیز ذیلی اصطلاح درج کرتے ہوئے اس کا پہلا حرف بطور اشارہ دیا گیا ہے۔جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات کے آخر میں دی گئی فرہنگ کو بطور بنیادی مآخذ کے استعمال کیا گیا ہے۔

’’فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ، حصہ دوّم‘‘میں ڈاکٹرجمیل جالبی نے جامعہ عثمانیہ کی ۳۳ مطبوعات سے استفادہ کیاہے ان بنیادی مآخذات کی تفصیل پیش لفظ کے بعد صفحات ’’ز‘‘ اور ’’ح‘‘ پر

موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے فہرست میں شامل کتب کا مکمل نام، جلدکانام، مصنف کانام، مترجم کا نام، سنِ تالیف درج کیاہے۔

’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ ‘حصہ اوّل میں مخففات کی ذیل میں علوم و فنون کے مخففات ابتدائی صفحات میں درج کئے گئے تھے جبکہ فرہنگ کے حصہ دوّم میں گرائمر اورجن زبانوں کی اصطلاحات درج کی گئی ہیں ان کے مخففات بھی دیے گئے ہیں مثلاً ؛

Adjective (Adj) , French,(Fr.) Latin, (L.) Plural, (Pl.)

Spanish (Sp.) Verb, (V.) ص مخففات)

’فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ ‘ڈاکٹر جالبی کا ایساکارنامہ ہے جس کی ضرورت اور اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو ہوشربا ترقی ہورہی ہے اس سے ہم آہنگ ہونے کے لئے اردو زبان میں اصطلاحات سازی کا عمل وقت کی اہم ضرور بن چکاہے بالخصو ص اس وقت جبکہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد اس کے عملی نفاذ کا حکم دیا ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے حکم کے اجراء کے بعد امید کی جاسکتی ہے کہ اردو کو بنیادی ذریعۂ تعلیم کے طور پر بھی اپنا لیا جائے گا۔ قومی زبان میں دی گئی تعلیم کی اہمیت سے ہر ذی شعور شخص واقف ہے۔ طلبہ کی علمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ ‘بنیادی ضرورت کی حثیت اختیار کرسکتی ہےـضرورت اس امر کی ہے کہ طلبہ کو تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے تاکہ اپنی قومی زبان کے پھلنے پھولنے کے امکانات مزید وسیع ہوسکیں۔

قومی انگریزی اردو لغت:

اردو میں ذولسانی لغات کی تدوین کی روایت چار سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔ پہلا انگریزی لغت ۱۵۹۵ء میں ایک پرتگالی نے مرتب کیا۔انگریزوں کے برصغیر پر اقتدار مستحکم ہونے سے بہت پہلے ذولسانی لغات مرتب کیے جائے رہے تھے۔ جن میں جارج ہیڈ لے فوربز اور فیلن کی انگریزی اردولغت شامل ہیں۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ان لغات کا دائرہ اثر اور ان کی معنوی اہمیت قابل قدر رہی ہو گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علمی، فکری،معاشی،معاشرتی اور تکنیکی شعبوں میں ترقی کے باعث یہ لغات جدید دور کا ساتھ نبھانے سے قاصر نظرآتی ہیں۔لغت نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن ذولسانی لغت مرتب کرنا اس سے زیادہ پچیدہ عمل ہےـذولسانی لغات مرتب کرنے کے لیے کم سے کم دوزبانوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ دو زبانوں سے واقفیت رکھنے سے مراد محض سرسری واقفیت نہیں لغت نویسی کے لئے ضروی ہے کہ الفاظ کی روح تک رسائی حاصل کرسکے۔ لفظوں کے تاریخی ارتقاء کے شعور کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں زبانوں کے ارتقائی مدارج سے آگاہی رکھنا ضروری ہے۔ کسی زبان کے الفاظ

خاص طور پر ان کی ترکیبی اور محاوراتی شکلوں کو دوسری زبان میں منتقلی کے عمل میں سے پیچیدگی ہی اس وقت پیداہوتی ہے جب لغت نویس ان زبانوں کے مزاج اور تہذیبی اقدارسے ناواقف ہو۔ اردو کی ابتدائی ذولسانی لغات اپنے دور کی ضروریات کے لئے شاید شافی و کافی تھیں لیکن وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید ذولسانی لغت کی ضرورت کو محسو س کرتے ہوئے ڈاکٹرجمیل جالبی نے ''قومی اردو لغت'' مرتب کی جو کہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹرجمیل جالبی لغت کی ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس لغت کا بڑا مقصد جو الفاظ، معانی کی تعداد کے اعتبارے آج تک شائع ہونے والی ہر لغت سے زیادہ ضخیم ہے، کہ وہ لوگ جو اردو میں کسی بھی موضو ع پر لکھنا چاہتے ہیں یہ لغت، الفاظ، اصطلاحات یانئے تصورات کی تفہیم میں ان کی مدد کرے اور جب ہم اردو زبان کا ذکرکرتے ہیں تو اس میں تمام پاکستانی زبانوں کو بھی شامل کرتے ہیں''۔(۱۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''قومی انگریزی اردولغت'' کے مقدمے میں ان اصولوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جن کی بنیاد پر یہ لغت مرتب کی گئی ہے۔ ''قومی انگریزی اردو لغت'' اوردیگر لغات کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اس لغت میں اردو زبان کے لسانی مزاج کے مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کو ملا کر نئے مفاہیم، نئے معانی، اور ان کے نئے رخوں کوایک واضح صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اظہار بیان کے نئے پیرائے زبان میں داخل کردئیے گئے ہیں اس لغت میں آپ کو اردو زبان بدلتی، نئے شعور، نئے تصورات اور نئے مفاہیم کو سلیقے سے اداکرتی محسوس ہوگی''۔(۱۹)

اس لغت کی تکمیل میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے معاونین کی تفصیلی فہرست صفحہ نمبر چودہ پر موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ لغت جدید ترین سائنسی،معاشی،معاشرتی،فکری،علمی،ادبی اور ڈحافتی ضرورتوں کے تحت تخلیق کی ہے۔اس لغت میں۱۷۵۵ء سے قبل متروک ہو جانے والے الفاظ شامل نہیں۔۱۷۵۵ء سے ۱۹۹۰ء تک استعمال ہونے واے الفاظ اس لغت کا حصہ ہیں۔لغت میں شامل الفاظ کے تمام ممکنہ معنی درج کئے گئے ہیں۔اگر ایک اصطلاح یا لفظ مختلف علوم و فنون میں مختلف معانی میں مستعمل ہے تو ہر علم کی ذیل میں اس کے الگ معانی دیئے گئے ہیں۔اردو الفاظ کے متعدد مترادفات درج

کئے گئے ہیں۔انگریزی الفاظ کی اسم، فعل۔صفت،حرف،حرف ربط اور حرف جار وغیرہ کی صورتوں کو اردو میں پیش کیا گیا ہے،چونکہ انگریزی زبان میں اسم اور حرف الگ ہوتے ہیں لہٰذا انہیں اردو میں بھی الگ الگ پیش کیا گیا ہے۔پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ان الفاظ کو بھی استعمال کیا گیا ہے جو اردو میں عام طور استعمال کئے جاتے ہیں۔معنی کی درست تفہیم کے لئے مختصر جملے بھی درج کئے گئے ہیں۔اگر ایک انگریزی لفظ مختلف معنوں میں مستعمل ہے تو اسے الگ الگ درج کیا گیا ہے۔اردو الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں۔لغت کے آخر میں ضمیمہ میں اردو کی کم مانوس اصطلاحات کی فہرست فراہم کی گئی ہے۔

’قومی انگریزی اردو لغت ‘کے مقدمے کے بعد لغت میں استعما ل ہونے والے ۲۰ مخففات کی فہرست دی گئی ہے۔ لغت نویسی اور گرائمر کے متعلق اردو الفاظ و اصطلاحات کے انگریزی مترادفات کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس لغت میں علوم و فنون کے اردو نام اور ان کے انگریزی مترادفات دئے گئے ہیں جن کی تعداد ۲۱۴ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ویبسٹر ڈکشنری (انسائیکلو پیڈک ایڈیشن)کوبنیاد بنایاہے۔ لغت میں الفاظ کے ہجے اور مفاہیم پہلے امریکن انگریزی میں اور بعد میں برطانوی انگریزی میں تحریر کئے گئے ہیں۔ اس لغت میں امریکی اور برطانوی لفظوں کے علاوہ اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، کینڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے الفاظ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ’’قومی انگریزی اردو لغت‘‘ میں الفاظ کے معانی درج کرتے ہوئے تمام ممکنہ معانی فراہم کئے گئے ہیں۔ اس خاصیت کی بنا پر اس لغت میں نہ صرف امریکن اور برطانوی انگریزی کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی انگریزی زبان کے معانی تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ الفاظ کے معانی کی تشریح کے لئے انگریزی جملوں کااستعمال بھی کیاگیاہے۔ مثلاً

Would, aux, vکاماضی اور ماضی بعید،کسی مزاجی Wil کیفیت کے اظہار کے لئے مستعمل ہے۔ مثلاً کسی خواہش، آرزو یا مرضی کے اظہارکے لئے (جیسےWould it were there)-(۱)

نیّت کے اظہار کے لئے(Those who would wagewar)

رواجی عمل کے اظہار کے لئے (She would go there daily)

شرط کے اظہار کے لئے(He would if asked)

ترجیح یاپسند کے اظہار کے لئے(He would rather win than lose)

مستقبل کے اظہار کے لئے(They said they would come tomorrow)

کم صاف یا کم واضح بیان یاسوال کے سلسلے میں (Would you be so kind)

(قدیم) واضح ہونایاپیش Worth (woe worth the day)

’’قومی انگریزی اردولغت‘‘ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا اظہار کرتے ہوئے الفاظ سازی بھی کی ہے۔ مثلاً;

جراثیم ربائیDisinfection, کے لئے،معلومات بندی، Data Processingکے لئے،نج کاری , Privitizationکے لئے، چسپاندہAdhesive, کے لئے اورجھری اندازی Tread کے لئے وضع کئے.

اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کے الفاظ شامل ہیں۔ اس طرح اردو کے بہت سے الفاظ انگریزی میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس لغت میں ان الفاظ کی نشاندہی کردی گئی ہے۔

منڈی، bazarبازار Bazaar,

[دراوڑی: بیل]پان، تنبول، برصغیرکی پان بیل، پان کا پتہ Betel

[اردو] چیتا، گربرائے جنگل Cheetah, (Brit) chetah

[اردو] چوگان یا پولو کے کھیل کا ایک دورChukker, Chukkar

[اردو] چکار، چکو، کبک، دراج Chukar, Chukar, partridge

[عربی، اردو] علماء (عالم کی جمع)Ulema , Ulma

ڈاکٹر جمیل جالبی نے’ قومی انگریزی اردولغت‘ میں ایسے انگریزی الفاظ کی نشاندہی کردی ہے جوتجنیس کے طور پر دو مختلف صورتوں میں مستعمل ہیں۔ ایسے الفاظ میں صرف ہجوں کا اشتراک ہوتاہے۔ اس طرح ایک لفظ کے تمام ممکنہ معنی معلوم ہوجاتے ہیں اور معانی کا فرق بھی سامنے آجاتاہے۔

ڈبل روٹی، چپاتی، پھلکا، نان پاؤ Bread, n(1)

(طباخی) کھاناپکانے سے قبل کچے کھانے کو روٹی کے ٹکڑوں سے ڈھانپنا i Bread, v

ریاکاری، ظاہردارانہ گفتگو، تصنع، دکھاوا، Cant: vi(2)

فقیر کی آواز میں روتے، چھینکتے اور گڑگڑاتے ہوئے بولنا Cant: n

خاص یا نمایاں زاویہ، ترچھی لکیر یا سطح Cant, a

(برطانوی بولی) جوشیلا، مضبوط، ہٹا کٹا Cant, a

(بول چال Cannot (کی مختصر شکل Can't

لونگ، قرنفل، گرم علاقوں میں پیداہونے والے سدا بہار پودے کے پھول کی کلی Clove (3)

لہسن کی پوتھی، یا گنٹھی کی کلی یا قاس، جوا Clove

(برطانوی) اون اور پنیر تولنے کا یک باٹ جو عموماً ۸پاؤنڈ کا ہوتاہے۔ Clove

ڈاکٹرجمیل جالبی نے اس لغت میں انگریزی الفاظ کی اسم، فعل، متعلق فعل، صفت وغیرہ کی مختلف صورتوں کی وضاحت ہر لفظ کے سامنے کردی ہے۔ مثلاً

مغارہ: زمین میں گہری کھوکھلی جگہ، Cavern, n(1)

کھوہ :غار، کہف، گُپھا

اندر رکھنا یابند کرنا، جیسے کسی غار میں ؛ Cavern, v.t

غار کی شکل میں کھوکھلا کرنا

غار غار؛ غاردار،؛کہفی ؛مجوّفCavernous,a

غاروں سے بھراہوا ؛ غار کا یا غارکی طرح،؛کئی چھوٹے چھوٹے گڑھوں یا درزوں سے بھراہوا،؛مسام دار،؛کثیرالغار،؛چھتّا سا

شیخی بھگارنا: اپنے اور اپنی ملکیت کے متعلق ڈینگیں مارنا (اسم فعل)Boast vi(2)

شیخی خوار: ڈینگیں مارنے والا (اسم فاعل)Boaster,n

متکبر، پرغرور، شیخی خورا(اسم صفت)Boastful

شیخی سے، تفاخر سے، تکبّرسے، تعلّی سے (متعلق فعل) Boastfully

شیخی، نخوت، تفاخر، تکبّر (اسم کیفیت)Boastfullness

فخریہ طور پر، شیخی بگھارتے ہوئے، لاف زنی (متعلق فعل)Boastingly, adv

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں اصطلاح سازی کی روایت کے مطابق بہت سے الفاظ کو مختصر کردیاہے جس سے وہ زیادہ بامعنی ہوگئے ہیں۔ مثلاًرباطہConverter:،گرمابہ Geyser:خوناب : Serumوغیرہ۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس اختر اعی صلاحیت کے بارے میں ڈاکٹر عطش درانی لکھتے ہیں:

> ’’نئی لفظ سازی کے عمل میں اردو کے قومی شخص کا احساس بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہمیشہ ساتھ چنانچہ مقامی اور علاقائی الفاظ کو استعمال کرنے کی سعی ہمیں جابجاملتی ہے جسے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مترادفات کی صورت میں پیش کیاگیاہے اور عموماً ایسے الفاظ لئے گئے ہیں جو اردو کے قدیم و جدیدذخیروں میں روایت کے ساتھ موجود ہیں۔ مقامی زبانوں کے زیر استعمال الفاظ اور تراکیب بھی اس لغت میں عام طور پر ملتی ہیں مقامی طرزِ اظہار کایہ استعمال اسم فاعل اور صفت و موصوف بنانے کے لئے بھی استعمال کیاگیاہے۔ جیسے مکڑی سے مکڑیلا، شکر سے شکریلا،، توند سے توندیلا، گوند سے گوندل، مونچھ سے مچھل، گھنٹی سے گھنٹل وغیرہ واؤ مطف اور زیراضافت کو اردو ہی کی علامات قراردے کر انہیں یورپی اور

مشرقی زبانوں نیز مقامی زبانوں کے الفاظ کی باہمی تراکیب میں بخوبی استعمال کیاگیاہے‘‘۔(۲۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت کے آخر میں ۴صفحات پر مشتمل ایک ضمیمہ شامل کیاہے جس میں ان ۳۵۱، الفاظ کی صراحت کے لئے ان کے اردو انگریزی متبادلات کی فہرست شامل ہے جبکہ انگریزی الفاظ جن اصطلاحات میں استعمال ہوتے ہیں ان کی صراحت متن کے اندر کردی گئی ہے ’۔قومی انگریزی اردو لغت‘ڈاکٹر جالبی کی انگریزی دانی اور اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کے اظہار کی علامت ہے۔’’قومی انگریزی اردولغت‘‘ کے اسلوب کے حوالے سے عبدالعزیز ساحر لکھتے ہیں ؛

’’امتزاجی اسلوب اس لغت کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معنوی حوالے سے اردو زبان کے اردو بزبان کے اردوپن یا آہنگ کو قائم رکھنے کے لئے جولسانی عمل اختیار کیا وہ ان کی لفظ شناسی اور اس کے امتزاجی پہلوؤں کا آئینہ دارہے‘‘۔(۲۱)

’’قومی انگریزی اردولغت‘‘ پر شاہد حمید کے اعتراضات:

’’قومی انگریزی اردولغت‘‘ کے حوالے شاہد حمید کا ایک مضمون سالنامہ The annual of urdu literature, Volume:9میں 1994ء میں چھپا۔ اس مضمون میں شاہد حمید نے ’’قومی انگریزی لغت‘‘ پر چند اعتراضات کئے جنہیں انہیں کے الفاظ میں درج کیاجارہاہے:

(1) This QD is entirely based on an American dictionary, 'Webster's. To me at least, such a choice is patently misguided. American dictionaries are essential tools to understand the intricacies of American English no doubt, but to select one of them as the basis for a lexicon intended primarily for the people of Pakistan must be based on some incontrovertible logic''.(۲۲)

(2) Yet perhaps a more serious shortcoming is the complete absence of a pronunciation guide to lexical items in the QD" (۲۳)

(3) Countless abbreviations are used in English---------Anyway, abbreviations constitute an integral part of any dictionary. The QD has, however completely ignored them". (۲۴)

(4) Just as in Arabic and Persian, a characteristric of English language is its pharasel verbs. The QD does include them but not in a number commensurate with its size. Take, for example, the verb "to get".By adding prepositions and verbs-such as "bout", across", affer, ahead.......... a wast number of idioms are produced. In the QD only those phrasal verbs have been listed that are formed with addition of "across", around", at", "away with", "by", "off", "together" and" up". Then again each idiom offten affords more than one meaning. "Take off" for example, is used in no fewer than eleven senses. Of these only two are given in the QD". (۲۵)

(5) Participles are used in English not only for forming various kinds of tenses but also as nouns and adjectives.In English dictionaries they are seldom entered. However, their absence in English-Urdu dictionaries is acctually left............It is thus crucial to list at least the more complex of such participles". (۲۶)

(6) Finally, as English words and expressions, like any other language,contain multiplicity of meanings, the standard practice is in the west to list them numerically...........The QD on the other hand uses semicolons to separate the different fields of meanings". (۲۷)

ان اعتراضات کے علاوہ شاہد حمید ’’قومی انگریزی اردو لغت‘‘ کے حوالے اس میں جن خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں ان میں اسم توصیف کو اصطلاح قراردینا، مختلف اصطلاحوں کو آپس میں گڈ مڈ کردینا، اصطلاحات کا مبہم ترجمہ، ایک لفظ کے تمام ممکنہ معنی دیتے ہوئے غیر ضروری تشریح و تصریح، انگریزی محاورات کی غلط ترجمانی،امریکن انگلش سے ناواقفیت وغیرہ شامل ہیں۔ مضمون کے آخر میں شاہد حمید رقم طراز ہیں:

(1) "Altogether then, the QD does fill a longstanding need, but only to a degree. Its shortcomings spring, in the main, from two sources: (1) thelack of a clear

conception of the goals underlying its compilation, along with an inadequate sensitivity to the principles of lexicography,and

(2) a rushed attempt to push the work through the press without allowing either the editors enough time to collect this thoughts and think things through or the proofreaders enough time to ensure greater accuracy in printing".(۲۸)

’’قومی انگریزی اور لغت‘‘ میں انگریزی ڈکشنری کو بنیاد بنانے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ میں وضاحت کرچکے ہیں کہ آج انگریزی زبان،برطانوی اثرونفوذ کے تابع ہی نہیں بلکہ اب زیادہ ترامریکی اقتدارو تسلط کے سہارے دنیا میں عام ہورہی ہے------جدید معیاری سائنسی معاشی، مالیاتی کتابوں اور کمپیوٹر پروگراموں میں جوزبان استعمال ہورہی ہے وہ بڑی حد تک امریکی انگریزی ہے۔دوسرااعتراض یعنی انگریزی تلفظ کی عدم فراہمی کے متعلق جمیل جالبی نے نئے مقدمے میں کوئی وضاحت نہیں البتہ اردو تلفظ کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ الفاظ پر اعراب کثرت سے لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح اردو تلفظ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ مخففات کے حوالے سے جمیل جالبی مقدمے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ سارے علوم و فنون کے لئے اصطلاحات اور گرائمر کے مخففات اس لغت میں استعمال ہوئے ہیں انہیں فراہم کردیاگیاہے۔

یہ لغت چونکہ اردوقارئین کے لئے مرتب کی گئی ہے لہذا کسی لفظ یاجملے کی صرفی و نحوی ساخت کی وضاحت کے لئے اردو قارئین کی سہولت کو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔اسی طرح محاورات تشریح کے لئے بھی وہی اختیار کیاہے جوکہ اردو قارئین کے لئے مناسب ہوسکتاہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ لغت،قومی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہے جس کی صراحت جمیل جالبی نے اس لغت کے مقدمے میں کردی ہے لہذا اس لغت کو اردو زبان کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے جبکہ دیگر جن خامیوں کی نشاندہی شاہد حمید صاحب نے کی ہے وہ اتنی سنگین نہیں جواس لغت کی اہمیت کو کم کرسکیں خود جمیل جالبی اس لغت کے بارے میں کہہ چکے ہیں:’’یہ لغت اختصاص نہیں بلکہ عمومی لغت ہے ایسی عمومیت جس میں اختصاص شامل ہے اور ایسااختصاص جس میں عمومیت شامل ہے‘‘۔(۲۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی لغت نگاری کا سلسلہ قدیم و جدید لسانی روایت پر مشتمل ہے۔ایک طرف انہوں نے اردو کے قدیم الفاظ کی لغت مرتب کرکے قدیم اردو کے الفاظ کو محفوظ کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے وہیں اس لغت کی مدد سے قدیم مخطوطات کی تفہیم اردو زبان و ادب کے قارئین کے لئے سہل بنا دی ہے۔ فرہنگ اصطاحاتِ جامعہ عثمانیہ کی تدوین و ترتیب بھی اردو زبان و ادب کے

فروغ اور اسے جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی عمدہ کاوش ہے بالخصوص اس وقت جب کہ اردو زبان کے بطور علمی اور سائنسی استعمال کے حوالے سے شعور میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اردو کو بطور سرکاری زبان کے استعمال کی ہر سطح پر کاوش کی جا رہی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ قومی انگریزی لغت بھی اردو زبان کی ترقی و ترویج کے حوالے سے ان کی کاوشوں کی عملی تصویر ہے۔اگرچہ ان کی ترتیب کردہ قومی انگریزی لغت کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ کسی بھی زبان میں تبدیلی اور بڑھوتری کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔نئے الفاظ کے شامل ہونے کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ متروک بھی ہوتے رہتے ہیں لہٰذا وقت کے تقاضوں کے تحت جدید لغت کی ضرورت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی قومی انگریزی لغت اپنے وقت کے لحاظ سے ایک اردو انگریزی لغت کی ضرورت پوری کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی لغت کے بعد بہت سی ذو لسانی لغات سامنے آئیں لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی ترتیب کردہ لغت کی اہمیت اپنی جگہ موجود ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ رضیہ نور محمد، 'اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ '، (از ۱۴۸۹ تا ۱۹۴۷ء)، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۱۶

۲۔ حسن سیّد،'لغت نویسی '، مشمولہ، لغت نویسی کے مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ،کتاب نما جمعہ نگر،۲۵نئی دہلی،ستمبر۱۹۸۵ء؛ ص ۴۲

۳۔ حنیف کیفی،ڈاکٹر، 'اردو کی دولسانی لغات '، مشمولہ، لغت نویسی کے مسائل، ایضاً، ص۱۴۱

۴۔ اردو تحقیق کی روایت، ایک مصاحبہ (گوہرنوشاہی، ڈاکٹرجمیل جالبی)، مشمولہ،'ادبی تحقیق': مرتبہ، ڈاکٹرجمیل جالبی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۹۴ء ص۔ ۳۶

۵۔ اشفاق احمد،' تعارف'، مشمولہ، 'قدیم اردو کی لغت '، مرتبہ؛ ڈاکٹر جمیل جالبی، باب اوّل، مرکزی اردو بورڈ لاہور، دسمبر ۱۹۷۳ء

۶۔ عبدالعزیز ساحر،ڈاکٹر، 'ڈاکٹر جمیل جالبی، شخصیت اور فن '، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص۹۳

۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،' قدیم اردو کی لغت'، (پیش لفظ)، ایضاً، ص ۸

۸۔ تفصیل کے لئے دیکھئے،مشفق خواجہ، 'قدیم اردو کی لغت،' مشمولہ، 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ،' ایضاً، ص۔۴۲۴۔۴۲۳

۹۔ محمد علی اثر،ڈاکٹر، 'ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق '، مشمولہ، سہ ماہی 'ارمغان' (جمیل جالبی نمبر)، شمارہ نمبر۳، اپریل، مئی، جون ۱۹۹۶ء، ص۱۱۴

۱۰۔ مشفق خواجہ، 'قدیم اردو کی لغت،' مشمولہ، 'جمیل جالبی۔ایک مطالعہ،' ایضاً، ص۔۴۲۴

۱۱۔ محمدعلی اثر،ڈاکٹر، 'ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق '، مشمولہ، 'ارمغان'، ایضاً،ص۱۱۴۔۱۱۵

۱۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،' اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'، پیش لفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، فروری ۱۹۹۱ء،ص(الف)

۱۳۔ وحیدالدین سلیم،مولوی، 'وضع اصطلاحات'، انجمن ترقی اردو، پاکستان (تیسرایڈیشن) کراچی ۱۹۶۵ء،ص ۱۲

۱۴۔ جمیل جالبی،،داکٹر' اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'، ایضاً، پیش لفظ، ص (ب)

۱۵۔ ایضاً، پیش لفظ، ص (الف)

۱۶۔ یعقوب میراں مجتہدی،سیّد،’ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘، مشمولہ ؛ ’جمیل جالبی۔ایک مطالعہ‘، مرتبہ:ڈاکٹر گوہرنوشاہی ایضاً،ص۴۲۶۔۴۲۷

۱۷۔ ’فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ‘(جلد دوّم)، مرتبہ:ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۳ء، پیش لفظ، ص۔ ج

۱۸۔ ’قومی انگریزی اردو لغت‘، مرتبہ ؛ ڈاکٹرجمیل جالبی، طبع اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص۔چھ

۱۹۔ ایضاً۔ ص۔ چھ، سات

۲۰۔ عطش درانی،ڈاکٹر،’اردو لغت کی تدوین اور ڈاکٹر جمیل جالبی‘، مشمولہ، جمیل جالبی۔ایک مطالعہ، ایضاً، ص۴۳۲

۲۱۔ عبدالعزیز ساحر،داکٹر،’ ڈاکٹرجمیل جالبی، شخصیت اورفن‘، ایضاً، ص۹۷

۲۲-Shahid Hamid "The annual of Urdu literature"‘‘،Volume:9,1994 Department of Languages and Cultures of Asia, University of Wisconsin - Madison page 162.

۲۳- same as above ,page 165.

۲۴-same as above, page 165.

۲۵-same as above,page 165-166.

۲۶-same as above,page 166

۲۷-same as above, page 166.

۲۸-same as above, page 175.

۲۹۔ قومی انگریزی لغت،مرتبہ: ڈاکٹرجمیل جالبی، ایضاً۔ ص۶۰

باب پنجم

ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظری اور عملی تنقید: تعارف و تجزیہ

عہدِ حاضر میں اردو ادب ے افق پر جن اہلِ علم کو بطور محقق اور نقاد غیر معمقلی پذیرائی حاصل ہوئی ہے ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بھی نمایاں ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی مختلف حیثیتوں سے نصف صدی سے زائد عرصے سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ڈاکٹر جالبی بطور نقاد،محقق،مترجم،مدون،ماہر تعلیم،ماہر ثقافت،مورخِ ادب اور ماہر لسان کے طور پر اپنی الگ شناخت بنانے میا8 کامیاب رہے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی موجودہ عہد کے معتبر ترین محقق،مورخ اور ناقد ہیں۔بالخصوص ادبی تاریخ نویسی۔ تحقیق و تنقید کے امتزاج سے وجود میں آنے والی ان کی ادبی تاریخ کی چاروں جلدیں اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتب کی روشنی میں ان کے تنقیدہ نظریات اور عملی تنقید کا جائزہ لیا جائے گا۔ڈاکٹر جالبی کی تنقید نظریاتی اور عملی میدان میں اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ عملی تنقید، نظریاتی تنقید سے مختلف اور قدرے مشکل فن ہے۔ مجتبیٰ حسین عملی یا اطلاقی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’عملی تنقید، ناقد کے ادبی ذوق اور اس کے سماجی شعور کا امتحان ہوتی ہے، یہاں نقد براہ راست ادب اور ادیب سے بحث کرتاہے۔ یہاں وہ نظریوں کی بات کرنے کی جگہ ادب سے اب ہی کی زبان میں گفتگو کرتاہے اور اس کے تخلیقی سوتوں تک پہنچنے کی کوشش کرتاہے۔۔اطلاقی تنقید ایک لحاظ سے ادب پارے کی از سرنوتخلیق ہے۔ جس کے توسط سے ہمارے سامنے ادبی تخلیق کے تمام مدارج پیش کردئیے جاتے ہیں۔ یہ ادب کے تخلیقی عمل کی تعبیر بھی ہے اور خالق کے حسن تخلیق کا قصیدہ بھی‘‘۔(۱)

عملی تنقید، شعرونثر کے فن پاروں کو فنی اصولوں کی روشنی میں پرکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی اور تنقیدی نظریات کی روشنی میں بھی تخلیقات کا جائزہ لیاجاتاہے اور بعض اوقات ناقد خود اپنے تاثرات کی روشنی میں فن پارے کی فکری اور فی قدروقیمت متعین کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتاہے۔

اردو زبان کی تشکیل و تعمیر میں فارسی زبان کااثردیگر زبانوں کی نسبت سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح اردو ادب میں تنقید نگاری کی ابتداء مشاعروں میں دی جانے والی اس داد کو قرار دیاجاسکتاہے جس

کے لئے عربی اور فارسی اصطلاحات بکثرت استعمال کی جاتی تھیں۔ تنقید کی یہ روایت اپنے عہد کے صفِ اوّل کے شعراء کی اصلاحوں کے مسوّدوں، تذکروں اور ادبی معرکوں اور مباحث میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اردو ادب میں تنقید کی نسبتاً مستحکم روایت تذکروں کی صورت میں ظہور پذیرہوئی اگرچہ تذکروں میں کی جانے والی تحقیق یک رخی اور فکر ی گہری سے محروم تھی لیکن ان تذکروں میں اُس عہد کے تنقیدی اشارے، آئندہ کی تنقید کے لئے بنیادفراہم کرنے کاسبب بنےفرمان فتح پوری تذکروں کی اس اہمیت کے پیش نظر لکھتے ہیں:’’جب تک ادب و الفاظ کا فن رہے گا، ان کی اہمیت کو نظری اور عملی دونوں قسم کی تنقیدوں میں کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیاجاسکتا۔ شعرو ادب کے سلسلے میں وہ شروع سے تنقید کاجزورہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے‘‘۔(۲)

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جہاں زندگی کے ہرشعبے پراثرات مرتب ہوئے اور انگریزی تہذیب و معاشرت کی علمداری نے ہماری تہذیب و معاشرت کومتاثرکرنا شروع کیاوہیں ادب بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اد ب پر مغربی اثرات کوقبول کرنے کے حوالے سے سب سے پہلے سرسید احمد کی تحریک کا کردار نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ادب کو زندگی کا ترجمان قراردینے کے بعد اس کی افادیت کے حوالے سے مختلف تنقیدی نظریات کو اردو ادب میں فروغ حاصل ہوا۔ سر سیّد احمد خان نے ۱۸۳۱ء سے لے کر ۱۸۵۱ء تک پندرہ کتب تصنیف کیں، جبکہ مجموعی طور پر چالیس کے قریب کتب تصنیف کیں۔ان کتابوں بالخصوص تہذیب الاخلاق،علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ میں جو مضامین قلمبند کئے ان میں سر سیّد کی تنقید کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔15- اگست 1867ء کو دیاگیا، محمد حسین آزاد کا لیکچر بعنوان ’’نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات‘‘ پہلا تنقیدی مضمون قراردیاجاتاہے۔ محمد حسین آزاد اردو میں تنقید کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی تنقید کو تذکروں میں پیش کی گئی تنقید سے اگلاقدم قراردی جاسکتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے بعد مولاناالطاف حسین حالی کو اردو تنقید میں خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی کتاب ’’مقدمہ شعروشاعری‘‘ اردو میں باقاعدہ نظریاتی تنقید کی اوّلین کوشش ہے۔ ڈاکٹر وزیرآغاحالی کی اس حیثیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’حالی کی اوّلیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے پہلی بار اردو تنقید میں نظری تنقید کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔انہوں نے نہ صرف نتقیدکے نظری مباحث کاآغاز کیابلکہ عملی تنقید کے تحت غزل، قصیدہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لینے کی بھی کوشش کی۔ نیز نظری تنقید

کے اصولوں کی روشنی میں بعض شعراء کے بارے میں اپنے تاثرات بھی مرتب کئے''۔(۳)

حالی نے نہ صرف اردو میں نظری تنقید کی بنیاد ڈالی بلکہ ان تنقیدی نظریات کو عملی طور پر استعمال بھی کیا اور ادب بھی تخلیق کیا۔ آزاد اور حالی کے بعد شبلی نعمانی کو اردو کی نظریات اور عملی تنقید کے حوالے سے اہم مقام حاصل ہے۔ شبلی نعمانی کی سب سے اہم تنقیدی تصنیف ''شعرالعجم''ہے۔ ''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد میں ان کے تنقیدی نظریات تفصیل سے ملتے ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر ان کی عملی تنقید کی تصویر پیش کرتاہے۔ اردو رتنقید میں نئے نظریات کے فروغ کے سلسلے میں وہ آزاد، حالی اور شبلی نے اردو تنقیدکا ایسی بنیاد فراہم کی جس پر مستقبل کی اردو تنقید کی عمارت استوار ہوئی۔ مشرقی و مغربی تنقید کے امتزاج کے حوالے سے بھی ناقدین اور محققین اردو زبان و ادب کے فروغ اور بہتری کے خدمات سرانجام دیں۔ ان میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، حبیب الرحمان شیروانی، سید مسعود حسین رضوی ادیب، محی الدین قادری زور، سید سلیمان ندوی، حامد حسن قادری، عبدالماجد دریابادی وغیرہ قابل ذکرہیں۔ ان محقق ناقدین نے نہ صرف اردو تنقید کوآگے بڑھایابھی اردو کے قدیم ادبی سرمائے کی بازیابی اور بحالی میں بھی اہم کرداراداکیا۔

بیسویں صدی میں مغربی ادبی تحریکوں کے اثرات کے اردو ادب میں بھی تنقیدی نظریات اور رحجانات میں تنوع نظر آتا ہے۔ ان رحجانات کی پیروی میں ناقدین مختلف تنقیدی تحریکوں سے وابستہ ہوئے۔ ان تحریکوں میں رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک سب سے اہم ہیں۔ رومانوی تحریک کے تحت جن ناقدین نے تنقیدی عمل کو آگے بڑھایا ان میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورگھپوری، خورشیدالاسلام، فراق گورگھپوری، شیخ عبدالقادر، رشید احمد صدیقی، عابد علی عابد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہم ناقدین میں سجاد ظہیر، اخترحسین رائے پوری، احتشام حسین، ظہیرکاشمیری، ممتاز حسین، فیض احمد فیض وغیرہ قابل ذکرہیں۔ نفسیاتی تنقید کے حوالے جن ناقدین نے اردو زبان وادب کو فروغ دیاان میں میرا جی،ڈاکٹر وحید قریشی،ریاض احمد،محمد حسن عسکری،سیّد شبیہ الحسن،ڈاکٹر سلام سندیلوی،سجاد باقر رضوی اور ڈاکٹر سلیم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔جمالیاتی تنقید کے حوالے سے اردو ادب کے ناقدین میں محمد حسین آزاد،مہدی افادی،نیاز فتح پوری،مجنوں گورکھ پوری،سیّد عابد علی عابد،سیّد وقار عظیم،سجاد انصاری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی اردو ادب کے ان معتبر ناقدین میں شامل ہیں جنہیں مشرق و مغرب کے ادب سے ناصرف مکمل آگاہی ہے بلکہ وہ اپنے اس علم میں عام قارئین کو ابتداء ہی سے مستفید بھی کرتے رہے ہیں۔ ان کی ترجمہ کردہ کتب ''ایلیٹ کے مضامین'' اور''ارسطوسے ایلیٹ تک'' ان کی مغربی ادب سے واقفیت اور دلچسپی کی مظہرہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی اپنی تنقید نگاری کی ابتداء کے حوالے سے ایک انٹرویومیں فرماتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں جب سہارن پور میں ہندومسلم فساد ہورہاتھا ' کرفیو لگاہواتھا اور ہم سب گھروں میں قید تھے تو اس وقت میرے پاس چند کتابیں تھیں ان میں فیض احمد فیض کی نقشِ فریادی بھی تھی۔ نقشِ فریادی اس زمانے میں میراپسندیدہ مجموعہ تھا۔ میں اسے پڑھتااورلطف اندوز ہوتارہتا تھا۔ اسے پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنا چاہئیے، یہ میراپہلا تنقیدی مضمون تھا جومیں نے لکھا جب میں کراچی آیا تو مسوّدہ میرے ساتھ تھا۔ صمد شاہین اور ممتازشیریں کانیادورنکل رہاتھا۔ میں نے مضمون شاہین صاحب کودے دیا جسے انہوں نے نیادور میں شائع کیا''۔(۴)

''نیادور'' میں چھپنے والے اس مضمون کی اشاعت کے ساتھ ہی ڈاکٹرجالبی کی تنقید نگاری کاسلسلہ شروع ہوا جوتقریباً پینسٹھ سالوں پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں ڈاکٹر جالبی تنقید مختلف رنگوں میں جلوہ گرہوتی رہی ہے۔ ان کی تنقیدی کتب میں ان کے نظریاتی تنقید اور عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں ساتھ ساتھ ان کی تالیف کردہ تاریخِ ادبِ اردو کی چاروں جلدوں میں بھی ان کی تنقیدی صلاحیت خوب کھل کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو کے علاوہ ان کی تدوین کردہ کتب، دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، میراجی ایک مطالعہ، کلیاتِ میراجی اور ن۔م۔ راشد ایک مطالعہ میں بھی ان کی عملی تنقید کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی محرکات،تنقید ی نظریات اورعملی تنقید نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی تنقیدی کتب کا تعارف پیش کیا جائے۔

پاکستانی کلچر:

''پاکستانی کلچر۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' ۱۹۶۴ء میں سب سے پہلے شائع ہوئی۔ بعد میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد سے شائع ہوا جبکہ ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹرایاز قادری نے اسے سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ پاکستانی کلچر' کے مباحث کے حوالے سے قیامِ پاکستان کے بعداس کتاب کوسب سے پہلی کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ڈاکٹرجمیل جالبی کی اس کاوش کے بعد پاکستانی کلچر پر مباحث کا آغاز ہواجو تاحال جاری ہے۔ ڈاکٹرجالبی کو اس کتاب کی تکمیل میں ساڑھے تین سال کا عرصہ لگا۔ اس کتاب میں کلچراور اس کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے دس ابواب شامل ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی نے اس کتاب کے مقدمے میں وضاحت فرمادی ہے کہ جہاں جہاں انہوں نے لفظ 'تہذیبی' استعمال کیاہے اسے انگریزی لفظ کلچرل کے معنی مراد لئے جائیں۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں بحیثیت قوم، پاکستانی قوم کو بہت سے مادی اور فکری مسائل کا سامنا کرناپڑا، وہیں پاکستانی شناخت اور کلچر کے کے حوالے سے بھی بہت سے سوالات اٹھائے گئے۔ جن ادباء اور ناقدین نے پاکستانی کلچر کی شناخت اور تعین کے حوالے سے ان مباحث میں حصہ لیا ان میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، صمدشاہین، ممتاز شیریں، انتظار حسین اور ڈاکٹرجمیل جالبی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی اور محمد حسن عسکری ان ناقدین میں شامل ہیں جن کی تنقید اور ڈاکٹرجالبی کی تاریخ نویسی بالخصوص کلچرکی افہام و تفہیم سے عبارت ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ڈاکٹرجالبی کی تنقیدی فکر اور مؤرخانہ بصیرت کی بنیادہی ان کی کلچر شناسی سے عبارت ہے۔ ''پاکستانی کلچر''۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' اس حوالے سے نہایت اہم کتاب ہے کہ اس میں ڈاکٹرجالبی نے کلچرکی تعریف متعین کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب اور کلچر کے تعلق سے پاکستان کے مخصوص قومی مسائل پر کھل کربحث کی ہے۔

۲۔ تنقیداور تجربہ:

''تنقید اور تجربہ'' کو ڈاکٹر جالبی کی سب سے پہلی باقاعدہ تنقید کی کتاب قرار دیا جا سکتا ہےیہ کتاب اگست ۱۹۶۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۲۴ مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی کے تنقیدی افکار کو سمجھنے اور عملی تنقید کے نمونوں کے حوالے سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ 'تنقیداور تجربہ'' کے مضامین کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں ایسے مضامین شامل ہیں جن میں ادبی مسائل کے ساتھ ساتھ ادب کو مختلف عوامل سے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''تنقید اور تجربہ'' کے پہلے دس مضامین کو اس ضمرے میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے حصے میں ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے عملی نمونے موجود ہیں۔ اگلے نو مضامین کو اس حصے میں شامل کیا جا سکتا ہے جبکہ آخری پانچ مضامین میں مغربی ادیبوں اور ناقدین کی فکر وفن کے حوالے سے تعارفی مضامین شامل ہیں۔

''تنقیداور تجربہ''،ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلو کو سمجھنے کے لئے انتہائی مفید ہے اس کتا ب میں موضوعات ادب کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کی دلچسپی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شاعری اور نثر دونوں صنف ادب سے ڈاکٹر جالبی خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ کلاسیکی غزل ہو یا جدید نظم، ناول ہو یا افسانہ ہر صنف سخن کے حوالے سے ان کی تنقید ایک گہرائی اور علمیت لئے ہوئے ایسی علمیت جو محض ادب کے سرسری مطالعے سے پید انہیں ہو سکتی۔ مشرقی ادب، مغربی ادبی رحجانات سے ڈاکٹر جالبی کی گہری دلچسپی ان کے وسعتِ مطالعہ اور صاحبِ فکرنقاد ہونے کی دلیل ہے۔

۳۔ محمد تقی میر۔حیات،سیرت،تصانیف اور مطالعۂ شاعری:

ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم کتاب ’’محمد تقی میر۔ حیات، سیرت، تصانیف اور مطالعہ شاعری‘‘ ہے جو کہ انجمن ترقئ اردو سے ۱۹۸۱ ءمیں شائع ہوئی اس کتاب میں جو مواد شامل کیا گیا ہے اسے ڈاکٹر جالبی نے ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والی تاریخ ادبِ اردو (جلد دوّم) میں من و عن شامل کر لیا تھا۔ اس کتا ب میں ڈاکٹر جالبی نے تفصیل سے میرؔ کے سوانحی حالات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جالبی نے میر کے سوانح کو تحقیقی اصولوں کی روشنی مرتب کیا ہے اور کوشش کی ہے میر کی حیات کے حوالے سے ہر پہلو کی مکمل چھان بین کے بعد اسے کتا ب کا حصہ بنایا جائے۔ جیسا کہ ان کے سالِ پیدائش کے تعین کے حوالے سے وہ مولوی عبدالحق اور سر شاہ سلیمان کے دلائل کو مسترد کرتے ہوئے مختلف تذکروں اور میرؔ کے کلام سے داخلی شواہد کی بنیاد پر۱۱۳۶ھ کو سالِ ولادت اور ۱۲۲۵ھ کو سالِ وفات قرار دیتے ہیں۔سنین کے تعین کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کی احتیاط پسندی ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے۔حتی کہ میر ؔکے چچا اور والد کے سالِ وفات کے تعین کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر جالبی پہلے سے موجود حقائق کو تحقیقی بنیادوں پر پرکھتے ہوئے قبول کرتے ہیں۔ میر کی سوانح قلمبند کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے میر کی حیات کے ہر اہم واقعے کو درج کرنے کے ساتھ ساتھ معمولی تفصیلات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تا کہ میر کی شاعری اور شخصیت کی تفہیم ہو سکے۔میرؔ کی زندگی کے ذاتی حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ میر ؔکے عہد کی تصویر کشی بھی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے جس سے میر ؔکے محرکاتِ شاعری کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ میر کی شخصیت سے وابستہ اُداسی،،مایوسی اور قنوطیت کے تصوّرات کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

4۔ نئی تنقید:

ڈاکٹرجمیل جالبی کے تنقیدی و فکری مضامین پر مشتمل یہ کتاب ’نئی تنقید‘ ۱۹۸۵ء میں پاکستان نیشنل اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جالبی کے ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک تحریر کئے گئے منتخب مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی تعداد۳۲ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جالبی کا تنقید کے حوالے سے امتزاج کا نقطۂ نظرزیادہ واضح صورت میں نظری اور عملی صورت میں ہمارے سامنے آتاہے ۔بقول جالبی:

> ’’اس مجموعے میں،میں نے کلچر کی سطح پر فکرو ادب کے امتزاج اور نئی تنقید اور نئے ادب کے لئے نئے پیمانے اور نئے معیار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دور میں جب ہماری تہذیب پارہ پارہ ہوکر بے سمتی کا شکار ہوگئی ہے اور ہم فکری تہذیبی اور تخلیقی

سطح پر گہرے بحران میں مبتلا ہے، ہمیں اپنی شناخت کے لئے فکری ’تہذیبی‘ تخلیقی، تنقیدی بلکہ زندگی کی ہرسطح پر ’’امتزاج‘‘ کی ضرورت ہے‘‘۔(۵)

ڈاکٹرجالبی تنقید اور ادب کے حوالے سے جس بحران کی نشاندہی کرتے ہیں وہ ان کے مطابق ہمارے اس روئیے کاشاخسانہ ہے جس کے تحت ہمارے ہاں مولاناحالی سے لے کر ابتک اپنے ادب کو مغرب کے اصولوں کے تحت جانچا جاتا ہے اور اپنی روایت،کلچر اور تہذیبی روح کو نظرانداز کردیاجاتاہے۔ڈاکٹرجالبی سمجھتے ہیں کہ اگر ہم تخلیقی طور پر دوبارہ توانا ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تہذیب کے عرفان کے ساتھ ساتھ تخلیقی و فکری شعور کے امتزاج کو بروئے کارلانا ہوگا۔ ’نئی تنقید‘ میں شامل مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے تنوّع کے حامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی افکار عملی تنقید کے نمونے، کلچرشناسی کے حوالے سے مضامین اور مغربی ادب سے ان کی دلچسپی کی عکاسی کرتے مضامین اس کتاب کاحصہ ہیں۔ ’’نئی تنقید‘‘ میں شامل پہلے ۸ مضامین ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی تصورات کو سمجھنے کے لئے اہم ہیں ۔

ڈاکٹرجالبی کی یہ کتاب ’نئی تنقید‘ ان کی تنقیدی فکر، امتزاجی تنقید کے حوالے سے ان کے مضامین اور مغربی ادب سے ان کی دلچسپی کے مختلف مظاہر کے حوالے سے اہم ہے۔ کتاب کے مضامین میں تنوع پایا جاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اپنی تنقیدی فکر کو نہایت وضاحت اور دلائل کی صورت میں پیش کیاہے۔ دوسری طرف ان کی امتزاجی تنقید کے ان کے تنقیدی مضامین پر اطلاق سے یہ مضامین بھی تنوّع کے حامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی دلچسپیوں کا دائرہ، ان کی فکر کی طرح ہی وسیع ہے۔ شاعری، ناول، افسانہ، مغربی ادب کی مختلف اصناف اور قدیم و جدید تنقیدی نظریات سب پرڈاکٹرجالبی گہری نظر رکھتے ہیں۔ جدید و قدیم اردو شاعری سے ان کی دلچسپی کا اندازہ میرؔ ، غالبؔ، اقبالؔ اور سلیم احمد کے متعلق مضامین سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اردو ادب کے منظرنامے پر ابھرنے والی تحریکیں اور مختلف نظریات اوران کے اثرات کو نہایت عمدگی اور گہرے تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں پیش کیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کی یہ کتاب اردو ادب کی تفہیم، ان کے تصوّرِ تہذیب، اور تنقیدی نظریات کی تفہیم میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مضامین ڈاکٹرجالبی کی عالمی ادب سے دلچسپی اور ان کی فکر کی بنیاد کے مآخذات ہونے کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ’’برٹرینڈرسل: سائنس کا پیامبر‘‘ مضمون کے تحت ڈاکٹرجالبی نے برٹرینڈرسل کے فکر کے ارتقاء اور بنیادی فکری نکات کی وضاحت نہایت خوبی سے کی ہے ایزراپاؤنڈ کا مضمون’’سنجیدہ فن کار‘‘ ان کی کتاب ’ارسطو سے ایلیٹ تک‘‘ میں بھی شامل ہے۔ کتاب کاآخری مضمون ’’آئرلینڈ کا جدید ادب‘‘ آئرلینڈ کے ادب کے تعارف کے حوالے سے اہم ہے۔

۵۔ ادب، کلچر اور مسائل:

ادب اور کلچر کے تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کی ایک کتاب ''ادب،کلچر اور مسائل'' کے نام سے ۱۹۸۶ء میں پہلی بار رائل بک کمپنی، کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جالبی کے ۵۴ مضامین اور دو انٹرویوز شامل ہیں۔ کتاب کے مرتب، خاور جمیل ہیں، جن کا د عویٰ ہے کہ اِس کتاب میں شامل مضامین اُن کی ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والی کسی کتاب میں شامل نہیں تھے۔ اس کتاب میں ایک طرف ادب اورکلچر کے تعلق کے حوالے سے مضامین شامل ہیں وہیں ادب کے حوالے سے مختلف سیاسی، سماجی نوعیت کے مضامین بھی شامل ہیں۔ بہت سے ایسے مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں جنہیں ان کی عملی تنقید کے ضمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے اس کتاب میں ادب اور ادب کے حوالے سے مختلف مسائل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین سے ان کے نظریۂادب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی اس کتاب میں کلچر کے حوالے سے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین میں قومی کلچر کے مسائل، قومی کلچر اور لو ک ورثہ، قومی کلچر کا مسئلہ، یکجہتی، پاکستانی ثقافت کے مسائل، قومی یکجہتی، کلچر اور زبان ' شامل ہیں۔ ان مضامین ڈاکٹرجالبی نے کلچر کی تشکیل کے حوالے سے کم و بیش انہی نظریات وخیالات کا اعادہ کیاہے جس کا اظہار و ہ کلچرحوالے سے اپنی کتاب ''پاکستانی کلچر'' میں کرچکے ہیں۔ ادب، ادیب، تصورِ نقد، دانشور، جدیدیت، روایت کے حوالے سے شامل مضامین کے علاوہ ڈاکٹرجالبی کی عملی تنقید کے حوالے سے بھی متعدد مضامین اس کتاب کا حصہ ہیں۔ 'گفتگو۔ ۱'کے عنوان کے تحت کامل القادری سے کی گئی ان کی گفتگو کتاب میں شامل ہے جبکہ' گفتگو۔ ۲'کے تحت اطہر نفیس کے ساتھ ان کی گفتگو کو شامل کیاگیاہے۔ یہ دونوں انٹرویوز ڈاکٹرجالبی کے ادبی نظریات کلچر، شناخت اردو زبان کے مقام اور تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہیں۔

ڈاکٹرجالبی کی دیگر تنقیدی کتب کے مقابلے میں ''ادب کلچر اور مسائل'' اس لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے کہ اس کتاب میں شامل مضامین بالخصوص ڈاکٹرجالبی کے ادب اور کلچر کے مسائل کو سمجھنے میں زیادہ کارگرہیں۔ اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین ادب اور کلچر کے تعلق کے حوالے سے مختلف امور کو زیر بحث لانے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں درپیش مسائل کے حل کی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ بقول احمد ہمدانی:

> ''ادب کو روایت سے جوڑ کر دیکھنے اور اپنے کلچر سے اس کی ہم آہنگی دریافت کرنے پر توجہ جمیل جالبی کے روّیے کی نمایاں خوبی ہے۔ وہ صرف ادب ہی کو کلچر اور ادبی روایت کے آئینے میں دیکھنے کے قائل نہیں بلکہ تمام دوسرے معاشرتی مسائل کے سلسلے

میں بھی وہ اپنے کلچر کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے ان مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ گو یا قومی کلچر ان کی فکر کا بنیادی موضوع ہے وہ زندگی کو نکھارنے، سنوارنے، آگے بڑھانے اور اس کو تبدیل کرنے کے ضرور قائل ہیں لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے مخصوص کلچر کے تقاضوں کے ی مطابقت میں انجام دینے پر زور دیتے ہیں۔ اپنے کلچر سے گہری وابستگی بلاشبہ ان کی شناخت ہے''۔(۶)

۶۔ قومی زبان یکجہتی، نفاذ اور مسائل:

'قومی زبان یکجہتی، نفاذ اور مسائل ' میں ڈاکٹرجالبی کے خطبات اور اردو زبان کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے دئیے مختلف اخبارات کو دئیے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں پہلی بار مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹرجالبی ایک مفکر نقاد ہیں۔ان کی فکر کی بنیاد، قومی کلچر،، قومی تشخص پراستوار ہے۔ اس کتاب میں شامل خطبات اور انٹرویوز قومی زبان کے تحفظ، نفاذ اور درپیش مسائل کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹرجالبی پاکستانی قوم کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حل کے لئے تجاویز بھی پیش کیں ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق پاکستانی قوم کو درپیش مسائل سے نمٹنے کے لئے چند بڑے فیصلے کرنے ہوں گے۔ جوکہ ان کے مطابق یہ ہیں:

''ان بڑے فیصلوں میں ایک بڑافیصلہ سیاسی نظام کاہے، دوسرا بڑا فیصلہ یکساں نظام تعلیم کا ہے۔ تیسر بڑا فیصلہ ان اقدار کا ہے جن پرہمیں اپنی فکر اور نظام کی بنیاد رکھنی ہے۔ چوتھا بڑا فیصلہ معاشی انصاف کا ہے۔ ایسا انصاف جس میں معاشرے کا ہرطبقہ پوری طرح شریک ہو، پانچواں بڑامسئلہ قومی زبان کا ہے جس کے بارے میں ہر روز نئے نئے شکوک و شبہات پیداکرنے میں مصروف عمل ہیں''۔(۷)

قومی زبان کی اہمیت اس حوالے سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ قومی زبان کو پس پشت ڈال کر انگریزی کو اپنا تولیاہے لیکن اس کے نتیجے میں فکری اور تخلیقی زوال کا شکار ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ایک صاحب بصیرت نقاد ہونے کے ناتے اس زوال کے اثرات اپنی تہذیب،قومی یکجہتی اور زبان و ادب پرمحسوس کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں قومی زبان کو اس کا جائزہ مقام دیا جائے تاکہ ہماری بیداری، حقیقی ترقی اور قومی یک جہتی کی منزل قریب سے قریب تر آسکے۔ کتاب کی ابتداء میں قائد اعظیم دوفرامین شامل کئے گئے ہیں جن میں قائد اعظم محمد علی جناح اردو کو

قومی زبان بنانے ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دوزبانوں (بنگلہ اور اردو) کو قومی زبان بنانے کے حوالے سے اپنے تحفظات کا اظہار کیاتھا۔ یہ تقاریر ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء بمقام ڈھاکہ اور ۲۴مارچ ۱۹۴۸ء بمقام ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن پرکی گئیں تھیں۔ اگلے صفحے پر آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کا وہ حصہ شامل کیاگیاہے جس مین اردو کو قومی زبان بنانے اور عملی نفاذ کے لئے تجاویز دی گئی ہیں۔

کتاب میں شامل خطبات میں ڈاکٹرجمیل جالبی نے اردو اور پاکستان کے رشتے پرتاریخی تناظر میں روشنی ڈالتے ہوئے اردو اور پاکستانی کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قراردیا ہے کیونکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے دیگر اسباب میں اردو زبان سے مسلمانوں کی محبت اور اس کی حفاظت کا جذبہ بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں اردو کے علاوہ کوئی اور زبان لینگوافرینکا ہونے کا دعوٰی نہیں کرسکتی۔ اردو کو قومی سطح پر رائج کرنے کے حوالے سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں ارد و میں ا صطلاح سازی کی کمی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق اگر ہم اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوچار ہزار انگریزی اصطلاحات و الفاظ قومی زبان میں شامل کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اردو زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

’’اردو اورمشینی تقاضے‘‘ میں ڈاکٹر جالبی نے اردو زبان کو سرکاری سطح پر رائج کرنے کے حوالے سے تکنیکی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے حل کی تجاویز پیش کی ہیں۔ یہ خطبۂ صدارت ۲۹ جولائی ۱۹۸۵ء کو دیا گیا تھا۔ آج اگر ہم اردو زبان کی کمپیوٹر کے سافٹ ویئر ز کے حوالے سے ترقی دیکھیں تو تقریباًچھبیس سال پہلے درپیش مسائل آج بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ آج اردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے حوالے سے اگر کوئی کمی پائی جاتی ہے تو محض نیت،قوتِ ارادی اور فیصلہ سازی کی کمی ہے۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی کے اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے بعد اردو کو ہر سطح پر استعمال کرنے میں کسی رکاوٹ کا اندیشہ نہیں ہے۔ عام طور پر اردو اصطلاحات کو ثقیل اور ناقابل فہم قرار دے کر ان کو رائج کرنے کے حوالے سے خدشات پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق اگر نصابی کتب میں تواتر کے ساتھ انہیں استعمال کیا جائے گا تو کثرتِ استعمال سے لوگ عاری ہوجائیں گے اور ابلاغ کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا جس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے قانونی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ یہ قانونی اصطلاحات آج ہماری روزمرہ زندگی میں روانی اور عمدگی سے استعمال ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے اس کتاب میں شامل خطبات اور انٹرویوز میں جابجا اردو زبان کو دفتری اور تعلیمی اداروں میں نافذ کرنے کے حوالے سے عملی اقدامات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اپنانے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ اردو اصطلاحات سازی،لغات،نصابی کتب اور کمپیوٹر سافٹ ویئرز کے حوالے سے بھی کافی کام کیا جا چکا ہے۔ ضرورت

اس امر کی ہے کہ قومی یکجہتی اور قومی ترقی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ فکری انتشار کو دور کرنے کے لئے جلد از جلد اردو کو ہر سطح پر رائج کیا جائے۔

۷۔معاصرادب:

ڈاکٹرجالبی کے ادبی، تنقید ی وفکری مضامین کا مجموعہ 'معاصر ادب ' ۱۹۹۱ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ اس کتاب میں ڈاکٹرجالبی کے ۹۹ مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ستر مضامین شعراء کے سوانحی خاکوں، کتب پرتبصروں اور ادبی جائزوں پر مشتمل ہیں۔ سوانحی خاکوں پر مشتمل مضامین میں زیادہ تر ''نیا دور'' کے اداریئے ہیں جو کہ مختلف اوقات میں''نیادور'' میں شائع ہوئے۔ پیش لفظ، ڈاکٹر قاضی عبدالقادر کا تحریر کردہ ہے۔مجموعے میں شامل ابتدائی مضامین، معاصر ادب کی صورتحال، مسائل اور روایت پر مشتمل ہیں۔

ادبی تخلیقات کے ضمن میں جن اصناف کا تجزیہ و تاریخ اس کتاب میں شامل ہیں، ان میں لغت، ہائیکو، بچوں کا ادب اور جدید افسانہ شامل ہیں۔ دومضامین ''اردو لغت گوئی کا تاریخی ارتقاء'' اور ''ہائیکو کے بارے میں'' میں ڈاکٹرجالبی نے مختصراً ان دونوں اصناف کے اردو میں ارتقاء پرروشنی ڈالی ہے بالخصوص ہائیکو کے پس منظر اور اردو میں ہائیکو کی ہئیت کے حوالے سے کئے گئے تجربات کو جاننے کے لئے یہ مضمون بہت سی معلومات فراہم کرتاہے۔ اس کتاب میں موجود ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی نظریات اس بات کے غماض ہیں کہ ادب اور ادیب کے حوالے سے جن نظریات کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''تنقید اور تجربہ'' (سن اشاعت ۱۹۶۷ء) میں کیاتھا۔ وہی نظریات تقریباً ۲۴ سال بعد اشاعت پذیر ہونے والی کتاب ''معاصر ادب'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ گویا ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی فکر کی بنیاد جن اصولوں پرقائم تھی ان میں بدلتے وقت کے ساتھ تغیرنہیں آیا بلکہ ان کی فکر مزید متواز ن،مدلل اور پختہ ہوکرہمارے سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کا تنقیدی وژن جن نظریات پرقائم ہے وہ نظریات ٹھوس اور روایت سے وابستگی کے اصولوں پرقائم ہیں۔ ڈاکٹرجالبی، ایک ادیب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جدت کو اپنانے کے ساتھ ساتھ ادبی روایت سے اپناربط قائم رکھیں وہیں ڈاکٹرجالبی کی تنقید میں بھی جدید عصری عناصر کی شمولیت کے باوجود اپنی مذہبی،تہذیبی اقدار سے وابستگی،ان کی روایت سے وابستگی کی مظہرہے۔ جدید مغربی نظریات کے فہم و ادراک اور انہیں اپنی فکر کاحصہ بنانے کے باوجود ڈاکٹرجالبی کی تنقید اپنی تہذیبی اقدار کی عکاسی ہے۔ یوں ادب اور کلچر کے اشتراک سے جس تنقید ی بصیرت کی توقع ڈاکٹرجالبی، اردو ناقدین سے کرتے ہیں، ڈاکٹرجالبی نے خود عملی طور پر اس کی صورت گری اپنے تنقیدی مضامین کی نظری و عملی صورتوں میں کردی ہے۔

۸۔ ادبی تحقیق :

ادبی تحقیق پہلی بارجون ۱۹۹۴ ء میں شائع ہوئی، ادبی تحقیق ' اس حوالے سے اہم کتاب ہے کہ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے فنِ تحقیق کو ادب و شاعری کے بنیادی مسائل کی تفہیم کے لئے استعمال کیاہے۔ اس کتاب میں اصولِ تحقیق اور تحقیقی طریقۂ کار کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرجالبی کی تحقیقی کا وشوں کی حامل تصانیف کا جائزہ بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کو اطلاقی تحقیق کے حوالے سے بھی اہم کتاب قرار دیاجاسکتاہے۔ اس کتاب میں ادب کے فکری، تنقیدی، لسانی و تاریخی پہلو اجاگر کرنے کے لئے متعددمضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی تدوینی تحقیقی خدمات کے حوالے سے ابواب شامل ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون ''تحقیق کے جدید رحجانات'' ادب کے حوالے سے تحقیق کی اہمیت، تحقیق و تنقید کے تعلق، اردو تحقیق کے حوالے سے درپیش مسائل اور جدید ادبی تحقیقی رحجانات کو سمجھنے کی عمدہ کاوش ہے۔''اردو تحقیق کی روایت ایک مصاحبہ'' کے نام سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور ڈاکٹرجمیل جالبی کے درمیان ہونے والی گفتگو میں ڈاکٹرجالبی کے تصور تحقیق، تحقیقی طریقۂ کار، اردو تحقیق کے مسائل، اردو تحقیق کی روایت، اردو زبان کے حوالے سے اہم تحقیقی کارناموں، جامعاتی تحقیق کے نقائص، ڈاکٹرجالبی کی تحقیقی و تدوینی خدمات اور پاکستان میں اردو تحقیق کا مستقبل اور اردو تحقیق کی بہتری کے حوالے سے امور پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی نظریات کا جائزہ:

ڈاکٹرجالبی کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ تنقید نگاری کے حوالے سے ان کے محرکات کاکھوج لگایاجائے۔ڈاکٹرجالبی اپنے ایک انٹرویومیں اس حو الے سے فرماتے ہیں:

> ''جب میں نے تنقید نگاری کا آغاز کیا تو ایک طرف ان لوگوں پڑھا جوبڑی تنقید لکھ رہے تھے جیسے ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز، سی ڈے لیوس، ہربرٹ ریڈر وغیرہ۔ساتھ ہی اپنے اردو لکھنے والے جیسے مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، احتشام حسین، اخترحسین رائے پوری، حسن عسکری وغیرہ کوبھی ذوق و شوق سے پڑھا، ساتھ ہی شبلی، حالی اور آزاد کا بھی مطالعہ کیا۔۔۔۔جہاں تک ان نقادوں کے اثرات کا تعلق ہے تو میں نے ان کااثر قبول کیا مگر اس حد تک جتنا وہ میری طبیعت سے مناسبت رکھتے تھے۔ ایلیٹ مجھے سب سے زیادہ پسند تھا پھراثرات کی بات یہ ہے کہ اگر خود آدمی کا تخلیقی و فکری سفر جاری رہے تو ہرپل ہرلمحہ بدلتے رہتے ہیں ایسے میں

کسی ایک ادبی شخصیت کااثر ذہن پرقائم ودائم نہیں رہتا۔ یہ تو اسی وقت قائم رہ سکتاہے جب ذہین کا سفر رک جائے ایسے میں منظر بھی ٹھہرجاتاہے۔ اثرکی بات دو اور دو چار کی نہیں ہوتی بلکہ ذہن میں اپنا رنگ چھوڑتے ہیں اور یہ رنگ دوسرے رنگوں اور خود لکھنے والے سوچنے والے کے ذہن کے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیارنگ،ایک نیاروپ بنالیتاہے اسی سے امتزاج پیداہوتاہے''۔(۸)

ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی محرکات سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ انہیں مشرق و مغرب کے ادب سے نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ انہوں نے مغرب ناقدین بالخصوص ایلیٹ کے اثرات کو نہ صرف قبول کیاہے بلکہ ان کے تنقیدی افکار اور ادبی کارناموں کے حوالے سے اس اثر کو بالخصوص محسوس بھی جاسکتاہے۔جیساکہ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اردو کابہترین نقاد اسے قرار دیاتھا جس کی دونوں آنکھیں روشن ہوں یعنی جو مغرب و مشرق کے ادب سے واقفیت رکھتاہواس حوالے سے ڈاکٹرجالبی کو اردو کا بہترین نقاد قرار دیاجاسکتاہے۔ بلکہ بقول ڈاکٹرمحمد احسن فاروقی:

''میں بیس برس سے دیکھ رہاہوں کہ ایک جمیل صاحب ہی ہیں کہ جن دونوں آنکھیں ہی روشن نہیں ہیں بلکہ نظر بھی سیدھی ہے اور اس لئے وہ ادب کو بالکل صاف اور صحیح دیکھ رہے ہیں اور جواندازہ لگاتے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح ہوتاہے۔ ساتھ ساتھ ان کی نظرمنفرد ہے اور جوبات وہ کہتے ہیں وہ سب سے الگ اور نئی ہوتی ہے''۔(۹)

ڈاکٹراحسن فاروقی اپنے مضمون ''جمیل جالبی کی تنقید نگاری'' میں ڈاکٹرجالبی کی تنقید نگاری اور کلچر شناسی کو میتھیو آرنلڈ اور ایلیٹ کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ احسن فاروقی کے مطابق میتھیوآنلڈ نے شاعری سے تنقید کا اور تنقید سے کلچر کا سراغ لگایا جس سے یہ ثابت ہوا کہ ادب کا مخرج کلچر ہے اور تنقید کوکلچر ہی کے مطالعے سے شروع ہوناچاہئیے۔ ڈاکٹرجالبی کے زیادہ تر تنقیدی مضامین میں کلچر اور اس کے رحجانات کا مطالعہ پس منظر میں موجود ہے۔اور میتھیو آرنلڈ کی ''کلچراینڈانارکی'' طرح یا ایلیٹ کی ''ٹوورڈس اے ڈیفینیشن آف کلچر'' کی طرح 'پاکستانی کلچر' ڈاکٹر جالبی کی اوّلین تصنیف ہے۔ہے۔ ڈاکٹراحسن فاروقی ''پاکستانی کلچر'' کو ڈاکٹرجالبی کی تنقید نگاری سے الگ نہیں بلکہ اسے ڈاکٹرجالبی کی تنقید نگاری کا''تمہید یہ''قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹرانور سدید بھی احسن فاروقی کی اس رائے سے متفق نظرآتے ہیں جب وہ لکھتے ہیں کہ''کلچر کو جمیل جالبی نے اپنے افکار و نظریات کے اظہار کا اولین وسیلہ بنایا''(۱۰)

قیام پاکستان کے بعد جہاں بحیثیت قوم، پاکستانی قوم کو بہت سے مادی اور فکری مسائل کا سامنا کرناپڑا، وہیں پاکستانی شناخت اور کلچر کے کے حوالے سے بھی بہت سے سوالات اٹھائے گئے۔ جن ادباء اور ناقدین نے پاکستانی کلچر کی شناخت اور تعین کے حوالے سے ان مباحث میں حصہ لیا ان میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، صمدشاہین، ممتاز شیریں، انتظار حسین اور ڈاکٹرجمیل جالبی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی اور محمد حسن عسکری ان ناقدین میں شامل ہیں جن کی تنقید اور ڈاکٹرجالبی کی تاریخ نویسی بالخصوص کلچرکی افہام و تفہیم سے عبارت ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ڈاکٹرجالبی کی تنقیدی فکر اور مؤرخانہ بصیرت کی بنیادہی ان کی کلچر شناسی سے عبارت ہے۔

''پاکستانی کلچر''۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' اس حوالے سے نہایت اہم کتاب ہے کہ اس میں ڈاکٹرجالبی نے کلچرکی تعریف متعین کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب اور کلچر کے تعلق سے پاکستان کے مخصوص قومی مسائل پر کھل کربحث کی ہے۔ پاکستان میں مختلف مقامی ثقافتوں کی الگ الگ شناخت کے علاوہ مشرق و مغرب کے نظریات کے تصادم کے نتیجے میں کلچر کے حوالے سے کسی ایک رائے پر اتفاق رائے پایاجانا ناممکن نظرآتاہے۔ دنیا بھر میں بالعموم کلچر سے مراد ایسے مادی اور روحانی اقدار کے امتزاج کو قراردیاجاتاہے، جوایک معاشرہ اپنی آنے والی نسلوں تک منتقل کرتاہے۔ قیام پاکستان کے بعد مادی اور روحانی اقدار کے انتشار اور تقسیم کے باعث پاکستانی کلچر کی شناخت کے حوالے سے ابہام اور تضادات پیداہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ قیام پاکستان کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور فسادات نے جہاں ہرطبقے کو متاثر کیا وہیں مشترکہ انسانی اقدار کی پامالی اور انسانیت کی تذلیل کے مظاہرنے قومی شناخت، قومی کلچر اور کلچر کے روحانی و مادّی عناصر کے حوالے سے بھی سوالات اٹھنے شروع ہوئے۔ ڈاکٹرجمیل جالبی اسی لئے کلچر کے مسئلے کواپنی بقاکا مسئلہ قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی اس کتاب کا پہلا باب' آزادی، تہذیبی مسائل اورتضاد '، قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئے انہیں مادی اور فکری مسائل پرغور و فکر کی دعوت دیتاہے۔ آزادی کے بعد 'اجتماعیت' اور 'یک جہتی' کے فقدان نے بہت سے سوالات کو جنم دیا۔ بقول جالبی:

> ''سارا معاشرہ اسلا م کے عظیم اصولوں اور پاکستان کے عظیم آدرش کے باوجود تنگ نظری، تعصب، علاقہ واریت اور تقلیدانہ ذہنیت کا کیوں شکار ہوا؟ کہیں ہماری موجودہ روش اور ہماراموجود نظامِ حیات فراریت کی ایک شکل تونہیں ہے۔ ہمارا ماضی کیاہے اور اس سے ہمارا کیارشتہ ہے ؟کیاہم ماضی کے تاریخی بہاؤ کامنطقی نتیجہ ہیں ؟اگر ہیں تو اس کی کیانوعیت ہے ؟مذہب زبان، مادیت اور معاشرتی

اتحاد کی سطح پر ہم کیاکررہے ہیں ؟ کیاہمارا اپنا کوئی کلچر ہے ؟اگرہے تو اس کی کیانوعیت ہے ؟اور اگرنہیں ہے تو اسے بنانے اور مشکل کرنے میں ہم نے اب تک کیاکیاہے ؟''۔(۱۱)

ڈاکٹرجالبی پاکستانی معاشرے کے تضادات کوواضح کرتے ہوئے معاشرتی انتشار، خیالات و عقائد کی قدامت، مغربی تہذیب کواپنانے کی خواہش اور معاشرے کے افراد کی ناآسودہ خواہشات کومعاشرتی اور تہذیبی زوال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے تہذیبی خلااور تضاد کے مظاہرجابجا نظرآتے ہیں۔ بالخصوص اپنے کلچر کے تحفظ کے حوالے سے ان پڑھ طبقہ، تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تہذیب و روایت سے محبت کی بجائے اسے قطع تعلق کرنے کو وجۂافتخار تصوّر کرتاہے۔ اسی تضادکی وجہ سے ایک طرف ہم اپنے تہذیبی رشتے، موہنجوداوڑ اور ہڑپہ کے کھنڈرات میں تلاش کرتے ہیں تو دوسری طرف ہمارے ذہن میں ماضی کے رشتے جغرافیائی حدبندیوں کے ساتھ اس طرح ابھرتے ہیں کہ ہم لاہور کی شاہی مسجد سے تو اپنائیت محسوس کرتے ہیں لیکن تاج محل سے نہیں۔ ڈاکٹرجالبی اس روّئیے کو قومی المیہ تصور کرتے ہیں۔ اس تضاد کے نتیجے میں ہندومسلم ثقافت کے ہزار سالہ ورثے سے ہماری لاتعلقی نے قومی یکجہتی کو نقصان پہنچایاہے۔ کیونکہ بغیراجتماعی ماضی کے کسی قوم کی تشکیل ناممکن ہے اور بغیر ماضی کے کلچر کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ ڈاکٹرجالبی قومی یکجہتی کے لئے مذہب کو ایک اہم عنصرقرار دیتے ہیں لیکن واحد عنصر قرارنہیں دیتے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کے حوالے سے محض مذہب کو اتحاد قائم رکھنے کا ذریعہ سمجھنے کے حوالے سے ان کے خدشات بالآخر درست ثابت ہوئے۔ ڈاکٹرجالبی کی یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان پائے جانے والے امتیاز ات (بالخصوص کلچرکے حوالے سے) مستقبل میں ان دونوں کی تقسیم کا سبب بنے اور ڈاکٹرجالبی کا یہ نظریہ درست ثابت ہوا کہ اگران دونوں حصوں کے درمیان قومی یکجہتی کے لئے مذہب کے علاوہ کلچر کے عنصر پر بھی زور دیاجاتاتو شاید یہ حادثہ رو نما نہ ہوتا۔ ڈاکٹرجالبی ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ تہذیبی مسئلہ کو قراردیتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں بیزاری،پسپائیت اور کھوکھلا پن نظرآتاہے۔ معاشرے کو ان مسائل سے نجات دلانے کے لئے ضرور ی ہے کہ مختلف صوبوں کے درمیان تہذیبی اشتراکات تلاش کرکے مشترکہ کلچر کی بنیاد رکھی جائے تاکہ زندگی میں نئے معنی پیداہوسکیں۔

ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی فکر میں'خیال' کے تصور کو بہت اہمیت حاصل ہے۔'کلچر' کے لئے ''خیال'' کی اہمیت اجاگرکرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

’’خیال ہرزندہ کلچر میں ایندھن کی حیثیت رکھتاہے----------خیال کی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے ذہن میں ایک ایساماحول پیداکردیتاہے کہ اس کی ساری زندگی اسی کے تابع ہوجاتی ہے۔ زبان، عبادات و اطوار، فکر، عقائد، طرز معاشرت، رسم و رواج، معاشرتی ادارے، مادی و روحانی اقدار، سب اسی کی کوکھ سے پیداہوتے ہیں اور انہی چیزوں کے مجموعے کا نام کلچر ہے۔ جب تک کلچر کی آگ میں خیال کاایندھن مسلسل مہیا کیاجاتارہتاہے،کلچر زندہ اور متحرک قوت کی حیثیت سے معاشرے میں تخلیق کی آگ روشن رکھتاہے اور جب خیال کا ایندھن مہیاہوجانا بند ہوجاتاہے یہ آگ سرد پڑنے لگتی ہے‘‘(۱۲)

ڈاکٹرجالبی ’خیال‘ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’خیال کو میں یہاں فلسفے کی وسیع معنی میں استعمال کررہاہوں اور فلسفے سے میری مراد خیال کی وہ روایت ہے جوکسی معاشرے کے ذہنی ماحول اور اس معاشرے کے لوگوں کے عقائد، روایات اور تاریخ سے مرتب ہوکر اس کا مزاج اور نظام اقدار متعین کرتی ہے۔ کسی معاشرے کا کلچر ہمیشہ اسی ذہنی ماحول سے متاثر ہوتاہے اوریہ ذہنی ماحول اس معاشرے کے فکروعمل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔‘‘(۱۳)

کسی قوم کے حقیقی فلسفے کی تشکیل میں اس معاشرے کا ذہنی ماحول، تاریخ اور روایت اہم کردار اداکرتے ہیں۔ ہمارے ذہنی ماحول اور معاشرتی ماحول کے درمیان تضاد کے نتیجے میں ’خیال ‘ کی تشکیل نہیں ہوپارہی جو کلچر کی تشکیل کی بنیاد ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے کلچر کے تشکیلی عناصر سے بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے ہمارے ہاں ’کلچر‘ کے لئے مستعمل الفاظ تہذیب اور ثقافت کا تجزیہ کرتے ہوئے لفظ تہذیب کوُ ان چیزوں سے متعلق قرار دیا ہے جن کا تعلق ہمارے ’’ظاہر‘‘ ہے جبکہ ثقافت کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کا تعلق ہمارے ’ذہن ‘ سے ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ان دونوں الفاظ کے معنی کے اشتراک کے لئے لفظ ’کلچر‘ استعمال کیا ہےڈاکٹر جالبی کے مطابق اس کتاب میں انہوں نے جہاں لفظ کلچر کا استعمال کیا ہے اس سے مراد تہذیب و ثقافت ہی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کلچر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’کلچر اس کل کانام ہے جس میں مذہب و عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر،رسم و رواج، افعالِ ارادی اور

قانون، صرفِ اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتاہے----کلچر میں زندگی کے مختلف مشاغل، ہنراور علوم وفنون کو اعلیٰ درجے پر پہنچانا، بری چیزوں کی اصلاح کرنا، تنگ نظری اور تعصب کو دورکرنا، غیرت و خودداری، ایثار و وفاداری پیدا کرنا، معاشرت میں حسن و لطافت، اخلاق میں تہذیب، عادات میں شائستگی، لب و لہجہ میں نرمی، اپنی چیزوں، روایات اور تاریخ کو عزت اور قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کو بلندی پرلے جانابھی شامل ہے‘‘-(۱۴)

ڈاکٹرجالبی کلچر کے دائرہ کا ر کا تعین کرنے کے بعد کلچر کے حوالے سے جن شرائط کو زیربحث لائے ہیں ان میں باضابطگی کے علاوہ خیال کے ارتقاء کو نہایت ضروری تصور کیا گیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے نقطۂ نظر کے مطابق زندہ کلچر کی نشانی ہے کہ اس میں خیال کا ارتقاء جاری رہتاہے جبکہ مردہ کلچر میں ’’خیال‘‘ کاارتقاء رک جاتاہے جس کے نتیجے میں کلچر کا نظام صرف معمول یا عادت بن کر ظاہری رسوم ورواج میں معتبر ہوکر بے روح ہوجاتاہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر نسل اپنے اسلاف کے افکار و خیال کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنے وقت اور ضرورت کے مطابق از سرنو ترتیب دے تاکہ خیال کا ارتقاء جاری رہ سکے۔ ڈاکٹرجالبی برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے ترقی پسند نظام خیال کی ترویج سے نئے کلچر کی تشکیل، اکبر کے عہد حکومت میں خیال کے زیر اثرکلچر کی ترقی اور جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں خیال کے ارتقاء اور کلچر کے عروج کو ’’خیال‘‘ کی ا ہمیت کے حوالے سے بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ اس طرح اور نگزیب کے عہد سے خیال کا ارتقاء رک جانے اور بتدریج کلچر کے زوال کی نشاندہی کرتے ہیں جوبالآخر سات سمندر پار سے آنے والی ایک دوسری قوم کے قوی، متحرک اور ترقی پذیر کلچر کے غلبے پر منتج ہوا۔ لکھنؤی معاشرے کو بھی اسے سلسلے کی کڑی قرار دیاجاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی پاکستانی کلچر کی تشکیل کے حوالے سے درپیش مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے قومی یکجہتی کو سب سے اہم تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی قومی یکجہتی کی بنیاد اس قومی روح پررکھنا چاہئے ہیں جوقومی کلچر کے تعین میں مددگار ثابت ہو۔

قومی کلچر اور علاقائی کلچرکا انضمام ایک ایسی وحدت کوفروغ دیتاہے جوکہ قومی یکجہتی کو فروغ دیتاہے۔ ڈاکٹرجالبی پاکستانی کلچر کے تعین کے حوالے سے ا اس رویے کی نشاندہی کرتے ہیں جس کے مطابق یک طرف محض ہزاروں سال پرانی تہذیبوں مثلاً موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا سے پاکستانی قوم کے تہذیبی رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف ہندوستان میں موجود مسلم

کلچر کی علامات مثلاً دہلی کی جامع مسجد، تاج محل اور مسجد قوۃ الاسلام وغیرہ سے قومی و ملی تہذیبی رشتے کو کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں ''ہمارے آگے پیچھے کی سیڑھیاں غائب ہوگئیں اور ہم کھلے صحرا میں اکیلے رہ گئے''۔(۱۵)

موہن جودڑو اور ہڑپہ سے تہذیبی رشتے استوار کرنے کی ڈاکٹر جالبی اس لئے مذمت کرتے ہیں کہ ان قدیم تہذیبوں کا ہمارے روحانی تجربات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ان قدیم تہذیبوں کے ساتھ ہمارارشتہ خارجی طور پر طوراستوار کیا جا سکتا ہے لیکن روحانی تجربے کاحصہ نہیں بنایاجاسکتا۔ ڈاکٹرجالبی نے تقریباً ایک ہزار سالوں پر مشتمل ''ہندمسلم ثقافت'' کو پاکستانی قوم کا ورثہ قراردیا ہے۔ اس ورثے کی نشانیاں ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے طول وعرض میں بکھری ہوئی ہیں جبکہ ہماری زبان، ہمارالباس، ہمارارہن سہن، ہمارے کھانے، ہمارے آداب معاشرت، ہمارے روزمرہ کے اوزار، رسم و رواج، مصوّری، موسیقی، شاعری اور ہمارامزاج اسی تہذیب کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی منفرد کلچر کی وجہ سے مسلمان ہندو، معاشرے میں ضم نہ ہوسکے اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

مذہب کے ترتیب کردہ نظامِ حیات کے نتیجے میں تہذیبی ادارے وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا ایک طرف قوالی، خطاطی، نقاشی ہمارے مذہب کا بھی اتنا ہی جاگزیر حصہ ہے جتنا اذان، مسجد اور محراب ہمارے کا کلچرکاحصہ ہے۔ کلچر کی سطح پرآئے بغیرمذہب محض کتابی علم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق مذہب کا زندگی کے ساتھ متحرک رشتہ قائم رکھنے کے لئے آزادعلماء اور ذہین مفکرین، مذہب کی اصلی، آدرشی شکل، نئے مسائل اور زمانے کے جدید تقاضوں کے روشنی میں معاشرے کے سامنے باربار پیش کرتی رہیں تاکہ معاشرے اور مذہب کے رشتے کو مضبوط کیاجاسکے۔ ہمارے مذہبی و تہذیبی تضا د نے ایک طرف بحیثیت قوم ہمارے تخلیقی عمل کو متاثر کیاہے اور دوسری طرف ہمارانظام خیال بھی منجمد ہوچکاہے۔

'مذہب اور کلچر' کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے ڈاکٹرجالبی ' برصغیر کی سوسالہ تاریخ میں مذہبی فکر کے حوالے سے اہم مفکرین کے نقطہ نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے سرسید احمدخان،مولانا محمد قاسم نانوتوی،شبلی نعمانی، مولانا عبدالکلام آزاد، علامہ اقبال، غلام احمدپرویز، مولانامودودی کی فکر کے منابع کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان مفکرین کے فکری تضادات کی بھی نشاندہی کی ہے جس کے نتیجے میں مذہبی تصورات کی نئی نئی شکلیں ظہور میں آتی رہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق مادی ترقی اور کلچر کا ارتقاء انسانی زندگی کی بقا، معاشرتی زندگی کی نشوونما اور تہذیبی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے ان ضرورتوں کو پوراکئے بغیرانسانی معاشرہ حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوسکتا۔ انسان کی ارتقائی ترقی کاجائزہ لیتے ہوئے مادی وسائل کے استعمال کی اہمیت اجاگرکرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی موجودہ عہد میں توانائی کی پیداوار اور پیداوار کے ذرائع کو سب سے اہم تصورکرتے ہیں ان کے مطابق توانائی کی

تسخیرو تصرّف انسانی کلچرکی ترقی کی بنیاد ہے۔ جس قدر جدید ذرائع پیداوار استعمال کئے جائیں گے۔ کلچر بھی اسی قدرترقی یافتہ ہوگا۔ اس حوالے سے ڈاکٹرجالبی مغربی اقوام کی ترقی کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی دعویٰ کرتے ہیں کہ توانائی کی تسخیر و تصرف کے ساتھ نظامِ خیال بھی بدلتارہتاہے۔ ان کے مطابق:''ضرورت اس امرکی ہے کہ ہم اپنی ساری فکر اور اس کے بنیادی اداروں کا از سرنوجائزہ لے کر اس شکل کوبروئے کارلائیں جوبحران اور تضاد کو دور کرکے قوتِ حیات اور عملِ ترقی کو تیز کردے۔ اسی مسئلے میں ہمارے معاشی مسئلے کا حل موجود ہے اور نئے طرز فکر و عمل کاحل بھی''۔(۱۶)

ڈاکٹرجالبی مشترک کلچر کی بنیاد کے لئے مشترک زبان کی اہمیت کے وکیل ہیں۔ مشترک زبان کسی بھی معاشرے میں اپنے اجتماعی اور قومی وجود کا شعور پیداکرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک زبان بولنے والے کسی دوسری زبان کے بولنے والوں کی نسبت کلچر کی سطح پرایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ کلچر چونکہ زبان میں ظاہرہوتاہے اس لئے زبان کلچر کی ایک اہم علامت ہے۔ پاکستانی معاشرے میں زبانوں کے طور پر پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی، پشتو اور براہوی وغیرہ مستعمل ہیں جبکہ انگریزی سرکاری سطح اور اردو قومی زبان پر استعمال کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں قومی کلچر کے فروغ کے حوالے سے زبان کی اہمیت کاعنصر پیچیدگی اختیار کرگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی اس مسئلے کوحل کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک طرف علاقائی زبانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیاجائے لیکن یہ پھلنا پھولنا ان معنوں میں نہ ہو کہ یہ علاقے، قومی کلچر کے تصور سے بے نیاز ہوکر اپنی الگ شخصیت بنانے میں مصروف نہ ہوجائیں۔ دوسری طرف اردو کوقومی زبان کے طور پر رائج کرکے وسیلہ اظہار بنایاجائے۔ جس سے قومی یکجہتی کے عنصر کو بھی فروغ ملے گا۔(ڈاکٹرجالبی نے زبان اور کلچر کے تعلق کے مباحث میں بنگلہ زبان اور مشرقی پاکستان کو بھی مدنظر رکھاتھا)۔ ڈاکٹر جالبی کی رائے میں:

> ''اگرزبان کے مسئلے کو ایمانداری اور خلوصِ دل کے ساتھ اس سطح پر حل کیاجائے تو ایک طرف علاقائی زبانیں ترقی کریں گی اور دوسری طرف قومی زبانیں پھل پھول کر ہمارے قومی مزاج اور تہذیبی روح کااظہار کرسکیں گی۔ اس طرح علاقائی اور قومی زبان میں جذب و قبول کا عمل بھی تیز ہوجائے گا اور ایک کی قوت دوسرے کی قوت بن جائے گی''۔(۱۷)

ڈاکٹر جالبی نے زبان اور اس کے رسم الخط کی اہمیت پرروشنی ڈالتے ہوئے اس تعلق کو تہذیب اور تشخص کے حوالے سے سمجھانے کی سعی فرمائی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو رسم الخط کو ختم کر کے د یوناگری لپّی اختیار کرنے کے خلاف ہیں۔ان کے مطابق اس عمل سے ہم اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے کلچر سے روگردانی کے مرتکب ہوں گے۔ بقول جالبی''رسم الخط تو ہرزندہ زبان کے جسم کی کھال کا درجہ رکھتاہے جیسے ہی اس کی کھال اتاری جائے گی جسم و جاں کا رشتہ بھی منقطع ہوجائے گا''۔(۱۸) ڈاکٹرجالبی نے اردو کے موجود ہ رسم الخط کو قائم رکھنے کے حوالے سے جودلائل پیش کئے ہیں وہ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق اردو رسم الخط ہماری روزمر ہ کی زندگی اور دفتری و تعلیمی امور کو سرانجام دینے کے لئے کافی ہے اگر اس میں کوئی کمی ہے تو اسے اہل علم کی مدد سے دورکیاجاسکتاہے۔ اردو زبان کا رسم الخط بدلنے سے ہم اس ہزار رسالہ تخلیقی کاوشوں سے محروم ہوجائیں گے جو اس زبان کا ورثہ ہیں۔ اردو ایک زندہ اور متحرک زبان ہے جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی مکمل گنجائش موجود ہے جبکہ ہندی زبان ایک مردہ زبان سے اپنی اصطلاحات اور مرکبات لے رہی ہے۔ اگر ہندی عام بول چال کی زبان سے قریب ترہوگی تو اس کی آوازیں بھی اردو سے قریب ترہوں گی لہذا اردو رسم الخط کو ختم کرنے کی بجائے اسے اسکولوں اور کالجوں کی سطح پر ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

کلچر کی تشکیل کے حوالے سے ذہنی آزادی کوبنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے خیال میں آزادیء اظہار کا احساس دراصل حقوق کے تحفظ کااظہار ہے۔ اگرافراد معاشرہ کوحقوق میسر ہوں گے تو نتیجتاً فرائض کی انجام دہی بھی سرگرمی سے ہوگی۔ ایک ادیب صداقت کے اظہار کو اپنی ذمہ داری تصور کرے گا توتخلیقی جذبات کی نموہوگی جس سے کلچر کی نشوونما میں مدد ملے گی۔ معاشرتی انصاف کے تقاضے بھی اظہار رائے کی آزادی کے نتیجے میں پورے ہوسکتے ہیں۔ ذہنی آزادی کو جسمانی آزادی سے الگ نہیں کیاجاسکتا۔ جس معاشرے میں اقتدار پرست قوتیں آزادی کے تحفظ، حب الوطنی اور بیرونی خطرا ت کا نام لے کر ذہنی آزادی کو کچلنے کی کوشش کرتی ہیں ا س معاشرے میں ''خیال'' کاارتقاء رک جاتاہے اور نتیجتاً کلچرکافروغ متاثر ہوتاہے۔ آزاد�ئاظہار کے نتیجے میں تبدیلی کا عمل تدریجی منازل طے کرتاہے اوراس طرح ''خیال''کافروغ بھی جاری رہتاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ان قوتوں کی نشاندہی بھی کی ہے جوآزادئ اظہار اور ذہنی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان عناصر میں سیاسی، مذہبی مقتدر قوّتیں شامل ہیں جواپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور افراد کو ذہنی طور پر اپناغلام بنائے رکھنے کے لئے ذہنی آزادی کو پنپتے نہیں دیکھ سکتے۔ جو قوتیں ان قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں ان کے بھی اپنے مسائل ہیں مثلاً دانشور، تعلیمی ادارے اور سیاسی جماعتیں وغیرہ۔ ان سب عناصر کے ذاتی مفادات، ذہنی آزادی کے تحفظ کے لئے اس طریقے سے جدوجہد نہیں کرتے جس طرح انہیں کرنا

چاہئیے، نتیجتاً ہمارامعاشرہ ذہنی آزادی اور اظہار رائے کے معاملے میں آج تک پسماندہ ہے۔ جب تک ذہنی آزادی کو فروغ نہیں دیا جائے گا ، قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ بھی حل طلب رہے گا۔

قومی تشخص کی تشکیل کے عوامل اور پاکستانی قوم کے لئے قومی تشخص کی ضرورت اور اہمیت پرروشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹرجالبی فوک ویز (جغرافیائی ماحول اور موسمی تقاضوں کے مطابق زندگی بسرکرنے کے طریقے) اور کلچر کے درمیان فرق اور ان کے دائرہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فوک ویز جغرافیائی ثقافتوں سے ازخود وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔یہ خودروہوتے ہیں لیکن ثقافت یا کلچر زراعت کی طرح ہوتاہے------اور ہروہ ممکن طریقہ اختیار کیاجاتاہے جس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔ گویا کلچر ایک شعوری کاوش و عمل سے پیداہوتاہے جس میں تراش خراش کرنا بھی شامل ہے اور اس میں کمال حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ فوک ویز قومی کلچر کے لئے بنیاد تو فراہم کرسکتے ہیں لیکن خود کلچر کی جگہ نہیں لے سکتے''۔(۱۹)

ڈاکٹرجالبی نے قومی کلچر کے تعین، اس کی تشکیل اور درپیش مسائل کے حوالے سے ہرپہلو سے عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔ اگرچہ اس کتاب میں بعض حصوں پر ناقدین کی طرف سے اعتراضات بھی سامنے آئے مثلاً موہنجوداڑو اور ہڑپہ کو اپنے تہذیبی سرمائے سے خارج کرنے اور مذہب کے حوالے سے بالخصوص تصوّف کے منفی رحجانات کی مذمت وغیرہ۔ شان الحق حقی اپنے مضمون ''پاکستانی کلچر ایک زاویہ'' میں ڈاکٹرجالبی کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''---------مگرہم اس حقیقت کو کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں کہ یہ آثار اسی سرزمین کی تہذیب کے آثارِ قدیم ہیں جسے ہم اپنا ملک کہتے ہیں۔ آخرعرب بھی جاہلیت کی شاعری پرفخرکرتے ہیں اور ہم خود عجمی صورت گری کوبھی اپنے کلچر کا جزو سمجھتے ہیں جالبی صاحب کا یہ قیاس کے موہنجوداڑو کا نام صرف اس لئے جاتاہے کہ ہندوستان کی قدامت کے آگے پاکستان کی قدامت کو بڑھایاجائے،صحیح نہیں۔ پاکستان کی قدامت تو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اسے بڑھانے یاگھٹانے کاکیاسوال اس کاذکر سب سے پہلے کسی پاکستانی نے نہیں کیا بلکہ ایک یورپین

نے کیا تھا یعنی سرموٹیمرویلر جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد اپنی کتاب ’’پاکستان کے پانچ ہزارسال‘‘ شائع کی تھی‘‘۔(۲۰)

ڈاکٹرجالبی نے ایک مفکرو نقاد اور بحیثیت دردمند اور محب وطن دانشور کے اس کتاب میں کلچر کے حوالے سے درپیش مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ ان کا یہ تجزیہ بعض لوگوں کو ناگوار بھی گزر سکتاہے لیکن پاکستانی کلچر کے تعین، تشکیل اور درپیش مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کی اس کتاب کی اوّلیت ہمیشہ برقراررہے گی۔

ڈاکٹر جالبی اپنی تنقیدی کتب میں اپنے تصورِ نقد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میرے لئے تنقید (اور یہی میر امیڈیم ہے) کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ادیبوں اور شاعروں کی توصیف و تعریف کا کام لیا جائے۔ یہ تنقید کا ایک کام ضروری ہے لیکن سارا کام ہرگز نہیں ہے------میں اس قسم کی تنقید کو نصابی تنقید کا نام دیتا ہوں------فکری تنقید کے بغیر آج کا ادب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ جب تنقید کے ساتھ میں فکر کا لفظ استعمال کرتا ہوں توا س سے میر ا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں جب سائنس نے فلسفے کو غیر اہم بنا دیا ہے اور فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر خودبے معنی ہوتا جا رہا ہے،میں ادبی تنقید کے ذریعے وہ کام انجام دینا چاہتا ہوں میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں انجام دے چکاہوں جو ایک زمانہ میں ادب اور فلسفہ الگ الگ انجام دیتے تھے۔ اسی لیے میں اس تنقید کو جو فکر سے عاری ہے جس میں زندگی کے مسائل، ادب کے متعلق سے سمجھنے کی شعوری کوشش نہیں ملتی، ادب کے دائرے سے خارج سمجھتا ہوں۔(۲۱)

ڈاکٹر جالبی ’’ادبی تنقید‘‘ کا دائرہ کار فلسفہ تک بڑھانا چاہتے ہیں اور ادبی تنقید کو ایک مربوط فکری نظام کے تحت لانے کے متمنی ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر جالبی نے ’’مفکرنقاد‘‘ کی ذمہ داریوں کا بھی تعین کیا ہے۔ ’’مفکر نقاد‘‘ کی ذمہ داری ہے کہ ’’وہ فکر کی سطح پر سارے معاشرتی، معاشی اور ذہنی عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کرے اور تخلیق کے لئے راہ ہموار کرے (۲۲)۔ڈاکٹر جالبی ’’جدید تنقید‘‘ کے لئے جس لائحہ عمل کا تعین کرتے ہیں اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

1۔ کلچر کا زوال،جس کی عکاسی بہترِطورپر تخلیقی سرگرمیوں میں دیکھی جا سکتی ہے کو ایک زندہ نظامِ خیال کی قوت سے تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے دوبارہ نئی زندگی دی جائے۔

2۔ زوال پذیر معاشرہ اورمنجمد نظامِ خیال ہمارے تخلیقی زوال کا ذمہ دار ہے۔

3۔ ہمارا کلچر اور تہذیبی عناصر، مغرب کے کلچر کے ہاتھوں فنا ہونے پر آمادہ نہیں کیونکہ ہمارے اپنے نظامِ خیال کے تہذیبی دائرے کی مرکزی کشش اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ لہٰذا نتیجہ انتشار، تصادم اور عدم توازن کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

4۔ قیام پاکستان کے بعد ہمیں تاریخ کی نئی تعبیر اور نئی تاریخی شعور کے ساتھ ایک ایسے دائرے کی تشکیل کی ضرورت ہے جس کا سنگم مغرب اور اپنے کلچر کے گہرے اور وسیع ادراک پر قائم ہو۔

ڈاکٹرجالبی نے تنقید کی اہمیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید اور تخلیق کے رشتے کو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم قراردیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق کسی ادیب و شاعر میں تنقیدی شعور جتنا زیادہ ہوگا اس کا تخلیقی شعور تھی اتنا ہی گہرااور وسیع ہوگا۔ تنقیدی شعور کے بغیر، ادب کی روایت کو فکرو اظہار کی سطح پرترقی نہیں دی جاسکتی۔ اسی ادبی اور تنقیدی شعور کے بحران کو وہ معاصر ادب کے زوال کا ذمہ دار قراردیتے ہیں۔

دیگر اصناف ادب کی مانند، تنقید، طریقۂتنقید اور تصورِ تنقید کے لئے بھی اردو ادب مغربی معیارات ورحجانات کا پیروکار رہاہے لیکن مغربی اثرات شعوری سطح پرہمارے نظامِ خیال کا حصہ نہیں بن سکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہماراادب، فکر وفن حتیٰ کہ معاشرتی، تہذیبی زندگی بھی بے سمتی کا شکار ہے۔ ڈاکٹر جالبی ادبی و معاشرتی زوال کے اس عہد میں تنقید اور تنقید نگار سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی میں غلط اقرار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریوں سامنے لائے، ان کا علاج دریافت کرے اور نئے نظامِ خیال کی تعمیر کے لئے بنیاد فراہم کرے۔ گویا تنقید کو ’فکر‘ اور ’ادب ‘ دونوں کے حوالے سے کام کرنا ہے بلکہ نئی حدود کی دریافت کے ساتھ ادب و فکر کا امتزاج بھی کرناہے اس سلسلے میں ڈاکٹرجالبی نے نئی تنقید کے دائرہ کار کا تعین بھی کیا ہے جو ڈاکٹرجالبی کے نظریے کے مطابق یہ ہے کہ تنقید صرف ادب تک محدود نہ ہو بلکہ اسے پوری زندگی پر پھیلا کر، تجزئیے، مطالعے اور غور و فکر کے بعد اجتماعی زندگی کی بہتری کے لئے استعمال کیاجاسکے۔ تنقید ہرقسم کے سوالات اٹھائے اور فرد اور معاشرے میں تنقیدی روح بیدار کرے تاکہ ایک دوسرے کے نظریے کو سمجھنے اور اسے برداشت کرنے کا جذبہ پیداہو۔ معاشرتی زندگی کو ہرقسم کے جبر سے پاک کرے۔ قومی ورثے کی تلاش میں قومی و ملی تاریخ کو تلاش کرے اور اپنے معاشرے کے فکر و احساس کے ساتھ اسے جوڑ دے۔ معاشرے میں پائی جانے والی منفی اقدار کے خلاف علم جہاد بلند کرے، معاشرتی مسائل کا تعین کرے، معاشرے میں پائی جانے والی ثنویت اور تضاد کے عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ایسا تعلیمی و

معاشی نظام دریافت کرے جو عدم مساوات کو ختم کرے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کو نظامِ اخلاق کا پابند کرنے کی کوشش کرے۔ادب اور فکر کے رشتے کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر بند معاشرے کے دروازے کھول کرجدید دنیا سے اس کے معنوی رشتے کو دریافت کرے۔ ادب پاروں کا تجزیاتی مطالعہ اور تشریح کرے ادب پاروں کی انفرادیت کو اجاگر اور تقابلی مطالعے سے ادب پارے کا درجہ متعین کرے۔ معاصر ادب کے منفی رحجانات کو ردکرتے ہوئے مثبت رحجانات کو ایک نئی جہت دے۔ دنیا کے دوسرے ادبیات کی اہم تخلیقات کو ترجمہ کرے۔ قدیم ادب کا اس کے اپنے عہد اور معاصر عہد کی روشنی میں جائزہ لے اور قدروقیمت متعین کرے۔ نئی تنقید کو تحقیق سے اپنا رابطہ استوار کرنا چاہیے۔ جسے ڈاکٹرجالبی، ایزراپاؤنڈ کے الفاظ میں ''اسکالرکریٹک'' قراردیتے ہیں۔ تنقیدی اسلوب کو نکھارے اور تمام اصنافِ سخن کو برابر اہمیت دے۔ نئی تنقید امتزاج کی اس سطح کو دریافت کرے جس پر یہ امتزاج ممکن ہو۔ مضمون کے آخر میں ڈاکٹرجالبی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ نئی تنقید کے اس مینی فیسٹو کو مکمل طور پر بروئے کار لانا آسان نہیں لیکن ''کام کاآغاز ہی نجام'' ہے۔

ڈاکٹر جالبی ''نئی تنقید'' کے حوالے سے تنقید اور تحقیق کے امتزاج کو ضروری قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق ایزراپاؤنڈ کا'محقق نقاد' ہی نئی تنقید کا ترجمان بن سکتاہے۔ ڈاکٹرجالبی تفصیل سے مختلف طریقہ ہائے تنقید کا تجزیہ کرتے ہوئے نئی تنقید کے لئے 'امتزاج' کے عمل کو لازمی قراردیتے ہیں۔ جس میں کسی ایک دبستان یا نقطہ نظر کے تحت فن پارے کی توضیح و تعبیر نہ کی گئی ہو۔ڈاکٹرجالبی نے تفصیل سے امتزاجی تنقیدکی مختلف سطحوں کی وضاحت کی ہے جن کی بنیاد پر امتزاجی تنقید کی عمارت کو استوار کیا جاسکتاہے۔ وہ سطحیں ادبی تاریخ، فلسفہ و فکر اور کلچر کی سطح ہے ادبی تنقید میں فکر و فلسفہ کے امتزاج کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی اس نظر یے کے حامی ہیں کہ ''ادب'' تنقید اور فلسفہ کے امتزاج سے جہاں کسی فلسفے کی تفسیر بنتاہے وہاں ادب خودفلسفہ کی بھی تشکیل نو کرتاجاتاہے''۔(۲۳)

ڈاکٹرجالبی اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب و تنقید اور فلسفہ کے راستے اور اظہار کی نوعیت یقیناًمختلف ہے لیکن منزل ایک ہے۔ دونوں سچائی اور حقیقت (Reality) کو تلاش کرکے نہ صرف زندگی کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ نئے نئے سوال اٹھاکر زندگی کو نیا شعور دیتے اور زندگی کو آگے بڑھا تے ہیں''۔(۲۴)

’’امتزاجی تنقید‘‘ میں فکر کے عنصر کی شمولیت کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی نے زور دیا ہے کہ ہمیں اپنی روایتی اور عصری فکرسے مکمل واقفیت حاصل کرکے اسے تخلیقی شعور کا حصہ بناناہوگا۔ امتزاج کی اگلی سطح ’’ادبی تاریخ‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی ادبی تاریخ کے لئے کسی ایک نقطہ نظر کو اختیار کرنے کی بجائے ادبی تاریخ کے وسیع کینوس کے تناظر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر پہلو، ہررنگ، ہرزاویہ اور علم، فکر، کلچر، لسانیات، تحقیق، سماجی و جمالیاتی زاوئیے سب ایک اکائی بن جائیں۔یہی رویہ حقیقی امتزاج کو جنم دے سکتاہے۔ امتزاجی تنقید کے لئے نقاد کا ادبی تاریخ کا علم اتنا وسیع ہو جو اسے ادب کی مرکزی روایت کا شعور عطاکرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ امتزاج کی تیسری سطح جس پر ’’امتزاجی تنقید‘‘ کی تکمیل ہوتی ہے وہ کلچر کی سطح ہے۔ تنقید میں کلچر کے امتزاج کے اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

> ’’کلچر کی سطح پر ہی تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روائتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتاہے اور ہوسکتاہے اس سے ادب اور ادب پارے کی وضاحت بھی ہوسکتی ہے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہوسکتاہے------ یہی تنقید کی تخلیقی سطح ہے اور یہی نئی تنقید کا منصب ہے‘‘۔(۲۵)

ڈاکٹرجالبی جس امتزاجی تنقید کی ضرورت اور اہمیت پرزور دیتے رہے ہیں وہ ان کی تنقید نگاری کا اصل اصول ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے امتزاجی تنقید کے نظریے کو سمجھنے کے لئے ان کے دو مضامین ’’نئی تنقید‘‘ اور ’نئی تنقید کا منصب ‘ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ’’نئی تنقیدکامنصب‘‘ کے عنوان کے تحت مضمون میں ڈاکٹرجالبی نے موجودہ تنقیدی عمل کے دائرہ کاجائزہ لینے کے ساتھ ساتھ نئی تنقید کے منصب کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر جالبی نے مغرب اثرات کے تحت درآنے والے مختلف تنقید رحجانات مثلاً سماجی تنقید، نفسیاتی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، سوانحی تنقید وغیرہ کے پس منظر، بنیادی نظریات خوبیوں اور خامیوں پرروشنی ڈالی ہے۔تاثراتی تنقید کے پس منظر اور مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی ایلیٹ کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> ’’ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے تاثراتی تنقید کو ایک نیا رنگ دیا۔ اس نے سوانحی تفصیلات کو تنقید سے خارج کردیا۔ ادب پارے کی سماجی، سیاسی و تاریخی اہمیت اور رومانیت کو رد کرکے جمالیاتی عنصر کو معروضیت کے ساتھ، تاثرات میں شامل کردیا۔ اس کے ساتھ ’’روایت‘‘ کو ادبی تنقید میں شامل کرکے اسے ایک نیارخ دے دیا‘‘۔(۲۶)

ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کے تصورِ روایت پرمحمد حسن عسکری کے اعتراضات کاتجزیہ کرتے ہوئے،، محمد حسن عسکری کے تصورروایت کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ عسکری صاحب روایت کے سلسلے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ مغرب روایت کے معنی سمجھنے میں ناکام رہاہے۔ ایلیٹ کے مطابق روایت تغیر پذیر رہتی ہے جبکہ عسکری کے مطابق روایتی ادب اور روائتی فنون صرف روائتی معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں اور روائتی معاشرے کی بنیاد مابعد الطبیعات پرقائم ہے جو غیر تغیر پذیر ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے عسکری صاحب کے تصورِ روایت کے حوالے سے سوال کیا ہے کہ روائتی معاشرے جوکبھی مابعد الطبعیات پرقائم تھے، اب مٹ رہے ہیں مثلاً چین اور ہندوستان کامعاشرہ ان میں روائتی معیار کیسے نافذ کئے جاسکتے ہیں ؟ ڈاکٹرجالبی نے اس نقطے کے جواب میں عسکری صاحب کے مضمون ہی کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ مغربی ادب سے استفادے کو بامعنی ادب کی تخلیق کے لئے لازمی قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی حسن عسکری کے اس تضاد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’دلچسپ بات یہ ہے کہ محترم عسکری صاحب جب اس کا حل تلاش کرتے ہیں تو نہ ابن العربی سے رجوع کرتے ہیں اور نہ شیخ وہاج الدین صاحب سے یا مولانااشرف علی تھانوی صاحب سے بلکہ مغربی ادب کی اس روایت کو جذب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جوفلوبیئر اور بود لیئرسے شروع ہوکر جوائس، پاؤنڈ اور لارنس تک پہنچتی ہے اور جس میں انہیں مشرقی مابعد الطبعیات کی مغربی صورت نظر آتی ہے۔
> اب سوال یہ ہے کہ اس اعتبار سے عسکری صاحب کا معیار روایت نئی ادبی تنقید کا معیار بن سکتاہے ؟ میراخیال ہے اس کا جواب نفی میں ہے‘‘۔(۲۷)

ڈاکٹرجالبی نے اس مسئلے کے حل کے لئے تجویز دی ہے کہ ایک صورت تو یہ ہے ما بعد الطبعیاتی معاشرے کے دوبارہ قیام کی جدوجہد کی جائے یا پھر مغرب کے اثرات کو آنکھیں بند کرکے قبول کرنے کی بجائے شعور اور انتخاب کے ذریعے قبول کریں اور وہ بھی صرف اس حصے کو جو ہماری روایت سے قریب تر ہو لیکن ڈاکٹر جالبی کے نزدیک یہ بھی آخری حل نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی آخر کار مغرب کا سیلاب ہمیں بہالے جائے گا۔ اپنے مضمون‘ ’’تنقیدی اور تحقیقی۔ وموضوعات پرلکھنے کے اصول‘‘میں ڈاکٹر جالبی محققین اور ناقدین کے کچھ اصول وضع کئے ہیں جنہیں اختیار کرکے تحقیقی و تنقیدی موضوعات کو بہتر طریقے سے پیش کیاجاسکتاہے۔ تحقیقی و تنقیدی موضوعات پرلکھنے کے لئے ڈاکٹرجالبی نے پیدائشی صلاحیت، کام کرنے کی لگن اور منزل پر پہنچنے کے عزم کو

تمام اصول وقوانین سے زیادہ اہم قراردیا ہے۔ ان عوامل کی غیر موجودگی میں کوئی تنقیدی اور تحقیقی اصول کارگر نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹرجالبی نے مغربی اثرات کے تحت اردو ادب پر اثرانداز ہونے والی ادبی تحریکوں کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کرتے ہوئے اپنے اسی نقطہ نظرکااعادہ کیا ہے کہ مغربی ادب کے اثرات قبول کرنے کے باوجود ہماراادب تخلیقی اپچ سے محروم ہے اور اس کی وجہ تہذیبی زوال اور اس کے ہمہ گیر اثرات ہیں۔ اس تہذیبی نظام کی بہتری کے لئے نئے نظامِ فکر کو رائج کرنے کی ضرورت ہے جو بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیبی ورثے کا بھی امین ہو۔ ڈاکٹر جالبی نے اپنے اسی نقطۂ نظر کے حوالے سے بطور نقاد اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ادب کے حوالے سے مختلف فکر ی مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی بطور نقاد اپنے مختلف مضامین میں ادب کے حوالے سے مختلف سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے مثلاً ہمارے دور میں تخلیقی سرگرمیاں کیوں بے جان ہوگئی ہیں ؟اس سوال کے جواب کی تلاش میں تہذیبی نظام اور اس کے زوال کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق ہمارا تہذیبی نظام اور اس کی روح ہماری معاشرتی مادی، ذہنی، روحانی خواہشات کو آسودہ کرنے کی قوت سے عاری ہوتا جا رہا ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیبی نظام کے پیداکردہ خلفشار اورانتشار ہماری تہذیبی اکائی کو منہدم کردیا ہے۔ ایسی تہذیبی مسئلہ ہمارے ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر جالبی تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مغربی نظام خیال کو مستعار لے کر اپنے منجمد نظام خیال کو حرکت میں لا سکتے ہیں ڈاکٹر جالبی کا استدلال یہ ہے کہ:''جب ایک قومی نظام خیال نے دوسری ضعیف تہذیب کے نظام خیال کو فتح کیا تو ان نظام ہائے خیال کے جذب و قبول سے ایک ایسا سنگم وجود میں آگیا ہے جس میں بنیادی طور پر فاتح نظام خیال موجودتھا۔(۲۸)

دومختلف تہذیبوں کے نظامِ خیال کے جذب وقبول کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی ایرانی تہذیب کی مثال پیش کرتے ہیں جو کہ اسلامی نظام خیا ل کے اثرات کے نتیجے میں ''اسلامی عربی عجمی تہذیب'' کی صورت میں نمودار ہوئی اس طرح ڈاکٹر جالبی مختلف تہذیبوں کے آپس میں میل جول اور ربط سے ظہورپذیر ہونے والے نئے نظام خیال کے رائج ہونے کی مثالیں دے کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''منجمدطرز احساس میں، باہر سے آنے والے نظام کے جذب وقبول سے ایک نئی قوت، حرکت کا ایک نیا عمل تو پیدا ہوسکتا ہے لیکن اس تہذیبی طرز احساس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔(۲۹)

اسی جدا تہذیبی طرز احساس کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمان اور ہندو ایک ہزار سال تک ساتھ رہنے کے باوجود ایک ساتھ نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر جالبی مغرب کے اثرات کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی اور مغربی اندازفکر کے طریق کار کا تجزیہ کرتے ہوئے مغربی نظام خیال کی خامیوں کی بھی

نشاندہی کی ہے۔ ادب کے مردہ ہو جانے کے سوال کے جواب کی تلاش میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب یہ اہل فکر کی ذمہ داری ہے کہ وہ ادب کو اب سے ماوراء کرتے ہوئے اپنے بنیادی تہذیبی مسائل، انسان، معاشرہ اور کائنات کے رشتوں پر از سرنو غور کریں۔ ڈاکٹر جالبی مابعد الادب کو نئے ادب کی تخلیق کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

ادب ایک سماجی سرگرمی ہے۔ ایک ایسی سرگرمی جو ادراک کی غیرمعمولی قوت کے ذریعے ہمارے عام ہستی کو بیدارکرکے ہمارے عام شعور کا حصہ بنادیتی ہے۔ یہی شعور زندگی میں تبدیلی لاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی ادب کو کسی مخصوص، سیاسی، معاشی یا سماجی نظام سے وابستہ کرکے محدود کرنے کے عمل سے اختلاف کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق:''ادیب کسی آدرش'' کسی آئیڈیالوجی، کسی نظریے کا علمبردار ہوسکتاہے۔ وہ زندگی کو آگے بڑھانے والے کسی بہتر سماجی نظام کا پابند ہوسکتاہے لیکن وہ ''پارٹی لائن''کی ہدایت کے مطابق صحافت توکرسکتاہے 'ادب تخلیق نہیں کرسکتا''۔(۳۰) اس سلسلے میں ڈاکٹرجالبی اس رائے کو بھی رد کرتے ہیں کہ وہ 'کمٹ منٹ' اور مقصدیت کے خلاف ہیں۔ ان کے مطابق وہ کمٹ منٹ یا مقصدیت کے مخالف نہیں بلکہ پارٹی لائن کے خلاف ہیں کیونکہ کوئی ادب عوام کو نظرانداز کرکے کسی ایک طبقے کے مفاد سے وابستہ ہوکر زندہ تخلیقی عمل نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹرجالبی، مولاناروم اور اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے تخلیقی عمل کو اس لئے اہم قراردیتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے جذبات واحساسات کا تزکیہ کرتے ہوئے،ایک فلسفۂ حیات کی روشنی میں ہمارے شعور کو بیدار کیااور یہی ادب کی سماجی ذمہ داری ہے۔

ڈاکٹر جالبی ایک''نئے نظام خیال'' کی تشکیل کے لئے بھی ادب کے کردار کو بہت اہم تصور کرتے ہیں۔ ''نئے نظام خیال'' کی ضرورت ڈاکٹر جالبی کے تصورِ کلچر اور تصورِ ادب کا مرکزی نکتہ ہے۔ ادب ہی کے ذریعے نظامِ خیال کے زوال کی نشاندہی ہوتی ہے لہٰذا نئے نظامِ فکر اور خیال کی تشکیل کے لئے ادب اور ادیب پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق،''ادب ہی واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعے معاشرہ اپنی حقیقی روح کو دریافت کرتا ہے اور عہد حاضر اور آنے والے دور کے حوالے سے نیا شعور حاصل کرتا ہے''۔(۳۱)

ادب کو یہ اہم ذمہ داری تفویض کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جالبی نے ادب کی ماہیت دریافت کرتے ہوئے، ادب کو ''زندگی'' کے اظہار کا نام قرار دیا ہے۔ڈاکٹر جالبی ''ادب'' کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ''لفظوں کے ذریعے جذبے، احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔''(۳۲)اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی محض جذبہ و احساس کو ادبی تحریر کے لئے ضروری تصوّر نہیں کرتے بلکہ الفاظ کی ترتیب و تنظیم اور لطف و مسرت کے عنصر کو ادب کے لئے اہم قرار دیتے ہیں۔ ایسی تحریریں محض وقتی اثرات مرتب نہیں کرتیں بلکہ آفاقیت کی حامل ہوتی ہیں۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق

انسان کے تخیل کوابھارنا، شعور وادراک کا حصول اور انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ادب کا اوّلین منصب ہے۔ادب، دوسروں کے تجربات میں شامل ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے جس سے ہمارے شعور اور ادرا ک کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادب کی انہی خصوصیات کے باعث ڈاکٹر جالبی ادب کو دوسرے فنونِ لطیفہ سے زیادہ مؤثر تصور کرتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی ''افادی ادب'' کے نقطہ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں ''ادب میں خالص افادیت''کے نظریے کو ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب کاکام تو زندگی میں معنی تلاش کرنا ہے اور ان کا رشتہ ماضی سے قائم کرکے مستقبل سے جوڑ دینا ہے۔ ادب کا حوالہ تو خود زندگی ہے اور وہ اسے ہی آگے بڑھاتا ہے۔ ادب تو انسانی تجربے کے مکمل علم و آگاہی کا نام ہے اور یہ علم وآگاہی وہ غیر معمولی مرتب ومنظم صلاحیت ہے جس کے اظہار کی صلاحیت صرف باشعور وردمند انسان کے پاس ہے''۔(۳۳)

ڈاکٹر جالبی نے مؤثر اور مدلل طریقے سے اس عام رویے کا جواب دیا ہے جس کے مطابق ہر قسم کی برائی خامی اور ٹوٹ پھوٹ کے لئے ٹیکنالوجی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ بالخصوص ادب کے زوال کا ذمہ دار ٹیکنالوجی کو قرار دینے کے روّیے کی مذمت کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے ٹیکنالوجی کے فوائد بیان کرنے کے ساتھ اس بات پر زور دیا ہے کہ ادب کے انحطاط کے حقیقی اسباب دریافت کئے جائیں۔ادب اور ادب سے وابستہ مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے اپنے ایک مضمون ''ادب اور قاری کا رشتہ'' میں بڑے ادب کی تخلیق کے لئے قاری کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق اگر لکھنے والے کو یہ احساس ہو کہ اس کے پڑھنے والے موجود نہیں ہیں تو لکھنے کا عمل کمزور پڑجائے گا۔ غا لب کی مثال ہمارے سامنے ہیں۔ اگرچہ غالب کے عہد میں غالب کی شاعری کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کاوہ مستحق تھا لیکن غالب کی شاعری کو پڑھنے اور پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ ضرور موجود تھا جن سے غالب کا گہرا اور براہ راست رشتہ قائم تھا۔ آج قاری اور ادیب کے درمیان کمزور رشتے کی بہت سی وجوہات ہے جن میں تیز رفتار زندگی اور ادب کی غیر معیاری تعلیم اور کمزور تخلیقی توانائی شامل ہیں۔ڈاکٹر جالبی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قاری اور ادب کے درمیان مضبوط رشتہ استوار کرنے کے لئے ادب کو شعور و ادراک کے عناصر کی شمولیت سے ذاتی اور اجتماعی تجربات کا ترجمان بنانا ہوگا۔

ادب کے منصب اور کردار ہی کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ جدید سائنسی دور میں ادب کی افادیت، اہمیت اور ضرورت سے متعلق ہے۔ ادب کی افادیت اور سائنس کی افادیت میں فرق ہے۔ ادب انسانی خواہشات کے اظہار کا نام ہے جبکہ سائنس ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ۔ ادب ادراک و احساس کے نئے نئے انحراف کی تلاش کے بعد انہیں تصرف میں لاتا ہے جس کے نتیجے میں زبان کو

وسعت ملتی ہے۔اور ادب نت نئے تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنتا ہے ادب انسان کی داخلی کائنات کا اظہار ہے جس پر خارجی عوامل کی پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ جبکہ''سائنس کے انکشافات،زمان ومکان کے نئے تصورات، دنیا کے حالات و کوائف کی خبریں، انسان کی اس کی ذات کے عرفان میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔اِ س طرح سائنس کی ترقی کو ادب کی ترقی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بقول جالبی:''سائنس کے اس دور میں ادب کو وسعت کی بجائے مرکزکی تلاش ہے اور یہ مرکز نئی نسل کے لئے ذات کاعرفا ن ہی ہوسکتا ہے''۔(۳۴)

''بوسیدہ مکان ڈاکٹر جالبی کے تصورِ ادب کو سمجھنے کے لئے انتہائی اہم مضمون ہے۔ اِس مضمون میں ڈاکٹر جالبی یورپ کے ادب اور سیاست کے درمیان تعلق سے پیدا ہونے والے ادب کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے کہ ادب کسی خاص نظریے کی ترویج کرکے دائمی قدر کا حاصل نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں مغربی ادب کے اثرات کے تحت ترقی پسندتحریک کے تحت لکھے جانے ادب کو ڈاکٹر جالبی صحافتی ادب قرار دیتے ہیں۔ سوائے چند تخلیقات کے جو عام انسانی تجربے کو خلوصِ نیت کے ساتھ محسوس کرکے لکھی گئیں۔ڈاکٹر جالبی کے خیال میں ادب وفن کی ترقی لازمی سماجی ترقی سے وابستہ نہیں اور ادب کی یہ خاصیت ہے کہ یہ سیاست دانوں کے اصولوں اور فارمولوں پر پورانہیں اترتا۔ مغربی ادیبوں کے حوالوں سے ڈاکٹر جالبی نے ادب کو کسی خاص سیاسی مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کی مذمت کی ہے۔ پروپیگنڈے اور پارٹی لائن سے سے وابستگی کے روّیے کی مذمت کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی ترقی پسند تحریک کے مثبت پہلوؤں کی طرف بھی توجہ مبذول کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''------ہم ترقی پسند ادب کے احسانات کو فراموش نہیں کرسکتے جس نے ادیب کے سماجی شعور کو زندہ اور جیتا جاگتا رکھ کرہمارے ادب میں ایک نئے طرزِ احساس کااضافہ کیاہے۔ ادیب کے پیروں کو زمین پر مضبوطی سے ٹکا دیاہے۔ بیانیہ طرز کو عام کر کے آرائشی طرز سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات دلا دی ہے او رادب کو نئے تجزیوں، نئی ہئیت اور تکنیک کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات سے بھی متعارف کروایاہے''۔(۳۵)

ڈاکٹرجالبی بنیادی طور پر 'راست افادیت' کے تصور کے خلاف ہیں۔ ان کے مطابق ادب ہمارے شعور و ادراک، محسوسات اور تاثرات کا مجموعہ ہے جس کا مقصد یہ ہے وہ ادراک جو ادیب کو زندگی کے شعور اور اس شعور سے پیداہونے والے تجربات سے حاصل ہواہو،انہیں الفاظ کی صورت میں پیش

کردے۔ ادب کے سماج پر اثرات بعد کی بات ہے۔اگر ادیب کا تجزیہ سچا اور شعور کاحامل ہوگا تو سماج پر خود بخود اثرانداز ہوگا۔ اد ب خالص 'اصلاحی' کام نہیں ہے۔ ڈاکٹرجالبی ادب و فن میں خالص اقدار کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق وقتی ضرورت کے تحت تخلیق کیاگیاادب تخلیقی تاثیر سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی اثرات کاحامل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹرجالبی حقیقی ادب کی تخلیق کے لئے فن کار کی ذات، اس کے مشاہدات اس کی داخلی کیفیات، اس کے تجربات اور شعور کے عرفان کو لازمی قراردیتے ہیں۔

ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی نظریات میں روایت کے عنصر کو بھی اہمیت حاصل ہے۔، ان کے تنقیدی مضامین سے ان تصور روایت کوسمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے دومضامین ''روایت اور جدیدیت'' اور ''روایت اور جدت'' ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ روایت اور جدیدیت کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی لکھتے ہیں:

> ''روایت جامد اور غیرمتحرک اشیاء کے ادراک و محسوسات کا نام نہیں بلکہ وہ تو ہرزمانے کے مخصوص تقاضوں کا کامیاب ترین اظہار ہوتی ہیں۔ ہردور ہزاروں شاعروں اور ادیبوں کی آوازوں سے گونجتارہتاہے مگر ادبی روایت میں ہر دور کی یہ ہزارونآوازیں اور تجزئیے شامل نہیں ہوتے بلکہ صرف وہی تحریریں اور وہی آوازہی روایت بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن میں فن کار نے انسانیت و آدمیت کے ہر اس بنیاد ی تجربے کو اپنے زمانے کے مختلف اور بدلے ہوئے شعور کے ساتھ قبول کیاہو۔ گویا روایت صرف جدید طرز احساس اور روّیوں کے مؤثر ترین لمحوں سے تخلیق ہوتی ہے اور زندہ شعور کو ایک کڑی میں پروتی ہے۔ اس طرح جدید زمانہ اور اس کا جدید شعور روایت کے صحت مند سلسلے میں ایک نئی کڑی بن کر جدیدیت کی طرف قدم بڑھاتاہے۔ یہ روایت اور جدیدیت کا بنیادی تعلق ہے''۔(۳۶)

'جدید یت کیاہے؟ 'مضمون میں ڈاکٹرجالبی ' جدیدیت کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہرنسل،اور یہ کوئی اختلافی بات نہیں ہے، اپنی ذہنی و مادی ضرورتوں اور عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے معیار اور

اپنے پیمانے خود مقرر کرتی ہے اور ان ہی پیمانوں سے اپنے دو ر کو، اپنے ماضی کو اور اپنے ادب پاروں کو ناپتی ہے۔ ماضی اور اس کے ہ ادب پارے جن میں اسے اپنے طرزِ احساس، اندازِ فکر کا شعور اور عکس نظرآتاہے۔ وہ اپنے سینے سے لگا کر اپنے معیاروں کے پیش نظر انہیں نئے معنی دے دیتی ہے---- فکری سطح پر دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتاہے۔ ان معنی میں ہم ہر نسل کے ایسے معیاروں اور پیمانوں، کو جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھی اور ناپتی ہے، جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں''۔(۳۷)

اپنے مؤقف کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر جالبی نے سرسید احمد خان کی تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک کی مثالیں دی ہیں جو اپنے اپنے عہد میں جدیدیت کی علامت تھیں لیکن آج ہم ان تحریکوں کو جدیدیت کے ضمرے میں نہیں رکھ سکتے گویا جدیدیت ایک اضافی چیز ہے جس کے معنی تغیر پذیر ہیں۔ ڈاکٹرجالبی جدیدیت کی تحریک کو انگریزوں کے تسلط کے بعد درآ نے والے مغربی خیالات اور صنعتی نظام کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ اردو ادب میں جدیدیت چونکہ مغربی نظام خیال کے اثرات کے نتیجے میں آتی ہے لہٰذا سائنسی انداز فکر و نظر کو اپنے شعور کا حصہ بناکر ہی ہم جدیدیت سے تخلیقی کام لے سکتے ہیں۔بقول جالبی:

''زندہ اور تخلیقی جدیدیت، سائنسی انداز نظر کی ہم راہی میں تاریخی شعور کی کوکھ سے پیدا ہوگی اور ''تاریخی شعور'' کے الفاظ میں ان ہی معنی میں استعمال کررہاہوں جن معنی میں جناب ایلیٹ نے استعمال کئے۔اس جدیدیت میں جب تاریخی شعور شامل ہوگا تو روایت کی کھنک دار آواز اس میں رس گھولے گی۔ اس کا لہجہ اس میں وقار اور اعتماد پیدا کرے گا''۔(۳۸)

ڈاکٹر جالبی کا تصور جدیدیت جسے وہ ''زندہ جدیدیت'' کا نام دیتے ہیں روایت کے تصور سے جڑا ہے۔ جس میں ماضی کے فن کار اور فن پارے بھی ہمارے تاریخی شعور کا حصہ بن کر عصرِ حاضر میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جالبی، اقبال کی مثال پیش کرتے ہیں جنہوں نے مرحوم شعرا ء سے اپنا رشتہ دریافت کرتے ہوئے ماضی سے حال کو پھر خود حال سے ماضی کو بدل دیا۔''اسلام کے قدیم تصور میں تاریخی شعور کے ساتھ روایت کا دامن تھامے جدیدیت کے وہ تمام

عنا صر شامل کردیئے جو آفاقی بھی ہیں ہماری روایت سے وابستہ بھی اور دور عہد حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق بھی''۔(۳۹)

ڈاکٹر جالبی نے اقبال کے اس روّیے کو جدیدیت کی مثبت مثال قرار دیا ہے جبکہ جدیدیت کی منفی رحجانات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ڈاکٹرجالبی کے اسی نقطہ نظر کی باز گشت سنائی دیتی ہے جس پر وہ اپنی تنقید ی کتاب''تنقید اور تجربہ'' میں اظہارِ خیال کرچکے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی جدیدیت کے منفی رحجان کو کلچر کے زوال، نظام اقدار وخیال کی بوسیدگی اور منجمد نظامِ خیال کی پیداوار قراردیتے ہیںڈاکٹرجالبی اپنے مؤقف کا اعادہ کرتے ہوئے تاریخ کی نئی تعبیر اور نئے تاریخی شعور کے ساتھ ایسے دائرے کی تشکیل پر زور دیتے ہیں جومغرب اور ہمارے اپنے کلچر کے گہر ے اور وسیع ادراک کے سنگم پرقائم ہوجیسے ڈاکٹر جالبی ابعادرابع Fourth Dimensionقراردیتے ہیں۔

ڈاکٹرجالبی اردو ادب میں جدیدیت کے رحجان کے پیش نظرتخلیق کئے جانے والے ادب کو مثبت طرِز فکر اور مثبت طرز احساس سے عاری قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ٹی۔ ایس۔ایلیٹ کے مضامین سے ان کے تصور روایت کے اہم نکات کو بیان کرتے ہوئے جدیدیت کے علمبردار وں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے کیونکہ ایک طرف وہ ''روایت'' کے تصور کی درست تفہیم سے عاری ہیں اور دوسری طرف جدیدیت کے رحجان کے تحت جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے اس کا تعلق خارجی دنیا سے بہت کم رہ گیا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر تخلیق کردہ ادب ذاتی جذباتیت اور سنسنی خیز ی کا شکارہے۔ ڈاکٹرجالبی کے خیال میں ''تخلیقی جدیدیت'' زمانے کے حالات سے منہ نہیں چراتی بلکہ انسانی فطرت کی دائمی و آفاقی قدروں اور رحجانات کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ تخلیقی تاثر سب سے اہم رہتاہے اور معاشرتی،سیاسی مسائل اس میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ زمان ومکان سے بلند تر ہوکر آفاقیت کی سرحدوں کو چھولیتے ہیں۔ اس سلسلے میں 'وارانیڈپیس '، 'کرائم اینڈ پنشمنٹ ' کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ہنری جیمس،کانراڈ، جیمسس جوائسس،پروست، ٹامس مان، اور ہمنگوے اپنے ناول نگاری میں جدیدیت کے علمبردار ہونے کے باوجود جدیدیت اور روایت سے وابستہ ار ہے۔

ڈاکٹرجالبی اپنے ایک مضمون ''جدید شاعر'' میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید شاعرکون ہے؟ اور اس کی تخلیقی دنیا کن عوامل کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ جدید شاعر کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

> ''جو شاعرصنعتی شہر کی پیچ در پیچ زندگی سے پیداہونے والے تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتاہےجدید شہر اپنی ساری آلودگیوں اور خرابیوں کے باوجود ہمارے دورکی ایک زندہ حقیقت ہے۔

جدید شاعر، جدید شہر کے حوالے سے خدا، کائنات، انسان اور زندگی
کے رشتوں کونئے سرے سے دریافت کرتاہے یہی جدیدیت ہے اوراسی
کا اظہار جدید شاعر کرتاہے''۔(۴۰)

جدید شہری زندگی کی پیچیدیگیاں، جدید شاعر کے تخلیقی عمل کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کاخیال ہے کہ جدید شاعر کو عام بول چال کی زبان کے لفظوں سے بڑے شہروں کے پیچیدہ تجزیوں کو سمیٹنے کی مشکلات سے گزرنا پڑتاہے۔ ڈاکٹرجالبی اس حوالے سے غالب کو پہلا جدید شاعر قراردیتے ہیں کیونکہ سفرِکلکتہ کے دوران جس طرح انہوں نے آنے والے وقت کی آہٹ کو پہچان کر اسے اپنی تخلیقی دنیا کا حصہ بنایا۔

ڈاکٹرجالبی نے اپنے اکثر مضامین میں جدید علامتی افسانے کو تنقید کا نشانہ بنایاہے۔ ان کے خیال میں اردو میں علامتی افسانے کا تجربہ، محض ایک تجربہ ہی رہا۔ تخلیق فن کی منزل کو نہیں پہنچ سکا، چند افسانوں کے علاوہ، علامتی افسانے تخلیقی سطح پر کم زور اظہار اور اور علامت نگاری میں ناکام رہے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ آج کا افسانہ نگار اردو نثر کی روایت اور مزاج سے بے خبرہیں۔ ان میں اظہار کی قوت کمزور ہے۔ ڈاکٹرجالبی نئے افسانہ نگاروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جدید صننعتی شہر کی زندگیوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناکرنئے اور جدید افسانے کو ترقی دے سکتے ہیں ۔

ڈاکٹرجالبی نے اپنے متعدد مضامین میں ایک مفکر نقاد کے طور پر معاشرتی مسائل کو نہ صرف اجاگرکیا ہے بلکہ ان کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ ان مضامین میں 'ہمارے دور میں ہجوکی معنویت '،'نئی نسل کا مسئلہ'، 'انقلاب کے عوامل'، 'دانش ور اور سیاستدان' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جوہمارے عہد کے معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی موجود دور کو انتشار کا دور قراردیتے ہیں۔ نفرت کی سیاست، خودغرضی، تنگ نظری اور تعصب نے ہماری معاشرتی اقدار کو بر ی طرح مجروح کردیاہے۔ تضاد اور تصادم کی فضانے معاشرتی مسائل کو دو چند کردیاہے۔ ایسے ماحول میں ڈاکٹرجالبی ادیبوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر ہمارے شعراء ان تمام عوامل، اس ڈھادینے والی کش مکش، تنگ نظری اور تعصب اور زندگی کے بے معنی پن کی ہجو ہی لکھ دیں تو ادب میں سنجیدگی پیداہوسکتی ہے۔ ہجو ہمارے گھٹے ہوئے ذہنوں کا کیتھا رس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

''نئی نسل کا مسئلہ ' کے عنوان کے تحت ڈاکٹرجالبی نے نئے ادیبوں کے ہاں، احساس، خیال اور ابلاغ کے وسائل کی کمیابی کا ذکر کرتے ہوئے،نئی نسل کے تخلیق کردہ ادب کو گھاس پھوس' اور 'کوڑا کرکٹ کے انبار' قراردیا ہے۔ 'انقلاب کے عوامل 'میں ڈاکٹرجالبی نے معاشرے میں پائی جانے والی ناانصافی، عدم مساوات، معاشی استحصال، مردہ اور منفی روایات کو اقدار کی پیروی جیسے عوامل کو انقلاب کا پیش رو قراردیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی اپنے معاشرے کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے، معاشرے میں

روایت کے انجماد، نظام خیال و اقدار کی شکستگی، عدم مساوات اور زندگی کی بے معنویت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔دانش ور اور سیاستدان‘، ’دانش ور یا ہرکارہ‘ میں دانشوروں کے کردار اور معاشرے میں مثبت فکر کے ارتقاء کے لئے دانشوروں اور سیاستدانوں کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک طرف دانشوروں اور سیاستدانوں کا گٹھ جوڑ معاشرے کی ترقی کا ضامن ہوتاہے تو دوسری طرف اگردانشور محض اپنے تعصبات اور ذاتی مفادات کے اسیر ہوجائیں تو یہ انسانیت کے مسائل میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہوتاچلاجاتاہے لہذا دانشور کے لئے ضروری ہے کہ وہ ’آزاد فکر‘ کو اپنا رہنما بنائے اور کسی سیاسی جماعت کاہرکارہ بننے کی بجائے وقتی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے معاشرتی مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہو، بالخصوص دانشور ادیب کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی ادب میں بے معنویت کا ذمہ معاشرتی زوال کو قرار دیتے ہوئے میر وسودا کے دور کے حو الے سے اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ’’اگر معاشرے کی زوال پذیری ہمارے دور کے ادب کو بے جان اور بے معنی بناتے ہوئے تو میروسودا کے زوال پذیر معاشرے نے اپنے دور کے ادب کو بے جان کیوں نہیں بنایا‘‘(۴۱)

اس سوال کے جواب کی تلاش میں ڈاکٹر جالبی میر و سودا کے عہد کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ یورپ میں کلاسیکی عہد اور نشاۃ ثانیہ کے تحت تخلیق کئے گئے ادب کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ’’تخلیق کی آگ کے لئے معاشرتی و تہذیبی سطح پر بنیادی اداروں پر ایمان کا سالم و قائم ہونا از بس ضروری ہے۔میر و سودا کا اپنے معاشرے، اسکی اقدار اور نظامِ خیال سے زندہ اور مربوط رشتہ باقی ہے اور اسی لئے تہذیبی زوال کے آثار کے باوجود وہ تخلیقی سطح پر وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ہمارے اپنے دور میں ممکن نہیں ہے۔(۴۲)

’مشرق کا المیہ ‘ میں ڈاکٹرجالبی ایک ایسے فکری نقاد کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو تہذیبی زوال کے عوامل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس صور ت حال سے نکلنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق ایک طرف ہمارے ’فکروعمل‘ کے درمیان تعلق ختم ہوچکاہے جس کے نتیجے میں ہم مغربی تہذیب کی نقالی اور پیروی میں شعور و ادراک ے بغیر کررہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہماری فکری نشوونما رک چکی ہے اور تخلیقی صلاحیتیں روبہ زوال ہیں۔ اس مسئلے کاحل ڈاکٹرجالبی ’’خیال کی تشکیلِ نو‘‘ کی صورت میں تجویز کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی اپنے اس نقطۂ نظر کا اعادہ دیگر مضامین میں بھی کرچکے ہیں کہ نئی تہذیبی ضرورتوں کے تحت نئے ’’نظام خیال‘‘ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے اس نظرئیے کی بازگشت ان کے ایک اورمضمون ’’نئے معنی کی تلاش‘‘میں بھی سنائی دیتی ہے۔ تہذیبی زوال اور فرسودہ نظامِ خیال کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے

’’عینی کلچر‘‘ اور ’’حسیاتی کلچر‘‘ کے نظریئے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اسلامی کلچر کے بنیادی خصائص کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ’عینی کلچر‘ جبکہ مغربی کلچر کے بنیادی خصائص کی وضاحت کرتے ہوئے اسے ’’حسیّاتی کلچر‘‘ قراردیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے عینی کلچر کی حسیاتی کلچر کے سامنے پسپائی کی وجوہات کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس بات پرزور دیا ہے کہ آج ہمیں پھر سرسید احمد خان کی طرح اپنی منزل کا تعین کرنا ہے اور وہ منزل یہ ہے کہ ہم عینی دائرے میں رہنا چاہتے ہیں یا حسیاتی دائرے میں داخل ہوناچاہتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی تخلیق میں جدّت اور تنوّع کے لئے کلچر میں نئے عناصر کی جذب پذیری کو اہمیت دیتے ہیں۔ تخلیقی سرگرمیوں کو فعال کرنے کے لئے کلچر کے ذریعے خیال ومواد کا امتزاج ناگزیر ضرورت ہے۔ ڈاکٹر جالبی اردو ادب میں فکری و تخلیقی جمود کو توڑنے کے لئے ادیب کو عہد حاضر کے فکری مسائل کے ادراک اور ان کے حل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی نے ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کا تجزیہ کرتے ہوئے ادیب اور سیاستدان کے کردار کا تعین کرتے ہوئے ادیبوں کو نصیحت کی ہے کہ ’’ادیب کے لئے یہی روّیہ اچھا ہے کہ وہ خود کو کسی کا پابند نا بنائے وہ سب سے آزاد رہے حتیٰ کہ اپنے تعصبات اور اپنی ذات سے بھی‘‘۔(۴۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ادیب سماجی شعور کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ ڈاکٹر جالبی نے ادیب کی سماجی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے سماجی مسائل اور حکومت وقت کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے ادیب کی سب سے اہم ذمہ داری،ذہنی آزادی کی سرگرمی کا تحفظ قرار دیا ہے جس کے بغیر ادیب کی تخلیقی قوت کمزور پڑجاتی ہے بلکہ زبان کا مستقبل بھی غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ آنے والی نسل کی عظیم عمارت کے لئے اس کی بنیادوں میں اپنے تجربات، احساسات، خیالات اور شعور کو شامل کر دے کو آگے چل کر ذہنی تبدیلیوں کے لئے محرک ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر جالبی نے ادیب کے جذبہ حب الوطنی کے حوالے سے مروجہ افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے ادیب کی اپنے فن کے حوالے سے ذمہ داری اور اپنے وطن کے حوالے سے جذبات کے درمیان پائے جانے والے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے ’’خداوندان اقتدار‘‘ کے اس رویے کی بھی مذمت کی ہے جس کے تحت ادیب کی تحریروں کے طرزاحساس کو سمجھے بغیر اس پر وطن دشمنی کا الزام عائد کردیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے اس روّیے کو تہذیبی رشتوں کے لئے نقصان دہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی کا ایک اہم مضمون’ نذیر احمداورہمارے تہذیبی رشتے ‘ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر جالبی نذیرا حمد کے تہذیبی نقطۂ نظر کی کھوج لگانے کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے کو درپیش تہذیبی زوال سے نکلنے کے طریقے بھی تجویز کئے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق سرسید کے پیش کردہ اصول ’’عقل‘‘ کے نتیجے میں افادہ کا اصول برآمد ہو اجو بالآخر ہماری معاشرتی و تہذیبی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں نمودار ہوا۔ سرسید احمد خان اور اکبر الہ آبادی کو دو انتہاؤں پر قراردیتے ہوئے ڈپٹی نذیر

احمد کوان دونوں کے درمیان قرار دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے ان کے اعتدال، توازن اور کلچر کی حفاظت کے نظریے کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے نقطہ نظر کو سب سے بہتر اور قابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق پسندیدگی کا بنیادی سبب ان کی اپنی تہذیب کے ساتھ وابستگی اور اپنے فن میں اس نقطہ نظر کے اظہار کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں جب ڈاکٹر جالبی ہمارے ادبی زوال کا بنیادی سبب تہذیبی زوال کو قرار دیتے ہیں‌ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے ان کی پسندیدگی ایک فطری امر بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مفکر نقاد کے طور پرادبی معاشرتی مسائل کی نشاندہی کرتے ہو ئے ان کے حل کی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنی نسل کے فکری روّیوں اور تخلیقی محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی نسل کے سب افراد کو تصادم اور بحران کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد موضوعات کی کمی کے باعث تخلیق کار روایت، قدیم ادب،قصہ کہانیوں اور داستانوں میں دلچسپی لینے لگے یا پھر مغربی ادب میں پناہ ڈھونڈ نے لگے۔ بقول جالبی:''اپنی تہذیب کی تشکیل نو، نئی اقدار کی تلاش و جستجو، اپنا مزاج بنانے اور سنوارنے کے کام کو ہم نے طاق میں رکھ دیا ہے یہی وہ المیہ ہے جس نے ہمارے اردگرد کہرکواور گہر اکردیاہے''۔(۴۴)ڈاکٹر جالبی اس المیہ کو دور کرنے کے لئے سنجیدگی، بے باکی اور سچائی کے ساتھ فکر و فلسفہ کو ادب کا حصہ بنانے کے عمل کو ناگزیز سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے تنقیدی مضامین میں، معاصر ادب کی صورتحال، مسائل اور روایت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے تہذیبی، فکری اور ادبی سطح پردرپیش شناخت کے مسائل کے حوالے سے عدم اطمینان کااظہار کیا ہے۔ ادب میں بے معنویت بالخصوص علامت اور تجریدیت کے استعمال سے پیداشدہ فکرو نظر کے ابلاغ کے مسائل، ادب کی بے معنویت میں اضافے کا سبب ہیں۔ معاصر ادب، زمانے کی روح سے عاری ہے جس کایک سبب یہ ہے کہ ادیب، فکروخیال کے اظہار کی بجائے شہرت اور آسائش کے حصول کو اپنا مطمأ نظر بنائے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً فکروخیال کے ساتھ ساتھ ادب کا بیج بھی مررہاہے اور معاشرہ سستی تفریحات سے دل بہلانے میں مصروف ہے۔ معاشرے میں معیاری ادب کی تخلیق کی ذمہ داری سب سے زیادہ ادیبوں پر عائد ہوتی ہے لیکن اگر ادیب خود مطالعے کے شوقین نہ ہوں تو وہ اظہار اور خیال کی سطح پر اپنے آپ کو دہرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مطالعے سے دوری، روایت سے دوری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اپنے مضمون''نئے لکھنے والوں سے'' میں ڈاکٹر جالبی نے عصری ادب کے مسائل پر روشنی ڈالنے کے ساتھ، نئے لکھنے والوں کے لئے لائحہ عمل بھی پیش کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے خیال میں نئے ادبیوں کو، جدید وقدیم ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے ادب کی روایت سے آگاہ ہوسکیں۔ تحریروں میں تازگی اور توانائی پیداکرنے کے لئے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ کم از کم ایک بیرونی زبان کے ادب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ادبی تخلیقات میں، زندگی کے گہرے شعور

کی عکاسی کے لئے، زندگی سے گہرا تعلق استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کے تجربات میں شریک ہوکر، ادیب اپنی تخلیق کو بامعنی بناسکتاہے۔ نئے لکھنے والوں کوسچائی کے اظہار میں بے باکی کا مظاہرہ کرنا ہوگا تاکہ آنے والی نسلوں کو بہتر مستقبل دیاجاسکے۔ ''شاعری اور مسائل حیات'' میں ڈاکٹرجالبی، شاعری میں مسائلِ حیات کے بیان کے لئے دوسطحوں کا ہونالازمی قراردیا ہے۔ بقول جالبی:''ایک وہ سطح ہے جس سے وہ اپنے دور کی ترجمانی کررہاہے۔ دوسری وہ سطح ہے جو اس کے عہد سے ماوراہوتی ہے۔ غالب، میر، اقبال، مولاناروم، حافظ و سعدی اس ذیل میں آتے ہیں''۔(۴۵)

ڈاکٹر جالبی نے اس حوالے سے میرؔ کی مثال پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں میر ؔکی شاعری کا لہجہ اور غم و کرب کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کاتعلق اس کے عہد کے کرب سے بھی ہے۔ اس لئے میرؔ اپنے دور کا مقبول ترین شاعر تھا۔ میر ؔنے اپنے عہد کے غم کوآنے والے زمانوں کی روح سے ملادیاہے۔ اسی لئے میر کا غم ذاتی ہوتے ہوئے بھی ذاتی نہیں۔ میر کی شاعری ہمیں آج بھی متاثر کرتی ہے۔ 'مسائل حیات' کو شاعری میں پیش کرنے کا طریقہ ہی شاعر اور اس کی شاعری کا درجہ مقرر کرتاہے۔

ڈاکٹرجالبی ادب کی بہتری اور معاشرتی اصلاح کے آلہ کے طور پر ادب کے لئے جمہوریت کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ حقیقی جمہوریت کی فضا ادب کی تخلیق میں انتہائی مددگار ہوتی ہے۔ جمہوریت ہی ادیب میں وہ شعور پیداکرتی ہے جوادبی تخلیقات میں فکر وخیال کے اظہار کا باعث بنتاہے لہذا ڈاکٹرجالبی ادیبوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے قلم کو جمہوریت کے ارتقاء اور استحکام کے لئے وقف کردیں۔

ڈاکٹرجالبی بنیادی طور پر اردو زبان کو قومی زبان کے طور پر اپنانے کے زبردست داعی ہیںڈاکٹر جالبی نے اپنے ان خطبات میں تاریخی شواہد کی بنیاد پر قومی زبان میں تعلیم کی ضرورت وا ہمیت اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی استعمار کی ان سازشوں کوبھی بے نقاب کیا ہے جن کے ذریعے میں دیسی لوگوں کو ذہنی غلامی کے پھندے میں پھنسا کر برصغیر میں اپنی حکومت کو طول دینا چاہتے تھے۔ بالخصوص ۱۸۳۵ء میں لارڈمیکالے کی رپورٹ اس حوالے سے انگریزوں کی حکمتِ عملی کی شہادت پیش کرتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ایسے عناصر ہمیشہ سرگرم رہے ہیں جو قومی زبان کو دفتروں اور تعلیمی اداروں میں رائج کرنے کے مخالف رہے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیمی دورنگی کا شکار ہے۔ جس کے نتیجے میں قومی یکجہتی کو نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ بطور قوم ہماری فکری نشوونما بھی رک چکی ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ، اعلیٰ مناصب تک پہنچنے میں کامیاب رہتا ہے جبکہ اردوذریعۂتعلیم کے طور پر اختیار کرنے والے معمولی ملازمتوں کے حصول میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ انگریزی زبان کو بطور سرکاری زبان رائج کرنے کے حامی عام طور پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ

انگریزی زبان بیرونی دنیا سے ہمارا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس دلیل کا جواب ڈاکٹر جالبی نے اس طرح دیا ہے:

> ''کیا جرمنوں اور فرانسیسیوں کا باہر کی دنیا سے رشتہ اس لئے منقطع ہے کہ انہیں انگریزی نہیں آتی ؟ وہاں بھی انگریزی صرف ان لوگوں کو آتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے اور اس کام کے لئے انگریزی دان رکھے جاتے ہیں لیکن ساری قوم کو فرانس اور جرمنی والے، باہر کی دنیا سے رشتہ قائم رکھنیکے لئے،انگریزی نہیں پڑھاتے۔پھر آپ دیکھئے کہ ساری عمر پڑھ کر آپ نے باہر کی دنیا سے کیا رشتہ قائم کیا ہے۔ جس کا رشتہ اپنی قوم سے، اپنے ملک سے گہرا نہیں ہوتا، اس کا رشتہ باہر کی قوموں سے، باہر کے ملکوں سے بھی اوپری، سطح اور مصنوعی ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا سے انگریزی کے ذریعے رشتہ قائم کرنے کا کلیہ ایک ایسا مہمل کلیہ ہے جو ہم نے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لئے نادانی میں قبول کر لیا ہے''۔(۴۶)

اردو کو سرکاری سطح پر قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے لئے ڈاکٹر جالبی نے اپنے خطبے ''اردو کے بارے میں سات باتیں'' میں نہایت عمدہ تجاویز پیش کیں ہیں۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق نظام تعلیم عوام اور خواص دونوں کے لئے یکساں ہونا چاہیے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو ختم کرکے پرائمری سطح پر معیاری تعلیم کے فروغ کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ انگریزی کو بطور ایک زبان کے سکھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اعلیٰ مناصب کے لئے مقابلے کے امتحان بھی انگریزی کی بجائے اردو میں ہونے چاہئیں۔

ڈاکٹر جالبی کی عملی تنقیدکا جائزہ(تنقیدی کتب کی روشنی میں):

ڈاکٹرجالبی کا تنقیدی وژن جن نظریات پرقائم ہے وہ نظریات ٹھوس اور روایت سے وابستگی کے اصولوں پرقائم ہیں۔ ڈاکٹرجالبی، ایک ادیب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جدت کو اپنانے کے ساتھ ساتھ ادبی روایت سے اپنارابط قائم رکھیں وہیں ڈاکٹرجالبی کی تنقید میں بھی جدید عصری عناصر کی شمولیت کے باوجود اپنی مذہبی،تہذیبی اقدار سے وابستگی،ان کی روایت سے وابستگی کی مظہرہے۔ جدید مغربی نظریات کے فہم و ادراک اور انہیں اپنی فکر کاحصہ بنانے کے باوجود ڈاکٹرجالبی کی تنقید اپنی تہذیبی اقدار کی عکاسی ہے۔ یوں ادب اور کلچر کے اشتراک سے جس تنقید ی بصیرت کی توقع ڈاکٹرجالبی، اردو

ناقدین سے کرتے ہیں، ڈاکٹرجالبی نے خود عملی طور پر اس کی صورت گری اپنے تنقیدی مضامین کی نظری و عملی صورتوں میں کردی ہے۔

ڈاکٹر جالبی کی عملی تنقید کے مظاہر شاعری اور نثر دونوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نثری اصناف میں افسانہ ہویا ناول، خطوط ہوں یا ڈرامہ، اور شعری اصناف میں غزل، نظم اور جدید شاعر اور جدید شاعری پران کی نظر بہت گہری ہے۔ مغربی اور مشرقی ادب کا وسیع مطالعہ اور مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات سے آگہی نے ان کے تنقیدی وژن کوجلا بخشی ہے۔ شعراء اور ادباء کے تخلیقی فن پاروں کی جانچ پرکھ میں ڈاکٹرجالبی فن پارے کے فنی محاسن اجاگرکرنے کے ساتھ ساتھ فن پارے کی تخلیق کے پس منظر، ادیب اور شاعر کے ذہنی محرکات، تقابل اور استخراج نتائج کو اہمیت دیتے ہیں ۔

ڈاکٹرجالبی کا تحریر کردہ سب سے پہلا تنقیدی مضمون ''فیض کی شاعری'' ان کے مجموعۂ مضامین' ادب، کلچر اور مسائل 'کا حصہ ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ تنقیدی مضمون کسی ناقد کی اوّلین کاوش ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے فیض کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے دونوں ادوار کی شاعری کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا ہے اور فیض کے محرکاتِ شاعری، موضوعاتِ شاعری اور فیض کے معاصرین پر ان کے اثرات اور شاعری کے فنّی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ فیض شناسی کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کا یہ مضمون بہت اہمیت کاحامل ہے۔ ڈاکٹرجالبی جدید شاعر سے جن خصائص کا مطالبہ کر تے ہیں وہ سب فیض کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ڈاکٹرجالبی جدید شاعرسے توقع رکھتے ہیں کہ وہ خارجی اور داخلی ماحول کے امتزاج سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تجربات کو اپنی شاعری کا حصہ بنائے۔ فیض کی شاعری میں یہ دونوں عناصر فیض کی شاعری کی جان ہیں۔ ایک طرف فرد کی داخلی دنیا، جذبات، تخیل، تصورا ت اپنی ذات کا ادراک،فطری خواہشات، فیض کی شاعر ی میں نظرآتی ہیں تو دوسری طرف خارجی دنیا انسان کے اجتماعی مصائب ومسائل، فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ ساتھ فیض کی شعری کائنات کا حصہ ہیں۔اس لئے ڈاکٹرجالبی کے مطابق:

> ''اس کی شاعری میں ہرقسم کے لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ وہ لوگ جو شعر کو محض شعریت کے لئے پڑھتے ہیں یامحض تفریحی شغل سمجھ کر مطالعہ کرتے ہیں یا وہ لوگ جو شاعری میں، شعریت کے علاوہ انقلابی عنصر، ترقی پسند تغیر اور فلسفیانہ گہرائی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ فیض ایک ایسا شاعر ہے جوہرطبقے کے معیار کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور رکھتاہے''۔(۴۷)

’’تنقیداور تجربہ‘‘،ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلو کو سمجھنے کے لئے انتہائی مفید ہے اس کتا ب میں موضوعات ادب کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی کی دلچسپی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شاعری اور نثر دونوں صنف ادب سے ڈاکٹر جالبی خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ کلاسیکی غزل ہو یا جدید نظم، ناول ہو یا افسانہ ہر صنف سخن کے حوالے سے ان کی تنقید ایک گہرائی اور علمیت لئے ہوئے ایسی علمیت جو محض ادب کے سرسری مطالعے سے پید انہیں ہو سکتی۔ مشرقی ادب، مغربی ادبی رحجانات سے ڈاکٹر جالبی کی گہری دلچسپی ان کے وسعتِ مطالعہ اور صاحبِ فکرنقاد ہونے کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن عظیم اردو شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا ہے ان میں میر تقی میر،غالب اور اقبال شامل ہیں۔ میر کی سوانح،شخصیت اور کلام کے حوالے سے ان کی کتاب ’میر تقی میر‘ نہایت اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر جالبی نے میر کے حوالے سے نہایت مستند معلومات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر سیر حاصل تنقید بھی کی ہے۔ڈاکٹر جالبی تنقید کے لئے مستند معلومات کی فراہمی پر بھی بھر پور توجہ دینے کے قائل ہیں۔ڈاکٹر جالبی کی وضع کردہ ترکیب ’تحقید‘ان کے تنقیدی نقطہء نظر کی عکاس ہے۔ میر کی شخصیت،ذاتی حالات اور کلام کے حوالے اہم معلومات اس کتاب کا حصہ ہیں۔میر کی شاعری کی ابتداء کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں کہ’’میر نے اُس زمانے میں جب وہ عالمِ جنون میں تھے،خانِ آرزو کے مشورے پر ریختہ گوئی شروع کی۔یہ ۱۱۵۳ھ،۱۱۵۴ھ(۴۱۔۱۷۴۰ء) کا زمانہ تھا۔(۴۸) میرؔ کو اپنی زندگی میں ابتداء ہی سے جن مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ان سے وہ اپنے آخری وقت تک نجات حاصل نہ کر سکے۔میر کے ذاتی حالات تو دگرگوں تھے ہی لیکن میرؔ کا عہد بھی ایک زوال پذیر دور تھا۔سیاسی،معاشی،تہذیبی اور اخلاقی اقدارتبدیلیوں کی زد پر تھیں۔ ڈاکٹر جالبی نے میرؔ کے عہد کی سیاسی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے میرؔ پر اثرات کی نہایت عمدگی سے نشاندہی کی ہے۔

میرکی شخصیت اور سیرت کی تعمیر میں ان کے خاندانی ماحول، بچپن کے حالات نے خاص کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر جالبی، میر کی اناء پرستی اور شدیداحساسِ ذات کے باوجود میر کو ایک ایسے شاعر کے طور پر دیکھتے ہیں جو زمانے کی کشمکش سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتا۔انہوں نے نامساعد حالات میں وہ سب کچھ کیا جو کوئی بھی دنیا دار انسان کر سکتا تھا۔ میر ؔنے معاشی سہاروں کی تلاش میں کئی سفر کئے۔مختلف امراء کی ملازمت کی۔ ’’ذکرمیر‘‘ کے لطائف بھی اس دلچسپی کے شاہد ہیں میردنیا سے بے تعلق نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو ایسی شاعری نہیں کرسکتے جوآج بھی ہمارے لئے زندہ تخلیقی عمل ہے‘‘۔(۴۹)

انہوں نے معاصرانہ ادبی معرکوں میں بھی حصہ لیا اور نکات الشعراء میں اپنی ذاتی پسند ناپسند کے مطابق شعراء کی گروہ بندی کے مرتکب بھی ہوئے۔ ڈاکٹرجالبی کی تحقیق کے مطابق میر کا ذاتی غم

اور ان کے عہد میں جاری شکست وریخت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر میر کی شاعری میں ظاہرہوتے رہے۔’’میرنے اپنے دور کی اجتماعی روح کے کرب کو اپنی شاعری کے آہنگ میں سمودیا۔۔۔۔غم جاناں اور غم دوراں میر کے ہاں مل کر ایک ہوجاتے ہیں‘‘۔(۵۰)

میرکی شخصیت کے حوالے سے میرکی ذہنی ساخت کامطالعہ نفسیاتی طریقۂ تنقید کی روشنی میں لیاگیاہےجس سے ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے امتزاجی پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی فن اور فن کار کوسمجھنے کے لئے تنقید کے کسی ایک طریقہ کارتک خود کو محدودنہیں رکھتے۔ وہ حسب ضرورت تنقید کے مختلف دبستانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ عمل ان کی تنقید کو گہرائی اور وقعت بھی عطاکرتاہے۔

ڈاکٹرجالبی نے میر کی تصانیف کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے سنِ تصنیف کے تعین میں داخلی اور خارجی شواہد کو مدنظررکھاہے۔ میرے کے تذکرے، نکات الشعراء کے مشمولات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے تحقیقی شواہد کی روشنی میں’ نکات الشعراء‘ کو شمالی ہند کے تذکروں میں اوّلیت دیتے ہیں جبکہ فنِ تذکرہ نویسی کے لحاظ سے ’نکات الشعراء ‘کو معیاری فارسی تذکروں سے کم تر قراردیتے ہیں لیکن کئی حوالوں سے ’نکات الشعراء‘ کو اپنے عہد کی ادبی گروہ بندی کی معلومات فراہم کرنے، شعراء کے کلام پر میرکی اصلاح دینے کے طریقوں، مختلف شعراء کی شخصیتوں کے تاثراتی نقوش اجاگرکرنے اور میر کے نظریۂشعرکو سمجھنے میں مد د ملتی ہے۔

ڈاکٹرجالبی نے’’ذکرمیر‘‘ کے مختلف نسخوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ’’ذکرمیر‘‘ کے سبب تالیف کاتعین کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی جہاں میرؔ کے بیکارہونے کو ایک سبب بتایا ہے وہیں میرؔ کے جذبۂ انتقام کو بھی ایک سبب قراردیا ہےڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق وہ اپنے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن اور سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو سے اظہار نفرت کرنا چاہتے تھے جنہوں نے سات سال انہیں اپنے گھر میں رکھا اور ان کی کفالت کی۔ ’’ذکرمیر‘‘ انہوں نے خانِ آرزو کی وفات کے بعد لکھی تاکہ ان الزامات کا جواب دینے والاکوئی نہ ہو۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق ’نکات الشعراء ‘میں میر ایک گروہ بند اور ادبی سیاست باز کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں،وہیں ’ذکرمیر‘ میں وہ ایک کینہ پرور، منتقم مزاج، اپنوں کو آسمان پرچڑھانے والے اور دشمنوں کو پاتال میں پہنچادینے والے انسان کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ طبیعت کے اسی رحجان کے پیش نظر انہوں نے ’ذکرمیر‘‘ میں کئی واقعات کو مسخ کرکے لکھاہے۔ ’’ذکرمیر‘‘ میں میرکے اسلوب کو ڈاکٹرجالبی نثرفارسی کے ہندوی اسلوب کی نمائندہ مثال قراردیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے میرکی سیرت اور مزاج سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ’’ذکر میر‘‘ سے وہ لطائف بھی درج کئے ہیں جنہیں ’’ذکرمیر‘‘ کے مرتب نے غیرمتعلق اور فحش کہہ کر خارج کردیاتھا۔

میرکے مطالعۂشاعری‘کے ضمن میں ڈاکٹرجمیل جالبی سب سے پہلے میرکی انفرادیت اور اس کے محرکات شاعری پرروشنی ڈالی ہے۔ میرؔ کی انفرادیت ان کے تخلیقی عمل میں پوشیدہ ہے۔ میر کی انفرادیت یہ ہے کہ میر کا تخلیقی عمل ہماری زندگی میں شعور اور معنویت پیداکرکے ہمارااپنا تخلیقی عمل بن جاتاہے۔ میراپنے تخلیقی عمل سے فکر و خیال کو بھی اوراحساس میں تبدیل کردیتے ہیں اور ایسی عام زبان میں پیش کرتے ہیں کہ اثرانگیزی ان کی شاعری کی بنیادی صفت بن جاتی ہے۔ میرؔ چونکہ بنیادی طور پرغزل کا شاعرہے لہٰذا ڈاکٹرجالبی میر کی غزل کے حوالے سے میرؔ کے تصورعشق کوسمجھنے کی کوشش کی ہےبقول جالبی:''میرکے ہاں عشق کے دودائرے ہیں ایک بڑادائرہ اور دوسرااس دائرے کے اندر ایک چھوٹا سادائرہ، بڑادائرہ وہ جوکل محیط ہے یہاں عشق ساری کائنات پر حاوی ہے۔ عشق ہی روح کائنات ہے۔

ع اک عشق بھررہاہے تمام آسمان میں''۔(۵۱)

ڈاکٹرجالبی، میرؔ کے تصورِ عشق کے بڑے دائرے کو مابعد الطبیعات سے جوڑتے ہیں۔ میرؔ کے نزدیل عشق کا یہی وہ تصور ہے جوکسی زوال پذیر معاشرے میں زندگی کی روح پھونک سکتاہے۔ میرکے عہد کے تناظر میں میرکا یہ تصورِ عشق ہی اس عہد کے تمام مسائل کاحل تھا۔ میر نےؔ موت کے مجاہدانہ تصور کو اپنے تصورِ عشق کا حصہ بناکر زندگی کو ایک نیاتسلسل دیا۔ ''میر کی غزل کاشق اور میر کی مثنویوں کے کردار اعلیٰ مقصد کی خاطر ایسے مشتاقانہ جان دیتے ہیں گویا یہ بھی زندگی کا ایک تسلسل ہے''۔(۵۲)

ڈاکٹرجالبی کے مطابق بیسویں صدی میں یہی تصورِ عشق اقبال کی شاعری میں بھی ملتاہے۔ میر کی شاعری کا دوسرا دائرہ مجازی نوعیت کاہے۔ انسانی عشق کی تمام کیفیات کو میرؔ نے نہایت عمدگی سے اپنی شاعری میں پیش کیاہے۔ ''اس دائرے میں میر کے ہاں زندگی سے گہری وابستگی اور کشمکش کا احساس ہوتاہے۔ ان کا ہرتجربہ اعلیٰ اور عام کو ایک بناکر پیش کرتاہے۔ ایسا عام جواعلیٰ ہے اور ایسا اعلیٰ جو عام ہے''۔(۵۳)

میرعشقیہ کیفیات کے بیان میں عام انسانی سطح کو مدنظر رکھتے ہیں۔ یہی عنصر میر کی شاعری کو ہرقسم کے انسان کے لئے باعث کشش بنادیتاہے۔ میر کی شاعری میں غم و الم کو ڈاکٹر جالبی ان کے ذاتی مصائب اور انتشاردہ عناصر کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ''لیکن میر کی شاعری میں غم کی نوعیت ڈھانے اور جلانے والے نہیں''۔(۵۴)

ڈاکٹرجالبی نے میرؔ کی شاعری میں غم کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے میرؔ کے غم کوانسانی آرزو کی شکست، تنہائی کے احساس اور زندگی میں فرد کی بے چارگی اور موت کے

سامنے اس کی بے مائیگی کے شعور کی پیداوار قراردیا ہے۔ میرکی شاعری سے غم کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے کیٹس، شیلی، گوئٹے اور بود لیئر وغیرہ کی شاعری سے تقابل کرتے ہوئے میر کے غم کو مثبت اور حیات افروز قراردیا گیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے میر کی شاعری میں غم و الم کے عناصر کے تجزئیے کے ساتھ ان کی شاعری کے غنائی پہلو کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق غنائی شاعری میں لاشعور کا حصہ شعور سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔اس لئے غنائی شاعری میں زبان اور رنگوں کی قدرتی آمیزش سب سے بڑا وصف ہے۔ میر کی زبان جذبات کے تقاضوں کے مطابق رنگ بدلتی ہے اور اسی فنی عمل سے غنایت پیداہوتی ہے۔

میر کی شاعری میں زندگی اور انسان کے حوالے ان تصورات کا تجزیاتی مطالعہ بھی دلچسپی کا حامل ہے۔ میر کی شاعری میں پایاجانے والے انسان، میرہی کی طرح اپنی ذات کو اہمیت دینے کے باوجود اجتماعیت سے بھی قطع تعلق نہیں کرتا۔ غم و نشاط کے پہلو متوازی طور پر چلتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق:

> ’’میر کی شاعری دو بنیادی علامتوں کے ذریعے اپنااظہار کرتی ہے۔ دل اور دلّی۔۔۔دل انسان کا وہ مرکز ہے جس کے آئینے میں میرؔ زندگی اور کائنات کاجلوہ دیکھتے ہیں اور دلّی اس تہذیب کا دل، جو مٹ رہی ہے‘‘۔(۵۵)

عام طور پر ناقدین میر کی شاعری اور شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے میر کی انا پرستی کو ایک اہم عنصر کے طور پردیکھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹرجالبی میر کی تخلیقی زندگی میں’’میں‘‘ کے عنصر کی بجائے ’’ہم‘‘ کے استعمال کو ان کی اجتماعی زندگی سے وابستگی کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح میرؔ کی شاعری میں بہترین اشعار وہ ہیں جن میں میر اپنے تخلص کے ساتھ خود کو مخاطب کرتے ہیں:

> ’یہاں وہ اپنی ذات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اس سے الگ بھی ہوجاتے ہیں اور میر، میرصاحب، میرجی، میرجی،صاحبن کر ایک الگ شخصیت بن جاتے ہیں۔ اسی لئے اکثر مقطعوں میں یوں محسوس ہوتاہے کہ محمد تقی، میرؔ کو اپنے سے الگ کرکے مخاطب ہورہے ہیں‘‘۔(۵۶)

ڈاکٹر جالبی نے بطور شاعر میرؔ کی کامیابی کا سبب اس تخلیقی عمل کو قراردیا ہے کہ جس میں میرؔ دکھ اٹھانے والے آدمی اور تخلیق کرنے والے شاعر کو الگ کرکے شاعری تخلیق کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی نے میرؔ کی شاعری کے جن دیگر پہلوؤں کا تجزیہ پیش کیاہے ان میں میر کی شاعر ی میں عام بول چال کی زبان کا ایسا استعمال جس میں وہ مولاناروم اور گوئٹے کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں۔ مولانا روم نے مثنوی میں اور گوئٹے نے فاؤسٹ میں عام بول چال کی زبان کو اس طور استعمال کیاکہ عوام وخواص، تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ دونوں ان سے لطف اندوز ہوئے۔ میرؔ کی شاعری کا بھی یہی کمال ہے۔ میرکے طرز میں سادگی کے ساتھ ایسی پرکاری پائی جاتی ہے جس کی پیروی دشوار ہے۔ سادگی، میرؔ کے تخلیقی و تنقیدی شعور کی کارفرمائی کانتیجہ ہے۔ محاورات کے استعمال سے طرزِ میرؔ میں رچاوٹ، اثر آفرینی، لہجے کی گرمی، انداز کی بے ساختگی بھی اس سادگی کو ابھارنے کا باعث بنتے ہیں۔ صنائع و بدائع کے استعمال کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> ’’رنگ، محاورات، صنائع، منتخب وموزوں الفاظ اور صوتی اثر کے ساتھ مل کر اس قدر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں کہ شعر کے اثر میں گم ہو کر ہم ان کے وجود کو ہی بھول جاتے ہیں----یہی صورت میرکے ہاں تشبیہ کے استعمال میں ملتی ہے۔ تشبیہ بھی شعرکے وجود کا حصہ بن کراس طور پرآتی ہے کہ اثرہمیں پہلے اپنی گرفت میں لے لیتاہے اور تشبیہ شعر میں چھپ جاتی ہے‘‘۔(۵۷)

میر کی شاعری میں سادگی کے عنصر کے باعث تراکیب کا استعمال کم نظرآتاہے میرنے اپنی شاعری میں جن فارسی تراکیب کو استعمال کیاہے انہیں اردو اسلوب سے ہم آہنگ کردیاہے لیکن ڈاکٹرجالبی میرکے طرز کی انفرادیت ان کی مخصوص تمثالوں میں تلاش کرتے ہیں جن سے ان کے مطالعے اور وسیع مشاہد ے کا ثبوت ملتاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق میر ؔنے اپنی زندگی میں بہت سفر کئے اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ان کے تصورات میں تنوّع کی بھی یہی وجہ ہے لیکن ان کی تمثالوں کا دائرہ بہت محدود ہے۔ کائنات کے حسن کو جن پہلوؤں سے وہ دیکھتے ہیں اس کا تعلق خارجی حسن سے نہیں بلکہ’ نور‘ سے ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں چمک، فضا، آن بان کے تاثرات زیادہ ہے گویا فضائی اثر سے انہیں زیادہ دلچسپی ہے۔

میر کے کلام میں صوری اور صوتی اثرات طویل بحروں کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ میر کی شاعری میں ایک راگ کی سی کیفیت ملتی ہے۔

> ’’یہ راگ چھوٹی، درمیانی اور بڑی بحروں میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس راگ میں تاشے باجے کا سازوروشور اور تیز رفتاری نہیں بلکہ یہ نیچے سروں میں دھیمی لے میں اٹھتاہے اور ایک خاص بلندی

تک پہنچتاہے----لفظوں اور ان کی ترتیب سے پیداہونے والی آوازیں،
بحروں کا آہنگ، قافیوں کا استعمال، ردیف کی تکرار اور ان سب میں
غم ملالہجہ اس مخصوص راگ کو پیداکرتاہے جس سے ایسی فضابنتی
ہے جوہمیں مسحور کردیتی ہے''۔(۵۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی دیگر ناقدین کی طرح میرؔ اور سوداؔ کا تقابل پیش کیا ہے لیکن ان دونوں کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی ایک کے مرتبے کوگھٹایایا بڑھایانہیں ہے بلکہ دونوں شعراء کے دائرہ کار کا اور مخصوصی تخلیقی صلاحیتوں کا ادراک کرتے ہوئے دونوں کو اپنی اپنی حیثیت میں اہم قراردیا ہے۔ جیسا کہ سودا کو قصیدہ اور ہجو میں باکمال شاعر قراردیا ہے جبکہ میرؔ کو غزل میں۔ ان دونوں شعراء کی شاعری کے مزاج کا فرق بنیادی طور پر ان دونوں شعراء کی شخصیتوں کے مزاج کا فرق ہے۔ جس کااثر ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر بھی پڑا ہے۔ سوداؔ کے مزاج کی خارجیت اور میرؔ کے مزاج کی داخلیت ہی ان دونوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے فرق کا اظہار نہیں کرتی بلکہ سودا کی اہمیت میرؔ کے مقابلے میں اس لئے بھی کم محسوس ہوتی ہے آ ج قصیدہ کی صنف متروک ہوچکی ہے جبکہ غزل آج بھی مقبول عام صنف ہے۔

ڈاکٹرجالبی نے ایک طرف میر اور سودا کا تقابل کیا ہے وہیں میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں غالبؔ اور اقبالؔ سے بھی برتر قرار دیا ہے اور میر کو مشرقی شعری روایت میں سعدی اور حافظ کے ہم پلہ قرار دیا ہے جبکہ مغربی شعری روایت میں میر کو ورڈ ورتھ، کولرج، بائرن، شیلی، کیٹس، ہیوگو، بودلیئروغیرہ کی طرح داخلی شاعری کے اہم نمائندوں کے ہم پلہ قراردیا ہے۔

ڈاکٹرجالبی میں میر کی زبان کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میرؔ کی شاعری میں سادہ اور عام بول چال کی زبان کے استعمال سے ایک طرف شاعریاور معاشرے کا رشتہ مضبوط ہواتو دوسری طرف عام بول چال کی زبان کی قوتِ اظہار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ میرؔ کی شاعری کی زبان فارسی کے زیر اثر نہیں ہے اس طرح میرؔ کی شاعری کی زبان فارسی کی حاکمیت کو ختم کرکے اردو کی حاکمیت قائم کردیتی ہے۔ میرؔ کے کلام میں بتدریج ہندی وپراکرتی الفاظ ختم ہوتے گئے وہیں فارسی تراکیب کا استعمال بھی بتدریج کم ہوتاگیا۔ میر نے اپنی شاعری میں نہ صرف پہلے سے وضع کر دہ تراکیب استعمال کیں بلکہ نئی تراکیب بھی وضع کیں ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے میرؔ کے کلام سے ایسی تراکیب کی لمبی فہرست فراہم کی ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:
کشتۂ ستم، ناوکِ بے خطا، حیرانِ تماشائی، شعلۂ‘پرپیچ و تاب، طائرِ پربریدہ، حیرانِ دیدار، شامِ شبِ

وصال، قبائے تنگ، آتشِ سوزانِ عشق، تکلیفِ باغ، تہہ تیغِ ستم، چراغِ زیرِ دامان وغیرہ۔ ڈاکٹرجالبی نے میر کے کلام سے ایسے اشعار کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں فارسی تراکیب کے استعمال کے باعث اگر غالب کے اشعار میں ملادیاجائے تو پہچان دشوار ہوگی۔

مثلاً درج ذیل اشعار ؛

ے داغِ فراق وحسرتِ وصل، آرزوئے عشق
میں ساتھ زیرِخاک بھی ہنگامہ لے گیا

ے اشکِ تر، قطرۂخوں، لختِ جگر، پارۂ دل
ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہتر نکلا

ے دردِ دل، زخم جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ !عالم سے مرے ساتھ چلاکیا کیا کچھ

بقول جالبی:

’’فارسی روایت کی پیروی کے باوجود یہ فارسی پن میرکے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ بھی میرؔ کا ایک تجربہ تھا۔ جب میرؔ اس اسلوب سے گزرکر اردو اسلوب کی طرف آئے تو وہ انفرادیت پیداہوئی جسے ہم رنگِ میرکہتے ہیں‘‘۔(۵۹)

میر کی شاعر کے لسانی مطالعے کی ذیل میں ڈاکٹرجالبی نے درج ذیل نتائج مرتب کئے ہیں۔

۱۔ میرنے فارسی محاورات اور مصدروں کو، مرکب مصدروں کی صورت میں اردو میں ڈھالا۔

ے دیکھا اسے جس شخص نے اس کو عجب آیا

۲۔ میر کی شاعری میں جن الفاظ کو متروکات میں ذیل رکھا جاتاہے مثلاً کبھو، تئیں، ایدھر، اودھر، کیدھر، گوئیا، ٹک، کنے اور لوہو وغیرہ یہ الفاظ میر کے عہد میں مستعمل تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے بعض کی شکل میں تبدیلی واقع ہوگئی یابعد میں بالکل متروک ہوگئے۔ دیگر متروک الفاظ میں ووہیں، ووں، تب تک، تب سے، جہاں کاتہاں، تس، جس تس، واں، کاہے کو، کاہے کے تد، زور، اپر، عجب،ہونٹھ، سناہٹا، جھوٹھ، بھل، بھیکھ، مچھلکا، تڑبھا وغیرہ الفاظ میں ہائے مخلوط کا استعمال بتدریج کم ہوتاگیا۔

۳۔ میرکی شاعری میں ’’نے‘‘ کااستعمال شعری ضرورت کے تحت بھی مخذوف ہوااور کبھی استعمال ہوا۔

۴۔ بعض الفاظ کی تذکیرو تانیث زمانۂ حال سے مختلف ہے۔

مثلاً

بلبل (مذکر)، گل وبلبل بہار میں دیکھا (دیوانِ اوّل)

ے قلم ہاتھ آگئی ہو تو سو سو خط لکھا ہوگا (دیوانِ اوّل)

۵۔ میرکے کلام میں جمع بنانے کے مختلف طریقے ملتے ہیں۔ مثلاً

’وں‘ کے استعمال سے سبھی ’سبھوں اور منتظر ’منتظروں ‘ ہوجاتاہے۔ بعض اوقات ’لی‘ کی جمع ’’لیاں‘‘ اور کی سے ’’کیاں‘‘اسی طرح ’’ہماری‘‘ سے ’ہماریاں ‘، ساری سے ’ساریاں۔ ‘ قدیم اردو کے اصول کے مطابق فاعل اگر جمع ہے فعل بھی جمع لاتے ہیں ؛

مثلاً

ے عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں (دیوانِ اوّل)

۶۔ میر عربی، فارسی اسماء کے آخر میں ’’ی‘‘ لگاکر کبھی اسم کو فاعل بنالیتے ہیں اور کبھی صفت بناتے ہیں مثلاً

سفری: مسافر اسباب لٹارہ میں یاں ہرسفری کا

زنجیری: قیدی ے چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں۔

۷۔ میر کے عہد تک عربی، فارسی، ترکی الفاظ کو ’’و‘‘عطف سے جوڑنے کا رواج رہاجوبعد میں متروک ہوگیا۔ مثلاً

ے نبی کا خویش وبھائی حیدر قرار کہتے ہیں (دیوانِ اوّل)

۸۔ ضمائر کے سلسلے میں بھی متروک صورتیں ملتی ہیں مثلاً ضمیر واحد غائب ’وہ ‘ کی جمع ’وے‘ یہ کی جمع ہے، تمہارے لئے کی جگہ تمھیں وغیرہ۔

۹۔ قدیم اردو کا طریقۂ کار جس کے مطابق عربی فارسی، ہندی الفاظ کے ’پن‘ یا ’پنا‘ لگاکر اسم فاعل بنالیاجاتاتھا، میر کی شاعری میں بھی یہ رحجان عام نظر آتاہے مثلاً عیار پن، دیوان پن، دبلے پنے وغیرہ۔

۱۰۔ میر کی زبان پربرج بھاشا کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے فعل کے استعمال کی چند مثالیں درج کی ہیں جو بعد میں متروک ہوگیامثلاً :

ؔ اس نرگسِ مستانہ کو کریاد کڑھوں ہوں۔

ے یاتوبیگانے ہی رہیے ہوجیے یا آشنا

ے ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھیو

میر کی شاعری کا لسانی مطالعہ میر کے عہد کی زبان کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوسکتاہے۔ زبان کے ارتقاء میں الفاظ کے مستعمل ہونے یا متروک ہونے یا قواعد کے اصولوں کے مطابق الفاظ کے استعمال اور الفاظ کی بناوٹ میں تبدیلیوں کے جائزے کے لئے لسانی مطالعہ بنیاد فراہم کرتاہے۔

میر کی شاعری کا ایک اہم حصہ اس کی مثنویات، قصائد اور ہجویات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹرجالبی، میر کی غزل سے زیادہ میر کی مثنویات کو اس کی ذات کے انکشاف کا ذریعہ قراردیا ہے۔ میر کی ۳۷ مثنویاں اب تک سامنے آچکی ہیں جنہیں موضوعات کے اعتبار سے ڈاکٹرجالبی نے چارحصوں میں تقسیم کیاہے۔ عشقیہ مثنویوں میں ۹ مثنویاں واقعاتی مثنویوں میں ۱۳ مثنویاں، مدحیہ مثنویوں میں ۳ مثنویاں اور ہجو یہ مثنویوں میں ۱۲ مثنویاں شامل ہیں۔ میرؔ کی مثنویات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میر کی مثنویات پر ان کی اپنی غزل کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ امر ان کی مثنویا ت کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ میر کی عشقیہ مثنویوں مثلاً خوا ب و خیال، جوشِ عشق اور معاملاتِ عشق میں میر کی آپ بیتی ملتی ہے جبکہ دیگر ۶ مثنویوں جگ بیتی ہے۔

میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کو میر نے ''دریائے عشق'' ہی کے نام سے فارسی نثر کی صورت میں بھی لکھاڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق مصحفی کی مثنوی 'بحرالمحبت ' میں بھی اسی قصے کو موضوع سخن بنایاہے اور خود مصحفی نے بھی اس بات کا اقرار کیاہے۔ میرکی عشقیہ مثنویوں سے میر ؔکے تصورِ عشق کو بخوبی سمجھا جاسکتاہے۔ یہ تصورِ عشق مادی و روحانی اور مجازی و حقیقی سطح پر مل کر ایک وحدت بن جاتاہے۔ بقول جالبی:''اس تصورِ عشق کی مابعد الطبعیات سے واقف ہوئے بغیر مولانا روم کی مثنوی، ابی العربی کے تصورِ عشق اور میرو اقبال کی شاعری کو نہیں سمجھا جاسکتا''۔(۶۰)

میرکی مثنویوں کے کردار بھی مافوق الفطرت نہیں بلکہ عام انسان ہیں۔ میر کی واقعاتی مثنویوں میں ساقی نامہ، جنگ نامہ، کتخدائی آصف الدولہ، جشنِ ہولی اور دربیانِ مرغ بازاں کے علاوہ شکارنامے اور نسنگ نامہ قابلِ ذکرہیں۔ عشقیہ مثنویوں کے برخلاف ان مثنویوں میں شکار کے نقشے، جنگل کی تصویریں، جانوروں کی حرکات و سکنات اور شکار کی گہما گہمی کو خوبصورتی سے بیان کیاہے۔زندگی سے قربت اورنشاطیہ رحجان بھی سامنے آتاہے۔ میر کی مثنویوں کے مختلف رحجانات اور ان کی سوانحی اہمیت اجاگرکرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی میر کی مثنویوں کورومانوی شعراء کے لئے مشعلِ راہ قراردیتے ہیں۔ بقول جالبی:

’’ان مثنویوں کی اہمیت قصوں کی وجہ سے نہیں بلکہ رومانی اندازِ نظر، واقعاتی تاثر اور اس مخصوص فضا کی وجہ سے ہے جومیر کی مثنویوں کے علاوہ دوسری مثنویوں میں نظرنہیں آتی‘‘۔(۶۱)

ڈاکٹر جالبی،میر کی مثنویوں کو میر کی (Self Study) قرار دیتے ہیں۔ میرکی ذات کو ان کی شاعری بالخصوص غزل اور مثنویات کے تناظر میں بخوبی سمجھاجاسکتاہے۔ ڈاکٹرجالبی میر ؔکی مثنویوں کو ان کی غزلوں کے توضیحی اشار یے قراردیتے ہیں۔ فنّی نقطۂ نظر سے بھی میر کا کمالِ سخن غزل اور مثنوی میں عروج پر نظر آتاہے۔

میر کی ہجویات کو ڈاکٹرجالبی نے تین حصوں میں تقسیم کیاہے۔ ایسی ہجویں جوافراد سے متعلق ہیں مثلاً ہجو عاقل خاں، ہجوآئینہ دار، ہجوبلاس رائے وغیرہ، دوسری وہ ہجویں جن میں اپنے حالات اور ماحول کو ہدفِ ملامت بنایاہے مثلاً درہجوِخانۂ خود، درہجوِلشکر، درشہرِ کاما وغیرہ۔تیسری قسم میں وہ ہجویں شامل ہیں جن میں اقدار، موسم اور دنیا پر طنز کیاگیاہے مثلاً درہجوِکذب، درہجوِبرشگا ل وغیرہ۔ میر ؔکی عشقیہ مثنویاں جہاں میرؔ کی زندگی کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہیں میرؔ کی ہجویات،میرکے عہد کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی صورت حال کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔

ڈاکٹرجالبی نے میر کی ہجویات کا مطالعہ، میر کی شخصیت کے تناظر میں کیا ہے اور سودا کو ہجو کے میدان میں میر کی نسبت زیادہ کامیاب قراردیا ہے۔ اس تقابل کے ضمن میں میرکی شخصیت اور سودا کی شخصیت کو بھی مدّ نظررکھا ہے۔ ہجو نگاری میں میرؔ اخلاقی حدود و قیود کا خیال رکھتے ہیں جبکہ سودا تمام اخلاقی حدود کو پامال کردیتے ہیں لہٰذا میر ہجویات میں اتنے کامیاب شاعر کے طورپر سامنے نہیں آتے جیسا کہ سودا، لیکن ڈاکٹر جالبی کے مطابق سودا ؔکے بعد میرؔ ہی اس دور کے دوسرے بڑے ہجونگار ہیں۔ میرؔ کی قصیدہ گوئی بھی روائتی نوعیت کی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق میر ؔکے قصیدے انفرادیت کے حامل نہیں ہے اور ناہی فنی محاسن کے لحاظ سے بلند درجے کے حامل ہیں۔ میرؔ کے قصیدے رواجِ زمانہ اور مذہبی عقیدت کے اظہار کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح میرؔ کے مرثیے اور سلام بھی روائتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے مرثیے اور سلام بھی روائتی نوعیت ہیں۔ ان کے مرثیے اثرانگیزی سے محروم ہیں۔ اس کی وجہ ڈاکٹرجالبی کے مطابق یہ ہے کہ:’میرکے لئے اپنی ذات اور اس کے غم زیادہ اہم ہیں وہ جس خوبی سے اپنے غمِ عشق کو مثنویوں میں بیان کرتے ہیں وہ دوسروں کے غمکا اظہار نہیں کرسکتے، یہ ان کی مجبوری ہے‘‘۔(۶۲)

ڈاکٹرجالبی نے میر کی سوانح، سیرت، شخصیت اور کلام کے سلسلے میں اپنے بھرپور تحقیقی و تنقید شعور کا ثبوت دیاہے۔ میرؔ کی سوانح کے حوالے سے ہرپہلو کو تحقیق اصولوں کی روشنی میں جانچ پرکھ کے بعد اس کتاب کا حصہ بنایاہے۔ ایسے امور جن میں متضاد آراء پائی جاتی تھیں انہیں تحقیقی شواہد

کی روشنی میں تضا دکی گرد سے پاک کیا۔ میر کی شاعری کے تجزئیے میں ان کی شخصیت کے مختلف رحجانات اور ذہنی روّیوں کو ناصر ف پس منظر کے طور پر استعمال کیاہے بلکہ ان کی شخصیت کے حوالے سے پائے جانے والی ناقدین کی آراء بالخصوص ان کی اداسی، یاسیت، بددماغی کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کو نہ صرف دورکیا بلکہ میر ؔکی شخصیت میں پیدا ہوجانے والے ان روّیوں کے محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے میر ؔکی شخصیت کی درست عکاسی کی بھی کوشش ہے۔ میر ؔکے کلا م کی قدر وقیمت متعین کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے میرؔ کی شاعری کے مختلف پہلووٴں کا جائزہ نہ صرف مشرقی شاعری کے اصولوں اور اہم شعراء کے حوالے سے لیاہے بلکہ مغربی تنقیدی فکر کے اصولوں کا اطلاق کی بھی عمدگی سے کیاہے اور مغربی شعراء اور میرؔ کے درمیان اشتراکات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ میر کی شاعری کی تنقید میں ان کاتجزیاتی انداز ایک توازن اور اعتدال لئے ہوئے ہے۔ وہ میر کے کلام کے فنی خصائص پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ خامیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے قصیدے، ہجو اور مرثیہ نگاری کووہی مقام دیتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں اور قصیدے اور ہجوکے میدان میں ان کے مقابلے میں سوداکی برتری تسلیم کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کا لسانی مطالعہ ان کے عہد کی زبان اور بعد کے ادوار میں آنے والی تبدیلیوں کی نہایت عمدگی سے نشاندہی کرتاہے۔ میر کی شاعری کی زبان نے جس طرح اپنے عہد میں اردو زبان کے ارتقاء اور تعمیر کردار اداکیا اس کی نشاندہی بھی ایک لسانی محقق کے انداز میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کی اس کتاب کو مطالعۂ میر کے ضمن میں نہایت عمدہ اضافہ قراردیاجاسکتاہے۔

ڈاکٹرجالبی حیات میرکے پر چھوٹے بڑے واقعہ سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ میر کی نفسیات اور شخصیت کے محرم بھی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے اپنے مضمون ''بنام محمد میر'' میں انتہائی دلچسپ انداز میں میر کو مخاطب کر تے ہوئے ان کی دو کتب، 'نکات الشعراء ا'اور 'ذکر میر 'میں پیش کردہ بعض حقائق اور تعصب پر مبنی تنقیدی آراء کے حوالے سے شکوہ کرتے پائے جاتے ہیں ان کایہ انداز، میر کے پیش کردہ واقعات کی صحت کی درستی اور میر کی تنقیدی آراء سے تعصبات کی گرد ہٹانے کی ایک اچھوتی کاوش ہے۔ ڈاکٹر جالبی کا یہ انداز نقد ان کے تنقیدی مضامین کو مزید دلچسپ بناتاہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی غالب شناسی کے حوالے سے متعدد مضامین ان کی تنقیدی کتب میں شامل ہیں مثلاً'طرز غالب' میں ڈاکٹر جالبی غالب کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لینے والے عوامل کی نشاندہی نہایت عمدگی سے کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کی ابتدائی زندگی، خاندانی ماحول اور ان شخصی عوامل کا تجزیہ پیش کیاہے جن کی بنیاد پر غالب کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ اسی مخصوص شخصیت کے مزاج میں انفرادیت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے غالب کی شاعری کے مخصوص مزاج قدروقیمت کا تعین کیا گیاہے۔ ڈاکٹرجالبی غالب کی انفرادیت پسندی کو ان کی شاعری اور شخصیت

کی تعمیر کے حوالے سے اہم قراردیتے ہیں۔ غالب کی یہ انفرادیت پسندی ہی تھی جس نے انہیں شاہراہِ عام سے ہٹ کر چلنے اور نیا راستہ نکالنے کی ترغیب دی۔ اس سلسلے میں جہاں غالب کی فطری صلاحیت نے ان کی مدد کی وہیں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور زوال پذیر تہذیب بھی اور دوسری طرف جدید مغربی تہذیب کے اثرات جوکہ سفر کلکتہ میں غالب نے محسوس کرلئے تھے،نے ان کی مدد کی اور بقول جالبی:''اپنے مزاج کے عین مطابق اپنا الگ راستہ تلاش کرتے کرتے میرزامروجہ شعری روائت کے دائر کو توڑ کر جدید تہذیبی، دائرے میں داخل ہوگئے''۔(۶۳) ڈاکٹر جمیل جالبی 'زبانِ غالب 'کے اجزائے ترکیبی کاتجزیہ کرتے ہوئے اس رائے کااظہار کیا ہے کہ ان کی زبان کا دائرہ عمل بہت پہلو دار اور وسیع ہے۔ زبان دانوں نے ان کی زبان میں غلطیاں نکالیں لیکن ان کی یہی غلطیاں خود اصول زبان بن گئیں۔ غالب نے اردو زبان کو اعلیٰ ترین جذبات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ طرزِ غالب میں ادراک و شعور، تخیل و ذکاوت اور روحانی و کلاسیکی رحجانات ایک اکائی کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں۔ غالب کی وضع کردہ نادرتراکیب، رمزیت، امیجری، لفظی و معنوی رعایتیں، موسیقیت وغیرہ کے عناصر نے غالب کی شخصیت کی اپچ کے ساتھ مل کر غالب کی تخلیقی کائنات کو وسیع ترکردیاہے۔بقول جالبی:

''........غالب کے علاوہ شاید ہی اردو کا کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اتنے حقائق ادراک و شعور کی اتنی گھتیاں، فکر واحساس کی اتنی معنی خیز لطافتیں، اتنے جامع اوصاف انداز میں پیش کی ہوں جو اس قدر واقعاتی بھی ہوں کہ زندگی کے ہرموقع پرہماراراستہ روک کر ذہن کی فضاکوروشن کی دیتی ہیں''۔(۶۴)

ڈاکٹرجالبی اس مضمون میں ایسے ناقد کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جوتنقیدی عمل کے دوران ''امتزاجی تنقید'' کے اصولوں کو پیش نظررکھتاہے۔ تجزیہ و تحلیل کا انداز اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ عمرانی، نفسیاتی اور تاثراتی تنقید کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھاہے جوکہ غالب جیسی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

''رازداں اپنا'' کے عنوان سے مضمون میں بھی ڈاکٹرجالبی غالب ہی کوموضوعِ سخن بنایا ہے۔ ڈاکٹرجالبی، غالب کی عظمت کے ان عوامل کا تجزیہ کیا ہے جن کے باعث غالب آج بھی ہمارے شعور وفکر کاحصہ بناہواہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق غالب اپنے زمانے کاجزو ہوتے ہوئے بھی اپنے زمانے سے آگے تھا۔ غالب نے کائنات اور انسان کو وہ آفاقی اور ابدی صداقتیں دریافت کیں جنھوں نے ذہن انسانی کو وسعت دینے میں اپنا کردار اداکیا۔ غالب اور ذوق کا تقابل کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی ذوق اور غالب کی شاعری کے اسی فرق کو واضح کرتے ہیں جس کی بنیاد روایت پرستی ہے۔ غالب نے روایت کے دائرے

کو توڑ کرنیاآہنگ اور فکروشعور کی نئی سطح پرمتعارف کروایا۔ جبکہ ذوق اپنے عہد کی شعری روایت کانمائندہ تھا جواس عہد کے ساتھ ہی دم توڑ گئی۔ اس مضمون کا ایک خاص جزو غالب کی شاعری میں فلسفیانہ عناصرکی نشاندہی ہے۔ ڈاکٹرجالبی غالب کو عظیم مغربی فلاسفہ کے ہم پلہ قراردیتے ہیں جو اپنی شاعری میں اخلاقیات کا بھی برتر نظام پیش کرتاہے۔

''مطالعہ اقبال کے نئے گوشے''کے عنوان سے ڈاکٹرجالبی نے اقبال کے فلسفۂعمل کے مآخذات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق اقبال کی فکر پر گیتا، مولاناروم، راجہ بھرتریہری کے اثرات نمایاں ہیں اور ''جاوید نامہ'' میں مہاتما بدھ کی شخصیت کے ذکر سے ان کی وسیع المشربی کا ثبوت ملتاہے۔ علامہ اقبال کے فلسفہ و فکرپرہونے والے کام پر ڈاکٹرجالبی نے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مطابق جس طرح اقبال نے ماضی وحال کے سرمایۂ علمی کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھا ہمیں بھی فکر اقبال کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تجربات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ ڈاکٹرجالبی نے مطالعۂ اقبال کے حوالے سے چند اصول پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق اقبا ل کے کلام کو اقبال کی زندگی کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے ساتھ ہی اقبال کے فلسفہ و فکرکو اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ ہمارے اور اقبال کے زندگی کے تجربے میں اختلافات اور مشترکات کی نشاندہی ہوسکے۔ زندگی، کائنات اور انسان کے حوالے سے اقبال کے نظریات کو دیگر علوم وفنون کی روشنی میں پرکھنا چاہیے یعنی اقبال کی فکر کا تقابل دیگر مفکرین کی فکر کے ساتھ کرناچاہیے۔ مطالعۂ اقبال کے ضمن میں دیکھنا چاہیے کہ اقبال جس معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں آیا وہ عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق وجود میں آملتاہے یانہیں مزید یہ کہ بدلتی ہوئی دنیا کے پس منظر میں فکرِ اقبال کا مستبقل کیاہے؟ ڈاکٹرجالبی نے فکرِاقبال کو سمجھنے کے لئے نئے اصول وضع کرنے کے سلسلے میں عہد حاضر کے تقاضوں کو بالخصوص مدنظر رکھاہے یہی ڈاکٹرجالبی کی تنقیدی خصوصیت ہے کہ وہ تنقیدی عمل کو ایک ایساعمل قراردیتے ہیں جو اپنے عہد اور اس کے تقاضوں سے ناواقف رہ کرآگے نہیں بڑھ سکتی لہذا ڈاکٹرجالبی کی عملی تنقید بھی اس پہلو کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اقبال شناسی کے حوالے سے ان کا مضمون'اقبال کا تصور ثقافت 'اقبال کے تصوّرِ ثقافت کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر جالبی کا پیش کردہ تجزیہ نہایت جامع اور بصیرت افروز ہے۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق:

> ''اقبال کا تصوأرِ ثقافت'لاجغرافیائی ' ہے۔ وہ عقل، حرکت و روانی، ارتقاء فکر و نظر اور اجتہاد پر زور دیتے ہیں تاکہ زندگی کے تخلیقی عمل کو جاری رکھا جاسکے۔ وہ ایسے نظامِ خیال کو بروئے کار لانا

چاہتے ہیں جس کی اساس روحانی ہو، جو تصورِ توحید پرقائم ہو، جس میں محدود وطنیت اور زمین سے پیوستگی سے نفرت ہو اور جس پر عالمگیر انسانیت کا تصور غالب ہو۔ وحی و تنزیل، عالمِ تاریخ اور عالمِ فطرت کا مطالعہ اقبال کے اس تصور ثقافت میں شامل ہے۔ اسی لئے اقبال کے ہاں انتہا پسندی کی بجائے اعتدال وتوازن ہے (۶۵)

ڈاکٹر اقبال کے حوالے سے شامل مضمون ''اقبال اور تشکیلِ جدید'' اقبال کی فکر کو جدید عہد کی ضرورتوں کے مطابق سمجھنے کی ضرورت کواجاگر کرتاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق اقبال کی فکر اب تک کیاجانے والاکام اقبال کی فکر کی توضیح توکرتاہے لیکن اقبال کی فکر کو آگے بڑھانے کا کام ا ب تک شروع نہیں ہوا۔ ''مسجد قرطبہ'' ڈاکٹر جالبی کی عملی تنقید کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹرجالبی 'مسجد قرطبہ' کو ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کی علامت اور شاعری کاتاج محل قرار دیتے ہیں اس نظم میں اقبال کی تخلیقی قوتیں اور ان کی فکر کے سارے بنیادی پہلو موجود ہیں۔ جس طرح تاج محل کا ہرمینار جداجدا ہو نے کے باوجود بھی تاج محل کے توازن اور آہنگ میں اضافہ کرتا ہے، اسی طرح ''مسجد قرطبہ'' کا ہربند منفرد اور مؤثر ہونے کے ساتھ ساتھ پوری نظم کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس نظم کا زبان و بیان، اس کی بندش و تراکیب، اس کی تغمگی اور کیف، اس کی فکر کا مثبت روّیہ، اس نظم کی اثروتاثیر میں اضافہ کرتاہے۔ ڈاکٹرجالبی، اقبال کی شاعری کو فکر و عمل کے فلسفے کی ترجمان قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری توانائی، قوت اور حرکت و عمل کی شاعری ہے۔ڈاکٹرجالبی نے اپنے متعدد مضامین میں فکر اقبال پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹرجالبی اقبال کی فکر کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کے ساتھ اقبال کی فکر میں مدحت رسولؐ کے عنصر کو سراہتے ہوئے اسے اقبال کی فکر کا بنیادی حوالہ قراردیتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی رائے بہت بامعنی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال جوکچھ سوچتے ہیں، جو کچھ محسوس کرتے ہیں، جس زاویے سے حیات و کائنات کے مسائل اور خدا و انسان کے رشتوں کو دیکھتے ہیں ان سب میں رسولِ خدا کی فکر و نظر شامل و موجود ہے۔۔۔۔۔۔مدحت رسول ؐ ان کے ہاں صرف عقیدت مندی کا نہیں ہے بلکہ ساری زندگی اور کائنات کا حوالہ بن کر سامنے آتی ہے''۔(۶۶)

ڈاکٹرجالبی کی عملی تنقید کے مختلف رنگوں کو ہم شیفتہ کا مطالعہ،آدھا شاعر بہادر شاہ ظفر، فراق کی رباعیاں، مجاز کی شاعری، میرا جی کو سمجھنے کے لئے حاجی بغلول، مہدی افادی کا ادبی مقام

اور حسن عسکری کے افسانے میں دیکھ سکتے ہیں۔ ''آدھا شاعر''
کے عنوان سے مضمون میں ڈاکٹر جالبی میردرد کی شاعری کا فکری
وفنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک عام خیال (جو کہ محمد حسین آزاد کا
میر تقی میرکی نکات الشعراء کے حوالے سے پید اکردہ ہے) کو رفع
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر تقی میر نے خواجہ میر درد کو آدھا
شاعر قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر جالبی میردرد کی شاعری کے پس منظر اور
ان کی صوفیانہ شخصیت کے تناظر میں ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے
ہوئے اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ''ان کے کلام میں تصوف کا
رنگ کم اور مجاز کا رنگ غالب ہے''۔(۶۷)

ڈاکٹر جالبی درد کی شاعری میں معرفت اور تصوف کے اشعار اور مجازی شاعری کا بھر پور تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دردؔ نے:

''اردو غزل کو ایک وقار، اعتدال، بیان کی سرخی اور لطافت سپردگی
اور رسیلا پن دیا ہے۔ لیکن درد کے ساتھ اب تک وہ انصاف نہیں ہوا
جس کے وہ مستحق تھے۔دردؔ کو رومانیت اور تصوف کا لبادہ اوڑھا یا
گیا کہ وہ صرف اسی خصوصیت کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئے۔ دردؔ
کے ہاں تصوف ہے ضرور لیکن دیوان کے بڑے حصے میں ان کے
ہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ دردؔ کے ہر شعر پر ان کے مزاج
کی مُہر ثبت ہے جس میں بڑی رنگینی اور بانکین ہے''۔(۶۸)

''بہادر شاہ ظفر'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جالبی بہادر شاہ ظفر کی شاعر ی کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے اس حصے کا مطالعہ پیش کیا ہے جو ان کے مطابق بہادر شاہ ظفرکی شاعری کے خدوخال اس کی شخصیت، روحِ عصر اور تہذیب کا عکس پیش کرتی ہے اور بہادر شاہ ظفرکی انفرادیت کی آئینہ دار ہے۔بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں ان کے ذاتی کرب کے اظہار کو ڈاکٹر جالبی نے جس طرح اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''بہادر شاہ ظفرکے کرب میں جمیل جالبی نے سسی فس کے کرب کی
مشابہت تلاش کی ہے تاہم ان کا ایقان ہے کہ یہ کرب ایک بے معنی
محنت کے احساس کا نتیجہ ہے اگر یہ کرب پورے سوزوگداز کے ساتھ

بہادر شاہ ظفرکے ہاں بن سنور جاتا تو سسی فس جیسی عظیم شخصیت

بہادر شاہ ظفرکی شاعری کے دریچوں سے جھانکنے لگتی''۔(۶۹)

ڈاکٹر جالبی قبولیت اور استفادہ کے لحاظ سے مصحفیؔ ، حسرتؔ اور ظفرؔ کو ایک صف میں رکھتے ہیں ڈاکٹر جالبی مصحفیؔ اور ظفرؔ کی شاعر ی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے مزاج کی قرابت کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی ظفرؔ کی شاعری کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے شاعری کی روایت سے آگاہی اور تاریخ کے تہذیبی شعور کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی اپنے مضمون ''فراق کی رباعیاں'' کے عنوان کے تحت فراق کی رباعیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے دور کو۱۹۲۹ء سےشروع کرتے ہیں اور اس عہد کی رباعیوں پر آسی غازی پوری،انیس اور حالی کی رباعیوں کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دوسرے دور کو ۱۹۴۵ءسے شروع کرتے ہیں اور اسے پہلے دور سے بالکل الگ تصور کرتے ہیں اس دور کی رباعیوں پر عشق کے آفاقی کلچر کے اثرات کو غالب قراردیتے ہیں بقول جالبی: ''عربی وفارسی اور سنسکرت، لاطینی، انگریزی اور یونانی روایات کے عالمگیر تصورات سے خاص استفادہ کیا گیا ہے''۔(۷۰)

ڈاکٹر جالبی فراق کی رباعیوں کو اردو کی اچھی جمالیاتی شاعری میں شامل کرتے ہوئے ان رُباعیوں کے جمالیاتی انداز ،جمالیاتی کیفیات، جمالیاتی جذبات اور جمالیاتی احساسات کو سراہتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی فراق کی عشقیہ شاعری میں جنس کے اظہار اُن کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کا ایک عکس اور تہذیبِ نفس کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔بقول ڈاکٹر جالبی ''وہ جنس کا شدت سے قائل ضرورہے مگر جنس میں وہ بلندی اور عالمگیر شان دیکھتا ہے کے محبت کا تصور اور نظریۂعشق بلند وارفع ہو جاتا ہے اور جسم کا احساس روحانی تجربہ بن جاتا ہے''۔(۷۱)

فراق کی رباعیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے اِ ن میں ایک نئے کلچر کی نمود کو بھی سراہا ہے۔ جو قدیم اساطیر، اسلامی اور ہندو کلچر کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے۔''مجاز کی شاعری''کے عنوان کے تحت مضمون کے پہلے حصے میں ڈاکٹر جالبی انقلابی شاعری کے حوالے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ایسی انقلابی شاعری کو قابل مذمت قرار دیا ہے جو تخلیقی اثرانگریزی سے محروم ہو۔ڈاکٹر جالبی اس نظریے کے قائل ہیں کہ روح عصر کے بغیر کوئی شاعر زندہ شاعر نہیں بن سکتا۔ لیکن وہ شاعر ی جیسے عظیم عطیے کو مخصوص مقاصد کے لیے استعما ل کرنے کے بھی خلاف ہیں۔ڈاکٹر جالبی حافظ، سعدی، غالب، اقبال اور ایلیٹ کو بڑا انقلابی شاعر اس لئے قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ شعراء اپنے دور کی روح کی آواز تھے۔ ایسی آواز جو آنے والے ادوار میں بھی اثر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی مجاز کی انقلابی شاعری کو تخریب پسندانہ شاعری کی ذیل میں رکھا ہے جب کہ مجاز کی اس شاعری کو قابل تحسین گردانتے ہیں جس میں ان کی داخلی کشمکش،سماج اور ان کی خواہشات کو موضوع

بنایا گیا ہے بالخصوص ان کی نظم ’’آوارہ‘‘کو اُس دور کے نوجوان کی روح کا اظہار قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی مجاز کو بنیادی طور پر رومانی شاعر قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اورمجا ز کی شاعری پر اختر شیرانی کے اثرات کے علاوہ جو ش اور اقبال کے اثرات کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔

’’حاجی بغلول‘‘ کے عنوان کے تحت منشی سجاد حسین کے ناول ’’حاجی بغلول‘‘ کے محرکات پس منظر کہانی، کردارنگاری، مزاح نگاری، مکالمہ نگاری کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے، منشی سجاد حسین کے طرزِ ادا،مزاح نگاری اور ناول کے آپسی تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ’’منشی سجاد حسین کے ہاں طرز ادا اور مزاح الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کے فطری طور پر شیر وشکر ہونے سے بات بنتی ہے۔ اگرمزاح کو طرز ادا سے الگ کرکے دیکھئے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان کے ہاں جو مزاح ہے وہ صرف لفظوں کو کھیل نہیں ہے۔ اس لئے لفظوں سے پیدا ہونے والا مزاح قہقہہ پیدا نہیں کرسکتا،تا وقتیکہ الفاظ، واقعات،پلاٹ اور متن کے ساتھ خاص تعلق نہ رکھتے ہوں اور ان لفظوں کے سہارے پلاٹ کا عمل آگے نہ بڑھ رہا ہو۔ ا لفاظ کے استعمال کا یہ ڈھب منشی صاحب کے ہاں طرز ادا کا معاملہ ہے جس سے وہ اصل قصے کے عمل کو آگے بڑھانے میں مد د لیتے ہیں‘‘۔(۷۲)

ڈاکٹر جالبی نے منشی سجادحسین کی نثر میں اس’’بدعت‘‘کی بھی نشاندہی کی ہے جس کے تحت منشی صاحب انگریزی اور ہندی الفاظ کو فارسی وعربی الفاظ کے ساتھ ’’و‘‘ عطف اور اضافت لگاتے ہیں۔ مثلاً قواعدِ ڈاک خانہ، اجرائے ڈگری وغیرہ اس روّیے کو ڈاکٹر جالبی زبان میں اختصار نویسی اور وسعت بیان کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی تنقید اور تحقیق کے سلسلے میں کلچر کو بہت اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ اِسی لئے اچھے ناول کی خصوصیت اُن کے مطابق یہ ہے کہ اس میں معاشرے کا تہذیبی اظہار علامتی انداز میں موجود ہو۔ ’’حاجی بغلول‘‘ کو ڈاکٹر جالبی نہ صرف تہذیبی اعتبار سے اہم تصنیف قرار دیتے ہیں بلکہ اس ’’حاجی بغلول‘‘ کے کردار کے حوالے سے ’’بغلولیت‘‘ کے رویے کی علامتی نشاندہی کو قابل تحسین گردانتے ہیں۔ بغلولیت کیا ہے؟ اس کا جواب ڈاکٹر جالبی اس طرح دیتے ہیں:

> ’’بغلولیت اس روّیے کو کہہ سکتے ہیں جس کے ذریعے انسان مذہبی قیود او رسماجی پابندیوں سے آزادی حاصل کرتا ہے جس میں ذہن کا

عمل آن جانے طور پر کسی ایسے ڈھنگ، ڈھب یا چھب سے ظاہر ہوتا ہے جو بظاہر بے معنی معلوم ہوتا ہے لیکن جس میں فرد کی تربیت اور اس کے شعور کی پوری ذہنی تاریخ ملتی ہے''۔(۷۳)

ڈاکٹر جالبی نے ظاہر داربیگ، کلیم، نصوح، ابن الوقت،خوجی، احمق الدین اور حاجی بغلول کے کرداروں کو بغلولیت کے اسی رویے کی علامتی شکل قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر جالبی کا تنقیدی مضمون ''مہدی افادی کا ادبی مقام'' اس حوالے سے اہم ہے کہ اس مضمون میں مہدی افادی کی تصانیف کی روشنی میں ان کے ذہنی ارتقاء کے سفر کو تین ادوار میں تقسیم کرکے ان کے انشاء پردازی اور ذہنی روّیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جالبی مہد ی افادی کی نثر کے تیسرے دور یعنی ۱۹۱۰ ؁ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۹ ؁ء پر ختم ہونے والی تخلیقی دور کو ان کی نثر کے حوالے سے سب سے وقیع دور قرار دیتے ہیں۔ اس عہد کی نثر میں ایک طرف پختگی، شوخی، نفسیاتی گہرائی، مطالعے کی وسعت،ذکاوت وذہانت جیسی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہیں ان کی نثر کی خامیوں یعنی تکرار اور بے ربطی کو بھی نمایا ں کیا ہے۔ڈاکٹر جالبی نے مہدی افادی کو اردو کا سب سے پہلا تبصرہ نگار قرار دیا ہے اورڈاکٹر جالبی نے ان کے مضامین کے حوالے سے ان کی تبصرہ نگاری کے اصول بھی مرتب کئے ہیں۔مہدی افادی کے اسلوب نگارش پر ان کے معاصرین کے اثرات کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی مہد ی افادی کے متعلق لکھتے ہیں:

''مہدی نہ سوانح نگار ہیں نہ تاریخ دان،نہ وہ مذہبی مبلغ ہیں اور نہ سیاسی پرچارک، وہ صرف انشاء پرداز ہیں اور اس لئے ان کو بھی کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ ان کا سب سے بڑا سہارا جہاں ان کی قوت جولانیاں دکھاتی ہے، انشاء پردازی ہے۔ وہ صرف انشاء پردازی کے سہارے زندہ ہیں اور انشاء پردازی کے سہارے زندہ رہیں گے''۔(۷۴)

''تنقید اور تجربہ''کے آخری پانچ مضامین مغربی ادب اور فلسفے کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کی مغربی ادب سے دلچسپی کی دلیل ہیں۔ ڈاکٹر جالبی بالخصوص ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی اور اس کے اثرات قبول کرنے کے حوالے سے برملا اظہار کرچکے ہیں بقول انورسدید:

''ایلیٹ، ڈاکٹر جالبی کے لئے محض ایک مصنف ہی نہیں چشمۂفیض بھی ہے۔ وہ ان کا رہنما ستارہ بھی ہے انہوں نے ادب، تہذیب اور زندگی

کے نئے اور پرانے سوالات پر ایلیٹ کے تجزیاتی، تحلیلی انداز میں غور کرنے کی کاوش کی اور پاکستانی تہذیب اور ثقافت کو ایک نئے مدار میں داخل ہونے کا راستہ دکھایا‘‘۔(۷۵)

ڈاکٹر جالبی نے ٹی ایس ایلیٹ کے تنقیدی نظریات کا خلاصہ بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ سارتر کے فلسفۂوجودیت کو نہایت عمدگی سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی ادب بالخصوص اردو کلاسیکی شاعری کے حوالے سے وجودیت کے مسئلے کو آسان فہم انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کو بیسوی صدی کا سب سے بڑا نقاد قراردیا ہے کیونکہ اس نے انگریزی ادب کا یورپی اقدا،رتہذیب و کلچر کے ساتھ رکھ کر جائزہ لیاہے بلکہ مختلف رحجانات کا مطالعہ بھی پیش کیاگویا سارے ادب کو نئے سرے سے ترتیب دے کر نئے خیالات ورحجانت کو فروغ دیا۔ ایلیٹ کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ایلیٹ کا شمار نہ صر ف انگریزی ادب کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتاہے بلکہ اسے بہترین ناقدین میں بھی شمار کیاجاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق:

’’ایلیٹ کی شاعری اور تنقید ایک ہی قوت کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ وہ چیز جو وہ اپنی شاعری میں پیدانہ کرسکااس کا ذکر اس کے ہاں تنقیدوں میں مل جاتاہے۔ اس کی تنقیدیں اس کے کارخانۂ شاعری کا ایک جزو ہیں اور شاعری کی تخلیق کے سلسلے کے احساسات، خیالات مطالعے اور عمل کا بیان یاتعمیم ہیں۔ اس لئے اس کی تنقیدیں ذہنی جستجو کا اظہار بن جاتی ہیں اور مستقبل کے تخلیقی و تنقیدی ادب کے لئے بڑے امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں‘‘۔(۷۶)

ڈاکٹرجالبی، ایلیٹ کے تنقیدی تصورات اور انگریزی ادب کی نئے سرے سے تفہیم اور انگریزی ادب پر دوررس اثرات کے حوالے سے ایلیٹ کی تنقید کو اردو ادب کی نئے سرے سے تفہیم کے لئے مثال قراردیا ہے اور ان کے تنقیدی تصورات کو اردو میں متعارف کروانے کے لئے ہی ان تراجم کا اہتمام کیاگیا۔’’ایلیٹ کے مضامین‘‘کے پہلے حصے میں ڈاکٹرجالبی کے تحریرکردہ چارمضامین میں سب سے پہلا مضمون ’بحیثیت نقاد‘ ہے۔ ڈاکٹر جالبی ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس کا سبب ڈاکٹر جالبی نے یہ بتایا ہے کہ کسی زبان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس زبان کے مزاج کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے کلچر، اور ان جذبوں اور محسوسات کو سمجھنا ضروری ہے اور نثر کو سمجھنا شاعری کو محسوس کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ ایلیٹ کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کایہ نقطۂ نظر بھی چونکادینے والاہے کہ ایلیٹ کی ادبی تنقید، اس کی شاعری کے مقصد کو آگے بڑھانے کے ساتھ

ساتھ اس کی شاعری کی نفی بھی کرتی ہے گویا ایلیٹ بطو ر شاعر اور بطور نقاد الگ الگ روپ میں ہمارے سامنے آتاہے لہٰذا اس کی تنقید سے اس کی شاعری کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ ایلیٹ کی شخصیت کے اس دہرے رخ کے باوجود ایلیٹ ایک بڑے شاعر اور بڑے نقاد کے طور پر ہمارے سامنے آتاہے۔ بقول جالبی:''آخری عمر کی تحریروں کو چھوڑ کر ایلیٹ کی شخصیت اور اس کے فن میں ایسے دو روپ ملتے ہیں جو ایک ہو کر بھی الگ الگ ہیں اور جہاں تنقیدی شعو،ر تخلیقی قوت کو او رتخلیقی قوت، تنقیدی شعور کو غصب نہیں کرتے''۔(۷۷)

ڈاکٹرجالبی، ایلیٹ کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایلیٹ تخلیق،تنقید کے درمیان گہرے روابط کی نشاندہی کرتاہے لیکن اپنے ''مخصوص معانی میں تخلیق کے لئے بے خبری اور تنقید کے لئے باخبری کو اہم تصور کرتاہے۔ یہاں تنقید میں شعور کی سطح واضح ہے فکر اور اس کے وہ بنیادی مسائل اہمیت رکھتے ہیں جن پر ادب کی بنیاد قائم ہے جس سے معاشرہ کی تہذیبی روح قوت حاصل کرتی ہے''۔(۷۸)

ڈاکٹرجالبی نے مروّجہ تنقیدی نظام کو ناکارہ قراردیا ہے کیونکہ ان کے مطابق ہرنسل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا تنقیدی نظام خود پیدا کرے۔ اگرکوئی نسل اپنے تنقیدی معیارات قائم کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو تخلیقی طور پر ناکارہ ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹرجالبی اردو ادب کے حوالے سے سرسید اور حالی کو اس لئے اہم قراردیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے نئے معیارات متعارف کروائے، انگریزی ادب میں ایلیٹ بھی اسی حوالے سے معتبر ہے کہ ایلیٹ نے اپنی نسل کے لئے معیارات متعین کئے جس کے نتیجے میں انگریزی ادب ایک انقلاب سے روشناس ہوئی۔ ایک مضمون 'ایلیٹ بحیثیت نقاد''میں ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے معروضی تلازمات (Objective correlatives) کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فن کی شکل میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ معروضی تلازمات تلاش کئے جائیں یعنی اشیاء کو اس طرح ترتیب دیاجائے،موقع محل اور واقعات کے سلسلوں کو اس طور پر جمایاجائے کہ جب خارجی واقعات،حسی تجربوں کے ذریعے ظاہر ہوں تو وہ مخصوص جذبہ یاجذبات، جو فنکار کے پیش نظر تھا، ابھرآئے، یہ کام بصری امیجز اور موزوں الفاظ کے ذریعے کیاجاسکتاہے۔ امیجزکے ذریعے جذبات کا اظہار ہوگا اور زبان کو اس طور پر استعمال کرنے سے سمعی تخیل کا۔ اس عمل کے ذریعہ ایلیٹ کاخیال ہے کہ پہلے سے

سوچا سمجھا، اثر پیداکیاجاسکتاہے اور فن پہلے سے سوچی سمجھی آفرینی کا نام ہے‘‘۔(۷۹)

ڈاکٹر جالبی نے ایلیٹ کے معروضی تلازمات کے نظرئیے کو ایلیٹ کے مضمون ’’روایت اور انفرادی صلاحیت‘‘ میں ایلیٹ کی پیش کردہ مثالوں سے مزید واضح کیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کے تنقیدی تصوّرات کے حوالے سے اس کے تصورِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے تاریخی شعور کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی کو ایلیٹ کی تنقید میں فکری عناصر کی موجود گی اور تجزیہ و تحلیل کے سائنٹفک انداز کو قراردیتے ہیں۔

ڈاکٹرجالبی نے،غالب اور ایلیٹ کا موازنہ کرتے ہوئے ان دونوں کی شاعری میں انٹیلیکچول عناصر کی موجود گی اورمقبولِ عام شاعری کے عناصر سے ہٹ کر نئے تخلیقی زاویوں سے شاعری کی تخلیق کے جذبہ کو مشترک قراردیا ہے۔ اس حوالے سے ایلیٹ کی نظم (Love Song of J. Alfred Prufrock)کا تجزیہ کرتے ہوئے ایلیٹ کی شاعری میں استعمال کردہ ا ستعارات، تلمیحات، تشبیہات، نظم کاتاثر، غنائیت، ڈرامائی عناصر، کلاسیکی، مابعد الطبیعاتی اثرات کے ساتھ ساتھ جدید نیچرل ازم، سمبلزم، امپر پشنزم کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے ایلیٹ کی شاعری میں اشکال اور ابہام کے باوجود اس کی نظموں کونئے شاعرانہ ادراک اور نئی فنی تشکیل کا حامل قراردیا ہے۔ ایلیٹ کی ابہام اور مشکل پسندی کے حوالے سےThe waste land کو ایک اہم نظم قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے تجزیہ و تحلیل کا اندازاختیار کرتے ہوئےThe Waste land کے تمام حصوں کی گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ اس نظم میں پائے جانے والے ابہام، علامات، فلسفیانہ عناصر، معروضی تلازمات، ڈرامائی عناصر کو انتہائی خوبی سے واضح کیا گیا ہے جس سے اس نظم کی تفہیم آسان ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کی جن دیگر نظموں کا تجزیاتی و تحلیلی انداز میں جائزہ لیاہے ان میںAsh Wednesday ، Four Quartets شامل ہے۔ ’’ایش ویڈنس ڈے‘‘ کو ڈاکٹر جالبی ویسٹ لینڈ کی نسبت زیادہ پختہ اور متنوع قراردیتے ہیں۔ ایلیٹ کی نظمFour Quartets کو ہئیت کے اعتبار سے سب سے منفرد قراردیا ہے۔ اس نظم کی ہئیت کے متعلق ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں:

’’چاروں حصوں کا فارم ایک ساہے اور ہرایک میں پانچ حصے ہیں اور ہر حصہ کو موسیقی کی ساخت کے اصولوں پرقائم کیا گیاہے۔ ہرعنوان میںQuartet کالفظ بھی موسیقی سے لیاگیاہے۔ ہرنظم موسیقی کی ایک حرکت کو سامنے لاتی ہے اور اس نظم کے پانچ حصے پانچ لہروں کی طرح ایک دائرے میں گھومتے ہیں‘‘۔(۸۰)

ڈاکٹرجالبی نے، ایلیٹ کی شاعری میں تخیل کے عنصر کو روایت کے اثرات کے تحت قراردیا ہے اس لئے ایلیٹ کی شاعری میں بھگوت گیتا، دانتے، بودلیئر اور ڈوَن کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ ایلیٹ کی شاعری میں جن اہم تصورات کی نشاندہی ڈاکٹرجالبی نے کی ہے وہ ان کے مطابق؛

''موسموں کاچکر،دن رات، موت زندگی، جوانی بڑھاپے کے تصورات ایلیٹ کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ جنت اور معصومیت، جہنم اورتجربہ کے تصوّرات بھی اسے بہت عزیز ہیں اور یہ اس کے مذہبی رحجانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔''(۸۱)

ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کی نظموں کی روشنی میں مندرجہ بالا تصوّرات کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ ایلیٹ کے نظموں میں پانی ایک علامتی حیثیت رکھتاہے۔ جبکہ ایلیٹ کی آخری دور کی نظموں میں ریگستان، باغ اور زینہ کی علامتیں بھی اہم ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کی شاعری کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایلیٹ تکنیک کے ذریعے روحانیت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ''اس کی ہر نظم موضوع تصورات، طرز، ہئیت اور عروض کو آہنگ میں لاکر ایک قسم کی مرتب و منظم مذہبی رسم بن جاتی ہے جو ایک طرف تزکیۂ نفس کرتی ہے اور دوسری طرف زندگی کی گہرائیوں سے روح کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے۔ شاعرانہ تکنیک اسی لئے اہم چیز ہے''۔(۸۲)

ایلیٹ کی شاعری کی عظمت بھی اسی اثر میں پنہاں ہے جہاں ابدی اقدار آفاقیت اور تکنیک اور فارم کی یکجائی نظرآتی ہے۔''ایلیٹ بحیثیت ڈرامہ نگار'' میں ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کی ڈرامہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیاہے۔ ڈاکٹرجالبی،ایلیٹ کی ڈرامہ نگاری کو اس کی نثر اور نظم ہی کی طرح اہم قراردیتے ہیں کیونکہ ایلیٹ کہ منظوم ڈرامے، فکر اور مزاج کے اعتبار سے اس کی نظموں سے ملتے جلتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں ایک جیسے موضوعات اور تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے ڈراموں کوDivine کا میڈی کی ذیل میں لاتے ہیں کیونکہ ان کا اختتام طربیہ ہے۔ ایلیٹ کے ڈرامے ''مرڈران کیتھڈرل، دی فیملی رییونین، دی کوکٹیل پارٹی اور دی کان فی ڈینشل کلرک،کو ڈیوائن کامیڈی کی ذیل میں رکھتے ہیں کیونکہ ان کااختتام طربیہ انداز میں ہوتاہے۔ ایلیٹ کے ڈرامائی جوہر، تکنیک اور اسلوب سمجھنے کے لئے ان کے ڈراموں مرڈ ر ان کیتھڈرل دی فیملی ری یونین، دی کوکٹیل پارٹی اور دی کانفی ڈینشل کلرک کا جائزہ لیاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے ان ڈراموں میں ایلیٹ کی تکنیک، علامات اور فکری عناصر کاجائزہ لیتے ہوئے ایلیٹ کے ڈراموں کو اس کی نظموں کی خارجی شکلیں قراردیا ہے۔ ان ڈراموں میں انہی تصورات اور موضوعات کو چناگیاہے جو ایلیٹ کی نظموں میں نظرآتے ہیں لیکن ڈراموں میں ان موضوعات اور تصورات زندگی کے تعلق سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ڈرامے اس لئے اہم ہیں کہ ان ڈراموں میں شاعری پربہت زور دیاگیاہے بالخصوص آزاد نظموں کا استعمال

زیادہ نظرآتاہے جس کے نتیجے میں،''ساڑھے تین سو سال بعد منظوم ڈرامہ کی ایک ایسی نئی روایت قائم ہوتی نظرآتی ہے جس میں پرانی روایت کے عناصر بھی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہیں اور ایلیٹ کی متوازن جدت بھی''۔(۸۳)

ایلیٹ فہمی کے سلسلے کاآخری مضمون ''ایلیٹ کا ادبی مقام'' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کی تنقید پراس کے امریکی روّئیے(رواداری اور آزادیٔ طبع کا فقدان)کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے دائرہ فکر کو اس لئے محدود قراردیا ہے کہ ایلیٹ قرونِ وسطیٰ کے ادب کو ماڈل بنانے پراصرار کرتاہے۔ اس کی وجہ دانتے ہے جس کی وجہ سے ایلیٹ قرونِ وسطیٰ کو ترقی اور نشاۃِ ثانیہ کو زوال کا دور قراردیتاہے۔ جبکہ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زوالِ روماسے دانتے تک مذہب کی جکڑ بندی یورپ کو متحدکرنے
میں کتنی ہی کامیاب رہی ہومگرجہاں تک ادب کا تعلق ہے ہمیں موت کا
سا سناٹا نظرآتاہے۔ یہ دور ادب کا تاریک ترین دور ہے''۔(۸۴)

ڈاکٹرجالبی نے، ایلیٹ کے تنقیدی روّیوں میں تضادات کی نشاندہی کرتے ہوئے، ایلیٹ کو روایت سے ہم آہنگی کی آواز بلند کرنے کے باوجود،خود روایت سے انکار کا قصور وار ٹھہرایا ہے جب وہ شیکسپئر، ملٹن اور گوئٹے وغیرہ کی عظمت کو تسلیم کرنے انکار کرتاہے۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے اس روئیے کو ''امریکی پیورٹین'' قراردیتے ہیں۔ ان تضادات کے باجود ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کی زورِ طبع، جدت طرازی اور عظیم تخلیقی اپچ کے باعث اسے انگریزی اور اردو ادب کے لئے اہم قراردیا ہے۔

مغربی ادب اور تنقید سے دلچسپی کے باعث ڈاکٹر جالبی کی ترجمہ کردہ کتاب''ارسطو سے ایلیٹ تک''کا مقدمہ بھی ڈاکٹر جالبی کی مغربی تنقید نگاروں پر تنقیدکے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔اس مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مغربی تنقید کو رحجانات کے لحاظ سے پانچ ادوار میں تقسیم کرکے ہر دور کے رحجان ساز شعراء،ادباء،ناقدین اور تحریکوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے اہم ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مغربی تنقید کے ارتقاء کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

مغربی ادبی نظریات کو ڈاکٹر جالبی نے مغربی ادب کے براہ راست مطالعے سے سمجھا ہے ان کے تنقیدی نظریات ان کے وسیع مطالعے اور فہم وادراک کا نتیجہ ہیںڈاکٹر جالبی ایک طرف مشرقی ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے مغربی ادب سے مثالیں پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف مغربی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے مشرقی ادب بالخصوص اردو ادب کے حوالے سے اپنی تنقید کو موثر اور با معنی بنادیتے ہیں جس سے ان کے قارئین کے لئے ان کے تنقید ی نظریات کی تفہیم آسان ہو جا تی ہے مثلاً''بورس پیسٹرنک کی شاعری''میں شعری تصاویر کے حوالوں کو میرؔ اور مومنؔ کے حوالے سے اس طرح سمجھایا ہے:

''ہمارے ہاں میر اور مومن ایسے شاعر ہیں جو عشق میں معاملے کے ساتھ پوری کائنات کو سمیٹ لیتے

ہیں۔ دشنامِ یار، طبأحزیں پر اس لئے گراں نہیں گزرتی کہ شاعر کی توجہ دشنام سے ہٹ کر نزاکتِ آواز پر چلی جاتی ہے یا پھر اس میں اسے شعلہ سا لپکتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

پیسٹرنک جب محبوب کا بوسہ لیتا ہے تو اسے اس بوسے میں بنفشہ کے ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا لباس اسے برف کے اس قطرہ کی طرح نظر آتا ہے جو اپریل کو مبارک باد ے رہا ہو‘‘۔(۸۵)

’’ادب اور عصری آگہی‘‘، میں ڈاکٹرجالبی اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں کہ کسی بھی فن پارے کو ماضی، حال اور مستقبل سے مربوط ہوناچاہیے اس سلسلے میں وہ میر اور غالب کی شاعری کا تقابل کرتے ہوئے ادب اور عصری شعور کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی غالب کے مقابلے میں ذمیر کو بڑاشاعر قراردیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے میر نے اپنے دورکی آگہی کوآنے والے زمانے سے ملا دیاجبکہ غالب کے ہاں عصری آگہی موجود ہے بلکہ وہ اپنے زمانے سے زیادہ آنے والے زمانوں کا ادراک زیادہ رکھتے تھے۔ڈاکٹر جالبی نے آج کے عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہی قرار دیا ہے کہ ’’ہمارے عہد حاضر کا ادب خیال وروح کے اعتبار سے اپنے عہد اور معاشرے سے ہم آہنگ نہیں ہے‘‘۔(۸۶)

ڈاکٹرجالبی نے جن قدیم شعراء کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کیا ان میں سچل سرمست بھی شامل ہیں۔ سچل سرمت کی شاعری کے افکار و نظریات کاتجزیہ کرتے ہوئے سچل سرمت اورقدیم اردو شعراء، شاہ باجن، علی محمد شاہ، جیوگام دھنی، قاضی محمود دریائی اور خوب محمد چشتی میں مماثلت کی نشاندہی کرتے ہوئے بے معنی تراجم کرنے کی بجائے سچل سرمت جیسے آفاقی شاعر کی شاعری کے ترجمہ کو قومی اور عالمی ادبی افق پر روشناس کروانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس طریقے سے علاقائی شاعری اور کلچر، قومی کلچر کا حصہ بن سکتے ہیں۔

جدید شعراء میں جن دیگر شعراء کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی نے تنقیدی مضامین لکھے ان میں اخترالایمان، میراجی اورکشورناہید شامل ہیں۔ اخترالایمان کی شاعری میں نثری نظم کے تجربات اور جاپانی ادب کی ہئیتStop Short کا استعمال،جدید شعراء میں ان کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔ ڈاکٹرجالبی،اخترالایمان کی شاعری کے فکر وفن کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ’شاعرالایمان ‘ قراردیا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری کے موضوعات اور فنّی عناصرکا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نثری نظم کی

مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے، کشور ناہید کی شاعری میں نثری نظم کی ہئیت سے انحراف کرتی نظموں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اسی انحراف کو کشور کی نظموں کی کامیابی کی وجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ممتاز موؤخ،ناقد،مدوّن اور مترجم ہونے کے باوجو د بچوں کے لئے بھی ادب تخلیق کیا۔ان کی سب سے پہلی ترجمہ کردہ کتاب''جانورستان'' بچوں ہی کے لئے تحریر کردہ ایک ناول 'اینیمل فارم 'کا ترجمہ ہے جس سے ان کی بچوں کے ادب کے حوالے سے دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'بچوں کاادب 'ان کا ایک ایسامضمون ہے جس میں بچوں کے ادب کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لئے ڈاکٹرجالبی نے تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ان کے مطابق:

> ''باہرکی زبانوں کے ادیب اپنے قدیم ادب کو طرح طرح سے بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں جن سے ان میں اپنے ادب ' اپنی تہذیب سے گہری دلچسپی پیداہوجاتی ہے مثلاً آج بھی بچوں کے مصنفین اپنے قدیم ادب کو کھنگالیں تو انہیں بہت سی کتابوں کے لئے مواد میسر آجائے گا۔ ایسامواد جس سے بچے گہری دلچسپی لیں گے مثلاً انوراسہیلی، اخلاقِ محسنی،سیاست نامہ، الف لیلیٰ اور ان سب سے زیادہ طلسم ہوشربامیں ایسا مواد موجود ہے جس کے استعمال سے بچوں کے تخیل، تجسس اور تحیر کو نئی وسعتیں دی جاسکتی ہیں''۔(۸۷)

ڈاکٹر جالبی، برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے حوالے سے سرسید احمد خان کی خدمات کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔ سرسید احمد خان کو عام طور پر ان کے مذہبی نقطہ نظر کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایاجاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی کا نقطہ نظر ہے کہ سرسید احمد خان مسلمانوں کی علمی، معاشرتی، سیاسی، وذہنی ترقی کے ساتھ مذہب و عقائد سے بھی دور نہیں کرناچاہتے تھے۔ سرسیداحمد نے فکروعمل کے اشتراک سے مسلمانوں کی حالت میں تبدیلی کی جدوجہد کی۔ اسی لئے ڈاکٹر جالبی سرسید احمد خان کو مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی علامت قراردیتے ہیں جبکہ اکبرالہ آبادی نے جس تہذیبی زوال کی نشاندہی اپنی شاعری میں کی تھی۔ آج ہم اسی کا شکارہوکر پیروئ مغرب میں اپنی روایت سے وابستگی کو قابلِ فخرتصور نہیں کرتے۔ڈاکٹرجالبی کے مطابق:

> ''اکبرکی آواز وہ آواز ہے جونہ صرف پاکستان اور ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیاء کو زندہ رہنے اور خود کو از سرِنو دریافت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اکبر جیسا شاعر ایشیاکی کسی دوسری زبان میں

مجھے نظر نہیں آتا جس نے مغربی تہذیب کے غلبے سے بچنے کے لئے اس دلچسپ اور دلکش انداز میں اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہو اور قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ اورباقی رکھنے کا گرسکھایاہو‘‘۔(۸۸)

ڈاکٹرجالبی نے اکبر کو ایک جدیدفلسفی شاعر قراردیا ہے۔ اپنی تہذیب کی حفاظت اور روایت سے وابستگی، ڈاکٹرجالبی اور اکبر کا مشترکہ نصب العین ہے۔ اکبر نے اپنے نظریات کی ترویج کے لئے شاعری کا سہارا لیاجبکہ ڈاکٹرجالبی نے اپنی تنقیدی فکر سے اپنے نقطۂ نظر کی ترویج کی۔ ڈاکٹرجالبی کے تنقیدی مضامین اسی فکری روّیے کی عکاسی کرتے ہیں۔

’جدید اردو نثرکا مسئلہ ‘‘میں ڈاکٹرجالبی نے اردو نثر میں پائے جانے والے مختلف اسالیب کاتجزیاتی مطالعہ پیش کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے اردو نثر کے اسالیب میں پائی جانے والی کمزوریوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہتر کرنے کے لئے تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے اردو افسانے پر مغرب کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک انسانوں میں پائے جانے تین رحجانات کی نشاندہی کی ہے۔پہلا رحجا ن افسانوں میں نئے تجربات کا، دوسرا افسانوں میں واقعیت اور نظریات کے پرچار کا اور تیسراافسانے کی تکنیک میں تنوّع کارحجان۔ ان تینوں رحجانات نے اردو ادب کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۶۵ء کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں ڈاکٹر جالبی نے جن رحجانات کی نشاندہی کی ہے ان میں واقعیت کی بجائے مافوق الفطرت اور تخیئلی عناصر کی شمولیت، علامتی انداز، تزکیاتی اثر سے محروم افسانے، واقعیت پرجذباتیت کے غلبہ کے رحجان والے افسانے، تجریدی افسانے، لمحوں کی کہانیوں کو پیش کرنے والے افسانے، چٹکلوں پر مبنی افسانے وغیرہ۔ ڈاکٹرجالبی نے افسانے میں پائے جانے والے ان رحجانات کو مایوس کن قرار دینے کے باوجود بعض رحجانات کو توازن کی شدت اور تجربات کے اظہار کے حوالے سے اردو افسانہ نویسی کے حوالے سے اہم قراردیا ہے۔

’’جدید علامتی افسانہ۔ایک منفی رحجان‘‘، میں ڈاکٹرجالبی علامتی افسانہ کی اردو میں مقبولیت کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے علامت نگاری کے منفی اثرات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے علامتی افسانے کے جن نقائص کی طرف توجہ دلائی ہے ان میں علامت کا بطور فیشن استعمال جو افسانہ نگارکی ذات، عرفان اور اظہار سے محروم ہے۔ علامتی افسانہ، حقیقی مسائل کے اظہارمیں ناکام ہے۔ علامتی افسانہ نگار ابلاغ کی قوت سے محروم ہے۔ آج کا افسانہ نگار حقیقت سے نا آشناہے لہذا حقیقت کو علامت کے ذریعے پیش کرنے کی بجائے علامت کے ذریعے حقیقت دیکھنے کا عمل کررہاہے۔ علامتی افسانہ ’انتشار کا افسانہ ہے کیونکہ اس میں فکر و اظہار کی سطح پر کوئی گہر تجربہ نہیں پایاجاتا۔ آج کا افسانہ نگار کسی بڑے ادبی تجربے کو علامتی افسانے میں پیش نہیں کرسکا۔ ڈاکٹر جالبی ان سب خامیوں

کی نشاندہی کرتے ہوئے اردو ادب کے ان بڑے افسانہ نگاروں کو الگ رکھتے ہیں جنہوں نے اردو ادب میں علامت نگاری سے نہایت عمدہ افسانے تخلیق کئے۔

ڈاکٹر جالبی نے انتہائی گہرائی اور تفصیلی انداز میں حسن عسکری کے افسانوں کا فکر ی وفنی تجزیہ کرتے ہوئے حسن عسکری کے افسانوں کے کرداروں، پلاٹ،تکنیک،اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ حسن عسکری کے ۹ ستمبر۳۹ء سے ستمبر ۱۹۴۷ء کے درمیان لکھے گئے گیارہ افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی سلسلے میں حسن عسکری کے ذہنی محرکات اور فرانسیسی ادیبوں اور فلسفیوں کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً حسن عسکری کے افسانے ’’حرامجادی‘‘ کو حییخوف کے افسانےThe school mistress سے متاثر قرار دیتے ہیں۔’’گھٹلیوں کے دام‘‘ کو فرانسیسی ادب کے بنیادی خیالات اور تصورات سے متاثر اور ماخوذ قرار دیا ہے۔ ’’قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے‘‘کو حسن عسکری کا سب سے کامیاب افسانہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی حسن عسکری کے افسانوں میں شعور کی رو کی تکنیک کے کامیاب استعمال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ’’حسن عسکری اپنے افسانوں میں کردار وں کے ذہنی تجزیے اور شعور کے بہاؤ میں اپنی ذمہ داری کو بھول نہیں جاتا۔ اسی لیے وہ اپنے جزئیاتی تفصیل اور شعور کے بہاؤ کے دوران میں استہزا اور تمسخر کا استعمال کرتا رہتا ہے جس سے اس کے افسانے دلچسپی اور شگفتگی کے حامل ہوجاتے ہیں اور پڑھنے والا بدمزگی اور اضطراب محسوس نہیں کرتا۔ یہ استہزا اور تمسخر کچھ اس طرح چلتے چلتے آجاتاہے جیسے یہ بھی شعور کے بہاؤ کا نتیجہ ہے‘‘۔(۸۹)

’’علی عباس حسینی‘‘ میں ڈاکٹرجالبی، علی عباس حسین کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری کے محاسن کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے علی عباس حسینی کو افسانہ نگاری کے تجربوں کے دور میں ’’روایت‘‘کا علمبردارافسانہ نگار قراردیا ہے۔ ’ایک منفرد افسانہ نگار‘ کی ذیل میں رفیق حسین کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیاگیاہے۔ رفیق حسین کی افسانہ نگاری کی انفرادیت کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:
’’رفیق حسین کا موضوع سب سے الگ ہے۔ وہ جنگل کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ وہ جنگل جہاں جانور بستے ہیں۔وہ جانور جن مین انسانوں سے زیادہ انسانیت اور انسانوں سے زیادہ احساس و اخلاق ہے۔رفیق حسین کی کہانیاں شکار کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ جانور وں کی سیرت کی کہا نیاں ہیں۔ان کہانیوں میں جانوروں کے کردار اتنے نمایاں، اتنے زندہ اور جیتے جاگتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان کی شخصیت کے پوشیدہ

پہلوؤں کے اظہار پر مسحور ہرکررہ جاتا ہے‘‘۔(۹۰)
ڈاکٹرجالبی نے ‘ رفیق حسین کے افسانوں کے تجزئیے سے ان کی مشاہدہ کی باریکی، جانوروں کی جبلت، سیرت و نفسیات سے گہری واقفیت، جانوروں کے انداز اور رنگ ڈھنگ سے واقفیت، جنگل کے مناظر بقائے زندگی کی کشمکش کے قدرتی جذبے کے بیان وغیرہ کو سراہتے ہوئے اردو افسانہ نگاری میں انفرادی حیثیت کا افسانہ نگار قراردیا ہے۔ ’’شام اودھ ایک مطالعہ‘‘ میں ڈاکٹرجالبی، ڈاکٹراحسن فاروقی کے ناول ’’شام اور اودھ‘‘ کو لکھنؤ کے تہذیبی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں اس لئے منفرد قراردیا ہے کیوں کہ اس ناول میں لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی ترجمانی ایک نواب کے محل سے کی گئی ہے جوکہ لکھنؤی تہذیب کا بھرپور عکاس ہوسکتاہے۔ ’’شام اودھ‘‘ کے پلاٹ کاتجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے مغربی ناول مثلاً بالزاک اور شیکسپئیر کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ کردار نگاری میں بھی یہ ناول انگریزی ناول کی روایت سے متاثر نظرآتاہے جس میں قصے سے زیادہ کرداروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ’’شام اودھ‘‘ میں اشاریت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’۔۔۔ان کرداروں کو تجرید ی نظر سے دیکھئے تو قصرالفضاء کا الف لیلوی ماحول اشاریت سے ہم کنار نظرآتاہے۔ نواب صاحب رجعت کا اشارہ ہے۔ حیدر نواب ترقی اور تبدیلی کا اشارہ ہیں اسی طرح یہ سب کردار ایک نہ ایک دائرے میں آتے ہیں لیکن ناول پڑھتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ یہاں اشاریت موجود ہے‘‘۔(۹۱)

’’شام اودھ‘‘ کی کردار نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے نفسیاتی طریقۂتنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھاہے۔ ڈاکٹرجالبی نے نوبہار کو ناول کی ہیروئن قراردیا ہے کیونکہ اس کے اندر زندگی کے بارے میں پرامید رویہ نظرآتاہے۔ ڈاکٹرجا لبی نے ‘ نوبہار‘ کے کردار کا موازنہ ’ایزیولائیک اٹ ‘ کی ہیروئن روز الینڈ اور جین آسٹن کے ناول ’’پرائڈ اینڈ پریجوڈس‘‘ کی ہیروئن ایلزبتھ بینٹ سے کرتے ہوئے اس کردار کی تخلیق کو احسن فاروقی کاکارنامہ قراردیا ہے۔
’’صاحب طرز ادیب ‘ میں ڈاکٹرجالبی، شاہد احمد دہلوی کی نثر کی خصوصیات کا تجزیہ پیش کیاہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر کا محمد حسین آزاد اور مولوی نذیراحمد کی نثر سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ’’شاہد احمد دہلوی کے ہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے ہاں نظر آتی ہیں اور نہ وہ ظرافت جونذیر احمد کے ہاں ملتی ہے لیکن ان دونوں صاحبِ

طرز ادیبوں کی نثر کے امکانات جس نقطہ پرآکرملتے ہیں وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نثرپیدا ہوتی ہے جس میں نہ استعار، محاورے، روزمرہ اور نکسالی زبان ایک خاص توازن کے ساتھ، ان کے مزاج کی سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لہجے کو جنم دیتی ہے‘‘۔(۹۲)

ڈاکٹرجالبی انہی خصوصیات کی بنیاد پر شاہد احمد دہلوی کو ایسا صاحب طرز ادیب قراردیتے ہیں جواچھی اردو سیکھنے کے لئے نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ’انارکلی۔ایک مطالعہ‘ میں ڈاکٹر جالبی، امتیاز علی تاج کے اس ڈرامے کا تجزیہ یورپ کی ڈرامے کی روایت کی روشنی میں کیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ’ڈرامہ ‘ مغربی ادب کے اثرات کے تحت ہمارے ادب کا حصہ بناہے لیکن ڈاکٹرجالبی نے، ڈرامے کی فنی تعمیر کے تجزئیے میں اردو ادب کی روایت کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ ڈرامے کے مختلف ابواب کے تجزئیے میں ڈاکٹرجالبی تنقید کے مختلف طریقوں کو بروئے کارلائے ہیں مثلاً ہرباب کا تجزیہ سائنسی تجزیاتی تحلیل کے انداز میں کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے تزکیاتی پہلو کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ انارکلی‘ کے مختلف کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی نہایت عمدگی سے نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق انارکلی کے تمام کرداروں میں جذباتیت و رومانیت کے عناصرغالب ہیں۔ انارکلی ‘ کو ڈاکٹرجالبی، المیہ قراردینے سے گریز کیا ہے کیونکہ اس کے قصے اور کرداروں میں کہیں بھی وہ انسانی عظمت نظر نہیں آتی جو ٹریجڈی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ’انارکلی‘ کے تمام کردار اپنے ہرعمل اور اس کے انجام کا ذمہ دار قسمت کو قراردیتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی روحانی اثرات اور جذباتیت کو ہی اس ڈرامے کی مقبولیت کا سبب قراردیتے ہیں۔ بقول جالبی ’’اردو نثر میں یہ ڈراماہمیت کاحامل رہے گا اور اس کا جذباتی اثر، اسکی خوبصورت اور شستہ نثر کی وجہ سے ہمیشہ ادبی نظرآتارہیگا‘‘۔(۹۳)

’’طلسم ہوشرباکے بارے میں چند باتیں ‘ میں ڈاکٹرجالبی نے جہاں’ طلسم ہوشربا ‘کے قصے اور اس کی جلدوں کے حوالے سے معلومات فراہم کیں ہیں وہیں داستانوں کے حوالے سے ہمارے ناقدین کے روّیوں کا تجزیہ بھی کیاہے۔ ڈاکٹرجالبی کی رائے یہ ہے کہ داستانیں ہماری قدیم ذہنیت کی پیداوار ہیں جبکہ اعتراضات ہماری جدید ذہنیت کی پیداوارہیں اور جدید ذہنیت ’’مغرب‘‘ کے اثرکانتیجہ ہے۔ ڈاکٹرجالبی انہیں ’’مغربی اثرات‘‘ کا تجزیہ کرتے ہوئے داستانوں کے حوالے سے پائے جانے مختلف نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے مطابق ایچ۔ جی۔ویلز کی تخلیقی کہانیوں کی طرح ہم اپنی داستانوں کو سائنس کا پیش رو قرارنہیں دے سکتے کیونکہ ان داستانوں میں ایسی دنیا کا خواب نہیں دکھایاگیاجہاں انسان اپنی لامحدود صلاحیتوں کو استعمال کرے۔ داستانوں کے بارے میں کہاجاتاہے کہ ان میں اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں جبکہ ڈاکٹرجالبی کے مطابق اردو داستانوں میں یہ خوبی محض اتفاقی

ہے۔ داستانوں کے ذخیرۂالفاظ، پلاٹ اور کردار نگاری کو اکثر ناقدین نے سراہاہے۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق یہ خوبیاں داستانوں میں یہ جزوی طور پر موجود ہیں لیکن ان خوبیوں کو داستانوں کی تنقید کے مرکزی اہمیت کی حاصل نہیں رہی۔ ڈاکٹرجالبی داستانوں کی تنقید کے حوالے سے نئے تنقید اصول وضع کرنے کی ضرورت پر زوردیا ہے تاکہ ہم اپنی تہذیب کے مرکزی اصولوں تک پہنچ سکیں۔ ڈاکٹرجالبی اس مضمون میں ایسے ناقد کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو فن پاروں کی پرکھ کے مروجہ اصولوں کو رد کرتے ہوئے نئے اصولوں و قوانین کی دریافت پر زور دیتے ہیں تاکہ کسی بھی فن پارے کی تفہیم اور قدروقیمت کے تعین میں آفاقیت کے عناصر شامل ہوں جوہردورکے لئے قابل قبول ہوں۔

ڈاکٹر جالبی کے تنقید ی نظریات اور عملی تنقیدکے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کلچر، تنقید،تحقیق اور فکر کے امتزاج سے ایک نئے تنقیدی نظام کو وضع کرنے اور عملی طور پر اسے برتنے کے قائل ہیں ڈاکٹر جالبی نئی تنقید (جسے وہ ’’امتزاجی تنقید‘‘ کا نام دیتے ہیں) کو کلچر، فکر اور تاریخ کے امتزاج سے ایک ایسی سطح پر دیکھنے چاہتے ہیں جہاں یہ تمام عوامل مل کر تنقید کو وسیع تر اور متوازن صورت عطا کرے۔ ڈاکٹر جالبی نے اپنے تنقید ی مضامین میں تفصیل سے اپنے امتزاجی تنقید کے نظریے پر روشنی ڈالی ہے ڈاکٹر جالبی کے تنقیدی مضامین کلچر اور تہذیب کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی نہ صرف فکراور کلچر کے مختلف عناصر سے وجود میں آئی ہے بلکہ عملی تنقید کے ضمن میں بھی انہوں نے کلچر کو بنیادی پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یوں ادب کی تفہیم، زندگی اور معاشرے سے قریب تر ہو جاتی ہے ڈاکٹر جالبی کی تنقید،فکراور کلچر کے امتزاج سے نہ صرف ہمارے فکری نظام کی کمزوریوں کو سامنے لاتی ہے بلکہ اس زوال اور کمزوری کو دور کرنے کے طریقے بھی بتاتی ہے ڈاکٹر جالبی نے ادب کو عظیم معاشرتی سرگرمی تصور کرتے ہوئے معاشرے پر اس کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی تنقید ہمارے تشخص کو دریافت کرنے میں معاون ہونے کے ساتھ ساتھ نئے نظامِ خیال کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ ایک محب وطن نقا دہونے کے ناتے ڈاکٹر جالبی ہمارے ادبی مسائل اور قومی مسائل کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ ان کی تنقیدی فکر جا بجا ہمارے مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کے حل کی تجاویز بھی پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی ہمارے تخلیقی زوال کو فکری زوال کا شا خسانہ قرار دیتے ہیں ہمارافکری زوال، بوسیدہ نظام خیال کی پیداوار ہے ڈاکٹر جالبی نے اپنی تنقید میں نئے نظامِ خیال کی تشکیل کے حوالے سے تجاویز بھی دی ہیں۔

ڈاکٹر جالبی جہاں بوسیدہ نظامِ خیال کو تخلیقی ادب کے زوال کاذمہ دار قرار دیتے ہیں وہیں ڈاکٹر جالبی نئے نظامِ خیال کی تشکیل میں اپنی ادبی روایات اور تہذیب کو نظرا نداز نہیں کرتے۔ اُن کے مطابق نئے تنقیدی معیارات وضع کرنے کے لئے مقامی معیارات کے ساتھ عالمگیر ادبی معیارات کی یکجائی وقت کا

تقاضا ہے۔ڈاکٹر جالبی،قومی زبان کے بہت بڑے داعی اور محافظ کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی نے زندگی بھر بہت سے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر خدمات سرانجام دیں۔ڈاکٹر جالبی قومی زبان کو رائج کرنے او ر اسے سرکاری طور پر نافذ کرنے کے حوالے سے عملی اقدامات میں حصہ لیا۔ بالخصوص مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین کے طور پر انہوں نے اردو کے نفاذکی عملی کوششوں سے حصہ لیا۔ڈاکٹر جالبی اردو کو نہ صرف ہمارے تہذیبی تشخص کی علامت سمجھتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی اور قومی ترقی کے لئے اردو کی حفاظت اور ترویج کو اوّلین ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی، تنقیدمیں جہاں کلچراور فلسفہ وفکر کے امتزاج کو پیش کیا ہے وہیں تحقیق کو بھی تنقید کا اہم حصہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے تحقیق اور تنقید کے امتزاج سے ایک نئے اصطلاح ''تحقید'' وضع کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی فکر میں ''باخبری'' ایک اہم عنصر بھی ہے۔ڈاکٹر جالبی ایک طرف ادب اور ادیب سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ شعور کی سطح پر غور وفکر کا حامل ہو بلکہ اپنے اردگرد کے واقعات جملہ سائنسی اور عمرانی علوم سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ خودڈاکٹر جالبی کی عملی تنقید ان کی فلسفہ،، نفسیات،عمرانیات اور دیگر علوم سے ان کی واقفیت کی آئینہ دار ہے۔ڈاکٹر جالبی کی یہ''باخبری'' محض مروّجہ علوم تک محدود نہیں بلکہ عالمی ادبی نظریات اور فلسفیانہ افکار سے واقفیت بھی ان کی تنقیدی فکر کا اہم حصہ ہے۔ڈاکٹر جالبی کا مغربی ادب اور فلسفیوں سے لگاؤ اور دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ خودڈاکٹر جالبی کئی مضامین اور انٹر ویوز میں ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی اور اس کے اثرات قبول کرنے کا ذکر کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر جالبی پر ایلیٹ کے اثرات کے حو الے سے لکھتے ہیں:

> ''.......ایلیٹ ڈاکٹر جالبی کے لئے محض ایک مصنف ہی نہیں چشمۂ فیض بھی ہے وہ ان کا رہنما ستارہ بھی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کاذہن متجسس تو پہلے ہی تھا لیکن ایلیٹ کے مطالعے نے ان کے ذہن کے گوشوں کو ایک نئی روشنی سے منور کیا، انہوں نے ادب، تہذیب اور زندگی کے نئے اور پرانے سوالات پر ایلیٹ کے تجزیاتی، تحلیلی انداز میں غور کرنے کی کوشش کی اور پاکستانی تہذیب اور ثقافت کو نئے مدار میں داخل ہونے کا راستہ دکھایا''۔(۹۴)

ڈاکٹر جالبی کے تنقیدی مضامین میں ایلیٹ ایک محوری حوالے کے طور پر موجود ہے چاہے وہ تہذیبی تناظر ہو یا روایت کا سراغ۔ڈاکٹر جالبی کی نظری اور عملی تنقید میں ایلیٹ کے اقوال بے ساختہ آ جاتے ہیں۔ایلیٹ کے علاوہ جن دیگر مغربی ناقدین اور فلسفیوں کے اثرات ڈاکٹر جالبی کی تنقید نگاری میں

محسوس کئے جاتے ہیں۔ان میں میتھیوآرنلڈ،ا یذراپاؤنڈ وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔ بالخصوص ایذراپاؤنڈ کا محقق نقاد ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی فکر کا ایک اہم جزو ہے۔ ڈاکٹر جالبی، ایذراپاؤنڈ کے محقق نقاد کو نئی تنقید کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی خود بھی اپنے تنقید ی مضامین اور ادبی تاریخ نویسی میں ایک محقق نقا داور محقق مؤرخ کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں ڈاکٹر جالبی ادیب کے فکر وفن پر تنقید ی آراء کے اظہار کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت اس کے کوائف کی فراہمی کے حوالے سے تحقیقی عمل کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مختصر تنقیدی مضامین کے علاوہ ادبی تاریخ میں وہ درست تحقیقی مواد کی فراہمی اور استخراجِ نتائج کے ضمن میں نہایت احتیاط کا اظہار کرتے ہیں۔ان کی فراہم کردہ تحقیقی معلومات کو جھٹلانا مشکل ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی نتائج کو بہت کم محققین اور مورخین نے چیلنج کیا ہے۔یا درہے کہ ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی کتب میں جہاں ان کی نظری اور عملی تنقیدکے مظاہر نظر آتے ہیں وہیں ان کے مرتب کردہ تواریخ ادب جو کہ نویں صدی عیسویں سے انیسویں صدی تک احاطہ کرتی ہے، میں اس طویل عرصے کے دوران اردو زبان وادب کے منظر نامے پر ظاہر ہونے والے اوّل و دوّم درجے کے شعراء اور نثر نگاروں پر تنقیدی آراء ملتی ہیں۔ڈاکٹر جالبی واحد نقاد ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو کے اس طویل ادبی منظر نامے پر ان کی تنقید ی آراء موجود ہیں اس لحاظ سے ڈاکٹر جالبی بجا طور پر دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو ادب کے حوالے سے جس مقدارمیں مطبوعہ اور غیرمطبوعہ مواد کا مطالعہ انہوں نے کیا ہے کسی بھی مورخ اور ناقد نے نہیں کیا ہو گا۔ڈاکٹر جالبی کی تنقید کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے خود کو کسی خاص صنفِ سخن سے وابستہ نہیں کیا ناول، افسانہ، اصناف شاعری وغیرہ پر ان کا تجزیہ انہیں ہمہ جہت اور ہمہ گیر نقاد ثابت کرتا ہے۔ اس حوالے سے یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ ڈاکٹر جالبی نے خود تخلیقی ادب کے حوالے سے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ لیکن فن پاروں کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ان کی تنقید، تخلیقی تنقید کاروپ دھار لیتی ہے۔ اس نہج پر پہنچ کر تنقید بذات خود ایک تخلیقی عمل بن جاتا ہے بقول احمد ہمدانی:

> ’’فن پارے کی خوشبودار خلوت میں گم ہوجانے کا یہ عمل چونکہ تخلیقی ہے اس لئے ڈاکٹر جالبی نے غزل، افسانے یا نظم کے تخلیقی کرب سے نہ گزرنے کے باوجود ان پر تنقید لکھ کر دراصل تخلیقی فریضہ ہی سرانجام دیا ہے۔ظاہرہے کہ تنقید کا تخلیق ہونا نقاد سے متخیلہ کی اعلیٰ اقدار کے مظہر ہیں‘‘۔(۹۵)

ڈاکٹر جالبی اپنے تنقیدی مضامین کی روشنی میں ایک متوازن اور معتدل ناقد کے روپ میں ہمارے سامنے ہیں۔ان کا یہ اعتدال اور توازن نہ صرف ان کی تنقید ی آراء کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ بطور مفکر نقاد، ان کے فکر ی روّیے بھی اعتدال اور توازن کے آئینہ دارہیں۔ اپنے ملک وملت کے مسائل کے تجزیے اور ان کے حل کے حوالے سے تجاویز دینے کی ضمن میں ایک طرف حب الوطنی کا دامن تھا مے رہتے ہیں وہیں عالمگیر انسانی اقداراور آفاقی قوانین کو اپنی تنقیدی فکرکے پس منظر اور پیش منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی ایک ایسے نقاد کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو مقامی،علاقائی اور بین الاقوامی تعصبات سے پاک ہے۔ مغربی تنقید اور ادب سے استفادہ ان کی وسعت نظری کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر جالبی کی فکر پر جہاں ایلیٹ، میتھیوآرنلڈاور ایذراپاؤنڈ کے اثرات کی نشاندہی کی جاتی ہے وہیں انہیں محمد حسن عسکری کے دبستان تنقید سے وابستہ ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری کی مانند ڈاکٹر جالبی نے بھی کلچر، اسلامی کلچرکی تشکیل اور معاصر ادب کو درپیش مسائل کے حوالے سے قلم اٹھایا لیکن محمد حسن عسکری کی مانند پاکستانی ادب کی تشکیل کے حوالے سے مباحث ڈاکٹر جالبی کی تنقید کا حصہ نہیں ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر جالبی کو محمد حسن عسکری کے دبستان تنقید سے وابستہ کیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر جالبی کی تنقیدی فکر، انفرادیت کے باعث اپنا الگ تشخص قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اس حوالے سے رقم طرازہیں:

> ’’محمد حسن عسکری سے متاثر ہوکر تنقید لکھنے والوں میں ڈاکٹر جالبی، سلیم احمد، شمیم احمد، مظفر علی سید، جمال پانی پتی اور سراج منیر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔۔۔۔۔ان کے ہاں شاید روایت کے تصور میں وہ مذہبی آہنگی بھی دکھائی دے، جو اسلام کے تصورِ حقیقت سے مستعار ہے لیکن ان سب میں فکر، طرزِ احساس اور نقطۂ نظر کی تعبیر بالکل مختلف اور منفرد رنگارنگی سے مرتب ہوتی ہے۔ ان سب کے ہاں تہذیبی جمالیات کی روایتی معنویت کی ہم آہنگی کے سوا شاید ہی کوئی دوسری خوبی مشترک ہو‘‘۔(۹۶)

ڈاکٹر جالبی کی تنقید کی مانند ان کا تنقیدی اسلوب بھی اعتدال، توازن او رتخلیقی اُپچ کا آئینہ دارہے۔ڈاکٹر جالبی کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ابلاغ اور ترسیل کوقرار دیا جا سکتا ہے۔ ’’طرز تحریر ان کے لئے تحریر اور اس کی معنویت سے جدا اور ان پر اضافی صفت نہیں بلکہ اس سے ان کی تحریر کی داخلیت عبارت ہے‘‘۔(۹۷)

تنقیدی فکر کے اظہار میں ابلاغ کا عنصر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ابلاغ میں ناکامی افسانوی ادب میں تو قابل قبول ہو سکتی ہے لیکن تنقیدی فکر ابلاغ کے بغیر ناکام تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی تنقید میں ابلاغ کا یہ عنصر ان کے الفاظ کے انتخاب اور غیر معروف تراکیب سے احتزاز میں پوشیدہ ہے حتیٰ کہ مشکل اور فلسفیانہ تصورات کے اظہار میں بھی الفاظ کا انتخاب معنویت اور شفافیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ ایک مضمون ''سارتر وجودیت اور ادب'' میں سارتر کے فلسفۂ وجودیت پر ایسے الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں کہ ادب کے عام قارئین بھی فلسفۂ وجودیت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''وجودیت'' کی داخلیت انسان کو اس کی اپنی ذات میں محدود نہیں کرتی بلکہ حیات و کائنات کی نئی منزلیں اور وسعتیں سامنے کر دیتی ہے۔ وہ اپنی آزادی کے تصور میں دوسروں کی آزادی کو نہیں بھولتا۔ اسے یہ خیال بھی رہتا ہے کہ زندگی اس وقت تک کچھ حیثیت نہیں رکھتی جب تک اسے بسر نہ کیا جائے اور اس میں معنی پیداکرنا خود انسان کا کام ہے انسانی کائنات داخلیت کے علاوہ کوئی دوسری کائنات نہیں ہے۔ وہ اپنی مطلقیت کا محور ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا قانون ساز نہیں ہے''۔(۹۸)

ڈاکٹر جالبی کی تنقید میں ابلاغ کے عنصر کی کامیابی ان کے الفاظ کے چناؤ اور مروّج زبان کے الفاظ کے استعمال میں مضمر ہےڈاکٹر جالبی کی تنقید ی فکر پر انگریز ناقدین کے اثرات کی نشاندہی کی جاتی ہے لیکن ڈاکٹر جالبی کی تنقید میں انگریزی زبان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے سوائے اس کے کسی انگریزی لفظ کے اردو متبادلات موجود نہ ہوں۔ ڈ اکٹر جالبی الفاظ اور اصطلاحات کے اردو تراجم کے استعما ل کو فوقیت دیتے ہیں۔ ان کا یہ رحجان ان کی نظریاتی تنقید ی مضامین اور عملی تنقیدی میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ غالب کی فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس کے ہاں میرؔ کی طرح احساس و جذبہ کے ننھے منے جگنو نہیں چمکتے بلکہ فکر کی حرارت اور شعور و احساس کا ادراک ذوقِ تماشا بخشتا ہے۔ غالب کی نظر ایک فلسفی کی نظر ہے اور وہ جن چیزوں کو سامنے لاتا ہے۔ تخیل، تجربے اور جذبات کے ذریعے (جسے ٹی ایس ایلیٹ فکر کا جذباتی مترادف Emotional Equivalent to Thought کہتا ہے۔)ان کی دائمی حقیقت اور گہرائی تک بھی پہنچا دیتا ہے''۔(۹۹)

ڈاکٹر جالبی نے جہاں انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات پیش کئے ہیں وہیں اپنی فکر کے اظہار کے لئے نئی تراکیب بھی تراشی ہیں جوان کی تحریروں میں ابلاغ کے عنصر کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی ایک طرف ایلیٹ کے فکر ی اثرات قبول کرنے کا اقرار کیا ہے وہیں ایلیٹ کے اسلوب اور جملہ سازی کی پیروی کا بھی اقرار کیا ہے۔ اپنے ایک انٹر ویو میں فرماتے ہیں:''ٹی -ایس ایلیٹ کو ترجمہ

کرنے کا سبب بھی یہی تھا کہ میں اس کے تنقیدی اسلوب کو اپنانا چاہتا تھا اور ترجمے سے میں نے اس کے اسلوبی راز کو دریافت کرکے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، میری تحریر پر ایلیٹ کا اثر نمایاں ہے''۔(۱۰۰)

ڈاکٹر جالبی کی جملہ سازی پر ایلیٹ کے اثرات کے باوجود، ان کی تحریروں کے جملے فنّی اور ہئیتی حوالے سے انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ خیال کی ترویج کے لئے کہیں جملہ طویل اور ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے اور کہیں چھوٹے اور بامعنی جملوں سے خیال کی ترسیل کا کام لیا گیا ہے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ ''میر کی شاعری میں جو تیور،جو لہجہ، جو رنگ اور غم وکرب کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا تعلق اس کے عہد کے اس کرب سے ہے،جب مغلیہ تہذیب زوال کی طرف جا رہی تھی''۔(۱۰۱)

2۔ ''میرا ایک ایسا شاعر ہے جس کے ساتھ ہم ساری زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ میر ہمیں اپنے اندر ؟لیتے ہیں۔ میر کے ہاں موت زندگی پر غالب نہیں آتی بلکہ زندگی موت پر غالب آتی ہے وہ قنوطی شاعر نہیں ہیں بلکہ زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی جس میں غم وخوشی، شادی و مرگ، کامیابی و ناکامیابی سب ایک ساتھ چلتی ہیں''۔(۱۰۲)

ڈاکٹر جالبی کے تنقیدی اسلوب کی ایک صفت اسکی 'معقولیت' ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی فکر کا محور کلچر، قومی یکجہتی اور قومی شناخت جیسے عناصر ہیں لیکن ان سب کے باوجود ڈاکٹر جالبی اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے معقولیت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اپنے نقطہ نظر کے بیان میں جذباتیت کا عنصر محض اس حد تک شامل کرتے ہیں جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہونے کا احتمال نہ ہو۔ ان کی تنقید، تنقیص کے دائرے میں داخل نہیں ہوتی۔اردو زبان کی ترویج کے حوالے سے انگریزی دان طبقے کے کردار کی مذمت ان الفاظ میں کرتے ہیں ؛

> ''جب انگریزی اسکول کے پڑھے ہوئے طالب علم حاکم بن کر کرسئ اقتدار پر بیٹھتے ہیں تو وہ ایک طرف وہ اپنی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنی تہذیبی روایت اوراپنے قومی ورثے سے نابلد ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ انگریزی اور انگریزی تعلیم کے نظام کو اور مضبوط کرتے ہیں اور ہمارے احساسِ قومیت کو کمزور سے کمزور تر کردیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے موجودہ نظام تعلیم نے انگریزی پر غیر معمولی زور دے کر نہ صرف ہماری نئی نسلوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو حد درجہ زخمی کیا ہے بلکہ انہیں قوم کے فکر و شعور کے لئے ناکارہ بنادیاہے''۔(۱۰۳)

ڈاکٹر جالبی کی تحریروں میں ایک استدلالی روّیہ ملتاہے۔ اُن کی تحریر میں اُن کے نظریات اور عملی تنقید کے نتائج کو نہایت وضاحت اور استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسی استدلالی روّیے کی بناء پر ان کے تحقیقی و تنقیدی نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً غالب کی شاعری میں امیجری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’آگ اور گرمی کی امیجری غالب کے تخلیقی مزاج کا حصہ تو ضرور ہے لیکن اگر ہم اس امیجری سے کوئی ایسا تنقیدی نظام بنانے کی کوشش کریں جیسا کہ مغرب کے جدید اشاریت پسندوں کے ہاں بن جاتا ہے تو ہمیں اس وجہ سے کامیابی نہیں ہوگی کہ اوّل تو غزل کی داخلی دنیا میں کسی منظم اشاریت کی گنجائش نہیں تھی پھر غالب کو دانتے کی طرح کوئی نئی واضح سکیم بھی نہیں ملی تھی‘‘۔(۱۰۴)

ڈاکٹر جالبی کا یہ استدلالی طریقہ کار ان کی تنقیدی فکر کی جا ن ہے، اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے مستحکم دلائل فراہم کرتے ہوئے قاری کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر جالبی کی فکر اور تحریریں اردو زبان سے ان کی محبت کی مظہر ہیں۔ ایک طرف ڈاکٹر جالبی کی فکر پاکستان اور اردو سے محبت کی عکاس ہیں تو دوسری طرف ان کی نثر کا اردو پن اسی محبت کا عملی اظہار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی نثر کا یہ اردو پن ان کے جملوں کی ساخت، الفاظ کے انتخاب، نئی تراکیب وضع کرنے میں نمایاں ہے۔ اردو زبان کے اہم ادیب ہونے کے ناتے وہ نہ صرف اردو زبان کے بہت بڑے داعی رہے ہیں بلکہ اردو کے نفاذ کی عملی کوششوں میں ان کے عملی کردار سے انکار ممکن نہیں۔اُن کی تحریروں میں شگفتگی، روانی اور سلاست نے ان کی نثر کو دلچسپ او رقابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ڈاکٹر جالبی تنقیدی فکر کے اظہار کے لئے ایسااسلوب اختیار کرتے ہیں جو نہ صر ف ادب کے سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے بلکہ عام قارئین بھی ان کے تنقیدی مضامین کو یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی کی تحریروں میں یہ شگفتگی اور دلچسپی ان کی نثر میں طنزومزاح اور تشبیہ و استعارہ کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ڈاکٹر جالبی نے اگرچہ تخلیقی ادب کے حوالے سے کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا لیکن ان کی نثر کی خوبصورت زبان نے ان کی تنقید کو تخلیقی تنقید بنا دیا ہے۔ڈاکٹر جالبی عام طور پر مضمون کی ابتداء اس انداز میں کرتے ہیں کہ قارئین ان کے طنزیہ و شگفتہ اسلوب کی بناء پر مضمون میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کا طنز بھی ان کی شخصیت اور تنقید کی مانند معتدل ومتوازن ہیں۔ ڈاکٹر جالبی طنز کے تیر نہیں چلاتے بلکہ شگفتہ سے انداز میں ہماری مجموعی قومی روّیوں اور کجیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے

خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔مثلاً بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے مضمون کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہیں ’’اردو شاعری کی تاریخ میں خرابئ صحبت کی دو مثالیں ملتی ہیں۔ ایک انشاء کے ہاں اور دوسری ظفر کی ذات میں۔ انشاء کو نواب سعادت علی خا ن کی صحبت کھا گئی اور ظفر کی شاعری کے چمن کو ذوق و شاہ نصیر کی بد ذوقی نے خزاں رسیدہ کردیا‘‘۔(۱۰۵)

اُن کی تنقیدی تحریروں میں تشبیہہ واستعارہ کا استعمال ان کی تحریروں کو بامعنی بنانے کے ساتھ ساتھ قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتا ہے مثلاً فراق کی رباعیوں کے جمالیاتی پہلوکو خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’فراق کی رباعیاں چاند کی ان پُر نور اور پاکیزہ کرنوں کی طرح ہیں جن سے روح اور جسم دونوں کو آرام اور سکون پہنچتا ہے۔ جب حقیقت کے تاروپود بکھرجاتے ہیں اور انسان اپنی روح میں ایک ہیجان اور اضطراب محسوس کرنے لگتا ہے اور زندگی میں اسے حقیقتوں کی کمی اور فقدان محسوس ہونے لگتا ہے تو فراق کی رباعیاں اپنے شیریں الفاظ،مدہم اور نیم خوابیدہ بوجھل اسلوب اور خوبصورت امیجز (images)کے ساتھ ہماری زندگی میں ایک تازہ جولانی، ایک نئی لہر اور نئی کیفیت بھر دیتی ہیں‘‘۔(۱۰۶)

ڈاکٹر جالبی کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ ان کا اسلوب کہیں بھی مغلق اور پیچیدگی اختیار نہیں کرتا۔ انہیں اپنی فکر اور نتائج کے اظہار کے لئے زبان کے بھر پور استعمال کا ہنر آتا ہے ان کی تحریروں میں جامعیت ان کی تحریروں کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ڈاکٹر جالبی اپنا نقطہ نظر کو گھما پھرا کر بیان کرنے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کردیتے ہیں کہ ان سے اختلاف کرنے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی کے تنقیدی مضامین ان کی تنقیدی فکر کے خدوخال اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عملی تنقید کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے بھی معاون ہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے غیر جانبدار انہ انداز میں مصنف کی شخصیت اور کلام کا تجزیہ کرنے کے بعد تنقید کے مختلف طریقوں، جمالیاتی، نفسیاتی، عمرانی وغیرہ کے امتزاج سے نتائج مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کی تنقید میں عمرانی اور نفسیاتی تنقید کے طریقۂ کار کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ کسی فن پارے کو اس کے عہد اور مصنف کی شخصیت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش تقریباًان کے تمام تنقیدی مضامین میں نظر آتی ہے۔ تنقیدی نتائج کے بیان میں ڈاکٹر جالبی محض تخلیقی محاسن گنوانے پر زور صرف نہیں کرتے بلکہ تخلیق کے

نقائص کی نشاندہی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے تنقیدی نتائج چونکا دینے والے اور مروّجہ نظریات سے الگ بھی ہوتے ہیں۔

تہذیب اور کلچر کے مسائل کو تنقید نگاری کے پس منظر کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے کوئی اور نقاد ڈاکٹر جالبی کی ہم سری نہیں کر سکتا۔ یہی پہلو بطور نقاد ان کی انفرادیت اور عظمت کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر جالبی کی تنقید کے اسی پہلو کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر جالبی کے عہد میں ادیب اور معاشرے کے طرز احساس میں ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان کے ہاں جن موضوعات نے زیادہ اہمیت حاصل کی، ان میں مختلف سماجی رشتوں کے تعین کا رحجان زیادہ نمایاں ہیں۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سب کو ایک مفکر کی آنکھ سے دیکھا ہے، جو منظر کے علاوہ پس منظر کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ موجود سے ناموجود کی دریافت کرتا ہے اور ماضی کا سرا حال کے ساتھ ملاتاہے تو اسے مستقبل کی طرف لپکنے کا موقع بھی عطا کرتا ہے۔ ان تمام مباحث میں انہوں نے کلچر اور تہذیب کو فکری اساس کے طور پر استعال کیا ہے اور تنقید کو اس آزادی کے ساتھ برتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کرا ن کے ہاں تنقید محض اظہار کا میڈیم نہیں اپنی بلکہ ایک مقصد بن جاتی ہے انہیں احساس ہے کہ بیسویں صدی میں سائنس نے فلسفے کو غیر اہم بنا دیا ہے اور فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ اس مشکل مرحلے پر ڈاکٹر جالبی نے وہ کام ادبی تنقید سے پائیہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، جسے ایک زمانے میں ادب اور فلسفہ الگ الگ سرانجام دیتے ہیں''۔(۱۰۷)

ایک بالغ نظر اور مفکر نقاد کے طور پر اپنے عہد اور آنے والے عہد کے مسائل کا ادراک اور ان کا حل تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر مثال پیش کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر جالبی بطور نقاد اردو ادب کے محسن کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔

حواشی وحوالہ جات باب پنجم

۱۔ مجتبیٰ حسین، 'ادب و آگہی'،کراچی،مکتبہ افکار،۱۹۶۳ء،ص ۴۴۔۴۵

۲۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،'اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'،لاہور،مجلس ترقیء ادب،طبع اوّل،۱۹۷۲ء،ص۷۲۱

۳۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،'تنقید اور جدید اردو تنقید'،کراچی،انجمن ترقی اردو،پاکستان،۱۹۸۹ء،ص۱۵۸

۴۔ انٹرویو،پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مشمولہ سہ ماہی' ارمغان' (جمیل جالبی نمبر)کراچی،اپریل مئی جون۱۹۹۶ء،، ص ۱۶۸

۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ' نئی تنقید'، مرتبہ، خاور جمیل، کراچی، رائل بک کمپنی ۱۹۸۵ء، اشاعت اوّل، ص۱۰

۶۔ احمد ہمدانی، 'ڈاکٹرجمیل جالبی کا تصور ادب وکلچر '، مشمولہ، ارمغان، ایضاً، ص۱۲۷

۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'قومی زبان،یکجہتی،نفاذاور مسائل'،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۹ء،ص۲

۸۔ انٹرویو پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا،ایضاً،ص۱۷۲

۹۔ محمد احسن فاروقی،ڈاکٹر، 'جمیل جالبی کی تنقید نگاری'، مشمولہ،'ڈاکٹرجمیل جالبی۔ ایک مطالعہ'،مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی،دہلی،دہلی پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۳ء،ص۱۵۹

۱۰۔ انورسدید،ڈاکٹر،'ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید '، مشمولہ،'ڈاکٹرجمیل جالبی۔ ایک مطالعہ'،ایضاً، ص۲۰۴

۱۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'آزادی، تہذیبی مسائل اور تضاد'، مشمولہ،' پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ '، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع پنجم،۱۹۹۳ء، ص۱۶

۱۲۔ ایضاً،ص۳۱

۱۳۔ ایضاً،ص۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۵۔ ایضاً،ص۶۹

۱۶۔ ایضاًص ۱۸۲

۱۷۔ ایضاً،ص ۱۹۳

۱۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'نئی تنقید'،مرتبہ؛خاور جمیل،کراچی،رائل بک ڈپو کمپنی،۱۹۸۵ء اشاعت اول، ص ۳۳۰

۱۹۔ ایضاً،ص ۳۱۵

۲۰۔ شان الحق حقی، 'پاکستانی کلچر ایک زاویہ '، مشمولہ 'ڈاکٹرجمیل جالبی۔ایک مطالعہ '، ایضاً ص۳۸۶

۲۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'تنقید اور تجربہ'، کراچی، مشتاق بک ڈپو، باراول، ۱۹۶۷ء، ص۸

۲۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'تنقید اور تجربہ'، ایضاً، ص۲۱۳

۲۳۔ ایضاًص۴۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۶۔ ایضاً، ص۳۷

۲۷۔ ایضاً، ص۴۲

۲۸۔ ایضاً،ص۲۳

۲۹۔ ایضاً،،ص ۲۶

۳۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’نئی تنقید‘ایضاً، ص ۲۷۹

۳۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’ادب، کلچر اور مسائل ‘، مرتبہ: خاورجمیل، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء، اشاعت اول، ص۱۳

۳۲۔ ایضاً، ص۱۷

۳۳۔ ایضاً،ص۱۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۵۔ ایضاً، ص۵۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۷۔۶۶

۳۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’نئی تنقید‘،ایضاً ص ۸۰

۳۸۔ ایضاً،ص۸۳

۳۹۔ ایضاً،ص۸۴

۴۰۔ ایضاً، ص۱۱۶

۴۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’تنقید اور تجربہ‘ایضاً،ص ۴۳

۴۲۔ ایضاً،ص ۴۵

۴۳۔ ایضاً،ص ۶۲

۴۴۔ ایضاً، ص۱۳۳۔۱۳۴

۴۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’معاصر ادب ‘، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰

۴۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’قومی زبان،یکجہتی،نفاذاور مسائل‘ایضاً،ص۳۶

۴۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ادب،کلچر اور مسائل‘،ایضاً، ص ۲۱۹

۴۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’تاریخ ادب اردو‘، جلد دوّم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ص۵۰۹

۴۹۔ ایضاً، ص۵۱۸

۵۰۔ ایضاً، ص۵۲۲

۵۱۔ ایضاً، ص۵۷۷

۵۲۔ ایضاً،ص۵۷۹

۵۳۔ ایضاً، ص۵۸۰

۵۴۔ ایضاً، ص۵۸۴

۵۵۔ ایضاً،ص۵۹۰

۵۶۔ ایضاً،ص۵۹۱

۵۷۔ ایضاً،ص۵۹۶

۵۸۔ ایضاً،ص۵۹۹

۵۹۔ ایضاً،ص۶۱۰

۶۰۔ ایضاً،ص۶۳۱

۶۱۔ ایضاً،ص۶۳۶

۶۲۔ ایضاً،ص۶۴۴

۶۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'نئی تنقید'ایضاً ص ۲۱۸

۶۴۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔۲۲۶

۶۵۔ ایضاً، ص ۳۲۶

۶۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'ادب،کلچر اور مسائل'،ایضاً، ص ۱۴۷

۶۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،تنقید اور تجربہ،ایضاً، ص۱۶۵

۶۸۔ ایضاً، ص۱۹۰

۶۹۔ انورسدید،ڈاکٹر،'ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید'،مشمولہ،'ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ' ایضاً، ص۲۱۲

۷۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'تنقید اور تجربہ'،ایضاًص۲۱۳

۷۱۔ ایضاً،ص۲۱۶

۷۲۔ ایضاً،ص۲۸۰

۷۳۔ ایضاً،ص۲۸۶۔۲۸۷

۷۴۔ ایضاً،ص۳۱۲

۷۵۔ انورسدید،ڈاکٹر،'ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید'،مشمولہ،'ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ' ایضاً،۲۰۹

۷۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'ایلیٹ کے مضامین '،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۶ء،ص۱۶

۷۷۔ ایضاً،ص۲۴

۷۸۔ ایضاً،ص۲۵

۷۹۔ ایضاً،ص۲۹

۸۰۔ ایضاً،ص۴۸

۸۱۔ ایضاً،ص۵۲

۸۲۔ ایضاً،ص۵۶

۸۳۔ ایضاً،ص۶۶

۸۴۔ ایضاً،ص۶۸

۸۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’تنقید اور تجربہ‘،ایضاً،ص۴۰۵

۸۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’نئی تنقید‘ایضاً، ص ۲۸۵

۸۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’معاصر ادب‘لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء،، ص۶۳

۸۸۔ ایضاً، ص۱۲۰۔ ۱۵۹

۸۹۔ جمیل جالبی،داکٹر،’تنقید اور تجربہ‘،ص۳۳۴

۹۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ادب کلچر اور مسائل‘،مرتبہ؛خاور جمیل،ایضاً،ص۱۰۹

۹۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’نئی تنقید‘ایضاً ص ۱۵۶

۹۲۔ ایضاً ص،۱۷۱

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۹۴۔ انور سدید،ڈاکٹر، ’ڈاکٹرجمیل جالبی کی تنقید ‘، مشمولہ، ’ڈاکٹرجمیل جالبی۔ایک مطالعہ ‘، ایضاً، ص ۲۰۹

۹۵۔ احمد ہمدانی ’منفرد ادبی تنقید ‘، مشمولہ، ’سفیراردو ‘، سہ ماہی، اکتوبر /نومبر۲۰۰۴ء، یوکے، ص ۱۴۶

۹۶۔ عبدالعزیز ساحر، ’ڈاکٹرجمیل جالبی شخصیت اور فن ‘،ایضاً، ص۳۸

۹۷۔ عبدالقادرقاضی،ڈاکٹر، ’جمیل جالبی ‘ اسلوب کی باتیں ‘، مشمولہ، ڈاکٹرجمیل جالبی۔ایک مطالعہ، ایضاً، ص۱۸۳

۹۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر ’، تنقید اور تجربہ‘، ایضاً، ص۸۶۔۳۸۵

۹۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر ’’نئی تنقید‘، ایضاً، ص۲۴۰

۱۰۰۔ ڈاکٹرجمیل جالبی سے گفتگو: شیراز بن عطاء وژن مجلہ اسلام آباد، ماڈل کالج، ایف ۲/۱۰، اسلام آباد، ۲۰۰۶، ص۱۸

۱۰۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’معاصر ادب ‘، ایضاً، ص ۳۰

۱۰۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،' نئی تنقید'، ایضاً، ص۲۰۹

۱۰۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'قومی زبان، یک جہتی، نفاذ اور مسائل'، ایضاً، ص۳۴

۱۰۴۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،' نئی تنقید'، ایضاً، ص۲۲۶

۱۰۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'تنقید اور تجربہ'، ایضاً،ص۱۹۱

۱۰۶۔ ایضاً،ص ۲۲۱

۱۰۷۔ انور سدید،ڈاکٹر،' ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید '، مشمولہ، 'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ایک مطالعہ'، ایضاً ایضاً، ص۲۰۵

باب ششم

ڈاکٹرجمیل جالبی کے تراجم اوردیگر تصانیف:تجزیاتی مطالعہ

ترجمہ:

لفظ ''ترجمہ'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ ترجمے کے لغوی معنی ایک زبان کے مواد یا کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا مترادف لفظTranslation ہے جوکہ لاطینی لفظ Translatrioسے اخذ کیاگیاہے۔ جس کے معنی پہچاننا یا منتقل کرنا کے ہیں۔ ترجمہ کے حوالے سے مختلف ناقدین اور مفکرین نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر حامد بیگ مرزاکے مطابق:

> ''کسی تحریر، تصنیف یاتالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے''۔(۱)

۲۔ نثار احمد قریشی کے مطابق:

> ''کسی مصنف کے خیالات کو لیاجائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایاجائے، ان کو اپنے الفاظ ومحاورات کے سانچے میں ڈھالاجائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیاجائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق محسوس نہ ہو''۔(۲)

۳۔ بقول جمیل جالبی:

> ''ترجمہ نگاری دراصل ایک فن ہے جس کے وسیلے سے ایک زبان کے علم کے سرمائے کو دوسری زبان میں منتقل کیاجاتاہے۔ اس عمل سے ایک قوم کے خیالات، جذبات و احساسات اور معلومات کے ذخیرے دوسری قوم تک منتقل ہوتے رہتے ہیں''۔(۳)

ان تعریفوں کا جائزہ لیاجائے تو ترجمہ کرنا ایک ایسا عمل قرارپاتاہے جس میں مترجم ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کی سعی کرتاہے کہ اصل تالیف کی فکر اور خیال نئی زبان میں پورے طور پر ڈھل جائے۔ اس انداز سے ترجمے کے عمل کاجائز ہ لیا جائے تو ترجمہ نویسی ایک فن اور ہنر قرار پاتاہے۔ ہر فن اور ہنر کی مانند ترجمہ نویسی کے بھی اپنے تقاضے، ضروریات اور اصول و قواعد ہیں۔

کسی بھی قوم کی علمی، تہذیبی اور فکری ترقی کے لئے ترجمہ نویسی کی ضرورت اور اہمیت سے انکارممکن نہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب تک علم کے ہرمیدان میں ترقی کی رفتارتیز ترین ہوچکی ہے۔ علم کے پھیلاؤ کے لئے ترجمہ نویسی بہترین تصور کی جاتی ہے۔ ماضی میں بنی نوع انسان نے ترقی کی جو منازل طے کی ہیں اور علوم و فنون ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پھیلے، اس عمل میں بھی عمل ترجمہ نے اپنا کردار ادا کیا۔ زبان و ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو عمل ترجہ کسی بھی زبان کے پھلنے پھولنے اور ادب کو محفوظ کرنے ہیں ہمیشہ معاون رہاہے۔ ترجمہ قدیم اساطیر،روایات اور قصوں کو محفوظ کرنے اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنے میں معاون رہا ہے۔

دنیا کی قدیم زبانیں جوکہ معدوم ہوچکی ہیں ان کا ادب ترجموں کی صورت میں آج بھی محفوظ ہے مثلاً قدیم سنسکرت اور یونانی زبان وادب کے شاہکار کالی داس کی ’شکنتلا‘اور ارسطو کی ’بوطیقا ‘آج بھی موجود ہے۔ گویا ترجمہ ماضی کو حال اور مستقبل سے جوڑنے کا عمل قراردیاجاسکتاہے۔ ترجمہ نویسی کاعمل مختلف ملکوں،تہذیبوں، زمانوں اور اقوام کے درمیان پل کا کردار اداکرتاہے۔ ایک ایسا پل جو ایک قوم اور تہذیب کے نظریات و افکار کو دوسری قوم تک منتقل کرتاہے۔ ترجمے کا عمل الفاظ اور زبان کی نشوونما میں اضافے اور تسلسل کا باعث بنتا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ:

> ’’ترجمہ کرتے وقت جہاں نئے الفاظ، استعاروں کے روپ میں جنم لیتے ہیں وہیں پرانے اور برتے گئے الفاظ کو آکسیجن مہیا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات کے جنم کے ساتھ نئے علوم و فنون سے آشنائی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نئی اصناف کا وروود ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتاہے‘‘۔(۴)

تراجم کی بدولت مختلف اقوام فلسفہ،طب،معاشیات،نفسیات،عمرانیات،کمپیوٹر اور تیکنالوجی کے شعبوں میں ایک دوسرے سے مستفید ہورہی ہیں۔دنیا کی سیاسی تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سی تحریکیں ترجمہ کرنے والوں کی محنت ہی کا نتیجہ ہیں۔ افریقہ اور ایشیاء میں چلنے والی بیدای کی تحریکوں میں بہت بڑا حصہ ترجموں کا بھی ہے۔ سامراجی طاقتوں نے مقبوضہ علاقوں کے طور طریقوں، مذہب، ادب اور تہذیب کو سمجھنے کے لئے تراجم ہی کا سہارا لیا۔ اس حوالے سے فورٹ ولیم کالج کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا بنیادی مقصد حکمران طبقے کو مقبوضہ علاقے کی زبان و ادب سے واقف کرنا ہی تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ آج کی ترقی یافتہ اقوام دنیا بھر کے علوم و فنون اور ادبیات کے ترجموں کے لئے ایک مربوط نظام رکھتی ہیں۔

عمل ترجمہ اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اقوام عالم کے درمیان ذہنی مفاہمت پیداکرنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ترجمے کا عمل اقوام عالم کو ایک دوسرے کے قریب لاتاہے اور یہ عمل عالمگیر ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں شرکت کا ذریعہ بن چکاہے۔ مختلف اقوام تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کو ایک دوسرے سے روشناس کروانے کے لئے بھی ترجمہ بہترین عامل ہے۔

بقول جیلانی کامران:

> ''ترجمہ کی ضرورت تہذیبی نشوونما کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سرچشموں کو خشک کردیتی ہیں اور اپنے آپ پھر کوئی نئی شئے پیدانہیں کرسکتیں۔ اس طرح وہ ذہنی علیحدگی اور ایک طرف تہذیبی تعصب کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اس بیماری کو ترجمے کا عمل دور کرتاہے اور قومیں اور تہذیبیں مسافت اور جغرافیے کی دقّتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں اور انسانوں کے گروہ مختلف دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں''۔(۵)

ترجمہ بنیادی طور پر اخذو استفادے کا عمل ہے۔ یہ علم کی لین دین ہے۔ ایک زبان کا علم دوسر ی زبان میں منتقل ہوتاہے توعلم کی ترویج تیز تر ہوتی ہے۔ ترجمہ کاعمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتاہے جہاں خیالات اور جذبات کی عکاسی کے لئے نیااسالیب وجود میں آتے ہیں وہیں الفاظ سازی کا عمل بھی شروع ہوتاہے۔ نئے محاورے وضع کئے جاتے ہیں۔ فکری اور نظریاتی سطحوں پرتنوع اور رنگارنگی پیداہوتی ہے۔ بقول حسن عسکری:

> ''ہمارے ہاں جس قسم کی بھی عظمت ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ترجموں سے ضرور ہے، اردو ادب میں آغاز سے لے کر غالب کے زمانے تک ترجمے چاہے زیادہ نہ ہوئے ہوں لیکن ہمارے شاعر دوقسم کی کوشش کرررہے تھے۔ ایک طرف تو وہ فارسی کے اسالیب اور تصورات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال رہے تھے۔ دوسری طرف وہ اپنی زبان کا ایک مزاج اور ایک روح متعین کرنی چاہتے تھے۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں اٹلی اور انگلستان کے شاعروں نے فرانسیسی کے زیر اثرا پنی اپنی زبانوں کے لئے کی''۔(۶)

عملِ ترجمہ زبان کی ہئیت سازی،مواداور لغات کی تدوین میں بھی مدد گار ثابت ہوتاہے۔ ترقی یافتہ زبانوں کے صدیوں پر محیط تجربات تراجم ہی کے ذریعے نئی زبانوں کو توانائی بخشے ہیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان وادب کے ارتقاء میں بھی توانائی بخشتے ہیں دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان وادب کے ارتقاء میں بھی ترجمہ نویسی کا نمایاں کردار رہاہے۔ اردو زبان کی تشکیل کا ابتدائی دکنی دورکہلاتاہے۔ بہمنی خاندان نے فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کے اثرات اسی دور میں ترجمہ نویسی کے ذریعے اردو زبان پر مرتب ہوئے جسے اس کے ابتدائی ادوار میں ہندی،ریختہ یا اردوئے معلیٰ کہا جاتا تھا۔ابتداء میں مذہبی اور اخلاقی کتب کے تراجم کئے گئے بعد میں داستانوں اور شعری سرمائیے کے تراجم سامنے آئے۔ اردو ادب کے ابتدائی تراجم میں وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء)، تحسین کی نوطرزِ مرصع (۱۷۹۷ء)، فضلی کی کربل کتھا (۱۷۳۱ء) شاہ رفیع الدین کا ترجمۂ قرآن مجید (۱۷۷۶ء) اور شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید'' (۱۷۹۰ء) اہم قراردیے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان میں انگریزی سے تراجم کا آغاز ۱۷۴۸ء میں ہواجب بائبل کاپہلا بامحاورہ ترجمہ کیاگیا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو میں علمی وادبی کتب کے باقاعدہ تراجم کاآغاز ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی ترجمہ کردہ کتب میں آرائش محفل،قصہ لیلیٰ مجنوں،گلستان سعدی،باغ و بہار،شکنتلا،بتیال پچیسی،وغیرہ اہم ہیں۔فورٹ ولیم کالج کے تحت ترجمہ شدہ علمی و ادبی کتب نے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع کرنے میں قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ فورٹ ولیم کالج سے ہونے والے یہ تراجم آگے چل کر اردو زبان و ادب کا سرمایہ ثابت ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ ''دلّی کالج

میں قائم کردہ 'دلی سوسائٹی ' کے زیرِ اہتمام نصابی کتب کے تراجم کاآغاز ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اس سوسائٹی کی ۱۱۲۸ کتب کا ذکر کیاہے جو اس سوسائٹی کے تحت ترجمہ ہوئیں۔ ان اداروں کے علاوہ تراجم کے لحاظ سے انفرادی کوشش بھی قابل تعریف ہیں۔ خاص طور پر سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی جس کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی۔ اس سوسائٹی کے زیرِ نگرانی چالیس کتب کے تراجم کئے گئے۔

انجمن ترقئ اردو، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے ترجمہ نویسی کا عمل آگے بڑھتارہا۔ ۱۹۱۷ء میں داارلترجمہ حیدرآباد کن کے قیام سے علمی و ادبی تراجم کا سلسلہ ترقی کرتاگیا۔ ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی نے ادبیات عالیہ کو اردو میں منتقل کرنے میں اہم کردار اداکیا۔ ادبی رسائل و جرائد کے آغاز سے ترجمہ نویسی کے عمل میں ایک نئی جہت آزاد ترجمہ کا آغاز ہوا۔ ان آزاد تراجم کی بدولت زبان و بیان کے نئے اسالیب اور سانچے میسرآئے اور چند ہی سالوں میں

اردو زبان و اد ب کا دامن وسیع سے وسیع ترہوگیا۔ ان تراجم کی بدولت نہ صرف اردو ادب نئی اصناف سخن سے روشناس ہوا بلکہ ادبی تحریکات کے اثرات بھی قبول کئے۔ بقول مرزاحامد بیگ:

''اردو ادب میں تذکرے کی جگہ تنقید، 'داستان اور تمثیل کی جگہ ناول ' رہس ور نوٹنکی کی جگہ ڈرامہ اور کہانی کی جگہ افسانے جیسی جدید اصناف نے لے لی اور ادبیاتِ عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کاخواب ہم نے پہلی باردیکھا۔ یہ محض ہئیت ہی کی سطح پر تبدیلیاں نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی ر وّیے کی تبدیلیاں بھی تھیں اور قدامت پسندی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر نئے زمانے میں سانس لینے کاجتن بھی''۔(۷)

ترجمہ نگاری کیے مختلف طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔ لفظی ترجمہ:

ترجمہ نویسی کا ایسا طریقۂکارجس میں مترجم لفظ کے لئے لفظ،محاورے کے لئے محاورہ اور صفت کے لئے صفت کا استعمال کرتا ہے۔ لفظی ترجمہ عام طور پر مترجم کی ذات کو زیادہ آزادی نہیں دیتا۔ اسے اپنی زبان کے مزاج اور متن کے مود اور اسلوب کے حوالے سے بہت سی باتوں کو نظرانداز کرنا پڑتاہے۔

(ب) بامحاورہ ترجمہ:

بامحاورہ ترجمہ ایسے ترجمے کو کہتے ہیں جس میں بنیادی متن کے مدعاومعنی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے،متن کے معانی و مفہوم کے علاوہ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہواس کی ساخت کا بھی خیال رکھاجاتاہے۔

(ج) آزادترجمہ:

اس قسم کے ترجمے میں مفہوم پر زیادہ زور دیاجاتاہے۔ مترجم متن پر عبور نہ بھی رکھتاہو تو اپنی زبان پر عبورکے سہارے مفہوم کو پیش کرسکتاہے۔ اس عمل کے دوران اسے حذف اور اضافے کا بھی اختیار بھی حاصل ہوتاہے۔ عموماً سائنسی اور علمی نثر میں یہ طریقۂکارمعاون تصورکیاجاتاہے۔

(د) اخذوتخلیص:

بعض مترجم حضرات اصل تصنیف کی ترجمانی کی بجائے اسے اپنے ماحول، ثقافت یاضروریات کے تحت اختصار کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ ایسے میں مختلف ابواب، اقتباسات یاجملے ضرورت کے تحت حذف کردئیے جاتے ہیں۔ لسانی نقطہ نظر سے ایسے تراجم اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ محض اصل

تصنیف کا خلاصہ پیش کردیاجاتاہے۔ عمل ترجمہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایسے تراجم کی اہمیت بہت کم ہوچکی ہے۔

ترجمہ چاہے کسی بھی نوعیت کا ہوعملی ترجمہ کے دوران چند عوامل کاخیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ جس صنف کا ترجمہ کرنامقصود ہو مترجم کو اس کی ہئیت اور موضوع سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔ ادب، ثقافت کے حوالے سے ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کا تاریخی شعور بہت اہمیت کاحامل ہے۔

۲۔ مترجم کو تخلیق کار اور متعلقہ زبان کے ادبی ثقافتی پس منظر کاعلم ہونابھی ضروری ہے کیونکہ فکر وخیال اور جذبہ واحساس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا گویا پھرسے تخلیق کرنے کے برابر ہے۔

۳۔ مترجم کو دونوں زبانوں کی ساخت اور قواعد سے بہت عمدہ واقفیت رکھنی چاہیے۔

۴۔ مترجم کو محنتی اور منظم ہونا چاہئے تاکہ وہ ترجمے جیسے کام مشکل کام کو ہنرمندی سے سرانجام دے سکے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب'ایلیٹ کے مضامین' کے پیش لفظ میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے اپنے نقطہء نظر کی تفصیل سے وضاحت کی ہےڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اچھا ترجمہ محض رواں اور سلیس نہیں ہوتا کیونکہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ رواں اور سلیس نہیں ہو سکتا۔اسی طرح ترجمے کا بالکل اصل تحریرکی مانند ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ ہر زبان اپنے مزاج،جملوں کی طوالت اور معنی کی ادائیگی کے لئے مختلف قسم کے الفاظ کی محتاج ہوتی ہے۔بالخصوص فلسفیانہ اور پیچیدہ افکار کا ترجمہ کرتے ہوئے اسے اصل زبان کے قریب رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ڈاکٹرجمیل جالبی مترجم کے فرائض کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مترجم کافرض ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز اداکاخیال رکھے۔لفظوں کاترجمہ قریب قریب معنی اداکرنے والے الفاظ سے کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے تراجم سے آخرکیافائدہ جو سلاست و روانی تو پیداکردے لیکن مصنف کی روح، اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کردے اور ساتھ ساتھ زبان کے مزاج کو اسی طرح روائتی روش اور اظہار بیان پر قائم رکھے''(۸)

یہ بات اہم ہے کہ ادبی ترجمہ میں مترجم کو مصنف کے اسلوبِ بیاں اور اندازِ فکر کوموثر طریقے سے پیش کرنے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ تعلیمی تکنیکی، سائنسی اور علمی تراجم میں مصنف اور مترجم کی شخصیات مطلوبہ اہلیت تک محدود ہوتی ہیں۔ اس قسم کے تراجم کمپیوٹر سے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے تخلیقی تراجم میں مترجم کی شخصیت بہت اہم کردار اداکرتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کئی حیثیتوں میں اپنی قابلیت کالوہامنوایاہے۔ جہاں انہوں نے تنقیداور تحقیق کے میدان میں بیش بہاکارنامے سرانجام دیتے ہیں وہیں ترجمے کے میدان میں بھی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی ترجمہ نویسی اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے نہ صرف مغربی تنقیدکے نمائندہ نقادوں کے تراجم کئے بلکہ بچوں کے لئے ناول کا ترجمہ بھی کیااور کلچر کے حوالے سے کتب کے تراجم بھی کئے۔ ان کئے گئے تراجم کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایلیٹ کے مضامین
۲۔ ارسطو سے ایلیٹ تک
۳۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت
۴۔ برصغیرمیں اسلامی کلچر

۱۔ ایلیٹ کے مضامین:۔

''ایلیٹ کے مضامین'' پہلی دفعہ ۱۹۵۹ء میں اردو اکیڈمی سندھ سے شائع ہوئی۔ ''ایلیٹ کے مضامین'' کا نظرِثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن، رائٹرز بک کلب، سے ۱۹۷۱ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ یہ کتاب ہندوستان سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے بھی شائع ہوچکی ہے۔ ''ایلیٹ کے مضامین'' کے دوسرے ایڈیشن میں پانچ نئے مضامین بھی شامل ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں کل نومضامین شامل تھے جبکہ نظرثانی شدہ ایڈیشن میں مضامین کی تعداد ۱۴ ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹرجالبی نے اس دوسرے ایڈیشن میں ایلیٹ کے حوالے سے اپنے چند نئے تنقیدی مضامین مثلاً ایلیٹ بحیثیت نقاد، بحیثیت شاعر، بحیثیت ڈرامہ نگار اور ایلیٹ کاادبی مقام شامل کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایلیٹ کے مطالعے کے ضمن میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔

''ایلیٹ کے مضامین'' کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمہ نگاری کے فن کے حوالے سے مختلف امور پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے مضامین کے ترجموں کا محرک ایلیٹ کی تحریروں کے حوالے سے اپنی پسندیدگی کوقرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کے جن مضامین کوترجمہ کے لئے منتخب کیاہے وہ ان کے مطابق نہ صرف عہد آفریں ہیں بلکہ ان مضامین میں ادب و تہذیب کے مسائل کو عالمگیر ذہنی تناظر میں رکھ کردیکھاگیاہے۔ ڈاکٹرجالبی ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی اور ایلیٹ کے اثرات قبول کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’ان ترجموں سے میں نے اپنے ذہن کی تعمیر کا کام لیاہے۔ یہ ترجمے دراصل میرے لئے ریاض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے میں نے ایلیٹ فکراور اس کے طرز اداکراپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کی ہے۔(۹)

اچھا ترجمہ کیاہے ؟ اچھا ترجمہ کن خصوصیات کا حامل ہوتاہے، مترجم کے فرائض کیاہیں ؟ اور ایک زبان سے کسی فن پارے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے زبان کو کیافائدہ ہوتاہے ؟ ڈاکٹرجالبی کے مطابق ترجمہ کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ زبان نہ صرف نئے مزاج سے آگاہ ہوکر پھیلتی اور بڑھتی ہے بلکہ نئے لہجوں، جملوں کی نئی ساخت سے آگاہ ہوکر زبان کی قوت اظہار کو ترقی ملتی ہے بلکہ دیگر زبانوں کے نئے خیالات بھی زبان کا حصہ۔ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے مترجم کا فرض بنتاہے کہ مصنف کے طرز اداواور لہجے کا خیال رکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر نئے مرکبا ت نئے الفاظ اور نئی بندشیں وضع کرے۔ ڈاکٹرجالبی ایسے ترجمے کو افضل قرار دیتے ہیں جس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے اور اپنی زبان کا مزاج بھی برقرار رہے اور ترجمہ اصل متن کے عین مطابق ہو۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے خود ان کے مطابق کوشش کی ہے کہ اپنی زبان کو اظہار کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیاجائے۔

ڈاکٹرجالبی نے پیش لفظ کے دوسرے حصے میں تنقید کی ضرورت و اہمیت اور نقاد کے فرائض کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ کتاب ایلیٹ کے تنقیدی نظریات کی تفہیم کے لئے ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی ابتداء میں جو چار نئے مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے عملی پہلو کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی تنقید اور تخلیق کو تہذیب کے ارتقاء میں بہت اہم قرار دیتے ہیں کیونکہ کسی دور کا علامتی اظہار اگرتخلیق میں ہوتاہے تو اس دور کا مکمل اظہار اچھی تنقید کے ذریعے ہوتاہے۔ ڈاکٹرجالبی عام قاری اور نقاد قاری میں فرق روارکھتے ہیں کیونکہ نقاد قاری محض تخلیق سے لطف اندوزہی نہیں ہوتابلکہ وہ یہ بھی جانتاہے کہ وہ اس تخلیق سے کیوں لطف اندوز ہواہے۔ وہ تہذیب اور ادب کے حوالے سے نئے نئے سوالات اٹھاتاہے۔ نقاد ہمارے مذاقِ سخن کو سنوار تاہے۔ حال کو ماضی سے جوڑتاہے اور ماضی کو نئے زاویوں سے اپنے قارئین کے سامنے لاتاہے۔ ڈاکٹرجالبی اچھی تنقید کے لئے نہ صرف اپنی زبان کے ادب کی تفہیم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت ضروری سمجھتے ہیں بالخصوص ان زبانوں سے جنہوں نے ہماری زبان واد ب کو متاثر کیاہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کے جن مضامین کا ترجمہ کیاہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شاعری کا سماجی منصب ۲۔ شاعری کی تین آوازیں
۳۔ شاعری کی موسیقی ۴۔ شاعری اور ڈرامہ
۵۔ شاعری اور پروپیگنڈہ ۶۔ بود لیئر
۷۔ روایت اور انفرادی صلاحیت ۸۔ کلاسیک کیاہے۔
۹۔ مذہب اور ادب ۱۰۔ ادب اور عصرِجدید
۱۱۔ صحافت اور ادب ۱۲۔ تنقید کامنصب
۱۳۔ تجربہ اور تنقید ۱۴۔ تنقید کے حدود

کتابیات کے آخرمیں ٹی۔ ایس۔ایلیٹ کی کتابوں کی تفصیل فراہم کی گئی۔ کتابیات کے دوسرے حصے میں ان کتب کی تفصیل فراہم کی گئی ہے جوایلیٹ کی شاعری یا تنقید پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جبکہ تیسرے حصے میں ان مضامین کے انگریزی نام اور سنِ تصنیف درج ہے جن کے تراجم اس کتاب کا حصہ ہیں۔ڈاکٹرمحمد احسن فاروقی جمیل جالبی کی اس کاوش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔۔ایلیٹ تنقید کی ایک سطح ہے جس تک ہمارے نقادوں میں وہی پہنچ سکے ہیں اور ان کا ترجمہ اتنا قدرتی، رواں اور انفرادی ہے کہ اسے 'اصل' تصنیف کہناچاہئیے۔ پڑھنے والوں کو جدید ترین تنقید کی سطح پر لانے میں پوری مدد کرتاہے اور اس سطح پرجو مسائل سامنے آتے ہیں ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتاہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہرادبی اور تنقیدی مسئلے پر نہ صرف ضروری معلومات سامنے آتی ہیں بلکہ ان پر ایک زاویۂ نظر بھی ملتاہے جوپڑھنے والے کی نظر کو متاثر ضرور کرتاہے۔ اسی طرح تنقیدی شعور پیداکرنے میں یہ تصنیف ایک خاص درس بہم پہنچاتی ہے۔'' (۱۰)

ارسطو سے ایلیٹ تک:

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی سے پہلی بار ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن میں ''ایزراپاؤنڈ'' کے مضمون ''سنجیدہ فنکار'' کااضافہ کیاگیا۔ اس ایڈیشن کو نئے سرے سے خطِ نستعلیق میں کمپوزکیاگیا ہے۔ کتاب کا آٹھواں ایڈیشن نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد سے شائع ہوا۔ 'دیباچہ 'پروفیسر انعام الحق جاوید کا تحریر کردہ ہےپیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحریر کردہ ہے۔اس کتاب کو ترتیب دینے کے پس منظر میں بھی مغربی ادب اور تنقید سے انکی گہری دلچسپی نے محرک کا کردار ادا کیابقول پروفیسر نظیرصدیقی:

''ڈاکٹرجمیل کی کتاب '، ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' اپنے تراجم اور مغربی نقادوں کے تنقیدی تعارف کی بناپر اردو کی تنقیدی کوششوں میں قدرِ اوّل کی چیز ہے۔ تنقید کا طالب علم اردو میں جتنا کچھ اس کتاب سے سیکھ سکتاہے اتنا کسی اور کتاب سے نہیں سیکھ سکتا۔ یہ کتاب نہ صرف مغرب کے تنقیدی نظریات سے بھرپور واقفیت بہم پہنچاتی ہے بلکہ مغربی تنقید کے بنیادی مسائل سے بھی آشناکرتی ہے''(۱۱)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے 'ارسطو سے ایلیٹ'' میں نہ صرف مغربی تنقید کے اہم شاہکاروں کے تراجم کئے ہیں بلکہ کتا ب کے مقدمے مغربی تنقید کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ہرُ اس نقاد کا جامع تعارف بھی پیش کیا گیاہے جس کے کسی شاہکار کا ترجمہ شاملِ کتاب ہے۔ مغربی تنقید کے ارتقاء اور تنقیدی رحجانات کے حوالے سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹرجالبی نے مقدمے میں اہم مغربی ناقدین کی فکر پرروشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح کے بارے میں معلومات فراہم کیں ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ تدوین کے زمرے میں آتی ہے لیکن اس کی اہمیت ترجمہ نگاری کے باعث ہے۔ اردو ادب کے قارئین کو انگریزی ادب اور تنقیدی آراء سے متعارف کروانے کے لئے اس کتاب کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی،ڈاکٹرجالبی کی اس کاوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بظاہر مغربی تنقید کے منتخب مضامین کے تراجم ہیں مگردراصل آئینے ہیں جن میں جب ہم اپنے تنقیدی معیاروں کو دیکھتے ہیں تو ہم پر انکشاف ہوتاہے کہ ابھی تو ہم ارسطو کی ''بوطیقا'' ہی سے انصاف نہیں کرسکے چہ جائیکہ کروچے، رچرڈس کاڈویل اور ایلیٹ کی تنقیدی سطح کو چھوسکیں---- چنانچہ ہمارے اہل ادب کا فرض ہے کہ وہ 'ارسطو سے ایلیٹ تک' کے مطالعہ سے خیرگی کی بجائے روشنی حاصل کریں اور ادب پاروں کی تحسین اور پرکھ کے نتھرے ستھرے معیار قائم کرنے میں لگ جائیں''۔(۱۲)

کتاب کے آخر میں ڈاکٹرجالبی نے ان ۱۸ کتب کی فہرست فراہم کی ہے جن میں سے منتخب مضامین کے تراجم کئے گئے ہیں جبکہ دیگر ۲۸ امدادی کتب کی فہرست بھی فراہم کردی ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی شامل ہے جس میں موضوعات کے علاوہ کتاب میں آنے والی شخصیات، مقامات اور اداروں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے درج کئے گئے ہیں۔اشایہ ابن حسن قیصر نے ترتیب دیاہے۔

۴۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت:۔

’’برصغیر میں اسلامی جدیدیت‘‘ تراجم کے حوالے سے ڈاکٹرجالبی کی ایک اہم کاوش ہے۔ ڈاکٹر عزیز احمد کی کتاب(Islamic Modernism in India and Pakistan)) ۱۸۵۷-۱۹۶۴ء) پہلی بار ۱۹۶۷ء میں چھپ کر منظرعام پرآئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عزیز احمد نے نوآبادیاتی ہندوستان میں اسلامی جدیدیت کے تناظر میں ۱۸۵۷ء سے لے کر قیام پاکستان اور اس کے بعد دورہائیوں کو اپناموضوع بنایاہے۔

’ڈاکٹرعزیزاحمد‘ ڈاکٹرجالبی کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرچکے تھے کہ ان کی اس کتاب کا ترجمہ ہوناچاہیے۔ پروفیسر عزیز احمد کے انتقال کے بعد تاریخ ادب کی جلددوم لکھنے کے بعد ڈاکٹرجالبی نے پروفیسر عزیز احمد کی دونوں کتب (برصغیر میں اسلامی کلچر، برصغیرمیں اسلامی جدیدیت) کے تراجم کے مسودے تیار کئے اور تاریخ ادب کی جلد سوم و چہار م پر کام کرنے سے پہلے ان تراجم کے کام کو مکمل کرنے کا عزم کیا۔ ان تراجم کی اشاعت کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ہمیں ذہنی، فکری سطح پراپنے زندہ مسائل کے حوالے سے ایسی کتابوں اور ایسے ہی مطالعوں کی ضرورت تاکہ ہم زندگی اور معاشرے کو آگے بڑھانے والی سوچ کی طرف مائل ہوسکیں اور فکر نو کا سورج، بادلوں کی اوٹ سے طلوع ہوسکے۔ آپ اس کتاب سے اتفاق کریں یااختلاف، یہ آپ سوچنے اور اپنی موجود ہ صورت حال کاجائزہ لینے کی طرف مائل ضرور کرتی ہے‘‘۔(۱۳)

ڈاکٹرجمیل جالبی نے پروفیسر عزیز احمد کی کتاب Islamic Modernism in India and Pakistanکاترجمہ’ برصغیر میں اسلامی جدیدیت ‘کے عنوان سے کیا۔ اسے سب سے پہلے ادارۂثقافت اسلامیہ نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیاجبکہ انڈیا سے یہ کتاب ’’ہندوپاک میں اسلامی جدیدیت‘‘، کے عنوان سے دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے ۱۹۹۰ء میں چھپی۔ کتاب کا انتساب پروفیسر عزیز احمد نے پروفیسر گستاف اے فان کے نام کیاتھا جبکہ ڈاکٹرجالبی نے اس کتاب کے ترجمہ کو جمیلہ ہاشمی کی بیٹی عاشی کے نام کیاہے۔ یہ کتاب سولہ ابواب پرمشتمل ہے۔ تمہید پروفیسر عزیز احمد کی تحریر کردہ ہے جس میں انہوں نے مختصراً کتاب کا تعارف پیش کیاہے اور کتا ب تحریر کرنے کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کے مطابق اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد مغربی طالب علموں کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک اسلامی ہند اور پا کستان کی مذہبی اور سیاسی فکر کے امتیازی واقعات سے روشناس کرواناہے۔ کتاب میں جدیدیت پسندی اور راسخ الاعتقادی کے مابین طویل کشمکش کو اس اندازمیں پیش کیاگیاہے کہ دونوں مکتبۂ فکر کے نظریات، اعتراضات اور باہمی کشمکش کا ارتقائی سفرقارئین کے

سامنے مربوط انداز میں سامنے آئے۔ ’برصغیرمیں اسلامی جدیدیت ‘کا محاکمہ کرتے ہوئے پروفیسر عقیل لکھتے ہیں:

’’عزیزاحمد نے اس تصنیف میں ۱۸۵۷ء کے بعد تمام اہم مسلمان مفکرین کے مذہبی اور سیاسی افکار کا نچوڑ پیش کردیاہے اور اس موضوع سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس عہد کے برعظیم کی اسلامی فکر کا تجزیہ اہمیت کا حامل ہے۔افکار و خیالات کا مطالعہ برراہ راست اور اصل بنیادی مآخذ کے ذریعے کیاہے اور موضوع بحث سے متعلق تمام ہی متعلقہ اور امدادی مآخذپیش نظررکھے ہیں۔ افسوس کسی اور پاکستانی مصنف نے اس موضوع کا خصوصی مستقل مطالعہ نہیں کیا‘‘۔(۱۴)

عزیز احمد کی یہ کتا ب سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انگریزوں اور مسلمانوں کے ابتدائی روابط، مغربی تمدن کے اثرات، برطانوی نظام عدالت کے اثرات، مذہبی فرقوں کا رد عمل اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کوموضوع بنایاگیاہے۔ دوسرے باب میں سرسید احمد خان اور ان کی تحریک، تحریک علی گڑھ، کامختلف پہلوؤں سے جائزہ لیاگیاہے۔ خصوصاً سرسید احمد خان کی تعلیم کے حوالے سے خدمات، تاریخ نویسی اور مذہبی فکر پرروشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب کا عنوان’’نظری جدیدیت کا انضمام‘‘ ہے۔ اس باب میں مولوی چراغ کی فکر کاتجزیہ ’’انتہا پسندی‘‘کے عنوان کے تحت کیاگیاہے۔ محسن الملک کی فکر اور کارناموں کا تجزیہ ’’خلاف روایت جدیدیت‘‘ کے عنوان کے تحت کیاگیاہے۔ باب کے آخر میں ممتاز علی اور نسائی تحریک کا جائزہ لیاگیاہے۔ ’’اسلامی تاریخ کے زاوئیے‘‘ کے عنوان سے شبلی نعمانی، امیرعلی اور حالی کی تاریخ نگاری کا تجزیہ کیاگیاہے۔ ’’روائیتی احیاء مذہب‘‘ کے عنوان سے اگلے باب میں نوروایت پسندی کی ذیل میں اہلِ حدیث مکتبۂ فکر کے مذہبی رحجانات اور نظریات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ چھٹے باب میں ’’خلافت اور بین اسلامیت‘‘ کے عنوان سے ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ تک اور ۱۹۱۰ء سے۱۹۲۴ء تک اسلامی دنیا کے سیاسی حالات کا تجزیہ پیش کیاگیاہے۔ ساتویں باب میں’’اقبال:مفکر انہ نوجدیدیت‘‘ کے عنوان کے تحت اقبال کے مذہبی تفکر، کاتفصیلی تجزیہ کیاگیاہے۔

آٹھویں باب میں ’’تخلیقِ پاکستان‘‘ کے عنوان کے تحت اقبال کا نظریۂپاکستان، محمد علی جناح اور دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان کے مختلف رحجانات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ نویں باب میں مولاناابولکلام آزاد کی تفسیرِقرآن اور مولاناابوالکلام کے نظریات کا تجزیہ کیاگیاہے۔

اگلے دوابواب میں مخطوط قومیت اور اسلامی سوشلز م کے تین نظریوں کے تحت اقبال، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولاناسہواردی کے نظریات کا تقابل اور تجزیہ پیش کیاگیاہے۔بارہویں باب میں پرویز احمد کے مذہبی نظریات کا تجزیہ ان کی تفسیر کی روشنی میں کرتے ہوئے دیگر آزاد رحجانات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ چودھویں باب میں پاکستان میں جدیدیت اور راسخ الاعتقادی کے درمیان پائی جانیوالی کشمکش کو موضوع بنایا گیاہے جبکہ پندرھویں باب میں ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک اسلامی رحجانات کاتجزیہ کیاگیاہے۔ سولہویں باب میں ان تمام مباحث کے حوالے سے نتیجہ اخذ کیاگیاہے۔ حواشی ہرباب کے اختتام پر موجودہیں جبکہ آخر میں کتابیات اور اشاریہ موجود ہے۔

’’برصغیر میں اسلامی جدیدیت‘‘ ایک تحقیقی و علمی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ہرصفحہ پرموضوع کے ماہرین کی آراء کے موجود ہیں۔ہرباب میں متعدد سکالرز، مؤرخین، ادیبوں، دانشوروں اور محققین کی آراء موجود ہیں۔ اس حوالے سے اس کتاب کا ترجمہ کرنا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ ایک طرف پروفیسر عزیز احمد کے اسلوب سے آگہی دوسری طرف ان درجنوں دانشوروں، مؤرخین، محققین اور ادیبوں کے اسلوب سے ہم آہنگی پیداکرتے ہوئے ان کے اقتباسات کا ترجمہ کرنا انتہائی محنت کا متقاضی تھا۔ ڈاکٹرجالبی نے ان تمام دشواریوں پر اس ہنرمندی سے قابوپایاہے کہ ان کی ترجمہ کردہ کتاب اپنے اندر ایک تخلیقی شان بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹرجالبی خود بھی ایک محقق، دانشور اور مؤرخ کے طور پر اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لہذ ا عزیز احمد کے تہہ دارمدلل اور علمی اسلوب کا ترجمہ کرتے ہوئے ان کی یہ صلاحیتیں بھرپور طریقے سے بروئے کارآئی ہیں۔ علمی و تحقیقی کتب کے ترجموں میں ڈاکٹرجالبی کی اس کتاب کوامتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ایک طرف یہ کتاب اردو ترجمہ نویسی کی روایت کو علمی سطح پر بلند کرنے میں ایک کڑی کا درجہ رکھتی ہے اور دوسری طرف پروفیسر عزیزکے تصورات تاریخ کو اردو دان طبقے تک پہنچانے کے لئے نہایت اہم کاوش کادرجہ رکھتی ہے۔

(۵) برصغیرمیں اسلامی کلچر:

پروفیسر عزیز احمد کی یہ کتاب Studies in Islamic Culture in the Indian Enviornment کے نام سے آکسفورڈ سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹرجمیل جالبی نے ۱۹۸۹ء میں اس کا ترجمہ ’’برصغیر میں اسلامی کلچر‘‘ کے عنوان کے تحت کیا۔ یہ ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ بنیادی ور پر یہ کتاب ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سلطنتِ دہلی، منگولوں کی یلغار، مسلم ہندوستان اور دارالاسلام، مغل ہندوستان اور دارالاسلام کاتجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے جبکہ چوتھے باب میں ’بین الاسلامیت اورجدیدیت ‘کے عنوان کے تحت سرسید احمد خان، جمال الدین افغانی، خلافتِ عثمانیہ، مولاناابوالکلام کا نظریۂخلافت اور اقبال کے تصورات کاتجزیاتی مطالعہ پیش کیاگیاہے۔ حصہ دوم بارہ

ابواب پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے کا عنوان’ مسلم ہندوستان اور ہندوستان کا باہمی تعلق‘ ہے۔ اس ذیل میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی تصادم، مسلما نوں کی ہندوستان میں آمد سے پیداہونے والے ردّ عمل اور اس کے اثرات،ہندوؤں کی مزاحمت اور تنگ نظری کوموضوع بنایا گیاہے۔ دوسرے باب میں مسلم نظم و نسق میں ہندوعناصر کی شمولیت، شاہ ولی اللہ کے مذہبی اور سیاسی نظریات اور ان کی تحریک مجاہدین کے اثرات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ تیسرے باب میں ہندوثقافت کے متعلق مسلمانوں کی ابتدائی تحقیقات کی ذیل میں ہندوعلوم کے متعلق عربی تحقیقات، البیرونی اور امیر خسرو کی خدمات کا تجزیہ کیاگیاہے۔ چوتھے باب میں ہندوؤں کے تصورِویدانت کو موضوع بنایاگیاہے۔ پانچویں باب میں اتحادِ مذاہب کی تحریکوں اور ان کے ردّعمل کاتجزیہ کرتے ہوئے بھگتی تحریک،سکھ مت اور اتحاد مذاہب کے دیگر داعیوں کا جائزہ لیاگیاہے۔ چھٹاباب اکبرکے مذہبی نظریات کے لئے مختص ہے۔ ساتویں باب میں نقشبندی رد عمل کوموضوع بنایاگیاہے۔ آٹھویں باب میں دارشکوہ اور اورنگزیب کے مذہبی نظریات کاجائزہ لیاگیاہے۔ نویں باب میں شاہ ولی اللہ کی تحریک کاجائزہ لیاگیا ہے۔ دسویں باب میں’ ثقافتی تعینات‘کے تحت سنسکرت ادب، فارسی ادب اور فارسی ادب میں ہندوؤں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گیارہویں باب میں ’’ثقافتی تعینات‘‘ کی ذیل میں اردو اور ہندی ادب ان کے اشتراکات اور ان دونوں کے درمیان لسانی تنازعہ کو موضوع بنایاگیاہے۔ جبکہ آخری باب میں علیحدگی پسندگی کے رحجان کا جائزہ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کے حوالے سے لیاگیاہے۔ کتاب کاآخرمیں تفصیلی کتابیات اور اشاریہ موجود ہے۔۔’ برصغیر میں اسلامی کلچر‘ کے بارے میں پروفیسر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> ’’عزیز احمد کے خیال میں ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا ارتقائی عمل دراصل عالمی اسلامی تہذیب کی ایک علاقائی تشکیل کی صورت میں تھا اور یہ اپنی بقاکے لئے ماحول کے لحاظ سے تبدیلیوں اور بیرونی اثرات کو قبول کرتارہا۔ وقت گزرے کے ساتھ ساتھ زمانہ کی ضرورتوں کے تحت اس نے ہندوستان کے غیرمسلم ماحول میں مداخلت اور مصالحت کی ضرورتوں کے تحت اس نے ہندوستان میں دونوں کو اہمیت دی۔ ابتدائی مرحلہ پر اس نے اپنے بنیادی روابط کو دنیائے اسلام سے منقطع ہونے نہیں دیا بلکہ منگولوں کے حملوں کی خدشات نے اسے بیرون ہند کی اس وقت کی مستحکم اسلامی سلطنتوں ترکی اور ایران سے بہت زیادہ قریب کردیا۔ بالآخر برطانوی عہد میں دارالسلام کے مرکزی نظریہ سے اس کی وابستگی نے اسے برعظیم میں ایک

علیحدہ سیاسی راستہ پرگامز ن کردیا۔ عزیزاحمد اپنی اس تصنیف میں
برعظیم کے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کے اظہار تک
پہنچے۔''(۱۵)

پروفیسر عزیز احمد کی کتاب ' ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' کی طرح یہ کتاب میں علمی و تحقیقی نوعیت کی حامل ہے۔ اس میں ۷۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں جاری و ساری ثقافتی تنوع، سیاسی و مذہبی نظریات، ادبی افکار اور باہمی (ہندو، مسلم) مناقشات کو نہایت عمدگی سے تحقیقی و تجزیاتی اندازمیں پیش کیاہے۔ اس کتاب میں بھی پروفیسر عزیزا حمد نے متعدد دانشوروں،محققین، ادیبوں اور مؤرخین کی آراء پیش کی ہیں جسکی وجہ سے یہ کتا ب ایک طرف پروفیسر عزیزاحمد کی فکر اور اسلوب کی نمائندہ ہے تو دوسری طرح ان محققین، ادباء اور دانشوروں کے نظریات کو بھی پیش کرتی ہے لہٰذا اس کتاب کا ترجمہ بھی ایک نہایت محنت طلب کام تھا۔ ڈاکٹرجالبی نے بطور مترجم نہایت جانفشانی سے یہ فریضہ انجام دیاہے۔ کتاب کے علمی و تحقیقی معیار کو کہیں بھی پست نہیں ہونے دیا۔ اردو دان طبقے کے لئے ہندوستان میں ثقافت کے تنوع کو سمجھنے کے لئے یہ نہایت اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے جس کا تمام ترکریڈٹ جمیل جالبی کی بطورمترجم کروار کودیاجاسکتاہے۔ انہوں نے اس کتاب کو بھی اس روانی اور تخلیقی انداز میں ترجمہ کیاہے کہ کتاب ترجمہ سے زیادہ طبع زاد کتا ب معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹرجمیل جالبی کی ترجمہ نگاری کے خصائص:

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ عمل ترجمہ کے دوران مترجم کو اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اگر ترجمہ تخلیقی رعنائی سے مزین ہوجائے تو ترجمہ نگاری بھی تخلیقی عمل بن جاتاہے اور مترجم کی ذات اصل تخلیق کا ر کے ساتھ مل کر فن پارے کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔ ڈاکٹرجمیل جالبی بھی ایسے مترجم کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے تراجم تخلیق نو بن کر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اصل تخلیق کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے رنگ و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی عکاسی کرتے ہوئے ترجمہ نویسی کو تخلیقی نوعیت عطاکرتے ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی ان محققین اور ناقدین میں شمار کئے جاتے ہیں جونہ صرف مشرقی تہذیب اور زبان کے مزاج سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں بلکہ مغربی تہذیب اور زبان کے مزاج سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ انہوں نے مغربی ناقدین کے مضامین کاترجمہ کرتے ہوئے ان کے تہذیبی اور ادبی حسن کو اردو زبان کاحصہ بنادیاہے۔ ترجمہ نگاری کو دوتہذیبوں کے درمیان مکالمے کا ذریعہ قراردیاجاتاہے۔ ایک تہذیب کے فکری و معنوی محاسن جب دوسری تہذیب کے فکری و معنوی محاسن سے ملتے ہیں تو استفادے کا عمل دوطرفہ ہوجاتاہے۔ ایک تہذیب کے اسلوبیاتی آہنگ کو دوسری تہذیب کے اسلوبیاتی آہنگ سے ہم کنار کرنا آسان کا م نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ترجمہ کردہ مضامین اور کتب کا جائزہ لیاجائے

تو اندازہ ہوتاہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس فریضے کو بخوبی نبھا یاہے۔ ڈاکٹرجمیل جالبی کو یہ اعزازحاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف ادبی اصناف سخن کے تراجم کئے بلکہ غیرادبی اصناف کے تراجم کرکے اپنی قابلیت کا لوہامنوایاہے۔ پروفیسر سجاد شیخ ترجمہ نویسی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ’’ترجمے سے اعلیٰ قسم وہ ہے جسے تخلیقی ترجمہ کہاجاسکتاہے۔ یہ دراصل ایک زبان میں کہی گئی بات کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کا نام ہے کہ ترجمہ ’’تخلیق نو‘‘ کی صورت اختیار کرلے۔ اردو میں اس روایت کو فروغ دینے والے مترجمین میں محمد حسن عسکری ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں مترجم تھے۔ موبی ڈک،مادام بواری اور گڈبائی ٹو برسن میں عسکری نے نہایت عمدگی سے مغربی ادب کے ان شاہکاروں کی اردو میں ’’تخلیق نو‘‘ کا قابل ستائش اور لائق تقلید کارنامہ سرانجام دیاہے۔ جالبی صاحب نے اپنے ترجموں کے ذریعے عسکری کی اس روایت میں اضافہ کیاہے‘‘۔(۱۶)

ڈاکٹرجمیل جالبی بھی ترجمے کی اس قسم کو سب سے برتر تصور کرتے ہیں کیونکہ اس طریقۂ کار سے بیان کے نئے طریقے وضع ہوسکتے ہیں اور زبان کے اظہار کے سانچے وسیع ترہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹرجمیل جالبی کے تراجم کو باآسانی تخلیقی تراجم قراردیاجاسکتاہے۔ وہ اپنے تخلیقی تراجم سے اصل تخلیق کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیتے ہیں کہ اس تصنیف کی فکری خوبصورتی بھی برقرار رہتی ہے اور ترجمہ ایک تخلیق نو کی صورت لے کر سامنے آتاہے۔
مغربی تنقید کے نظریات کو اردو میں متعارف کروانے کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل مغربی تہذیب اور زبان کے مزاج شناس ہیں۔ مشرقی تہذیب اور اردو زبان پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی اس صلاحیت کی بنا پر مغربی تنقید کے تراجم اس خوبصورت سے پیش کیاہے کہ مشکل سے مشکل فکری مباحث کو انہوں نے عام فہم بنا دیاہے۔ ترجمہ نگاری کے اصول، طریقہ کار اور اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نقطہ نظر بیان ہوچکاہے۔ ڈاکٹرجالبی ترجمہ کرتے ہوئے اصل زبان اور جس زبان میں ترجمہ مقصود ہو دونوں کے مزاج کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح ترجمہ نہ صرف تخلیقی عمل بن جاتاہے بلکہ دو زبانوں کے درمیان ہم آہنگی پیداکرنے کا سبب بھی بنتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمہ نگاری میں مصنف کے لہجے کی کھنک کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئی بندش وضع کرنے کو بھی ترجمہ

نگاری کے دوران اہم عمل تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے تراجم کی درج ذیل مثالیں ان کے ترجمہ نگاری کے نظریات کی عملی صورتیں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کے مضامین، میں’ ایلیٹ کے مضامین‘ کے تراجم پیش کئے ہیں۔تراجم کرتے ہوئے انہیں ایک ہی مصنف کے اسلوب اور نقطہ کو قارئین تک پہنچانا تھا جبکہ ارسطو سے ایلیٹ تک ‘ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۸ ناقدین کے تصورِ نقد کا ترجمہ پیش کیاہے۔ ان ناقدین میں ارسطو، ہوریسس، لونجائنس، دانتے، سرفلپ سڈنی، بولو، لیسنگ، گوئٹے،کو لرج، سانت بیو، میتھیوآرنلڈ، لیوٹالسٹائی، ہنری جیمس، کروچے، آئی۔ اے رچرڈ س، کرسٹو فرکارڈوویل، ایزرا پاؤنڈ اور ٹی۔ ایس۔ایلیٹ شامل ہیں۔ ان تمام ناقدین کے اسلوب سے واقف ہونے کے ساتھ ان کے تنقیدی نظریات کا تنوع بھی ایک ایسا عنصرہے جوکہ ترجمہ نگاری کی راہ میں مشکلات کا باعث بن سکتاہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم کے جائزے سے پتہ چلتاہے کہ انہوں نے ان تمام ناقدین کے طرز ادا کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمہ نگاری کا عمل مکمل کیاہے بلکہ ان کے تنقیدی تصورات کو بھی درست انداز میں قارئین تک پہنچایاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم کی چند جھلکیاں درج ذیل ہیں:

’’ایلیٹ کے مضامین‘‘ میں شامل ایلیٹ کے مضمون،’’روایت اور انفرادیت‘‘ میں ایلیٹ کے تصورِروایت کاترجمہ اس آسان فہم زبان میں کیاگیاہے کہ ادب کے خاص قارئین کے ساتھ عام قارئین بھی ایلیٹ کے تصور روایت کو نہایت خوش اسلوبی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایلیٹ کے الفاظ میں:

> ‘‘ Tradition is a matter of much wider significance. It can't be inherited and if you want it you must obtain it by great labour. It involves,in the first place, the historical sense, which we may call nearly indispensible to any one who would continue to be a poet beyond his twenty-fifth years; and the historical sense involves a perfection, not only of the pastness of the past, but of its presence; the historical sense compels a man to write not merely with his own generation in his bones, but with a feeling that the whole of the literature of Europe from homor and within it the whole of the literature of his own country has a simultaneous existence and composes a simultaneous order. This historical sense, which is sense of the timeless as well as of the temporal and of the timeless and of the temporal together; is what makes a writer traditional, And it is at the same time what makes a writer most acutely consious of his place in time, of his contemporariety."(۱۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس اقتباس کا ترجمہ نہایت جامعیت اور برجستگی کے ساتھ کیاہے۔ جالبی کے الفاظ میں:

ترجمہ:

''روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کاحامل ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل بھی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اول تو اس کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت بھی پڑتی ہے جو ہر اس شاعر کے لئے لازمی ہے جو پچیس سال کی عمر کے بعد بھی شعر کہتارہے۔ تاریخی شعور کے لئے ادراک کی ضرورت بھی پڑتی ہے نہ صرف ماضی کی 'ماضیت' کی بلکہ اس کی موجودگی بھی تاریخی شعور ادیب کو مجبورکرتاہے کہ لکھتے وقت جہاں اسے اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یورپ کا ساراادب ہومرسے لے کے اب تک، اور اس کے اپنے ملک کا ساراادب زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔ یہ تاریخی شعور جس میں لازماں اور زماں کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے وہ چیز ہے جوادیب کو روایت کا پابند کرتاہے اور وہیں وہ شعور جو کسی ادیب کو ''زماں'' میں اسی کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتاہے''۔(۱۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کے طویل اور پیچیدہ انگریزی جملوں کو نہایت، روانی، سلاست اور برجستگی کے ساتھ اردو نثر میں منتقل کیاہے۔ ایلیٹ کے ''تصویر روایت'' کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی پیدانہیں ہوتی۔ ادب کے قارئین اور عام قارئین بھی اقتباس میں پیش کردہ مفہوم کو باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ایلیٹ کا پیش کردہ اقتباس ڈاکٹرجالبی کے ترجمہ کردہ اقتباس سے طویل بھی ہے اور اس میں جملوں کی طوالت اور تہہ داری بھی موجود ہے جبکہ ڈاکٹرجالبی نے اسے ترجمہ کرتے ہوئے اختصار، جامعیت، تسلسل اور روانی کو برقراررکھا ہے۔ بعض اوقات مترجم، ترجمہ کرتے ہوئے اصل تصنیف کا مفہوم قاری تک پہنچانے کے لئے صراحت اور تشریح کا بھی سہارا لیتاہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی ایک عمدہ زبان دان کے طور صراحت اور تشریح کا سہارا لینے کی بجائے الفاظ سازی اور متبادل اصطلاحات کا خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اس پیراگراف میں ایلیٹ کے استعمال کردہ لفظPastness کاترجمہ ''ماضیت'' اور Contemporariety کا ترجمہ ''معاصرت'' جیسے بامعنی الفاظ سے کیاہے۔

ڈاکٹرجالبی کی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ'' میں بھی ان کی ترجمہ نگاری کی خوبیوں کو باآسانی تلاش کیاجاسکتاہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ''ارسطو سے ایلیٹ''میں شامل سرفلپ سڈنی کے مضمون ''The Defense of Poesy'' کا اقتباس اور ڈاکٹرجمیل جالبی کا ترجمہ:

> The purifying of wit, this enriching of memory, enabling of judgement and enlarging of conceit, which commonly we call learing, under what name soever it come forth orto immediate end so ever it be directed , the final end is to lead and draw us to as high a perfection as our degenerate souls made worse by their clay lodging, can be capable of ".(۱۹)

ترجمہ:

''ذہن کی صفائی، حافظے کی بھرپوریت، قوت فیصلہ اور تصورات کی وسعت، وہ چیزیں ہیں جو علم سے منسوب کی جاتی ہیں۔ علم کا وقتی مقصد کچھ بھی ہو لیکن اس کاقطعی مقصد یہ ہوتاہے کہ وہ جس میں کمال کی طرف لے جائے اور اس حد تک لے جائے جس حد تک ہماری خستہ حال روح جاسکتی ہے''۔(۲۰)

The study of poetryکا اقتباس اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

> " The historic estimate is likely in especial to affect our judgement and our language where we are dealing with ancient poets; the personal estimate when we are dealing with poets our contemporaries, or at any rate modern. The exaggerations due to the historic estimates ore not in themselves, perhaps, of very much gravity. Their report hardly enters the general ear; probably they do not always impose even on the literary men who adopt them. But they lead to dangerous above of language. So we hear Caedman amongst our own poets, compared to Milton ". (۲۱)

ترجمہ:

’’تاریخی مغالطہ خاص طور پر اس وقت ہمارے فیصلے اور زبان پر غالب آسکتاہے جب ہم قدیم شعراء کا مطالعہ کررہے ہوں۔ ذاتی مطالعہ اس وقت غالب آسکتاہے جب ہمارا واسطہ اپنے ہم عصر شعراء یا ان شاعروں سے پڑے جو بہرطور جدید کہلاتے ہیں۔ شاید تاریخی مغالطے سے پیداہونے والے مبالغے اپنی جگہ زیادہ گھمبیر اور اہم نہیں ہوتے۔ ان کے نتائج عام کانوں تک نہیں پہنچتے شاید یہ مبالغے ان ادبی لوگوں کو بھی متاثر نہیں کرتے جو ان کے پہلے سے قائل ہیں مگر یہ عمل زبان کو خطرناک اور ناجائز استعمال کی طرف ضرور لے جاتاہے‘‘۔(۲۲)

ان دونوں مثالوں میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری میں جامعیت، ابلاغ، سلاست، روانی، برجستگی اور قابل فہم الفاظ و اصطلاحات کے استعمال کی خوبیوں کو بخوبی دیکھا جاسکتاہے۔ ڈاکٹرجالبی کا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس سے تنقیدی نظریات کا ابلاغ آسان ہوجاتاہے۔ بلکہ طویل اور پیچیدہ جملوں کو قاری کے فہم کی سطح پر آسان اور جامع الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ طویل جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بامعنی اور جامع تراکیب کے استعمال سے مصنف کے منشاء کو قارئین تک منتقل کیا ہے اور اس سلسلے میں بطور خاص خیال رکھا ہے کہ جملے کا کوئی حصہ بھی حذف نہ ہو اور بات بھی مکمل طور پر قارئین تک منتقل ہو جائے۔ڈاکٹرجالبی کے تراجم اپنی روانی اور سلاست کے باعث ان کی طبع زاد تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ڈاکٹرجالبی نے ایک ایسے اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے جو علمی اور تحقیقی مضامین کے ترجموں کے لئے نہایت موضوع اور کار آمد ہے۔

ڈاکٹرجالبی کی ترجمہ نگاری کی اپنی خصوصیات کے باعث ان کی یہ دونوں کتب ’’ایلیٹ کے مضامین‘‘ اور ’’ارسطو سے ایلیٹ تک‘‘ اپنی پہلی اشاعت ہی سے طلبہ اور ادب کے قارئین کے درمیان انتہائی مقبول ہیں۔ یہ دونوں کتب مغرب کے تنقیدی نظریات اور تنقید کے حوالے سے بنیادی مسائل کو سمجھنے میں بھی انتہائی مدد گار ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کی تنقید اور اسلوب پر ایلیٹ کے اثرات ان کی ایلیٹ کی شاعری اور تنقید سے دلچسپی کی دلیل ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے ایلیٹ کے تصورات کو نہ صرف اپنے تنقیدی نظریات کا حصہ بنایا بلکہ اپنی تراجم کی صورت میں پیش کرکے اردو ادب کے قارئین کے لئے بھی بیش خدمت سرانجام دی ہے۔ پروفیسر نذیرصدیقی، ڈاکٹرجالبی کی اس سعی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترجمے کا کام یونہی کچھ کم آسان نہیں پھرایلیٹ جیسے نقاد کے مضامین کا ترجمہ۔ انگریزی تنقید میں ایلیٹ سے زیادہ سادہ زبان اور سادہ جملے شاید ہی کسی اور نے لکھے ہوں لیکن جو تہداری یا پیچ و خم ایلیٹ کی سادگی میں ہے وہ بھی کسی اورکے ہاں نہیں۔ اس اعتبار سے ایلیٹ کی تحریروں کا ترجمہ نہایت مشکل کام تھا،جس سے ڈاکٹرجالبی بڑی حد تک کامیابی سے عہد ہ بر آہوئے ہیں۔ یہاں میں ''بڑی حد تک'' کے الفاظ اس لئے استعمال کررہاہوں کہ ترجمے کے معاملے میں تھوڑا بہت اختلاف ہر مترجم سے ممکن ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مترجم مصنف کے مفہوم کو سمجھ سکا ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ مصنف کے مفہوم کو عام فہم بناسکاہے یا نہیں۔ ان دونوں کا موں میں ڈاکٹرجالبی کی کامیابی شبہ سے بالا تر ہے''۔(۲۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ کردہ کتب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مصنف کے فکرو فن پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے فن اور طریقہء کار کے حوالے سے اپنے نقطہء نظر کی وضاحت نہایت عمدگی سے کی ہے۔بطور مترجم تخلیقی شان برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ مصنف کے طرز ادا اور متن کی تفہیم کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ترجمہ نگاری میں الفاظ کے چناؤ، تراکیب سازی،الفاظ سازی،محاورات کے چناؤ، جملے کی ساخت اورطوالت کے انتخاب میں دونوں زبانوں کی فنی نزاکتوں کو مد نظر رکھا ہے۔ترجمہ نگاری میں فن ترجمہ کے اصول و ضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنف کے منشاء کو اس انداز میں قارئین تک منتقل کیا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہ تراجم طبع زاد تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔تنقیدی کتب کے تراجم میں زبان کا استعمال بالخصوص لائق توجہ ہے۔بھاری بھرکم تنقیدی اصطاحات سے قارئین کو مرعوب کرنی کی بجائے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا گیا ہے کہ خشک ادبی مباحث قابل مطالعہ بن گئے ہیں ادب کے خاص قارئین کے ساتھ عام قارئین بھی ان کتب سے بھر پور استفادہ کر سکتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

"The best poetry is what we want;the best poetry will be found to have a power of forming,sustainaing,and delighting us,ad nothing else can.A clear,deeper sense of the best in poetry,and of the strength and joy to be drawn from it,is the most precious benefit which we can gather

from a poetical collection there is inevitably something which tends to obscure in us the cinsciouness of what our benefit should be ,and to distract us from the pursuit of it.We should therefor steadily set it before our minds at the outset,and should compel ourselves to revert constantly to the thought of it as we proceed." (24)

ترجمہ:

’’ہمیں بہترین شاعری ہی درکار ہے۔بہترین شاعری میں تعمیر کرنے،حوصلے کے ساتھ زندہ رکھنے اور مسرور کرنے کی ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو کسی اور چیز میں نہیں ہوتی۔شاعری کا زیادہ واضح،زیادہ گہرا تصور اور قوت وخوشی جو اس تسور سے حاصل ہو سکتی ہے،وہ بیش بہا فائدہ ہے جو زیر نظر مجموعہ ء کلام سے ہمیں حاصل ہو سکتا ہے۔مگر پھر بھی ایسے مجموعہء کلام کی ماہیت و فطرت میں لازما کوئی ایسی چیز بھی ہوتی ہے جو فائدے کے بارے میں ہمارے شعور کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں اسے حاصل کرنے سے باز رکھتی ہے۔لہٰذا شروع ہی سے باقاعدہ طور پر ہمیں اسے اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔اور اس مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے باربار اس خیال کی طرف واپس آتے رہنا چاہیئے۔‘‘ (۲۵)

ٹی۔ایس ایلیٹ کے مضمون Tradion and individual talent کا ایک اقتباس درج ہے۔

"To proceed to a more intelligible exposition of the relation of the poet to the past;he can neither take the past as a lump,an indiscriminate bolus,nor can he from himself wholly on one or two private admirations, nor can he from himself wholly upon one preferred period.The first course is inadmissible,the second is an important experience of youth,and the third is a pleasant and highly desirable suppliment .The poet must be very

consious of the main current,which does not at all fiow invariably through the most distinguished reputations.He must be quite aware of the obvious fact that art never improves,but that the material of art is never quit the same.'(26)

ترجمہ:

''ماضی کے ساتھ شاعر کے تعلق کی اور زیادہ واضح تشریح کے لئے(یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے)کہ وہ نہ تو ماضی کو کوئی ڈلا یا پتھر سمجھ کر قبول کر سکتا ہے،نہ وہ اپنی ذات کی کلی طور پر تعمیر ایک یا دو نجی پسندیدگیوں پر کر سکتا ہے۔اور نہ اپنی ذات کی تعمیر کلیتہ اپنے کسی پسندیدہ دور پر کر سکتا ہے۔پہلا راستہ ناقابل قبول ہے۔دوسرا نوجوانی کا ایک اہم تجربہ ہے اور تیسرے کی حیثیت ایک خوشگوار اور حد درجہ پسندیدہ غنیمہ کی ہے۔شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرکزی اور اصل میلان سے واقف ہو اور ضروری نہیں کہ یہ میلان ممتاز شہرت کے مالک اساتذہ ہی میں نظر آئے۔اسے اس واضح حقیقت سے سے بھی واقف ہونا چاہئیے کہ فن(کسی چیز کو)آگے نہیں بڑھاتا لیکن فن کا مواد کبھی بھی بالکل ایک سا نہیں ہوتا۔''(۲۷)

درج بالا اقتباسات،ترجمہ نگاری میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی فنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرنے کے ساتھ ان کے ترجمہ نگاری کے نقطہء نظر کے عین مطابق ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے نقطۂ نظر کے مطابق کسی سنجیدہ وپیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں اور سلیس نہیں ہو سکتا کیونکہ ترجمہ کا مزاج اصل تحریر سے مختلف ہوتا ہے۔اردو میں طویل جملے کا ترجمہ کرتے ہوئے اس میں تسلسل اور روانی برقرار رکھنے کے کے لئے مترجم کو بہت کرنی پڑتی ہے۔درج بالا اقتباسات میں ایلیٹ کے طویل اور پیچیدہ جملوں کو نہایت مہارت سے اردو میں منتقل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی بطور مترجم،مصنف کے لہجے اور طرز ادا کہ برقرار رکھنے کے قائل ہیں۔جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے قریب المعانی الفاظ سے مفہوم کی ادائیگی کی بجائے نئے الفاظ اور نئے مرکبات اور نئی بندشیٗ تراشنے کے قائل ہیں۔ان کی یہ کاوش ان کے ترجموں کی تخلیقی شان میں اضافے کا باعث ہے۔

بچوں کے مختصر ناول، جانورستان کے علاوہ جن دیگر دو کتب کے تراجم ڈاکٹرجالبی نے کئے ہیں ان میں پروفیسر عزیر احمدکی کتاب " Islamic Modernism in India " اور " Islamic Culture is Subcontinent " شامل ہیں۔ یہ دونوں کتب اپنی نوعیت کے اعتبار سے علمی، تحقیقی اور تاریخی نوعیت کی حامل ہیں۔ ان کتب میں پروفیسر عزیزکے علمی، سنجیدہ اور تہہ دار اسلوب کو اردو کے قالب میں ڈھالنا نہایت محنت طلب کام تھا۔ ڈاکٹرجالبی خود بھی ایک علمی و تحقیقی حوالے سے اہم شخصیت ہونے کے باعث ان موضوعات کے حوالے سے ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ بالخصوص برصغیر کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے لہذا یہ دونوں کتب ایک طرف ان کی طبیعت سے فطری مناسبت رکھتی ہیں تو دوسری طرف اردو ادب کے قارئین کو ان موضوعات کے حوالے سے قابل ذکر اور اہم تصانیف سے روشناس کروانے کا ذریعہ بھی بنی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی نے پروفیسر عزیر احمد اور ان کتب میں حوالوں کی صورت میں موجود دیگر دانشوروں اور محققین کے خیالات کو نہایت عمدگی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹرجالبی کی ترجمہ کردہ ان کتب کا اسلوب بھی ان کے روایتی اسلوب کے مانند برجستگی، روانی، سلاست اور عالمانہ شان لئے ہوئے ہے۔ ان کتب سے ڈاکٹرجالبی کی ترجمہ نگاری کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

1.‘‘ In comparing the conscept of Islamic solidarity as a social unity, with the modern western consception of a nation, Iqbal had taken his cue from Ererst Renan".(۲۸)

ترجمہ:

> اسلامی اجتماعیت کے تصور کو ایک معاشرتی وحدت کے طور پر جدید مغربی،تصو رِ قوم سے مقابلہ کرنے کا خیال اقبال نے ارنسٹ رینان سے لیا ہے۔(۲۹)

2. Discriminatory measures of a social character were not introduced by Aurangzaeb until 1695.After the rising of the Muthura Juts, the Satnamis, the sikhs and the Marthas; then he issued orders that no Hindu except the Rajputs, the official varriors cast which had been very loyal to the Mughal rule, should bear arms, can ride on elephants or Arab or Iraqi horses or in palanquins.(۳۰)

ترجمہ:

1695''تک اورنگزیب نے معاشرتی نوعیت کے امتیازی اقدامات کی داغ بیل نہیں ڈالی تھی۔ اس نے یہ قدم متھرا کے جاٹوں، شامیوں، سکھوں اور مرہٹون کے سراٹھانے کے بعد ہی اٹھایا۔ چنانچہ اس نے فرمان جاری کردیاکہ راجپوتوں کے سوا، جو باضابطہ جنگجو قوم تسلیم کرلی گئی تھی اور مغل حکومت کی نہایت وفادار تھی،کسی کو اسلحہ رکھنے یا ہاتھیوں یا عربی اورعراقی گھوڑوں پر سوار ہونے اور پالکیوں میں نکلنے کی اجازت نہ تھی''۔(۳۱)

ان دونوں مثالوں میں پہلی مثال میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے پروفیسر عزیز کے نسبتاً طویل جملے کو نہایت مہارت سے اردو میں اس طریقے سے منتقل کیاہے کہ عبارت میں کہیں بھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوا بلکہ تقریباً اتنے ہی الفاظ میں عبارت کا ترجمہ کیاہے جتنے الفاظ اصل اقتباس میں موجود ہیں۔ ترجمہ نویسی کے لئے استعمال کئے گئے الفاظ اور تراکیب بھی انتہائی مانوس اور فکر اور خیال کے ابلاغ میں نہایت مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ دوسری مثال میں پروفیسر عزیز کے پیش کردہ ایک طویل ترین جملے کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے میں مہارت سے بامحاورہ اور شستہ اور رواں ترجمہ کیاگیاہے۔ یہ عمل نہایت مشاقی کا متقاضی ہے۔ جملے کی طوالت اور تہہ داری ابلاغ میں دشواری پیدا کرنے کی بجائے ایک منطقی ربط کیسے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے تفہیم اور دلچسپی کے عنصر کو بڑھاتی ہوئی جملے کو اختتام کی طرف لے جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ان دونوں کتب کے تراجم میں مصنف کے اسلوب اور فکروخیال کو اس انداز میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ یہ کتب تخلیقی تراجم کی کامیاب مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے یہ تراجم اردو زبان میں تحقیقی و علمی اسلوب کی روایت کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے تنقیدی سرمائے میں اضافے کا سبب ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہ تراجم ان کے وسیع مطالعے، عمیق نظری اور محنتِ شاقہ کے عکاس بھی ہیں اور دوتہذیبوں کے درمیان مکالمے، فکری و معنوی سطح پر علم کے تبادلے اور دو مختلف زبانوں کے درمیان قریبی ربط و تعلق استوار کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ڈاکٹرجالبی کے ان تراجم کو بحیثیت مجموعی عالمانہ اور فکر انگیز کتب کے تراجم کے لحاظ سے مثالی تراجم کی روشن مثالیں قراردیاجاسکتاہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کے ان دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے اردو زبان وادب کے حوالے سے عظیم خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ انتہائی مصروفیات کے باوجود بچوں کے ادب کے لئے وقت نکالا اور اس حوالے سے قابل قدر اضافہ کیا۔ بچوں کے لئے ادب تخلیق کرنا اتنا آسان

نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے بالخصوص بچوں کی دلچسپی کے حوالے سے موضوعات کا انتخاب نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ بچوں کے لئے موضوعات کے انتخاب کے لئے نہ صرف ان کی عمر، طبعی رحجانات، میلانات، دلچسپیوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے بلکہ اس امر کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا پہلو بھی نظر انداز نہ ہو۔ موضوع کے انتخاب کے علاوہ الفاظ کا چناؤ اور اسلوب بیاں بھی انتہائی توجہ کا متقاضی ہے۔ خاص طور پر ایک پختہ کار محقق اور نقاد کے لئے بچوں کی سطح پر آکر ادب تخلیق کرنا واقعی ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

بچوں کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو ادب تخلیق کیا اس میں مولانا رزاق الخیری کے رسالے''بنات'' میں ''بلیاں'' کے عنوان کے تحت ۱۹۸۴ ء تک آپ کی ۷۴ کہانیا ں شائع ہوئیں۔ جبکہ ۱۹۸۳ء میں''حیرت ناک کہانیاں''کے عنوان سے ایک طویل قصہ ۱۹۸۳ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس کتاب کاسندھی میں ایاز قادری نے ''حیرت ناک کھاٹیوں''کے نام سے ترجمہ کیا جو مکتبہ اسلوب کراچی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ بچوں کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے جارج آرول کے ناول ''The Animal Farm'' کا 'جانورستان 'کے نام سے ترجمہ بھی کیا جو مکتبہ نیا دورکراچی سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ بچوں کے ادب کی تخلیق کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک اہم کارنامہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کے مرکزی کردار خوجی سے بچوں کو متعارف کروانا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''فسانہ آزاد'' سے اخذ کرکے کہانیوں کا ایک سلسلہ ''خوجی پرکیا گزری'' شروع کیا۔ اس سلسلے کا ذیلی عنوان ''نہ ہوئی قرولی'' کو بنایا۔ ''فسانۂ آزاد'' سے اخذ کردہ کہانیوں کا یہ سلسلہ لاہور سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے ''ہونہار'' میں جنوری۱۹۷۶ء میں شروع ہوا۷۱ قسطوں پر مشتمل یہ سلسلہ مئی ۱۹۸۴ء تک جاری رہا۔ ۱۹۹۳ء میں فیروز سنز لاہور سے ''نہ ہوئی قرولی'' کتابی صورت میں شائع ہوا۔(۳۲)

بچوں کے لئے ادب تخلیق کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بچوں کی عمر کے لحاظ سے دلچسپیوں، رحجانات اور تربیتی پہلو کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔ بچے عموماً مافوق الفطرت عناصر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیںڈاکٹر جمیل جالبی نے بچوں کی تربیت کے لئے مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ ساتھ جانوروں کو کرداروں کی صورت میں پیش کرکے کہانیاں تخلیق کیں جن کا بنیادی مقصد بچوں کو اچھائی، نیکی، بہادری، ہمدردی، غمگساری، اتحاد واتفاق اور انسان دوستی کا سبق دینا ہے۔ موضوع کے انتخاب کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اسلوب بھی قابل ستائش ہے۔ ایک بلند پایہ محقق، نقاد،ماہر لسان اور مورخ ہونے کے ناتے ڈاکٹر جمیل جالبی کے اسلوب میں سنجیدگی،متانت،علمیت اور استدلال کا درآنا غیرمعمولی بات نہیں لیکن بچوں کے لئے ادب تخلیق

کرتے ہوئے ایسے اسلوب کی پیروی کرنا جس سے بچے تخلیق سے توجہ اور دلچسپی کے ساتھ لطف اندوز ہوں بہت مشکل امر ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مرحلے کوبھی بحسن و خوبی عبور کیا۔'نہ ہوئی قرولی' ڈاکٹر جمیل جالبی کے اسلوب کی کشش ہی کے باعث پونے نو برس تک مسلسل شائع ہوتی رہی اور بچوں کی مقبول ترین کتب میں شامل ہوئی۔ ڈاکٹر محمود الرحمن جمیل جالبی کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''وہ نہ کہیں ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، نہ ہی محاورات کی بھر مار کرتے ہیں نہ طویل جملہ لکھنے کے عادی ہیں اور نہ ہی عبارت کو گنجلک کردینے کے خوگرہیں۔وہ بچہ بن کر بچوں کی زبان بولتے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں جو ننھے دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ پڑھنے والے بچوں کو اس کا ذرا سا بھی شائبہ پیدا نہیں ہوتا کہ ان سے مخاطب ایک ایسا شخص ہے جو اپنے تبحرِ علمی، وسعتِ معلومات اور بلند فہم ادراک کی بدولت پورے برصغیر میں ایک قد آور اور ادیب اور محقق کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے''(۳۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کے ضمن میں بطور مدیر''نیا دور'' کی ادارت بھی شامل ہے۔ اگرچہ اس ادبی رسالے پر بطور مدیر ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام کبھی شائع نہیں ہوالیکن یہ بات ان کے تمام دوست احباب اور لکھاری جانتے تھے۔(۳۴) کہ ''نیا دور'' کی عمدہ ادارت کے پس منظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی صلاحیتیں کارفرما ہیں۔ ان کے متعدد احباب نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بطور مدیر''نیادور'' کے صفحات کی زینت نہیں بنا لیکن سب جانتے تھے کہ ''نیادور'' کی چھپائی، تحریروں کے انتخاب اور موضوعات کے چناؤ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ذات پس منظر میں موجود تھی۔''نیادور'' کے اداریے ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحریر کردہ ہیں۔

''نیا دور'' کے ادبی معیار اور ادبی اہمیت کے حوالے سے نذرالحسن صدیقی لکھتے ہیں:

''نیا دور کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اسے پڑھ کر باورق گردانی کرکے معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر نے اس کے ہر صفحے پر خصوصی توجہ دی ہے کتاب کی غلطیوں سے پاک املاء کی صحت کے بعد ان کا بیشتر غیر مدون وغیر مطبوعہ کلام نیا دور میں شائع ہوا۔ عزیز احمد کی آخری کہانیاں ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' اور ''تیری دلبری کا بھرم'' بھی نیادور ہی میں شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آخری کہانی ’’مویشی بازار‘‘ بھی نیادور میں شائع ہوئی۔ اگر نیا دور کی اوّلیات کی فہرست بنائی جائے تو اس میں بہت سے ایسے پہلو سامنے آئیں گے جو دوسرے ادبی رسالوں میں نظر نہیں آتے۔ جرمن،چینی، ایرانی،انگریزی، روسی نظموں میں لاطینی ادب کے تراجم بھی نیا دور کی اوّلیات میں شامل ہیں‘‘۔(۳۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ’’نیادور‘‘کے میں تحریر کردہ اداریے مضامین کی صورت میں ان کی کتب’’ادب کلچراور مسائل‘‘ اور ’’معاصر ادب‘‘ میں شامل ہیں۔ ’’نیا دور‘‘ کے اداریوں کی مکمل تفصیل ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی مرتب کردہ ’’ڈاکٹر جمیل جالبی۔ سوانحی کتابیات‘‘میں موجود ہیں۔(۳۶)

حواشی وحوالہ جات باب ششم

۱۔ حامد بیگ مرزا،ڈاکٹر، ' ترجمے کا فن '، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۱۹۸۸ء، ص۵

۲۔ احمد فخری حاجی، 'دورتراجم ' مشمولہ، 'ترجمے کا فن اور روایت'، مرتبہ: نثاراحمد قریشی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص۴۰، ۴۱

۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، 'شاہد احمد دہلوی '، بحیثیت ترجمہ نگار، ص۔ ۲۳۴

۴۔ مرزاحامد بیگ، ڈاکٹر: 'ترجمے کا فن'، ایضاً، ص۱۶

۵۔ جیلانی کامران،'ترجمے کی ضرورت'،مشمولہ،'تنقید کا نیا پس منظر'،مکتبہ ادبِ جدید،لاہور،۱۹۶۴ء،ص ۶۷

۶۔ محمد حسن عسکری،'گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے۔'مشمولہ،'ماہِ نو کراچی'،فروری،۱۹۵۴ء

۷۔ حامد بیگ مرزا،ڈاکٹر،' ترجمے کا فن '، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۱۹۸۸ء، ص۳۸

۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،'ترجمے کے مسائل'،مشمولہ،'تنقید اور تجربہ' مشتاق بک ڈپو،کراچی،۱۹۶۷ء ص ۱۲۲

۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹڑ، 'ایلیٹ کے مضامین '،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۶ء،ص۸

۱۰۔ محمد احسن فاروقی،ڈاکٹر،'ارسطو سے ایلیٹ تک''مشمولہ،'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، انڈیا، باراوّل، ۱۹۹۳ء، ص۴۲۰

۱۱۔ نظیر صدیقی، 'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک ممتاز مترجم''،مشمولہ،'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'ایضاًص۴۰۳

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی،'ارسطو سے ایلیٹ تک'،مشمولہ،'ڈاکٹر جمیل جالبی۔ایک مطالعہ'ایضاً،ص۴۱۹

۱۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، (مترجم)'برصغیر میں اسلامی کلچر ' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۰۔۱۱

۱۴۔ معین الدین عقیل،،ڈاکٹر،'عزیز احمد۔پاکستان میں تاریخ نویسی کی منفرد مثال'،مشمولہ،جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان،جلدix،۱۹۸۶،ص۱۰۴

۱۵۔ ایضاً،ص۱۰۱۔۱۰۲

۱۶۔ سجاد شیخ،’اعلیٰ ترجمے کی دو مثالیں ‘، مشمولہ،’جمیل جالبی۔ایک مطالعہ ‘، ایضاً،ص ۴۰۶

. www.poets.org/ poetorg/text/tradion and individual talent ۱۷

۱۸۔ جمیل جالبی،،ڈاکٹر،’ایلیٹ کے مضامین ‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،ص۱۸۵۔۱۸۴

- . www.barteby.com۱۹

۲۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، ’ارسطو سے ایلیٹ تک ‘، ایضاً، ص ۲۴۷

ww.barteby.com21-

۲۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’’ارسطو سے ایلیٹ تک‘‘ ایضاً، ص ۳۴۴

23.www,bartleby.com

۲۴۔ جمیل جالبی,ڈاکٹر،’ارسطو سے ایلیٹ‘،ایضاً،ص۳۴۰

25.www.bartleby.com

۲۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،’ایلیٹ کے مضامین‘ایضاً،ص۱۸۶۔۱۸۷

۲۷۔ نذیر صدیقی، ’ڈاکٹر جمیل جالبی، ایک ممتاز مترجم ‘، مشمولہ ’ڈاکٹرجمیل جالبی۔ایک مطالعہ‘، ایضاً، ص۰۲

28 - Aziz Ahmed, Professor " Studies in Islamic Culture in Indian enviornment" Oxford university press, 1966ء , Page: 269

۲۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،(مترجم)’برصغیر میں اسلامی کلچر ‘، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۴۱۵

30. Aziz Ahmed, Professor " Studies in Islamic Culture in India enviornment" Oxford university press, 1966ء , Page: 199

۳۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، (مترجم) ’برصغیر میں اسلامی کلچر ‘ ایضاً، ص۳۰۳

۳۲۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں یہ معلومات ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی مرتب کردہ سوانحی کتابیات ’’ڈاکٹر جمیل جالبی‘‘ سے لی گئی ہے۔ ’نہ ہوئی قرولی‘ کی قسط وار اشاعت کی تفصیل اس سوانحی کتابیات کے ص نمبر ۳۱۱سے لے کر ۳۱۴ تک موجود ہے۔

۳۳۔ محمود الرحمن،ڈاکٹر، ’ڈاکٹر جمیل جالبی۔بچوں کے ادیب،‘‘ مشمولہ جمیل جالبی: ایک مطالعہ‘ ازگوہر نوشاہی،ایضاً،ص۴۴۸

۳۴۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے نذرالحسن صدیقی کا مضمون’نیا دور کی ادارت اور ڈاکٹر جمیل جالبی‘،مشمولہ،’جمیل جالبی: ایک مطالعہ‘ایضاً،ص۴۳۶

۳۵۔ ایضاً،ص۳۷۔۴۳۶

۳۶۔ تفصیل کے لئے دیکھیئے’ڈاکٹر جمیل جالبی (سوانحی کتابیات)،مرتبہ:ڈاکٹر نسیم فاطمہ،طبع دوم،ایضاً،ص۲۳۲۔۲۳۷

باب ہفتم

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات: مجموعی جائزہ

ڈاکٹر جمیل جالبی کا پورا نام محمد جمیل خان ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ڈاکٹر جمیل خان نے اپنے نام کے ساتھ جالبی کا لاحقہ استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی کے دادا، آپس میں ہم زلف تھے۔ سید جالب دہلوی کی غیر معمولی شہرت کے سبب جمیل جالبی کے گھر میں ان کا ذکر رہتا تھا۔ یوں ڈاکٹر جمیل جالبی کے لئے سید جالب دہلوی ایک آئیڈیل شخصیت کا روپ دھار گئے اور ان کے نام''جالب'' کی مناسبت سے اپنے نام کے ساتھ ''جالبی'' کا اضافہ کردیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے جد امجد سوات کے رہنے والے تھے۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۹ء ہے جبکہ اصل تاریخ پیدائش ۱۲ جون ۱۹۲۹ء ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے گورنمنٹ ہائی اسکول سہارن پور سے ۱۹۴۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۵ ء میں میرٹھ کالج سے بی۔اے کیا۔۱۹۴۹ء میں انگریزی میں ایم۔اے سندھ یونیورسٹی کراچی سے جبکہ ۱۹۵۰ ء میں ایم۔اردو کیا جبکہ سندھ یونیورسٹی کراچی سے ہی ۱۹۵۰ء میں ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۷۱ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ڈاکٹر غلام مصطفی کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں بہادر یار جنگ ہائی اسکول سے کیا۔ جہاں وہ ۱۹۵۲ء تک بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں سی۔ایس۔سی کا امتحان پاس کرکے انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے اور بطور انکم ٹیکس کمشنر ریٹائر ہوئے۔ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء سے ۱۳ اگست ۱۹۸۷ء تک جامعہ کراچی کے وائس چانسلررہے۔ ۱۲نومبر ۱۹۸۷ء سے نومبر ۱۹۹۴ء مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد کے صدر نیشن کے طور پر خدمات سرانجام دیں جبکہ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۸ء تک اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے اعزازی صدر رہے۔

یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر جمیل جالبی کی اپنی خالہ زاد نسیم شاہین کے شادی ہوئی۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی چاراولادیں ہیں۔دوبیٹے،خاورجمیل اور محمد علی خان اور دوبیٹیاں سمیرا جمیل اور فرح جمیل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو چار مرتبہ داؤد ابی انعام ملا۔ جبکہ حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۹۰ء میں ستارہ امتیاز اور ۱۹۹۴ء میں ہلال امتیاز سے بھی نوازا گیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تخلیقی زندگی کی ابتداء ان کے طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوئی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے اور انہوں نے اسکول کے لئے ایک سٹیج ڈراما''سکندر اور ڈاکو'' ۱۹۴۱ء میں تحریر کیا۔ پہلا تنقیدی مضمون نئے شاعر۔ فیض احمد فیض کے نام سے ۱۹۴۸ء میں تحریر کیا جو نیادور کراچی میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی پہلی ترجمہ کردہ کتاب'' جانورستان'' تھی جو ۱۹۵۸ء میں منظر عام پرآئی۔ یہ کتاب جارج آرول کے ناول ''The Animal Farm'' کاترجمہ تھا۔ پہلی مرتبہ کتاب حاجی بغلول ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی جبکہ پہلی کتاب ''پاکستانی کلچر۔۔۔۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہفت روزہ''پیام مشرق'' کراچی کے چھ ماہ کے لئے نائب مدیر کے طور پر خدمات سرانجام دیں جبکہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ''ساقی'' کراچی کی مجلس ادارت میں شامل رہے اور ''باتیں کے عنوان سے ادبی کالم نگاری بھی کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''نیادور'' کراچی کے مدیر کے طورپر کام کرتے رہے لیکن بوجوہ بطور مدیر اپنا نام کبھی پرچے کے مدیران میں نہیں لکھوایا۔ڈاکٹر جمیل جالبی باقاعدہ ملازمت کے علاوہ اعزازی رکن کے طور پر بہت سے اداروں سے بھی منسلک رہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی عمر کا ایک بڑ احصہ اردو زبان وادب کی خدمت کرتے ہوئے گزارا۔ اپنی بے بیش بہا علمی وادبی خدمات کے باعث وہ اردو زبان وادب کے بہترین تنقید نگار، محقق،مترجم،لغت نگار، کلچر شناس اور مورخ کے طور پر منفرد حیثیت رکھتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تقریباً۳۸ کتابیں شائع ہو چکیں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نہایت خوش پوش، خوش شکل اور خوش مزاج انسان کے طور پر اپنے حلقہ احباب میں جانے جاتے ہیں۔ اردو زبان وادب میں انتہائی اہم مقام حاصل کرچکنے کے باوجود عاجزی اور انکساری ان کی شخصیت کے اہم خصائص ہیں۔ اردو زبان وادب کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی سب سے وقیع،قابل قدر اور عظیم الشان کاوش،تاریخ ادب اردو کی تالیف ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو چار جلدوں پر مشتمل ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ تاریخِ ادب کی جلدیں اردو زبان کی ابتداء سے انیسویں صدی کے نصف آخر تک اردو زبان وادب کا احاطہ کرتی ہیں۔ اردو زبان میں ادبی تاریخ نگاری کی ابتداء تذکروں کی صورت میں ہوئی۔لیکن تذکروں میں پائی جانے والی معلومات کی فراہمی میں تحقیقی پہلو کو نظرانداز کرنے معتصبانہ اور لگی بندھی تنقید کے باعث انہیں تاریخ ادب کے حوالے سے مستند مآخذ کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

محمدحسین آزاد کی 'آبِ حیات' کو اردو زبان وادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہونے کا اعزاز حاصل ہے لیکن'آبِ حیات'میں بھی تذکروں میں پائی جانے والی خامیاں اس کی تاریخی اہمیت کو متنازعہ بناتی ہیں البتہ محمد حسین آزاد کے اسلوب کے باعث 'آب حیات ' کو اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل

ہے۔'آب حیات'کی اشاعت کے بعد اردو زبان میں متعدد تاریخ ادب وجودمیں آئیں کچھ تاریخیں مؤرخین کی انفرادی کوششوں کا ثمر تھیں اور کچھ تاریخیں اداروں اور جامعات کے تحت بھی وجود میں آئیں لیکن اردو ادب کی تاریخوں میں جو وقعت،پسندیدگی اور اعتبار واعتما د ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریرکردہ تاریخ ادب کو میسر آیا وہ کسی اور تاریخ کے حصے میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی جلدوں کی مقبولیت کی بہت سی وجوہات ہیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ ادب اردو کی یہ چار ضخیم جلدیں ایک فرد واحد کا کارنامہ ہیں۔ جو کام بہت سے افراد اور ادارے بھی نہ کرسکے اسے فرد واحد کی محنت شاقہ،لگن اور عزم نے ممکن بنادیا۔ تاریخِ ادب کی ان چاروں جلدوں کی تکمیل میں تقریباً نصف صدی کی عرق ریزی اور محنتِ شاقہ شامل ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی چاروں جلدیں اپنے مشمولات کے باعث اردو ادب کے عام قارئین،ناقدین اور طلباء میں انتہائی مقبول ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ تاریخ ادب اردو کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اردو زبان کی پہلی تاریخ ہے جس میں ادب کو اس کے عہد کے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر میں رکھ کرسمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب کو ایک ایسا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے جس میں پوری زندگی،روحِ ادب اور تہذیب کے جلوے نظر آئیں۔ تاریخ ادب اردو کی چاروں جلدوں کی ترتیب میں زمانی ترتیب کو محلوظ خاطر رکھا گیاہے۔

اسطرح ادب کا ارتقاء تدریجاً آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان جلدوں میں اپنے نظریۂتاریخ نویسی کی بھر پور پیروی کی ہے اور ادب کو ایک کل کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر عہد کی زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کو ارتقائی انداز میں پیش کیا ہے جس سے اردو زبان میں الفاظ کی مختلف شکلوں اور الفاظ کے رائج ہونے یا متروک ہوجانے کا واضح پتہ چلتا ہے۔ ہر جلد کی ابتداء میں اس جلد میں پیش کردہ عہد کا تفصیلی سیاسی، معاشرتی،تہذیبی اور معاشی حالات کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور جس سے اس عہد میں تخلیق کردہ ادب کی تفہیم آسان ہوجاتی ہے.

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو(جلد اول) میں اردو کی ابتداء کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے تاریخی حقائق سے استدلال پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے شمال کو اردو زبان کا مولد قرار دیا ہے اور اپنے دعوے کے حق میں مستند دلائل بھی پیش کئے ہیں اور اردو اور پنجابی کے تعلق کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کے دلائل سے اتفاق کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو کی ان جلدوں میں سوائے دوسری جلد کے نظم ونثر کے ارتقاء کو ساتھ ساتھ پیش کیا ہے۔(دوسری جلد میں آخری باب میں نثر کا جائزہ لیا گیا ہے)جس سے اردو زبان کے اصناف کے حوالے سے مجموعی ارتقاء کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور ادب ایک کل کی

صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ان جلدوں میں شامل ادیبوں،شعراء تحریکوں، اداروں کے حوالے سے اس قدر معلومات اکٹھی کی ہیں کہ کسی اور تاریخ ادب سے اس قدر مواد کا ملنا ناممکن ہے تاریخ ادب اردو کی چاروں جلدیں اپنی جامعیت اور مواد کے اعتبار سے نہایت وقعت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریر کردہ تاریخ ادب اردو کی ان چاروں جلدوں کی اہم خصوصیت ان میں پیش کردہ مواد کا استناد ہے۔ اب تک تحریر کی گئی تاریخوں میں،کوئی تاریخ ادب،تحقیقی لحاظ سے اتنی مستند تسلیم نہیں کی جاتی جس قدر ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریر کردہ تاریخ ادب اردو کو سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مؤرخانہ ذمہ داریوں کو نہایت احسن طریقے سے نبھایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں اوّلین مآخذات پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ جس قدر مخطوطات سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے استفادہ کیا ہے کسی اور مؤرخ نے نہیں کیا ہے۔ اپنے مآخذات کی جانچ پرکھ میں تحقیقی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے مآخذات کی درست نشاندہی بھی کی ہے۔ تاریخ ادب مرتب کرتے ہوئے جس قدرمواد کا مطالعہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے کسی اور مورخ نے نہیں کیا۔ اس حوالے سے ان کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ اردو زبان وادب کے حوالے سے جس قدر مخطوطات اور مطبوعات کا مطالعہ انہوں نے کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان جلدوں میں سنین کے بیان میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔بالخصوص شعراء اور ادباء کی تاریخ ولادت، تاریخ وفات اور ان سے منسوب کردہ تخلیقات کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحقیقی انداز نظر انتہائی قابل ستائش ہے۔ مستند معلومات کی فراہمی کے لئے دستیاب مواد کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ داخلی شواہد کی بنیاد پر استخراج نتائج ڈاکٹر جمیل جالبی کی مؤرخانہ بصیرت کا نہایت اہم پہلو ہے۔ اس حوالے سے ’خالق باری‘ کے انتساب کے حوالے سے ان کی تحقیق قابل ذکر ہے۔اسی طرح تاریخی شواہد کی بنیاد پرعبدالواسع ہانسوی کو اردو لغت نگاری کا بانی قرار دیا ہے۔دکنی ادب پر گجری ادب کے اثرات کا عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے گجری ادب کی روایت کو دکنی ادب کی روایت کی نسبت مستحکم قرار دیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اوّل میں اردو نثر کی اوّلین تصنیف قرار دی جانے والی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ’’معراج العاشقین‘‘کو تحقیقی شواہد کی بنیاد پر مخدوم شاہ حسین بیجا پوری کی تصنیف قرار دیا ہے جو کہ سلسلہ امینیہ کے مرید تھے۔قدیم ادب ہی کے سلسلے میں پروفیسر زور اور نصیرالدین ہاشمی کے اس دعوے کو رد کیا ہے کہ ’’چندر بدن اور مہیار‘‘ مرزا محمد مقیم کی تصنیف ہے جس نے مقیمی تخلص اختیار کیا۔ڈاکٹر جالبی کی تحقیق کے مطابق مقیم اور مقیمی دو الگ اشخاص ہیں اور اس مثنوی کے اصل مصنف مقیمی ہیں جو کہ کسی بادشاہ کے متوسل نہیں تھے اسی لئے اس مثنوی میں کسی بادشاہ کی مدح میں اشعار نہیں ملتے۔محمودؔ کی واحد دستیاب غزل بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی دریافت ہے۔اسی طرح شیخ احمد گجراتی کی مثنوی

’یوسف زلیخا‘ کی دریافت کا سہرا بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے سر ہے۔ملاّ وجہی سے منسوب ’تاج الحقائق‘ کو بھی تاریخی دلائل کی روشنی میں وجیہ الدین محمد کی تصنیف قرار دیا ہے۔’سب رس‘ کے مآخذ قصوں کی کھوج بھی عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ولیؔ کے سالِ ولادت کا تعین بھی معاصرانہ شہادتوں کی بنیاد پر کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی انہی کاوشوں کا ثمر ہے کہ تحقیقی نتائج کے لئے جس قدر بھروسہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریر کردہ تاریخ ادب پر کیا جاتا ہے کسی اورمورخ کی تاریخ پر نہیں کیا جاتا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی محققانہ کاوشوں سے نہ صرف بہت سے ادیبوں اور شعراء کے حوالے سے پائے جانے والی غلط فہمیوں کا دور کیا ہے بلکہ بہت سے انکشافات منظر عام پر لائے ہیں۔ صفِ اوّل کے شعراء اور ادباء کے حوالے سے معلومات کی فراہمی کے لئے جس قدر ان کی تاریخ ادب کی جلدوں پر بھروسہ کیا جاتاہے اسی قدر صفِ دوم کے تخلیق کاروں کے حوالے سے بھی مستند معلومات ان تاریخوں میں موجود ہے۔تاریخ ادب اردو جلد دوم میں جعفر زٹلی کے متعلق انتہائی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور جعفر زٹلی کے کلام کو پہلی دفعہ اس کے تہذیبی اور سیاسی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔دوسری جلد ہی میں داخلی شواہد اور معاصرانہ شہادتوں کی بنیاد پرآبروؔ کو شمالی ہند کا پہلا ریختہ گو شاعر قرار دیا ہے جبکہ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تحقیق کے مطابق فائز کی اوّلیت کو تسلیم نہیں کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد سوم میں اردو اور ہندی کے ایک ہی زبان ہونے کی بحث کو سیٹتے ہوئے ہندی کو اردو زبان کا دیوناگری روپ قرار دیا ہے۔فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے اٹھارویں صدی سے قبل اردو نثر میں سادہ نویسی کی روایت کا سراغ لگایا ہے۔فورٹ ولیم کالج کی غیر مطبوعہ تصنیفات کے اشاریہ کی فراہمی بھی ایک اہم تحقیقی کاوش ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادیبوں اور شعراء کے درمان بپا ہونے والے معرکوں کی تفصیلات بھی نہایت عمدگی اور دلچسپ اسلوب میں پیش کی ہیں۔تاریخ ادب جلد چہارم میں بھی عمدہ معلومات کی فراہمی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے’برہانِ قاطع‘ کے حوالے سے نہ صرف غالب کے اعتراضات کا جائزہ پیش کیا ہے بلکہ سراج الدین علی خان آرزو اور ڈاکٹر نذیر احمد کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیاہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتب کی فہرست اور تعارف بھی پیش کیا ہے جو کہ’قاطع برہان‘ کے جواب میں لکھی گئیں۔اسی طرح غالب کی زندگی کے ایک اہم قضیے’’مقدمہ ازالہء حیثیتِ عرفی‘‘ کی اہم تفصیلات تاریخی و دستاویزی شہادتوں کی مدد سے فراہم کی گئی ہے۔سر سید اور ان کے معاونین کی خدمات کا جائزہ بھی نہایت تفصیل سے لیا گیا ہے اور ہر پہلو سے مفید معلومات فراہم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی ان جلدوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب کے تناظر میں ہر تخلیق کار کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا ہے اس سلسلے میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں بھرپور طریقے سے بروئے کار آئی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تنقیدی کتب میں ایک نقاد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن تاریخ ادب اردو میں ان کا تنقیدی شعور بالخصوص اہمیت کا حامل ہے ایک مورخ کے لئے تنقیدی بصیرت کا حامل ہونا بہت ضروری ہے مورخ کی تنقیدی بصیرت اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اہم اور غیر اہم میں امتیاز کرسکے۔ ایک مورخ کسی تخلیق کار کے مقام ومرتبہ کے تعین میں اس کے عہد کو مدنظر رکھتے ہوئے آنے والے عہدکے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھتا ہے اس ضمن میں مورخ کا وسیع مطالعہ اور ادب کے منظر نامے پر مکمل گرفت ہونا بہت ضروری ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تنقیدی بصیرت سے نہ صرف اردو کے صف اول اور صف دوم کے شعراء پر تنقید آراء کا اظہار کیا بلکہ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کو ادب کی تاریخ کے تناظر میں ان کا جائزمقام دلوانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک ناقد کے طور پر ڈاکٹر جمیل جالبی تقریباً تمام اصناف ادب پر عبور رکھتے ہیں ان کی دلچسپی نظم ونثر میں یکساں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے شعراء کے کلام کے فکر ی وفنی محاسن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان پر معاصرین کے اثرات، ان کی تخلیقات کا لسانی تجزیہ اور مقامی اور عالمی ادب سے تقابلی مطالعہ، ان کے تنقیدی طریقہ کار کا اہم جزو ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تنقید بصیرت کی روشنی میں بعض تخلیق کاروں کے حوالے سے مسلمہ نظریات کو جرأت مندانہ انداز میں ردّ کیا ہے۔

مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی درد کو محض ایک صوفی شاعر کے طور پر دیکھنے کے قائل نہیں اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی میر کو غالب پر بطور شاعر فوقیت دینے کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان تاریخ ادب کی جلدوں کی ایک خصوصیت شعراء اور ادباء کا موازنہ بھی ہے اسی طرح اردو زبان وادب کے حوالے سے مختلف ادوار میں پائے جانے والے مباحث کا تجزیہ بھی نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے مثلاً اردو شاعری دورزوال کی پیداوار قراردینے کے حوالے سے بحث یا مرثیے کو ایپک قرار دینے کی بحث وغیرہ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی آراء نہایت غیرجانبدار متوازن، مدلل اور افراط وتفریط سے پاک ہیں۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن پر تنقید کرتے ہوئے ان اصناف کے تاریخی ارتقاء کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنویات کے قصوں کاتجزیہ کرتے ہوئے ان مثنویوں پر فارسی اور اردو مثنویات کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان مثنویوں کے مآخذات کی بھی نہایت عمدگی سے نشاندہی کی ہے جوکہ ایک قابل قدر کاوش ہے۔تاریخ ادب کی ان جلدوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا اسلوب بھی لائق تحسین ہے۔تاریخ ادب اردو کی جلد اوّل پر محمد حسین آزاد کے اسلوب کی پیروی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل

جالبی پر اعتراضات بھی کئے گئے تھے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی دیگر جلدوں میں محمد حسین آزاد کے اثرات کو ترک کرتے ہوئے تاریخ ادب کے لیے ایک ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو دیگر مؤرخین کے لئے بھی لائق تقلید ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریریں ابلاغ اور معقولیت کے باعث قارئین میں بہت مقبول ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی میں عام طورپر استعمال ہوتے ہیں۔ غیرمعروف تراکیب اور الفاظ سے گریز کرتے ہوئے بعض اوقات تشبیہ واستعارہ کے استعمال سے بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریروں کی شگفتگی،روانی اور سلاست کے باعث تاریخ ادب اردو عام قارئین کے لئے بھی دلچسپی کی حامل ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو کی چاروں جلدوں کے تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کے مورخین میں سب سے ممتاز مورخ ہیں اردو ادب کی اب تک شائع شدہ تواریخ میں سے کوئی بھی تاریخ ادب، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب سے معیار میں بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو اپنے مشمولات، تحقیقی پہلو، تنقیدی معیار اور اسلوب کے حوالے سے اردو ادب کی تاریخوں میں سب سے بہترین تاریخ ادب ہے بالخصوص ایک فردواحد کے کانامے کے طور پر اس تاریخ ادب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب کے صف اوّل کے تخلیق کاروں کے حوالے سے اس قدر معلومات ان جلدوں میں فراہم کردی ہے ان تخلیق کاروں کی سوانح، شخصیت اور تخلیقات کے حوالے سے کسی اور کتاب سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بطور مورخ اپنا فرض نہایت احسن طریقے سے انجام دیا ہے۔تاریخ ادب کی ان جلدوں کے تجزیے سے ڈاکٹر جمیل جالبی ایک غیر جانبدار، محنتی اور دیانتدار مورخ کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ تاریخ ادب کی تالیف کے لئے جس قدر مواد تک رسائی انہوں نے حاصل کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مآخذات کی نشاندہی کرتے ہوئے دیانتدار انہ اور غیر جانبدارانہ تجزیے سے تاریخ ادب میں ایسے نتائج مرتب کئے ہیں جن سے انکار کی گنجائش بہت کم ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی دیگر علوم مثلاً فلسفہ، عمرانیات، نفسیات وغیرہ میں دلچسپی نے بھی انہیں بلند پایہ مؤرخ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی امتزاجی تنقید نے تاریخ ادب کے صفحات پر بھی جلوہ گری کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے تہذیبی اور سماجی شعور کی بنیادپر ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ادب کو ایک ایسے عنصر کے طورپر پیش کیا ہے جو نہ صرف اپنے عصر کا نمائندہ ہوتا ہے بلکہ آنے والے ادوار کی عصری مصنویت سے ہم آہنگ ہوکر روایت کے تسلسل کو آگے بڑھاتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو پر مختلف ناقدین مثلاً ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر غلام مصطفی خان، رشید حسن خان وغیرہ کے اعتراضات بھی سامنے آئے لیکن ان سب ناقدین اور

اردو ادب کے دیگر ممتاز ناقدین،محققین،مورخین اور ادیبوں اور دانشوروں نے بھی سراہا اور اسے اردو ادب کی کامیاب ترین تاریخ ادب قرار دیا۔

بطورمدوّن ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو کارنامے سرانجام دیئے ان میں دیوانِ نصرتی، دیوانِ حسن شوقی،مثنوی کدم راؤپدم راؤ، بالخصوص بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ قدیم اردو ادب کے حوالے سے ان کی یہ تدوینی خدمات، اردو زبان وادب کی گم شدہ گڑیوں کی تلاش کی نہایت اہم کڑیا ں ہیں۔ دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی کی تدوین سے نہ صرف اس عہد کے مذہبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور حکومتی امور کو سمجھنے میں مددملتی ہے بلکہ اردو زبان کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں بھی یہ دواوین بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دواوین کی تدوین میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تدوینِ متن کے اصولوں اور طریقہ کار کو نہایت عمدگی سے برتا ہے۔ حقائق کی جانچ پرکھ میں ان کا تحقیقی طریقہ کار، فراہم کردہ معلومات کو استناد مہیا کرتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی اور نصرتی کے سوانحی حالات تحقیقی جانفشانی سے قلم بند کئے ہیں۔ ان دونوں شعراء کے کلام کا تجزیہ اردو غزل بالخصوص اور دیگر اصناف کے بالعموم، ارتقائی مطالعے کے ضمن میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ’’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘‘ کی بازیافت اور تدوین ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایسا کارنامہ ہے جس کی بنیاد پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی گئی۔ اس مثنوی کی تدوین سے اردو زبان وادب کی تاریخ دوصدیاں پیچھے چلی گئی ہے۔ اس مثنوی کی تدوین سے اردو زبان کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں بھی بہت آسانی ہوگئی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عرق ریزی، ذہانت، تحقیقی وتنقیدی شعور کی بنیاد پر اس مثنوی کو مرتب کرکے شائع کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کارنامہ اردو زبان وادب کے حوالے سے ان کے اہم ترین کارناموں میں شامل ہے۔قدیم ادبی متون کی تدوین کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میراجی،ن۔م۔راشد کے کلیات بھی مرتب کئے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے منشی سجاد حسین کے ناول حاجی بغلول اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں پر مشتمل کتاب ’’بزمِ خوش نفساں‘‘ کو بھی ترتیب دیا۔ یوں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تدوینی خدمات کا دائرہ کار قدیم وجدید ادب پر محیط ہو جاتا ہے۔

ماہرِ لسان کے طور پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو خدمات سرانجام دیں ان میں قدیم اردولغت، اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ (دوجلدیں) اور قومی انگریزی اردو لغت کی ترتیب تالیف نہایت اہمیت کی حامل ہے۔قدیم اردو کی لغت، اردو کے قدیم ادبی سرمائے کی تفہیم میں نہایت معاون ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں اردو زبان کے وہ قدیم الفاظ جمع کئے ہیں جو کہ قدیم اردو مخطوطات کی تدوین کے دوران انہوں نے جمع کئے تھے۔ اردو زبان کے بدلتے روپ کو سمجھنے اور اردو کی ارتقائی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے قدیم اردو کی لغت منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لغت تقریباً گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل تھی اس لغت میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو اردو زبان کی پہلی باقاعدہ مثنوی ’’کدم راؤ پدم راؤ‘‘ میں استعمال ہوئے۔ شیخ باجن، شاہ

علی جیوگام دھنی، قاضی محمود دریائی اور خوب محمد چشتی کے دستیاب مخطوطات اور عادل شاہی اور قطب شاہی دور کی تصانیف نظم ونثر کے الفاظ بھی اس لغت کا حصہ ہیں۔ اس لئے قدیم اردو زبان کی تفہیم کے لئے یہ لغت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ الفاظ کے معنی کی تفہیم کے علاوہ تلفظ کے حوالے سے بھی یہ لغت اہمیت کی حامل ہے ایک ہی لفظ کی مختلف املائی صورتوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''فرہنگِ جامعہ عثمانیہ'' (جلداول ودوئم) کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالترتیب ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں ترتیب دیا۔فرہنگِ جامعہ عثمانیہ جلد اوّل میں ۴۲ ہزار جبکہ دوم میں ۲۸ ہزار اصطلاحات شامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان دونوں جلدوں میں تقریباً تمام شعبہ جات کی اصطلاحات کو اکٹھا کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ اصطلاحات کی ان جلدوں کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ بالخصوص سپریم کورٹ آف پاکستان کے آرڈر کے بعد جس میں اردو کو قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے حوالے سے فیصلہ سنایا گیا ہے، اصطلاحات کی یہ جلدیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں اردو اصطلاحات کی کمی کو دور کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔

اردو زبان کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی ایک اور قابلِ قدر خدمت ''قومی انگریزی اردو لغت'' کی تالیف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے دعوے کے مطابق یہ لغت اب تک شائع ہونے والی ہر لغت سے زیادہ ضخیم ہے(یاد رہے یہ لغت۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی)۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت کے لئے ویبسٹر ڈکشنری (انسائیکلو پیڈک ایڈیشن) کو بنیاد بنایا ہے۔ الفاظ کے مفاہیم اور ہجے پہلے امریکی انگلش میں بعد میں برطانوی انگلش میں دئے گئے ہیں۔ انگریزی زبان کے علاوہ، اس ڈکشنری میں اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے الفاظ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس لغت میں الفاظ کے مفاہیم بیان کرنے کے لئے الفاظ سازی بھی ہے جبکہ مفاہیم کے بیان میں اردو اور مقامی زبان کے اصول وقواعد کو مدنظر رکھاہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس عہد میں انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔اردو زبان کو دنیا کی دیگر زبانوں سے قریب لانے میں یہ لغت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ طلباء اور اساتذہ کی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ عام قارئین کے استفادے کے لئے بھی ''قومی انگریزی اردو لغت'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اردو زبان کی ترقی وترویج کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی لغت نگاری اور اصطلاحات کی جمع آوری کے حوالے سے ان کی کاوشیں انہیں زبان کا محسن قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان کاوشوں کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ آنے والے ادوار میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ یہ لغات اور اصطلاحات کے ذخیرے اردو زبان کی ترقی میں خشت اوّل کی حیثیت سے قدر کی نگاہ سے جاتی رہیں گی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ان کتب کے علاوہ ان کی تاریخ ادب اردو کی چاروں جلدیں اور ان کی ترجمہ کردہ کتب کے مقدمے بھی ان کی نظری وعملی تنقید کو سمجھنے میں انتہائی معاون ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید نگاری کی باقاعدہ ابتداء ان کے مضمون ’نئے شاعر۔فیض احمدفیض ‘ سے ہوئی جو کہ ’’نیادور‘‘ کراچی میں شائع ہوا۔اس مضمون کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید نگاری کا سلسلہ شروع ہواجو کہ تقریباًپینسٹھ سالوں پر محیط ہے اس طویل عرصے میں اردو زبان کے اول ودوئم درجے کے تقریباًتمام شعراء اور ادبا کے حوالے سے تنقیدی خیالات پیش کئے۔ قدیم ادب کے ساتھ ساتھ جدید ادب پر بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر بہت گہری ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لئے ان کی تنقید کتب بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقید نظریات کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی فکر پر مشرقی نظریات کے علاوہ مغربی ناقدین اور ادباء کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ایلیٹ کے حوالے سے ان کی پسندیدگی ان کی نظری وعملی تنقید میں جابجا محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایلیٹ ہی کی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی بھی تنقیدنگاری میں کلچر شناسی کواوّلین اہمیت دیتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر، تنقید، تحقیق اور فکر کے امتزاج سے ایک نئے تنقیدی نظام کو وضع کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ا سے ڈاکٹر جمیل جالبی ’’نئی تنقید‘‘ کا نام دیتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی فکر کو سمجھنے کے لئے ان کی تنقیدی کتب کے ساتھ ساتھ کلچر کے حوالے سے ان کی سب سے پہلی کتاب ’’پاکستانی کلچر۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ‘‘ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کتاب اس حوالے سے بھی اہم ہے قیام پاکستان کے بعد کلچر کے حوالے سے یہ پہلی کتاب تھی جس کے بعد کلچر کے حوالے سے مباحث کا آغاز ہوا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی تعریف متعین کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب اور کلچر کے تعلق کے حوالے سے پاکستان کے مخصوص قومی مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ بالخصوص پاکستان میں پائی جانے والی مختلف ثقافتوں کے درمیان اشتراکات اور اختلافات کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کلچر کے مباحث میں قومی کلچر کے فروغ میں حائل رکاوٹوں کا تجزیہ نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی تشکیل میں قومی یکجہتی کو نہایت ضروری تصورکرتے ہیں اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے مشترکہ زبان، مشترکہ مذہب اور زندہ نظام خیال کو ضروری تصورکرتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتب میں ادب کے حوالے سے ان کے نظریات کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی فکر کو سمجھنے کے لئے ان کی کتابیں ’’تنقیداور تجربہ‘‘،’’نئی تنقید‘‘،’’ادب کلچر اور مسائل‘‘اور ’’معاصر ادب‘‘قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کو ایک ایسا میڈیم تصور کرتے ہیں جس کے ذریعے محض ادیبوں اور شعراء کی تعریف و توصیف کرنا مقصود نہ ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید اور فکر کو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔ فکر وفلسفہ کے امتزاج سے نقاد اس قابل ہوتا ہے کہ ادب اور زندگی کے مسائل کا ادراک کر سکے۔ اسی تنقیدی نقطہ نظر کے باعث ڈاکٹر جمیل جالبی مفکر نقاد کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے اسے اس بات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ فکر کی سطح پر تمام معاشرتی، معاشی اور ذہنی عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے ادب کا تجزیہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ادیب سے بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ عہد حاضر کے فکر ی مسائل کا ادراک کرتے ہوئے ان کے حل کے لئے تجاویز دے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ادیب کے لئے سماجی شعور کو نہایت اہم تصور کرتے ہیں۔ ذہنی آزادی کے سرگرمیوں کا فروغ بھی ادیب کی اہم ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادیب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام سے وابستہ ہو کر اپنے آپ کو اس مخصوص نظام کا مبلغ بنانے سے گریز کریں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادیب کو کسی خاص آئیڈیالوجی سے وابستہ ہونے کے مخالف نہیں بلکہ ’’پارٹی لائن‘‘ کی ہدایت کے مطابق ادب تخلیق کرنے کے ضرور خلاف ہیں۔

ادیب کی ذمہ داریوں کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کی ماہیت، ضرورت اور اہمیت پر بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی محض جذبہ و احساس کو ادبی تحریر کے لئے ضرور ی تصور نہیں کرتے بلکہ الفاظ کی ترتیب وتنظیم اور لطف ومسرت کے عنصر کو بھی ادب کے لئے اہم تصور کرتے ہیں ان کے مطابق انسان کے تخیل کو ابھارنا، شعوروادراک کا حصول اور انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کا بیدار کرنا ادب کا اوّلین منصب ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کو دیگر فنون لطیفہ پر اس لئے فوقیت دیتے ہیں کہ ادب ہمیں دوسرے لوگوں کے تجربات میں شامل ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب میں خالص افادیت کو بھی رد کرتے ہیں۔ ادب اور قاری کے درمیان مضبوط تعلق کو اچھے ادب کی تخلیق کے لئے ضروری تصورکرتے ہیں۔ اسی طرح ادب اور سماج کا گہرا تعلق بھی بہت گہرا ہے۔ ادب وفن میں خالص اقدار کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے وقتی ضرورت کے تحت تخلیق کئے گئے ادب، تخلیقی تاثیر سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ،دائمی اثرات سے بھی محروم قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ادب کے متعلق تصورات کے حوالے سے ان کا تصور روایت بھی اہمیت کی حامل ہے۔ روایت ایک بنیادی چیز مگر اس کے برتنے کا طریقۂ کارہر دور اور ہرعظیم ’’فرد‘‘ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں جب ایک طریقہ پرانا ہو جاتا ہے اور اسی کی کوکھ سے ایک نئے، نامیاتی وجود کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنا مرکز تلاش کرکے اس دور کی جدیدیت بن جاتا ہے۔گویا جدیدیت، روایت سے بغاوت کرنے کے باوجود روایت ہی سے نکلتی ہے۔روایت اور جدیدیت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن ڈ اکٹر جمیل جالبی اردو ادب میں موجود ’’تصورجدیدیت‘‘

کی مذمت کرتے ہیں ان کے مطابق’’جدیدیت‘‘ کے علمبردار’’روایت‘‘ کی درست تصور کی تفہیم سے عاری ہیں اور جدیدیت کے تحت تخلیق کیا جانے والا ادب مثبت طرز احساس اور مثبت طرز فکر سے عاری ہے۔

ادب اور ادیب کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کرنے کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید اور نقاد کے منصب پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کو محض ادب تک محدود کرنے کے قائل نہیں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نئی تنقید کوا دب کے علاوہ پوری زندگی کے تجزیے، مطالعے اور غوروفکر کے بعد اجتماعی زندگی کی بہتری کے استعمال کیا جانا چاہئے۔ تنقید ہر قسم کے سوالات اٹھائے اور فرداور معاشرے میں تنقید ی روح بیدار کرے تاکہ ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں برداشت کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو۔ معاشرے میں پائی جانے والے منفی اقدار کے خلاف علم جہاد بلند کرے۔ معاشرے کے مسائل کا تعین کرے۔ معاشرتی تقادات کو واضح کرے اور ایک تعلیمی ومعاشی نظام دریافت کرے جو عدم مساوات کو ختم کردے۔ سائنس وٹیکنالوجی کو نظام اخلاق کا پابند کرے ادب اور فکر کے رشتے کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر بند معاشرے کے دروازے کھول کر جدید دنیا سے اس کے معنوی رشتے دریافت کرے۔ ادب پاروں کا تجزیاتی مطالعہ اور تشریح کرے۔ ادب پاروں کی انفرادیت کو اجاگر کرے اور تقابلی مطالعے سے ادب پارے کا درجہ متعین کرے۔ معاصر ادب کے منفی رحجانات کے رد کرتے ہوئے مثبت رحجانات کوا یک نئی جہت دے۔ دنیاکے دوسرے ادبیات سے اہم تخلیقا ت کے تراجم کرے۔ قدیم ادب کلاس کے اپنے عہد اور معاصر عہد کی روشنی میں جائزہ لے۔ تنقید،تحقیق سے اپنا رشتہ جوڑے۔ تنقیدی اسلوب کو نکھارے اور تمام اصناف سخن کو برابر اہمیت دے۔

ادب، ادیب،تنقید اور نقاد کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نقطہ نظر محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی عملی تنقیدان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی عملی تصویر ہے ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نقاد کے طور پر جہاں فن پارے کی جانچ پرکھ میں معاشرتی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی عوامل کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہتقابل وتجزیہ ان کی عملی تنقید کا اہم عنصر ہے وہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی عملی تنقید کے نمونے جدیدوقدیم ادب پر ان مہارت اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید اور تحقیق کے امتزاج سے ایک نئی اصطلاح ’’تحقید‘‘ وضع کی ہے جوکہ ان کی تنقید کے نمونوں کے لئے بہتر اصطلاح ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید میں تحقیق کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کسی بھی ادیب یا فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے اس ادیب اور تخلیق کے حوالے سے تحقیق طلب امور کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ’’سنی سنائی‘‘ باتوں پر یقین کرنے کی بجائے اوّلین مآخذ تک رسائی ان کی تنقید اور تحقیق کی وقعت کی ضامن ہے۔ قدیم شعراء اور ادباء مثلاًمیر، غالب، شیفتہ،حالی، اکبر الہ آبادی،نظیراکبرآبادی، ڈپٹی نذیرا حمد، سرسید احمد خان، منشی سجاد حسین ہو یا میر اجی، ن۔م۔راشد، فیض

اسرارالحق مجاز، حسن عسکری، انتظار حسین،عصمت چغتائی،کشور ناہیدیا عزیزاحمد وغیرہ پر عملی تنقید کے نمونے ان کی تمام اصناف نظم ونثر سے دلچسپی اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں بلکہ تحقیقی نقطہ نظر سے بھی وقعت کے حامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی تنقیدی آراء کے اظہار میں اعتدال اور توازن کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں البتہ جدیدیت کی تحریک کے تحت وجود میںآنے والے ادب پر ان کی تنقید ی آراء میں طنز کی شدت جدیدیت کے حوالے سے ان کی ناپسندیدگی کی مظہر ہے۔ جدیدیت کے حوالے سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان عناصر کی عمدگی سے نشاندہی کی ہے جو ان کے مطابق جدیدیت کے منفی رحجان کے عکاسی ہیں جبکہ جدیدیت کے حوالے سے مثبت رحجان اور عوامل کی نشاندہی بھی عمدگی سے کی گئی ہے گویا جدیدیت کے حوالے سے ان کی ناپسندیدگی محض تنقید برائے تنقید کی ذیل میں نہیں آتی۔ اس ناپسندیدگی کے پس منظر میں ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید محض ''ادب''کی جانچ پرکھ تک محدود نہیں۔ انہوں نے ''نئی تنقید'' کے حوالے سے نقاد کی جن ذمہ واریوں کا تعین کیا ہے ان عصری مسائل کا شعور اور ان کے حل کی تجاویز دینا بھی شامل ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ایک محب وطن نقاد ہونے کے ناتے ملکی مسائل اور ادب کے حوالے سے ان کے تعلق کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ اردو زبان کو قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے حوالے سے انہوں نے نہ صرف عملی طورپر اقدامات میں حصہ لیا بلکہ متعدد مضامین بھی تحریرکئے جن میں اردو زبان کو قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت اور اہمیت کو دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی کتاب ''قومی زبان، یک جہتی، نفاذاورمسائل'' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اردو کو قومی زبان کے طورپر رائج کرنے کے مخالفین کے اعتراضات کے مدلل جوابات دینے کے علاوہ نہایت عمدہ عملی اقدامات بھی تجویز کئے ہیں۔ جن کی بنیاد پر اردو زبان کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ عملی طورپر رائج کیا جا سکتا ہے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو برقرار رکھنے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمات قابل تحسین ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا اسلوب تنقید اپنی شگفتگی اور دلچسپی کے عناصر کے باعث تنقید جیسے خشک موضوع کو بھی قارئین کے لئے انتہائی دلچسپ کا حامل بنانے میں بہت معاون ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی اسلوب میں ہلکا پھلکا طنز، تشبیہ واستعارہ کا استعمال اور مناسب الفاظ کا استعمال اور عام بول چال کا انداز ان کے تنقیدی اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدکو تخلیقی تنقید قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی تنقیدی زبان سے ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو صرف انہی سے مخصوص ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی تنقیدی مضامین میں جہاں مغربی ناقدین کے نظریات کا حوالہ عموماًدیتے ہیں وہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ان کے تنقیدی مضامین میں اکثر نظر آتا ہے لیکن انگر یزی زبان کے الفاظ کا یہ استعمال انتہائی معتدل اور برمحل ہے۔ مجموعی طورپر ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی

مضامین ان کے تنقیدی نظریات، متوازن،معتدل،غیرجانبدار انہ تنقیدی آراء، امتزاجی تنقید اور ’’تحقید‘‘ کی خصوصیات کے حامل ہونے کے باعث اردو تنقید کا سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ نگاری،تدوین، لغت نگاری اور تنقید نگاری کے علاوہ اردو زبان وادب کو ایک اور حوالے سے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں وہ ترجمہ نگاری کا شعبہ ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مغربی تنقید کے صف اوّل کے ناقدین کے نظریات کو اردو زبان میں نہایت عمدگی سے متعارف کروایا۔ ان کی ترجمہ کردہ کتب ’’ارسطو سے ایلیٹ تک‘‘ اور ’’ایلیٹ کے مضامین‘‘ اس حوالے سے عام قارئین اور ادب کے طلباء اپنی اشاعت کے روز اول سے مقبول ہیں۔ ان کتب کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے جو کہ ان کتب کی مقبولیت، ضرورت اور اہمیت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف ان کتب میں انگریزی کے معروف ناقدین کے مضامین کے ترجمے شامل کئے ہیں بلکہ ان ناقدین پر نہایت عالمانہ مقدمے بھی تحریر کئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ کردہ ان کتب میں انہوں نے ترجمہ نگاری اصولوں اور طریقہ کار کو اس طور برتا ہے کہ یہ تراجم ’’اصل‘‘ تصنیف معلوم ہوتے ہیں اردوادب کے قارئین کو جدید تنقیدی نظریات سے آگہی فراہم کرنے کے لئے ان تراجم کی ایک خاص قدر وقیمت ہے جسے تما م اہل فکر ونظر تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کتب کے تراجم میں مصنف کے طرز ادا اور لہجے کا خیال رکھتے ہوئے،ضرورت کے تحت نئے الفاظ نئی بندشیں اور نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے حتی المقدور ترجمے کو اصل متن سے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مغربی ناقدین کے مضامین کے تراجم کے علاوہ،ڈاکٹر جمیل جالبی نے پروفیسر عزیز احمد کی دوکتب ’’برصغیر میں اسلامی جدیدیت‘‘اور ’’برصغیر میں اسلامی کلچر‘‘ کا ترجمہ بھی کیا ہے یہ دونوں کتب اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی عالمانہ اور محققانہ مواد پر مشتمل ہیں۔ان کتب کی خاص بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تقریباً ہرصفحے پر ممتاز اسکالر ز، مورخین، ادیبوں،دانشوروں اور محققین کی آراء موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ان کتب کا ترجمہ کرنا انتہائی مشکل امرتھا۔ ایک طرف پروفیسر عزیز احمد کے اسلوب سے آگہی اور دوسری طرف ان درجنوں دانشوروں،مورخین،محققین اور ادیبوں کے اسلوب سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ان کے اقتباسات کے تراجم کرنا انتہائی محنت کا طالب تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان تمام دشواریوں پر نہایت ہنرمندی سے قابو پایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی عالمانہ بصیرت کے حامل پر ترجمے اپنے انداز ایک تخلیقی شان رکھتے ہیں۔ ان کتب کو پڑھتے ہوئے بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ طبع زاد تخلیق ہیں یا تراجم ہیں۔ علمی وتحقیقی کتب کے تراجم میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ کردہ یہ کتب اردوزبان علمی سطح پر بلند پایہ بنانے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ قارئین اور طلباء اور دانشوروں کے درمیان ان کتب کی مقبولیت ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری کی صلاحیتوں کا بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی بطور نقاد، مدون، ماہرِ لسان، مؤرخ اور مترجم خدمات کے جائزے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کو اردو زبان وادب کا محسن قرار دینے کے حوالے سے دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سب مذکورہ حیثیتوں میں انتہائی محنت، لگن،دیانت، جستجو اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت اردو زبان وادب کے لئے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ان کاوشوں کے باعث یہ ضروری ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف ہر سطح پر کیا جائے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی اردو زبان وادب کے حوالے سے خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی ایک کوشش ہے جبکہ ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت اب بھی موجود ہے۔اردو ادب کے طلباء ناقدین،محققین کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی ایک ایسے مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے نہ صرف موجودہ عہد فیض یاب ہو رہا ہے بلکہ جب تک اردو زبان قائم ودائم ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

کتابیات

بنیاد ی مآخذات

۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،ادب، کلچر اور مسائل (مرتبہ: خاور جمیل)،کراچی،رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، لاہور مجلس ترقی ء ادب، باراول،۱۹۹۴ء

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، بار ہشتم،۲۰۱۴ء

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ایلیٹ کے مضامین: (ٹی ایس ایلیٹ کے ۹مضامین کا ترجمہ)کراچی، اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۰ء

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر،(مترجم) برصغیر میں اسلامی جدید یت:،ازپروفیسر عزیز احمد، اسلامک ماڈرن از ام ان انڈیا اینڈپاکستان (۱۸۵۷۔۱۹۶۴ء): لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸۹

۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،(مترجم)برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد کی کتاب ' اسلامک کلچران انڈیا اینڈ پاکستان 'کاترجمہ ، ۱۹۹۰ء

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر،بزمِ خوش نفساں،(شاہد احمد دہلوی کے ۲۶ سوانحی خاکے، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۵ ء۔

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، کراچی، مشتاق بک ڈپو، بار اول ۱۹۶۴ء

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (ٹھارویں صدی)جلد دوم(حصہ اول) لاہور، مجلس ترقی ادب، جولائی ۱۹۸۴ء

۱۰۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو (اٹھارویں صدی)جلددوم،(حصہ دوم)،لاہور، مجلس تر قی ا دب، جولائی۱۹۸۴ء(دونوں جلدوں کی یکجا اشاعت۱۹۸۷ء)

۱۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو (جلدسوم) مجلس ترقیء ادب،لاہور،۲۰۰۶ء

۱۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) مجلس ترقیء ادب، لاہور،۲۰۱۲ء

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (قدیم دور سے آغاز ۱۷۵۰ء تک)(جلد اوّل)، لاہور، مجلس ترقی ادب، جولائی۱۹۷۵ء

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، لاہور، یونیورسل بکس، بار دوم ۱۹۸۸ء

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مترجم)جانور ستان: (جارج آرول کے ناول اینمل فارم کا ترجمہ)، کراچی مکتبہ نیا دور، ۱۹۵۸ء

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، حاجی بغلول(منشی سجّاد حسین کا مزاحیہ ناول)، مشتاق بک ڈپو کراچی، ۱۹۶۱ ء۔

۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، حیرت ناک کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی، ۱۹۸۸ ء۔

۱۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، دیوان نصرتی، لاہور، قوسین، بار اول،۱۹۷۲۔

۱۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،دیوان حسن شوقی،انجمن ترقیء اردو،کراچی، ۱۹۷۱ء

۲۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد اول) اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۱ء

۲۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، (جلد دوم)اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت، لاہور،مرکزی اردو بورڈ، اول ۱۹۷۳ء

۲۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، مقتدہ قومی زبان،بار پنجم ۲۰۰۲ء

۲۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی زبان، یکجہتی، نفاذ اور مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۹ء

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، کلیاتِ میرا جی، اردو مرکز لندن، ۱۹۸۸ ء۔

۲۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، بار اول ،۱۹۷۳ء۔

۲۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، محمد تقی میر، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان بار اول،۱۹۸۱ء۔

۲۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصرادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، بار اول ۱۹۹۱ء

۲۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، میرا جی ایک مطالعہ، سنگِ میل لاہور، ۱۹۹۰ ء۔

۳۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ن م راشد ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۲ ء۔

۳۱۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، نہ ہوئی قرولی ۱۹۹۳ء (سلسلہ وار کہانی جو کہ کامل القادری کے اشتراک سے ماہ نامہ ہنہار کراچی میں چھپتی رہی۔

۳۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، کراچی، رائل بک کمپنی، بار اول ۱۹۸۵ء

ثانوی مآخذات

تحقیقی و تنقیدی کتب

۱۔ آزاد،محمد حسین،آب حیات،لاہور،خزینہ علم و ادب،۲۰۰۱ء

۲۔ ابوالکلام قاسمی،ڈاکٹر،مشرقی شعریات اور تنقید کی روایت،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہور،۲۰۰۰ء

۳۔ ابو للیث صدیقی،ڈاکٹر،لکھنؤ کا دبستانِ شاعری،کراچی:غضنفر اکیڈمی پاکستان،۲۰۰۲ء

۴۔ احسن فاروقی،ڈاکٹر،محمد،اردو میں تنقید،لاہور عشرت پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۷ء

۵۔ احسن فاروقی،ڈاکٹر، محمد،تایخ ادبِ انگریزی،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۶ء

۶۔ احسن فاروقی،ڈاکٹر، محمد،مرثیہ نگاری اور میر انیس،بار دوم،لکھنوء،ادارہ فروغ اردو،۱۹۶۴ء

۷۔ احتشام حسین، سیّد،تنقیدی جائزے،لکھنوء،فروغِ اردو،۱۹۷۸ء
۸۔ احتشام حسین، سیّد،مرتب،تنقیدی نظریات،لاہور،لاہور اکیڈمی،۱۹۶۸ء
۹۔ احتشام حسین، سیّد،مراثی انیس(جلد اوّل)،بار دوم،لکھنوء،ادارہ فروغ اردو،۱۹۶۴ء
۱۰۔ اسلم قریشی،ڈاکٹر،ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر،لاہور،مجلس ترقیء ادب،۱۹۷۱ء
۱۱۔ اعجاز حسین،ڈاکٹر،سیّد،مختصر تاریخ ادب اردو،کراچی،اردو اکیڈمی،طبع سوم،۱۹۷۱ء
۱۲۔ امداد اثر،امام،کاشف الحقائق،لاہورر،مکتبہ معین الادب،۱۹۵۶ء
۱۳۔ انعا م الحق کوثر،ڈاکٹر،بلوچستان میں اردو،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۶ء
۱۴۔ انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،کراچی،انجمن ترقی ء اردو،پاکستان،۱۹۸۵ء
۱۵۔ ایم سلطانہ بخش،ڈاکٹر،(مرتب)اردو میں اصول تحقیق(جلد اول)،اسلام آباد،ورڈوژن پبلشرز،۱۹۹۵ء
۱۶۔ بدر منیر الدین،بیسویں صدی کا شعروادب،لاہور،پہلیمر پبلیکیشنز،۱۹۸۸ء
۱۷۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جلد ۶ تا ۹، ۱۹۷۲ ء۔
۱۸۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،ادبی تحقیق کے اصول،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،طبع اول،۱۹۹۶ء
۱۹۔ تبسّم کاشمیری، ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک)، نئی دہلی، ایم۔آر۔ پبلیکیشنز، ۲۰۰۲ ء
۲۰۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں علامت نگاری،لاہور،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۵ء
۲۱۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر،معاصر ادب،نثری مطالعات،لاہورکلیہء علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونیورسٹی،۲۰۰۰ء
۲۲۔ تنویر علوی،ڈاکٹر،اصول تحقیق و ترتیب متن،دہلی،شعبہ ء اردو دہلی یونیورسٹی،۱۹۷۷ء
۲۳۔ تنویر علوی،ڈاکٹر،مرتب،انتخاب دواوین،نئی دہلی،شعبہء اردو دہلی یونیورسٹی،۱۹۸۷ء
۲۴۔ ٹائن بی،آرنلڈ،جے،مطالعہء تاریخ،(مترجم:غلام رسول مہر)لاہور،۱۹۶۳ء
۲۵۔ جیلانی کامران،تنقید کا نیا پس منظر،لاہور،مکتبہء جدید،۱۹۶۴ء
۲۶۔ جیلانی کامران،مغرب کے تنقیدی نظریے،لاہور،مکتبہ کارواں،۲۰۰۰ء
۲۷۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخِ اردو، آگرہ،ناشر لکشمی نارائن اگروال، ۱۹۵۷ ء۔
۲۸۔ حسن اختر،ڈاکٹر،ملک،تہذیب و تحقیق،لاہور،یونیورسل بکس،۱۹۸۵ء
۲۹۔ خالد سعید(مرتب)، قومی تشخص اور ثقافت، اسلام آباد، ادارہ ثقافت پاکستان، بار اول،۱۹۸۳ء
۳۰۔ خرم قادر،ڈاکٹر،تاریخ نگاری،نظریات و ارتقاء،لاہور،مکتبہء دانش،۱۹۹۴ء
۳۱۔ خلیق انجم،ڈاکٹر،فن ترجمہ نگاری،نئی دہلی،انجمن ترقی ء اردو،ہند،۱۹۹۵ء
۳۲۔ راغب رحمانی،مولوی،مترجم،مقدمہ ابن خلدون،کراچی،نفیس اکیڈمی،۱۹۸۲ء
۳۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادبِ اردو، لکھنوء،راجہ رام کمار بک ڈپو، ۱۹۵۲ ء۔

۳۴۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ،لاہور، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب،۱۹۸۹ء
۳۵۔ رضیہ نور محمد،ادرو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا جائزہ(از۱۴۸۹ تا۱۹۴۷ء)،لاہور،مجلس ترقیءادب،۱۹۷۵ء
۳۶۔ زور محی الدین قادری،ڈاکٹر،اردو شہ پارے،حیدرآباد دکن،۱۹۶۹ء
۳۷۔ سجاد باقر رضوی،ڈاکٹر،تہذیب و تخلیق،لاہور،مکتبہ ادب جدید،۱۹۶۶ء
۳۸۔ سر سیدین پاکستانی ادب،پانچویں جلد،(مرتبہ)رشید امجد،فاروق علمی راولپنڈی،فیڈرل سر سیّد کالج،۱۹۸۲ء
۳۹۔ سعد مسعود غنی،ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو،ملتان،المضراب پبلشرز،۲۰۰۵ء
۴۰۔ سلام سندیلوی،اردو رباعیات،لکھنوء،نسیم بک ڈپو،۱۹۶۳ء
۴۱۔ سلمان احمد،مرتب،اردو کی ادبی تاریخیں،نظری مباحث،حیدرآباد،قصرالادب،پاکستان،۱۹۹۹ء
۴۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر،اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۵ء
۴۳۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،تنقیدی دبستان،لاہور،سنگ میل پبلیکیشنز،،۱۹۹۷ء
۴۴۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر،اردو داستانیں،اسلام آباد،مقتدرہ پاکستان،س ن
۴۵۔ شبلی نعمانی،مولانا،الفاروق،مطبع مفید عام،آگرہ،۱۹۷۰
۴۶۔ شبلی نعمانی،مولانا،شعرالعجم،اسلام آباد،نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۹۲ء
۴۷۔ شگفتہ زکریا،ڈاکٹر،اردو نثر کا ارتقاء (آغاز سے ۱۸۵۷ء تک)،لاہور،سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۰۴ء
۴۸۔ شمس القادری،اردوئے قدیم،لکھنوء،نول کشور پریس،۱۹۳۰
۴۹۔ شیخ ابراہیم ذوق،مرتبہ،اسلم پرویز،دہلی،انجم ن ترقیء اردو،۱۹۹۹ء
۵۰۔ شیرانی حافظ محمود،پنجاب میں اردو،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان۱۹۹۸ء
۵۱۔ شیرانی،مظہر محمود،مرتب،مقالات حافظ شیرانی،جلداوّل،لاہور،مجلس ترقی ء ادب،۱۹۶۶ء
۵۲۔ صادق علی گل،ڈاکٹر،فن تاریخ نویسی،ہومر سے ٹائن بی تک،لاہور،پبلشرز ایمپوریم،۱۹۹۳ء
۵۳۔ صادق علی گل،ڈاکٹر،سرگذشت تاریخ،لاہور،پبلشرز ایمپوریم،۱۹۹۸ء
۵۴۔ طاہر فاروقی،محمد اور خاطر غزنوی،پاکستان میں اردو،(۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک)پشاور،یونیورسٹی بک ایجنسی،۱۹۶۵ء
۵۵۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،اردو تنقید کا ارتقاء،کراچی،انجمن ترقیء اردو،۲۰۰۱ء
۵۶۔ عبدالحق،مولوی،اردوکی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ،دہلی،انجمن ترقی ء ہند،۱۹۳۹ء
۵۷۔ عبدالحق،مولوی،قدیم اردو،کراچی،انجمن ترقی ء اردو،پاکستان،س ن
۵۸۔ عبدالرزاق قریشی،مبادیات تحقیق،بمبئی،انجمن اسلام ریسرچ انسٹیٹیوٹ،۱۹۴۸ء

۵۹۔ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر،ڈاکٹر جمیل جالبی؛ شخصیت اور فن،اسلام آباد،اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۷ء
۶۰۔ عبدالقادر سروری، اردو کی ادبی تاریخ، حیدرآباد،نیشنل فائن پر نٹنگ پریس، ۱۹۵۸ء
۶۱۔ علی جاوی ڈاکٹر، بر طانوی مستشر یقین اور اردو ادب، دہلی،اردو اکیڈمی،۱۹۹۲ء
۶۲۔ علی جواد زیدی، تاریخ ادب کی تدریس، لکھنو،ئنصرت بلشرز،۱۹۸۳ء
۶۳۔ عبدالقیوم،تاریخ اادب اردو،کراچی،پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز،۱۹۶۱ء
۶۴۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سیّد،اردو ادب جنگ عظیم کے بعد،لاہو،اردو اکیڈمی،۱۹۶۶ء
۶۵۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سیّد،اشارات تنقید،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،طبع دوم،فروری ۱۹۹۳ء
۶۶۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سیّد،شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن،لاہور،مکتبہ جدید،۱۹۵۲ء
۶۷۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سیّد،ولی سے اقبال تک،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء
۶۸۔ عتیق صدیقی،محمد،گلکرسٹ اور اس کا عہد،علی گڑھ،علی گڑھ یونیورسٹی،پریس،۱۹۶۰ء
۶۹۔ عشرت رحمان،اردو ڈراما،تاریخ و تنقید،لاہور،اردو مرکز،س ن
۷۰۔ علی جواد زیدی،دو ادبی سکول،کراچی نفیس اکیڈمی،۱۹۸۸ء
۷۱۔ علی جواد زیدی،اردو میں قومی شاعری کے سو سال،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۷۸ء
۷۲۔ عین الحق فرید کوٹی،اردو زبان کی قدیم تاریخ،لاہور،ارسلان پبلشرز،۱۹۷۲ء
۷۳۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،ادب اور ادب کی افادیت،لاہور،الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء
۷۴۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری،لاہور،مجلس ترقی ء ادب،۱۹۷۲ء
۷۵۔ قمرالدین بدایونی،بزم اکبر،دہلی،انجمن ترقیء اردو ہند،۱۹۴۴ء
۷۶۔ کلیاتِ نصیر شاہ،مرتب،ڈاکٹر تنویر علوی،لاہور،مجلس ترقیء ادب،۱۹۷۱ء
۷۷۔ کلیم الدین احمد،ڈاکٹر،اردو تنقید پر ایک نظر،لاہور،عشرت پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۵ء
۷۸۔ کلیم الدین احمد،ڈاکٹر،اردو شاعری پر ایک نظر،لاہور،نامی پریس،س ن
۷۹۔ گوپی چند نارنگ،لغت نویسی کے مسائل٬نئی دہلی،کتاب نما جمعہ نگر،ستمبر،۱۹۸۵ء
۸۰۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، بار اول،۱۹۹۳ء
۸۱۔ گیان چند جین، سیدہ جعفر، تاریخِ ادبِ اردو ۱۷۰۰ء تک، پانچ جلدیں، نئی دلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۵۸ء۔
۸۲۔ گیان چند جین،ڈاکٹر، تحقیق کا فن، اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، ۲۰۰۲ء
۸۳۔ گیان چند جین،ڈاکٹر،اردو کی نثری داستانیں،لکھنوء،اردو اکادمی،۱۹۸۷ء
۸۴۔ مالک رام،تحقیقی مضامین،نئی دہلی،مکتبہ جامعہ نئی دہلی لیمیٹڈ،۱۹۸۴ء
۸۵۔ مبارک علی،ڈاکٹر، تاریخ آگاہی، لاہور،نگار شات، ۱۹۸۶ء

۸۶۔ مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ اور فلسفہء تاریخ،لاہور،تاریخ پبلی کیشنز۔
۸۷۔ مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ کے نظریات،لاہور،نگارشات،س ن
۸۸۔ مجتبیٰ حسین،ادب و آ گہی، کراچی،مکتبہ افکار،۱۹۶۳ء
۸۹۔ مجنوں گورکھ پوری،تنقیدی حاشیے،حیدر ۆباد دکن،ادارہ اشاعت اردو،۱۹۴۵ء
۹۰۔ مجنوں گورکھ پوری،ادب اور زندگی،لاہور،آزاد کتاب گھر،۱۹۵۵ء
۹۱۔ محمد مظہر الدین،صدیقی،اسلام کا نظریہء تاریخ،لاہور،ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۷۹ء
۹۲۔ منظور حسین،ڈاکٹر،تحریک جدوجہاد بطور موضوع سخن،اسلام آباد،نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۸ء
۹۳۔ نسیم عباس، عامر سہیل، (مرتب)، ادبی تاریخ نویسی، لاہور،پاکستان رائٹرز کو وآپریٹو سوسائٹی،۲۰۱۰ء
۹۴۔ نسیم فاطمہ، ڈاکٹر بہ اشتراک سعید احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی (سوانحی کتابیات)لاہور، الفیصل ناشران و تاجرانکتب،۱۹۹۶ء
۹۵۔ نصیر الدین ہاشمی،ڈاکٹر،دکن میں اردو،لاہور۔اردو مرکز،س ن
۹۶۔ نصرتی،(مرتبہ)مولوی عبدالحق،نئی دہلی،انجمن ترقی ء اردو،۱۹۴۴ء
۹۷۔ نورالسلام،ریسرچ کیسے کریں، نئی دہلی،شاد پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء
۹۸۔ نورالحسن ہاشمی،ڈاکٹر۔دلی کا دبستان شاعری،کراچی،اردو اکیڈمی،سندھ،۱۹۶۶ء
۹۹۔ نیاز فتح پوری،انتقادیات،کراچی،ادارہ ادبیات عالیہ،۱۹۵۹ء
۱۰۰۔ وحید الدین سلیم، مولانا، وضع اصطلاحات، تیسرا ایڈیشن،کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء
۱۰۱۔ وحید قریشی،ڈاکٹر،تنقیدی مطالعے،لاہور،مکتبہء کارواں،۱۹۶۷ء
۱۰۲۔ وحید قریشی،ڈاکٹر،مقالات تحقیق،لاہور،مغربی پاکستان اکیڈمی،۱۹۸۸ء
۱۰۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید تنقید، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، بار اول ۱۹۸۹ء
۱۰۴۔ وقار عظیم، پروفیسر،سیّد،اندر سبھا،لاہور،اردو مرکز،۱۹۵۷ء
۱۰۵۔ وقار عظیم، پروفیسر،سیّد،فورٹ ولیم کالج،لاہور،یونیورسل بکس،۱۹۸۶ء
۱۰۶۔ ہادی حسین،مغربی شعریات،لاہور،مجلس ترقی ء ادب،۱۹۸۶ء

انگریزی کتب

1. Ali jawad zaidi; A Hisotry of urdu literature, Sahitya akadmi ,New Dehli,1993

2.Aziz Ahmad,Professor,Studies in Islamic culture in Indian envoirnment,Oxford university press,1966

3. Douglas Bush; Literary History and literary Critisism New York University Press, 1965

4. Eliot ,T.S,On poetry and poets.London,1956

5. Hudson,W.H.'An introduction to the study of literature' ,London,1959.

6. Muhammad Sadiq; A History of Urdu Literature, 2nd edition, oxford University press (Delhi 1964)

7. Ralph Russel; "The pursuit of urdu literature", Oxford University Press Bombay, Calcutta, Madras 1992

8. Ram Babu Saksena; A History of Urdu Literature , Allahbad 1972

9. Rene wellek; Austen Warren, Theory of literature, penguin books U.S.A 1963.

10.Russel.Ralph,How not to write the History of urdu literature and other essays on Islam,London,Oxford university press,1999.

11.T. Grahame Bailey; A History of urdu literature association Press YMCA, Cacutta, London oxford university ,Press,1932

لغات،انسائیکلو پیڈیا

۱۔ اردو انسائیکلو پیڈیا،فیروز سنز،لمیٹڈ،لاہور

۲۔ اردو لغت،اردو ڈکشنری بورڈ،کراچی،جلد پنجم

۳۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری ایڈیشن،۱۹۹۸ء

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ،پنجاب لاہور،جلد نمبر ۴

۵۔ ریڈرز ڈائجسٹ گریٹ انسائیکلوپیڈیا،ڈکشنری،۱۹۶۲ء

۶۔ فرہنگ عامرہ(عربی،فارسی اور ترکی الفاظ کی لغت)محمدعبداللہ خان خویشگی فرہنگ فارسی،تالیف:ڈاکٹر محمد معین

7. Dictionary Persian,Arabic and English:by,John Richardson.

رسائل و اخبار ات:

۱۔ اردو نامہ،شمارہ مارچ،۱۹۶۶ء

۲۔ ادب لطیف لاہور مئی ۱۹۵۷ء

۳۔ سہ ماہی ارمغان]جمیل جالبی نمبر[کراچی، اپریل،مئی، جون ۱۹۹۶ء

۴۔ تخلیقی ادب،شمارہ نمبر،۵،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء

۵۔ جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان،جلدix،۱۹۸۶ء

۶۔ دریافت شمارہ نمبر ۵ نمبر،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آبادگست۲۰۰۶ء

۷۔ دریافت،شمارہ نمبر،۱۱،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آباد۔۲۰۰۹ء

۸۔ روز نامہ جنگ کراچی، ۲۸جون۱۹۹۵ء

۹۔ روز نامہ نوائے وقت، اسلام آباد،۱۱جنوری ۲۰۰۵ء

۱۰۔ صحیفہ لاہور دسمبر ۱۹۵۷ء۔

۱۱۔ ہفت روزہ فیملی میگزین، کراچی، ۲تا ۸ جنوری ۲۰۰۰ء

۱۲۔ ماہ نامہ، ٹوٹ بٹوٹ، کراچی، مئی ۱۹۸۴۔

۱۳۔ ماہ نو،کراچی،فروری،۱۹۵۴ء

۱۴۔ ماہ نولاہور اپریل ۱۹۹۰ء

۱۵۔ نقوش کا شخصیات نمبر،۴۷، ۲۸ نومبر ۵۷

۱۶۔ وژن مجلہ، اسلام آباد ماڈل کالج، اسلام آباد ایف ۲۰۰۶/۷،۶ء

مقالات

۱۔ جمیل جالبی، شخصیت اور فن، مقالہ نگار، رضوانہ نسیم، بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی

۲۔ (اردو تنقید کے ارتقاء میں) ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمات، مقالہ نگار، محمد انیس الرحمن بھاگل پور

۳۔ اردو تنقید میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمات، مقالہ نگار، محمد عیسیٰ انصاری،مٹھلا

۴۔ حیدرآباد دکن میں اردو تحقیق کی روایت،مقالہ نگار،طارق محمود،پی ایچ۔ڈی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

۵۔ پاکستان میں عملی تنقید کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،محمد یقبال کامران،پی ایچ۔ڈی،جی سی،یونیورسٹی،لاہور

۶۔ اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،مقالہ نگار،ناصر عباس،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی،ملتان

۷۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مقالہ نگار،سیدہ افشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی،لاہور

ویب سائٹس

1. wwwbartleby.com Time:2:30pm

2 .www.google.com Time:3:30pm

3 . www. poets.org/ poetorg/text/tradion and individual talent Time:4:00pm

4. www.wikipedia.com Time:8:00pm